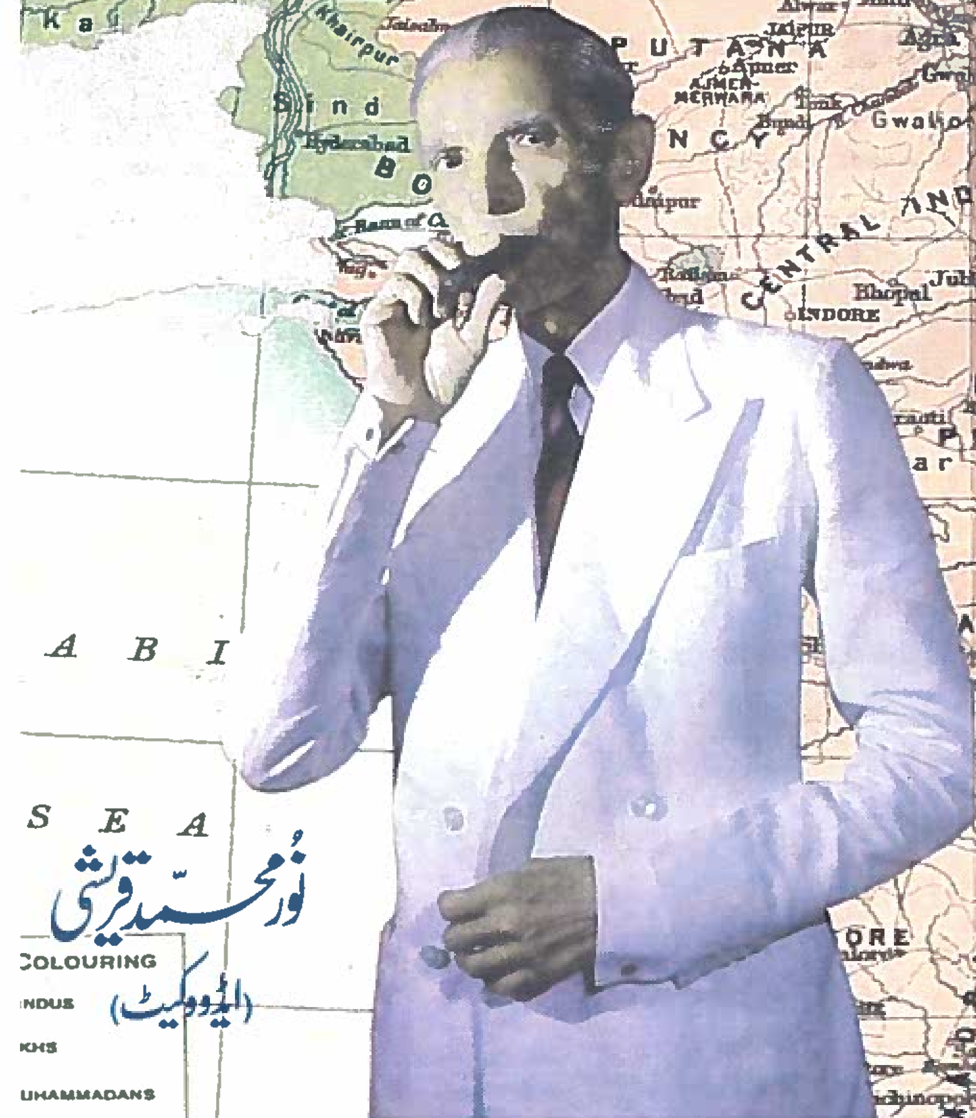
تو صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی

نورمحمد قریشی

(ایڈووکیٹ)



تو صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی

نور محمد قریشی (ایڈووکیٹ)

النونما

British Indian Empire 190



نورمحمد قریشی

مسٹر جناح کی شخصیت و سیاست کے تناظر میں دو قومی نظریہ کی حقیقت اور تقسیم برصغیر و قیام پاکستان کے محرکات وعوامل اور نتائج وعواقب کا بے لاگ تجزیاتی مطالعہ

النونما

www.justhistory.info

سرورق پر مسٹر جناح کی تصویر

ہم نے کتاب ہٰذا کے سرورق کے لیے جناح صاحب کی جس تصویر کا انتخاب کیا ہے، یہ (یا اس سے ملتی جلتی کوئی تصویر) دراصل ان کی اپنی پسند فرمودہ تھی۔ معروف مورخ جناب قیوم نظامی لکھتے ہیں:

"قائداعظم نے گورنر جنرل کا منصب سنبھالنے کے بعد سرکاری دفاتر اور پاکستانی سفارت خانے کے لیے اپنی جس پورٹریٹ کا انتخاب کیا وہ شیروانی اور جناح کیپ والی نہ تھی، بلکہ تھری پیس سوٹ اور ہاتھ میں سگار والی تھی۔"

(قائداعظم: بحیثیت گورنر جنرل/ ص:79)

تو صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی

مسٹر جناح کی شخصیت وسیاست کے تناظر میں دوقومی نظریہ کی
حقیقت اور تقسیمِ برصغیر وقیامِ پاکستان کے محرکات وعوامل اور
نتائج وعواقب کا بے لاگ تجزیاتی مطالعہ

نور محمد قریشی

[ایڈووکیٹ]

النور

4-حافظ چیمبر، 30-میکلیگن روڈ، لاہور

0321 - 4650131, www.alsharia.org

کتاب: تو صاحبِ منزل ھے کہ بھٹکا ھوا راھی
مصنف: نُور محمد قریشی (ایڈووکیٹ)
ناشر: النور، حافظ چیمبر، 30-میکلیکن روڈ، لاہور
طابع: قیوم پرنٹرز، لاہور
پانچواں ایڈیشن: جنوری2013ء
قیمت:

فہرست

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام

جب برصغیر تقسیم ہوا میرے لڑکپن کا زمانہ تھا۔ اب میں عمر کے اس حصے میں ہوں کہ ہر وقت بلاوے کے انتظار میں ہوں۔ لیکن اس پورے عرصے میں کوئی دن بھی ایسا نہیں گزرا جب ہر طرف سے یہ آواز نہ آ رہی ہو کہ ''ملک بہت نازک حالات سے گزر رہا ہے۔'' ایک نسل گزر گئی لیکن اس ملک کے نازک حالات ختم نہ ہوئے اور نہ ان کے ختم ہونے کی اُمید ہے۔ ہر دن بد سے بدتر ہی آ رہا ہے۔ اس کتاب کے نقشِ اول کی اشاعت سے لے کر اب تک حالات مزید خراب ہی ہوئے ہیں۔ اخبارات کے تجزیوں اور کالموں اور ٹی وی چینلز کے مذاکروں میں ملکی حالات کی ابتری کا رونا کثرت سے رویا جاتا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر حسین احمد پراچہ اپنے کالم ''حکم اذاں'' [مطبوعہ: روزنامہ نوائے وقت لاہور، 4 مئی 2009ء] میں لکھتے ہیں:

''آج آپ جس محفل میں چلے جائیں وہاں پاکستان کے مستقبل کے بارے میں آپ کو بڑی تشویش ناک باتیں سننے کو ملیں گی۔ عوام بے یقینی کا شکار ہو چکے ہیں۔ علامہ اقبالؒ فرما گئے ہیں کہ: غلامی سے بدتر ہے بے یقینی''

عوام بے یقینی کا نہیں بلکہ نااُمیدی و مایوسی کا شکار ہو گئے ہیں، جیسا کہ ممتاز ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان اپنے کالم ''ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام'' [مطبوعہ روزنامہ جنگ لاہور 3 اکتوبر 2011ء] میں رقم طراز ہیں:

''غالبؔ نے اپنی ایک غزل کے مقطع میں کہا تھا:

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

پہلے مصرعہ میں تو غالبؔ نے تمام مصائب کے ختم ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن دوسرے

مصرعہ میں ان مصائب کا اختتام مرگِ ناگہانی قرار دینے سے اُمید و توقع حالات کے بہتر ہونے کی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ شعر اس وقت پاکستان کے مصیبت زدہ، لاچار، بے بس اور نا اُمید عوام پر صادق آتا ہے کیونکہ وہ ہزار اور ایک مصیبتوں سے دوچار ہیں اور کہیں سے کوئی بہتری نہ نظر آتی ہے اور نہ ہی بہتری کی اُمید ہے۔''

جناب جاوید قریشی کا کالم روزنامہ نوائے وقت، لاہور 10 رمئی 2010ء میں بعنوان ''بحران ہی بحران'' شائع ہوا ہے، جس میں وہ رقم طراز ہیں:

''پاکستان اور ہم پاکستانی آج کل [آج کل ہی نہیں، گزشتہ 63 سال سے۔ ناقل] عجیب کیفیت سے گزر رہے ہیں۔ ایک بحران ختم ہونے نہیں پاتا کہ دوسرا منہ پھاڑے کھڑا ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ان بحرانوں نے زندگی عذاب بنا رکھی ہے۔ منیر نیازی نے کہا تھا:

اک اور دریا کا سامنا تھا منیؔر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اُترا تو میں نے دیکھا

منیؔر اس ملک پر آسیب کا سایہ ہے یا کیا ہے
کہ حرکت تیز تر ہے اور سفر آہستہ آہستہ

بحرانوں میں سب سے شدید بجلی کی ناہوت اور لوڈشیڈنگ کا بحران ہے۔ اتنی شدید اور اس قدر طویل لوڈشیڈنگ اس ملک کی تاریخ میں پہلے دیکھنے میں نہیں آئی۔ صنعتیں بند ہوتی جاتی ہیں۔ مزدور بے روزگار ہوتے جاتے ہیں۔ لوگوں کے چولہے ٹھنڈے ہو رہے ہیں لیکن حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ مسئلہ کو حل کرنے کی بجائے ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے حکومت نے سرکاری دفاتر میں ہفتہ میں دو چھٹیاں کر دیں۔ دکانداروں کو حکم دیا گیا کہ دکانیں 8 بجے شام بند کر دی جائیں۔ طوعاً و کرھاً کاروباری حضرات نے یہ پابندی بھی قبول کر لی۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ لوڈشیڈنگ میں مزید اضافہ! پریشان حال، بے روزگار لوگ سڑکوں پر نکل آئے، زبردست احتجاج ہوئے۔ حکومت ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ لوگوں کی تکلیف اور اذیت کو دیکھتے ہوئے ن

لیگ کے قائدین نے کہا کہ 8 بجے دکانیں بند کروا دینا کاروباری لوگوں کے ساتھ زیادتی ہے اور وہ زیادہ دیر اس کی حمایت نہ کر سکیں گے۔ حکومت کو کوئی ٹھوس اور پائیدار حل اس مسئلہ کا تلاش کرنا ہوگا۔ ایک طرف تو بجلی کی عدم فراہمی کا یہ عالم کہ لاہور اور فیصل آباد جیسے شہروں میں چودہ چودہ، سولہ سولہ گھنٹہ بجلی غائب، اُدھر بجلی کے بل جوں کے توں۔ بلکہ بعض حالات میں مزید زیادہ۔ کارخانے بند ہونے سے لوگ بے روز گار ہو رہے ہیں۔ خودکشیاں ہو رہی ہیں۔ عوام اپنے بچے فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ لیکن حکومت کو لوگوں کو راحت دلوانے میں کوئی دلچسپی نظر نہیں آتی۔''

جناب جاوید قریشی اپنے ایک دوسرے کالم ''مہنگائی کا طوفان اور بے کس عوام'' [مطبوعہ: نوائے وقت لاہور، 15 نومبر 2010ء] میں لکھتے ہیں:

''کمر توڑ مہنگائی اور بے روزگاری نے غریب عوام کی رات کی نیند اور دن کا چین غارت کر دیا ہے۔ کوئی دن جاتا ہوگا جب حکومت کی طرف سے کسی نہ کسی ضروری چیز کی قیمت میں اضافے کا اعلان نہ ہوتا ہو جو عوام کی تکلیف میں مزید اضافہ کا سبب نہ بنتا ہو۔ آٹا، چاول، دال، گھی، تیل، گوشت، سبزی، غرض روزمرہ استعمال کی کوئی شے بھی اب عوام کی دسترس میں نہ رہی ہے۔ لوگ غربت سے تنگ آ کر خودکشیاں کرنے پر مجبور ہیں۔ مائیں اپنے جگر گوشوں کو قیمتاً فروخت کرنے پر مجبور یا ایسے فلاحی اداروں کے حوالے کرنے پر آمادہ ہیں جہاں اُنھیں دو وقت کی روٹی دستیاب ہو۔ حالات اس قدر خراب اور تکلیف دہ ہیں کہ نظیر نہیں ملتی۔ بعض اشیاء جو ملک میں دستیاب نہیں تھیں، یہاں پیدا نہیں ہوتیں اور ملک انھیں درآمد کرنے پر مجبور ہے۔ ان کی قیمتوں میں عالمی اُتار چڑھاؤ کی بدولت اضافہ تو سمجھ میں آ سکتا ہے لیکن وہ چیزیں جو ہمارے یہاں پیدا ہوتی ہیں جیسے پیاز، مرچیں، دالیں، چاول، آٹا وغیرہ ان کی قیمتوں میں بلاوجہ اور بلاجواز اضافہ غریب بے کس عوام کی سمجھ سے باہر ہے۔ یہاں بھی سیاست کارفرما نظر آتی ہے۔''

جناب سعید آسی نے اپنے کالم ''یار و ہم ہیں پاکستانی'' [مطبوعہ نوائے وقت لاہور، 11 جنوری 2010ء] میں بحیثیت مجموعی ملکی حالات کو آشکار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اس سے بڑی اذیت اور کیا ہو سکتی ہے کہ گھر میں بجلی، پانی اور گیس کی بندش، باہر سی این جی گیس کی سہولت سے محرومی اور بازاروں میں مہنگائی کی اتنی مار کہ کچھ خریدنے کو بھائی نہ دے۔ ایک دل جلے کا بار بار ایس ایم ایس آ رہا ہے:

میرا ٹی وی ہے جاپانی
میرا اے سی انگلستانی
گھر میں بجلی ہے نہ پانی
یارو میں ہوں پاکستانی

ہماری پامردی کے ایسے قصوں کے ایس ایم ایس تواتر سے چل رہے ہیں۔ ایس ایم ایس کے ذریعے دنیا بھر میں گھومنے والا ایک لطیفہ بھی ملاحظہ فرمائیں:

ٹیچر: دنیا کے پہلے انسان کی نیشنلٹی کیا تھی؟

شاگرد: پاکستانی۔

ٹیچر: وہ کیسے؟

شاگرد: اس کے پاس گھر بھی نہیں تھا، آٹا بھی نہیں تھا، بجلی بھی نہیں تھی، پانی بھی نہیں تھا، پھر بھی وہ زندہ تھا۔ کیوں ہوا نا پاکستانی۔

گویا اس ارضِ کائنات پر پہلے انسان کے ورود سے بھی پہلے اس ملک خداداد کا قیام عمل میں آ گیا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی طے کر لیا گیا تھا کہ اس ملک خداداد کے باسی کی "دِل پاور" اتنی رکھی جائے کہ وہ بجلی، پانی، گیس، آٹے، چینی اور دیگر ضروریاتِ زندگی کے بغیر بھی نہ صرف زندہ رہے بلکہ بڑے دبدبے اور ولولے کے ساتھ زندہ رہے۔ چنانچہ اس خاصیت کا حامل جو بھی انسان آپ کو اس کرۂ ارض کے کسی بھی کونے میں دستیاب ہو جائے تو بلا تحقیق آپ اس کے پاکستانی ہونے کا سرٹیفکیٹ جاری کر سکتے ہیں۔ مگر ذرا سوچیے! کیا یہ سارے عذاب ہمارے ہی مقدر میں لکھے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو اپنی مخلوق میں کسی قسم کے امتیاز کے روادار نہیں ہو سکتے۔ پھر ساری انسانی محرومیاں ہمارے ہی حصے میں کیوں؟ حضرت علامہ اقبال نے تو فتویٰ دیا ہوا ہے:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا[1]

پھر کیا ایسا ہی نہیں ہوا کہ ہمارے والیانِ ملک و مختار نے کبھی قوم کی حالت بدلنے کا نہیں سوچا، ہمیشہ اپنی حالت بدلنے پر ہی توجہ دی۔ اسی لیے تو ان کے محلات کے در و دیوار تک جگ مگ جگ مگ کرتے رہتے ہیں اور ازلی اندھیرے عام انسانوں کی آبادیوں کا مقدر بنا دیے گئے ہیں۔ ان کے پالتو جانوروں کے ٹھوٹھے بھی بھرے رہتے ہیں اور مجبور و محروم انسانوں کو جسم کے ساتھ سانس کا رشتہ استوار رکھنے والی ضروریاتِ زندگی بھی دستیاب نہیں:

آپ تے پیویں بُکّاں شربت
سانوں گھُٹ گھُٹ زہر پلاویں

معطر فضا میں انواع و اقسام کی نعمتوں کے ساتھ پلنے، پروان چڑھنے والے اس حکمران طبقۂ اشرافیہ کا کیا اس وطنِ عزیز کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ اگر ان کی شہریت بھی پاکستانی ہے تو وہ دیگر پاکستانیوں والا محرومیوں کا اعزاز کیوں نہیں رکھتے، خود لہو پی کر دیگر شہریوں کو مساوات کا درس دینے والے اس طبقۂ بلند و بالا کو جب تک انسانی محرومیوں کا احساس نہیں ہو گا، جب تک وہ بھوک سے عاجز نہیں آئیں گے، جب تک بجلی اور گیس کی محرومی کے باعث ان کے کچن کے چولہے ٹھنڈے نہیں ہوں گے اور جب تک مارکیٹ میں جا کر روزمرہ استعمال کی اشیاء خریدنے کی سکت نہ پا کر انھیں اپنے حال پر رونا نہیں آئے گا، وہ قوم کا مقدر بدلنے کا کبھی نہیں سوچیں گے۔ اس لیے پہلے اس مراعات یافتہ طبقہ کی زندگیوں کا چلن بدلنے کی ضرورت ہے۔ ان کے بحر کی موجوں میں اضطراب لانے کے لیے انھیں کسی طوفاں سے آشنا کرنا ضروری ہے، ورنہ اس ترقی یافتہ جدید دور میں بھی بجلی اور گیس سے محرومی ہمارا مقدر بنی رہے گی اور ہمارے اس اعزاز کی بنیاد پر دنیا بھر میں ہمیں شناخت کرنا قطعاً مشکل نہیں ہو گا۔ کیا ضروری ہے کہ ہماری شناخت ایک مجبور و محروم انسان کی ہی بنی رہے۔"

1۔ یہ شعر علامہ اقبال کا نہیں، مولانا ظفر علی خاں کا ہے۔ (ن م ق)

جمہوریت سے جو توقعات وابستہ کی گئی تھیں اُن میں سے ایک بھی پوری نہیں ہوئی نہ اس کی اُمید ہے۔ ملک میں ابتدا سے لے کر اب تک آمریت اور جمہوریت کی باریاں بندھی ہوئی ہیں۔ جب لوگ جمہوریت سے مایوس ہو جاتے ہیں تو کسی مردے ازغیب (فوجی ڈکٹیٹر) کے لیے دعا گو بن جاتے ہیں اور مردے ازغیب کے آنے کے بعد جمہوریت کے لیے جدوجہد شروع کر دیتے ہیں۔ اس چکر کے ختم ہونے کے آثار دور دور تک نظر نہیں آتے۔ اِس صورتِ حال کی وجہ سے ہی ملک بدترین بحرانوں سے دوچار ہے۔ لوگ غربت، بھوک، افلاس اور بے روزگاری کی وجہ سے خودکشیاں کرنے پر مجبور ہیں۔ دراصل ملک کو اِن حالات میں پہنچانے والے، بقول ڈاکٹر صفدر محمود قائداعظم کے کھوٹے سکے اور اُن کے بعد اُن کے کھوٹے سکے ہی ہیں۔ یہی لوگ نسل در نسل اس ملک پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ نام نہاد جمہوریت کی صورت میں بھی یہی لوگ آتے ہیں اور یہی لوگ آمریت کے لیے حالات پیدا کر کے پھر اُس کی چھتری تلے آ جاتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ گزشتہ 63 سال سے ملک اور عوام کو لوٹتے چلے آ رہے ہیں۔ اس صورتِ حال پر روزنامہ نوائے وقت، لاہور، 31 اگست 2009ء میں ایک تجزیاتی رپورٹ بعنوان ''پاکستان میں جمہوریت سمیت ہر نظام ناکام رہا، مہنگائی اور غربت سے خودکشیاں بڑھ گئیں، لوگ بدترین نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو گئے، سیاسی جماعتیں، حکومت، بیوروکریسی، اسٹیبلشمنٹ بھی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ہتھے چڑھ گئیں'' شائع ہوئی ہے۔ جس کا متن ملاحظہ ہو:

''کرپشن اور بدعنوانی کی وجہ سے پاکستان میں جمہوریت بدترین بحران کا شکار ہو چکی ہے۔ تجزیاتی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ہر قسم کا نظامِ حکومت ناکام رہا ہے۔ صدارتی، پارلیمانی، آمرانہ نظامِ حکومت کے ساتھ ساتھ جمہوریت کی ناکامی کی بھی اصل وجہ کرپشن اور بدعنوانی ہے۔ تجزیاتی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ہر شعبے کے طاقتور افراد اس ملک کو لوٹ رہے ہیں۔ ایسا میکانزم بنایا جا چکا ہے کہ غریب عوام کا استحصال اشرافیہ کی مجبوری اور ضرورت بن چکا ہے۔ مہنگائی کی وجہ سے اشیاءِ ضروریہ بھی اب غریب آدمی کی دسترس سے باہر ہو چکی ہیں جس کی وجہ سے پاکستان میں غریب لوگ بدترین نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ تجزیاتی رپورٹ کے مطابق موجودہ حکومت آنے کے بعد سے اب تک مہنگائی اور غربت کی وجہ سے پاکستان میں

خودکشی کرنے والے افراد کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔ کراچی، لاہور، اسلام آباد جیسے شہروں میں غریب افراد ہر روز خودکشیاں کرنے پر مجبور ہیں۔ سرمایہ دار پاکستان میں مکروہ بدعنوانیوں میں ملوث ہیں۔ سرمائے کی طاقت کو استعمال کر کے غریب طبقے کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ سیاسی جماعتوں، حکومت، بیوروکریسی، اسٹیبلشمنٹ میں سب جگہ سرمایہ دار، جاگیردار اور جرنیل بیٹھے ہوئے ہیں جو صرف اپنے طبقے کی بہتری کے لیے پالیسی بنا رہے ہیں۔ پاکستان میں سیاستدان پالیسی سازی میں غریب طبقے کے مفادات کو تحفظ دینے پر کوئی توجہ نہیں دے رہے ہیں، جس کی وجہ سے غربت اور امارت میں خوفناک حد تک فاصلہ پیدا ہو چکا ہے۔ غربت اور امارت میں اتنے بڑے فرق کی وجہ سے سماجی معاشرہ تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔''

جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی کرپشن اور بدعنوانیوں کی وجہ سے پاکستان میں پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھئے کہ آج ملک نے ایک ناکام ریاست کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ ملک کے تمام محکمے تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ ریلوے تباہ ہو چکی ہے۔ پی آئی اے تباہی کے دھانے پر ہے۔ سٹیل ملز ناکارہ۔ واپڈا نااہلی کا شکار۔ پٹرولیم رسائی سے باہر۔ گیس نایاب۔ امن و امان کے محافظ خود تحفظ سے محروم۔ ضروریاتِ زندگی لاپتا۔ میرٹ کا تو ذکر کرنا ہی جرم ہے۔ بجلی کے بحران کی جو صورتِ حال ہے وہ معاصر جنگ، 3 اکتوبر 2011ء کے ادارتی شذرہ سے عیاں ہے۔ ملاحظہ ہو:

''ملک گیر سطح پر بجلی کے بحران اور غیر علانیہ لوڈشیڈنگ کے دورانیے میں اضافے کی وجہ سے اکثر شہروں میں 20، 20 گھنٹے سے زائد لوڈشیڈنگ نے جہاں عوام کا جینا دوبھر کر دیا ہے وہاں پوری قومی معیشت متزلزل ہو کر رہ گئی ہے، شہروں میں لوگوں کو پینے کا پانی تک دستیاب نہیں، جبکہ سرکاری و نجی ہسپتالوں میں ڈینگی کے مریضوں کے ٹیسٹ اور ان کے علاج کی راہ میں پیدا ہونے والی رکاوٹوں نے انتہائی سنگین صورتِ حال کو جنم دیا ہے۔ 8500 میگاواٹ ریکارڈ شارٹ فال نے عوام کو حکومت، پیپکو اور واپڈا کے خلاف احتجاجی مظاہروں پر مجبور کر دیا ہے۔ لاہور کی 80 فیصد آبادی گزشتہ دو دن سے رات بھر تاریکی میں ڈوبی رہی جس کی ایک بڑی وجہ حکومت کی طرف سے پیپکو اور دیگر اداروں کو واجبات کی عدم ادائیگی ہے۔ یہ صورتِ حال عوام میں حکومت کے

خلاف شدید ردِعمل پیدا کر رہی ہے۔ اگر حکومت نے اس صورتِ حال پر قابو نہ پایا تو اسے شدید عوامی ردِعمل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ حکومت کو چاہیے کہ وہ عوام کو اعتماد میں لینے اور انھیں اس صورتِ حال کے بنیادی اسباب اور بحران پر قابو نہ پا سکنے کی وجوہات سے آگاہ کرے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ بازار میں موم بتیاں تک دستیاب نہیں اور اگر کہیں دستیاب ہیں تو ان کی قیمت عام آدمی کی قوتِ خرید سے باہر ہے۔ یو پی ایس سسٹم بھی بالکل بے کار ہو چکا ہے۔ اس طرح عوام ایک متبادل ذریعے سے بھی بجلی حاصل نہیں کر پا رہے۔ آج تک اس بحران نے ایسی شدت کبھی اختیار نہیں کی۔ ماضی کی کسی حکومت نے مسائل کے حوالے سے کسی بھی شعبے کے لیے ٹھوس منصوبہ بندی کی طرف توجہ نہیں دی۔ نہ اب تک کالا باغ ڈیم تعمیر ہو سکا، نہ پانی، ہوا اور سورج کی روشنی سے بجلی پیدا کرنے اور تھر کے کوئلے کے ذخائر سے بھرپور استفادہ کرنے کی کوشش کی گئی، حالانکہ صرف تھر میں کوئلے کے ذخائر سے ڈیڑھ سو سال تک بجلی پیدا کر کے بہت کم قیمت پر صارفین کو فراہم کی جا سکتی ہے۔ اگر حکومت نے اس بحران پر قابو پانے کے لیے ضروری اقدامات نہ کیے تو اس کے لیے سنگین مشکلات پیدا ہوں گی اور شدید عوامی ردِعمل انتہائی خطرناک مسائل کو جنم دے گا۔"

اِن بدترین ملکی حالات کی وجہ سے عوام کن حالات و کیفیات میں مبتلا ہیں، صرف تین حوالے پڑھیے۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور، 11 اکتوبر 2009ء میں عالمی ادارۂ صحت کی رپورٹ شائع ہوئی ہے جس میں بتایا گیا ہے:

"پاکستان میں ہر پانچواں شخص نفسیاتی مرض کا شکار ہے۔ ڈپریشن سے متاثرین کی تعداد سب سے زیادہ ہو گئی ہے۔"

پاکستان کے ہیومن رائٹس کمیشن کی ایک رپورٹ روزنامہ جنگ لاہور 16 فروری 2012ء میں بعنوان "کچھ لوگوں کے لیے غربت سے بچنے کا واحد راستہ خودکشی ہے۔ بچوں کی آہیں والدین کے لیے تکلیف دہ ہیں، ماؤں نے بھیک مانگنی شروع کر دی" شائع ہوئی ہے۔ رپورٹ کا متن حسبِ ذیل ہے۔ ملاحظہ ہو:

"اسلام آباد، کراچی (رائٹرز) کچھ پاکستانیوں کے لیے غربت سے بچنے کا واحد راستہ

خودکشی ہے، بھوک سے بلبلاتے بچوں کی آہیں اور سسکیاں والدین کے لیے تکلیف دہ ہیں۔ ماؤں نے بھیک مانگنا شروع کر دی، اس وجہ سے کچھ لوگ ملازمت کے لیے باہر چلے جاتے ہیں، جبکہ کچھ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے عسکریت پسندوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ پاکستان کے ہیومن رائٹس کمیشن کے مطابق 2011ء میں اکتوبر تک 10 ماہ میں 1600 لوگوں کے لیے خودکشی کا فیصلہ واحد راستہ تھا، گزشتہ سال 2399 لوگوں نے غربت کی وجہ سے خود کو قتل کر ڈالا۔ کمیشن نے کہا کہ معاشی حالات کی وجہ سے حالات اس سے بھی بدتر ہو سکتے ہیں۔ حکومت نے 2011-12ء کے بجٹ میں اس مقصد کے لیے صرف 0.04 فیصد فنڈز مختص کیے ہیں جبکہ دفاع کے لیے 17.8 فیصد مقرر کیا گیا، غربت کی وجہ سے والدین خودکشی کر لیتے ہیں اور بچوں کو قتل کر دیتے ہیں یا انھیں چھوڑ دیتے ہیں۔"

روزنامہ جنگ لاہور 15 نومبر 2009ء میں ایک قاری جناب محمد شفیع کا مراسلہ شائع ہوا تھا جس میں وہ لکھتے ہیں:

"میرا تعلق قانون نافذ کرنے والے ادارے سے ہے اور میں گزشتہ 25 سال سے ایک اعلیٰ منصب پر خدمات انجام دے رہا ہوں۔ میرے لیے یہ باعثِ تشویش ہی نہیں بلکہ انتہائی تکلیف دہ اور دُکھ کی بات ہے کہ میں نے اپنی اس طویل ملازمت کے دور میں ایسے دل خراش اور تکلیف دہ حالات نہیں دیکھے تھے جو گزشتہ چار پانچ سال سے دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ یہ حالات غربت، افلاس، بے روزگاری، معاشی مشکلات سے تنگ آ کر خودکشی پر مبنی واقعات ہیں جنھیں پڑھ سن کر دل لرز جاتا ہے۔ اکثر افراد اپنی بیوی بچوں کو بھی اپنے ساتھ قتل کر دیتے ہیں۔ بالخصوص عید اور دوسرے مذہبی تہواروں پر ایسے واقعات میں خوفناک اضافہ ہو جاتا ہے اور والدین بچوں کی طرف سے نئے کپڑوں، جوتوں اور عیدی کی فرمائشیں پوری نہ ہونے پر اپنے آپ کو موت کے منہ میں دھکیل دیتے ہیں اور بچوں کو بھی خوفناک طریقے سے موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال ماضی میں کبھی دیکھنے سننے میں نہیں آتی تھی۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ سابقہ پرویز حکومت عوام کی ترقی اور خوشحالی کے

دعوے کرتی رہی اور اب موجودہ حکومت بھی اس قسم کے دعوؤں میں مصروف ہے اور حالت یہ ہے کہ وہ گندم، آٹا، چینی، گیس اور بجلی کے بحران پر قابو پانے میں ہر طرح ناکام ہو چکی ہے۔ اور اگر یہی صورت حال جاری رہی تو خودکشی کے یہ لرزہ خیز واقعات ہماری اور موجودہ حکومت کی تاریخ میں ایک المناک باب بن جائیں گے، کوئی انھیں مٹا نہیں سکے گا اور اس سے حکمرانوں کی ناقص کارکردگی اور ناکامی کا تاثر اپنے عروج پر پہنچ جائے گا۔"

آج ملکی حالات اس قدر بدتر ہو گئے ہیں کہ عوام مایوس اور مجبور ہو کر خودکشیاں کر رہے ہیں، میرے نزدیک اس ملکی ابتری و بدحالی کی اصل وجہ اور سبب مسٹر جناح اور اُن کے رفقا (جو بقول خود اُن کے "کھوٹے سکے" تھے) کی بے بصیرت، بے فراست، بے حکمت، بے حمیت سیاست و قیادت اور ان کی وہ بنیادی غلطیاں، کوتاہیاں اور حماقتیں ہیں جن کا ذکر میں نے اس کتاب میں کیا ہے اور برملا کیا ہے بلکہ ڈنکے کی چوٹ پر کیا ہے۔

میں نے اپنی اس کاوش کی پہلی اشاعت [بہ ضخامت 224 صفحات] کو ایک کرم فرما کے تعاون سے نومبر 2008ء میں شایع کر کے اپنے حلقۂ احباب میں مطالعہ کے لیے تقسیم کر دیا تھا اور بڑی تعداد میں لیگی نقطۂ نظر رکھنے والے اہلِ قلم دانش وروں کی خدمت میں، اس گذارش کے ساتھ کہ وہ اس پر نقد و تبصرہ فرمائیں، یہ کتاب رجسٹرڈ ڈاک سے ارسال کی تھی۔ بعد میں اُن سے خطوط کے ذریعے بھی تقاضا کیا کہ وہ اس کا جواب لکھیں، لیکن سوائے جناب خالد ہمایوں کے،[1] کسی نے ایک لفظ بھی اس کتاب کے بارے میں نہیں لکھا۔[2] دوسری طرف جب یہ کتاب لوگوں

1۔ جناب خالد ہمایوں نے جو کالم لکھا تھا، اس کے ابتدائی حصہ کو ہم نے کتاب کے زیرِ نظر ایڈیشن کا "اختتامیہ" بنا دیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہی آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ انھوں نے اگر کچھ لکھا تھا تو کیا لکھا تھا۔

2۔ کتاب شایع ہونے کے بعد مسلم لیگی نقطۂ نظر رکھنے والے جن حضرات کی خدمت میں ارسال کی گئی تھی، ان میں سے چند کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(1) ڈاکٹر صفدر محمود، لاہور (2) پروفیسر فتح محمد ملک، اسلام آباد (3) جناب خالد ہمایوں، لاہور
(4) جناب عطاء الرحمٰن، لاہور (5) جناب ہارون الرشید، اسلام آباد (6) جناب مجید نظامی، لاہور
(7) جناب سرفراز حسین مرزا، لاہور (8) پروفیسر محمد مظفر مرزا، لاہور

کی نظر سے گزری تو اس کو وہ پذیرائی ملی جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی، چند ہی روز میں کتاب کا تمام سٹاک ختم ہو گیا جبکہ اس کی طلب شدت سے کی جاتی رہی۔ بعد میں اس کی فوٹو کاپیاں بہ کثرت تقسیم ہوتی رہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

اب اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بہت سے اہم اور ضروری حوالوں کے اندراج اور بہت زیادہ اضافوں کے ساتھ شایع ہو رہا ہے۔ اس ایڈیشن کے لیے ایک علم دوست اور اَدب نواز کرم فرما جناب حسین عبداللہ میواتی نے اس موضوع پر مجھے بہت سی پُر از معلومات کتابیں، کتابچے اور بے شمار مقالات و مضامین اور اخباری تراشے مہیا کیے کہ اگر میں نقشِ ثانی کے لیے کتاب میں اضافہ کرنا چاہوں تو کر سکوں۔ چنانچہ میں نے ان کے مہیا کردہ مواد و لوازمہ سے استفادہ کیا اور کتاب میں جس جگہ پر مناسب سمجھا وہاں اضافہ کر دیا، جس نے طبع ثانی کو پہلے سے کہیں زیادہ مدلل اور جامع بنا دیا ہے۔ انھوں نے اس ایڈیشن کی تالیف و ترتیب میں بھی بہت معاونت فرمائی۔ میں اس گراں قدر تعاون کے لیے میواتی صاحب کا از حد شکر گزار ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اُنھیں اس تعاون پر اجرِ عظیم عطا فرمائے، آمین۔

میرے ایک مہربان نے مجھے احساس دلایا ہے کہ "آپ کے بزرگوں نے تو تحریک پاکستان میں حصہ لیا، وہ مسلم لیگ کے ووٹر تھے اور آپ کس قدر خلاف ہیں۔" عرض ہے کہ میرے بزرگوں پر ہی کیا موقوف، میں خود بھی شروع میں مسٹر جناح کا شیدائی، لیگ کا حامی اور ووٹر تھا، لیکن سقوطِ مشرقی پاکستان (1971ء) کے بعد میں نے اس موضوع پر مطالعہ و تحقیق اور غور و فکر کیا تو میں اس نتیجے پر پہنچا جس کا اظہار میں نے اس کتاب میں کیا ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے بزرگوں کی خطاؤں کو معاف فرمائے اور میری توبہ کو شرفِ قبولیت بخشے۔ آمین۔

نور محمد قریشی (ایڈووکیٹ)

23 مارچ 2011ء — 4 حافظ چیمبر 30 میکلیگن روڈ، لاہور

باعثِ تحریر آں کہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا . مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰہُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا ٥

برصغیر کی برطانوی قبضہ سے آزادی کے لیے گزشتہ صدی میں تقسیم برصغیر تک جو جدوجہد اور سیاسی کشمکش برپا رہی وہ میری شعوری زندگی سے قبل کی بات ہے۔ مجھے جب شعور حاصل ہوا تو اس وقت برصغیر میں دو آزاد ممالک پاکستان اور بھارت دنیا کے نقشہ پر موجود تھے۔ شعور کی آنکھ کھولتے ہی اہل دانش کی طرف سے جو سبق ملا وہ یہ تھا کہ دنیا میں اقوام کی تشکیل مذہب سے ہوتی ہے نہ کہ وطن سے۔ چونکہ برصغیر میں دو مذاہب (ہندو دھرم اور اسلام) کے ماننے والے آباد تھے اس لیے یہاں دو اقوام موجود تھیں البتہ ہندو قوم برصغیر میں عددی لحاظ سے اکثریت میں تھی لیکن برصغیر کے انتہائی مشرق اور انتہائی مغرب کے کچھ حصوں میں مسلمانوں کو بھی عددی برتری حاصل تھی۔ اس لیے جب انگریز برصغیر کو آزاد کر کے رخصت ہونے لگے تو مسلمانوں کی قیادت نے دو قومی نظریہ کی بنیاد پر یہ مطالبہ کیا کہ برصغیر کے جن علاقوں میں مسلمانوں کو عددی برتری حاصل ہے ان کو برصغیر کے بقیہ علاقے سے علیحدہ کر کے ایک الگ ملک کے طور پر آزاد کیا جائے۔ انگریزوں نے مسلم لیگی قیادت کے اس مطالبہ کو تسلیم کرتے ہوئے برصغیر کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا جو بھارت، مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان پر مشتمل تھے۔

پاکستان میں ہمارے دانش ور حضرات نے ہمیشہ ہی لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے

کہ برصغیر کے مسلمانوں کی جس قیادت نے برصغیر کو تقسیم کروایا وہ ہر لحاظ سے مثالی تھی۔ یہ کہ ایسی بے مثل قیادت تو مسلمانوں کو کبھی نصیب ہی نہیں ہوئی تھی۔ نہ فہم و فراست میں اس کا کوئی ثانی تھا اور نہ جرأت و استقامت میں کوئی اس کا مقابلہ کرسکتا تھا۔ نہ ہی اس قیادت سے کبھی کوئی ایسی غلطی ہوئی جو مسلمانوں کے لیے نقصان کا باعث ہوتی۔ اگر برصغیر کے مسلمان اس قیادت کے پیچھے نہ چلتے تو یقیناً تباہ و برباد ہوجاتے۔ اس قیادت نے ایسا معرکہ سر کیا کہ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ وہ قیادت ہر لحاظ سے معصوم عن الخطا تھی۔ اس نقطۂ نظر کو تقریباً عقیدہ (CULT) بنا دیا گیا ہے۔ کیا واقعی ایسا ہے جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے اور باور کرایا جاتا ہے؟ میں نے آئندہ صفحات میں اسی تاریخی مغالطے کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

برصغیر کی تقسیم کے نتیجہ میں مسلمان تین حصوں میں تقسیم ہوگئے۔ تقریباً ایک تہائی مسلمان مستقل طور پر بھارت کی مشرک اکثریت کے غلام بن گئے۔ کیا ہماری قیادت کو ان کے مسائل کا ادراک تھا؟ پاکستان کے لیے جو علاقہ قبول کیا گیا، اس کے مسائل کیا ہوں گے، کیا ہماری قیادت کو ان کا کوئی اندازہ تھا؟ 2007 کے اواخر اور 2008 کی ابتدا میں پاکستان بدترین قسم کے بجلی و پانی کے بحران سے دوچار ہے [بلکہ یہی صورتِ حال 2009ء میں بھی رہی اور 2010ء کے بعد سالِ رواں 2011ء میں بھی یہی حال ہے]۔ اس کا اندازہ حکومت پاکستان کے ایک ترجمان کے بیان سے ہوجاتا ہے جو 27 مارچ 2008 کے اخبارات [جنگ، نوائے وقت، اور پاکستان] میں شائع ہوا ہے اور پیش خدمت ہے:

''سندھ طاس واٹر کونسل کے چیئرمین اور عالمی پانی اسمبلی کے کوآرڈینیٹر حافظ ظہور الحسن ڈاہر نے کہا ہے کہ بھارت کسی غیر معمولی ایجنڈے کے تحت پاکستان کے دریاؤں پر قبضہ کرنے کے لیے جن منصوبوں پر کام کر رہا ہے یہ قطعی غیر قانونی عمل ہے، بھارت نے پاکستان کے دریاؤں کا 80 فیصد پانی روک رکھا ہے، 15 روز سے منگلا اور تربیلا ڈیم ڈیڈ لیول پر ہیں، ٹیوب ویل بند پڑے ہیں، آئندہ سال آٹے کا شدید بحران پیدا ہوگا۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے گزشتہ روز ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ آئے روز پاکستان میں پانی کا بحران کیوں بڑھتا جا رہا ہے، اس ضمن میں 29 مارچ کو لاہور میں سندھ طاس واٹر کونسل کا انعقاد عمل میں لایا جا رہا ہے

جس میں یہ لائحہ عمل طے کیا جائے گا کہ بھارت کو پاکستان کے باقی ماندہ دریاؤں پر ڈیمز بنانے، بیراج تعمیر کرنے اور دریاؤں کا رخ موڑنے سے کیسے روکا جاسکتا ہے۔ جب عالمی برادری میں یہ مسئلہ اٹھایا گیا تو بھارت کو اس انسانیت سوز عمل کا ضرور خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ انھوں نے کہا کہ ابھی تک کسی حکومت نے اس انتہائی اہم مسئلہ کی جانب غور ہی نہیں کیا۔ موجودہ نومنتخب حکومت اور پارلیمنٹ بیوروکریسی کی من گھڑت اور بوگس رپورٹس پر ہرگز یقین نہ کرے۔ بھارت نے پاکستان کے دریاؤں کا 80 فیصد پانی روک رکھا ہے، یکم جنوری سے 26 جنوری تک دریائے چناب کو مکمل طور پر بند کردیا گیا تھا، ایک گھونٹ پانی آگے نہیں آسکا لیکن کسی متعلقہ افسر نے اس کا نوٹس تک نہیں لیا اور نہ اعلیٰ حکام کو مطلع کیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ بجلی کا بحران شدت اختیار کرچکا ہے، شہروں میں لوڈ شیڈنگ کا دورانیہ 10 سے 12 گھنٹے اور دیہی علاقوں میں 14 گھنٹے تک لوڈ شیڈنگ جاری ہے، اکثر ٹیکسٹائل ملیں بند پڑی ہیں۔ حافظ ظہور الحسن ڈاہر نے کہا کہ بھارت نے پاکستان کے آبی وسائل مکمل طور پر اپنی حدود میں سمیٹنے کے لیے جموں کے شمال مشرق کشتواڑ کے علاقہ میں دریائے چناب پر ایک اور بڑا ہائیڈرل پراجیکٹ شروع کردیا ہے جس کے ابتدائی مرحلہ پر 31 بلین روپے لاگت آئے گی۔'' (1)

حالات و واقعات شاہد ہیں کہ ہماری قیادت کو اس مسئلہ کا قطعاً ادراک نہیں تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری قیادت تو برصغیر کے جغرافیہ سے بھی آگاہ نہیں تھی۔ اگر ادراک تھا تو وہ انتہائی بے حس قیادت تھی جس کے پیش نظر صرف یہ تھا کہ کسی طرح برصغیر کے کچھ حصہ پر اقتدار حاصل ہو جائے۔ رہ گئے مسائل تو وہ اہل پاکستان کی آئندہ نسلیں جانیں اور ان کا کام۔ رہ گئے برصغیر کے وہ مسلمان جو پاکستان نہیں آسکتے تھے تو وہ ہماری قیادت کا مسئلہ ہی نہیں تھے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے بصیرت و بصارت اور فراست عطا کی تھی وہ یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ انھیں اس کا ادراک تھا۔ ایسے ہی ایک صاحبِ بصیرت و فراست راہنما امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ انھوں نے 1946 میں دہلی کی شاہی مسجد کے سامنے پارک میں ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے وہ سب کچھ بتادیا تھا جو سندھ طاس واٹر کونسل ہمیں تقسیم برصغیر کے ساٹھ سال بعد بتا رہی ہے۔ اس درویش صفت رہنما نے کیا کہا۔ آپ بھی مطالعہ کیجیے:

"حضرات! آج میں نے کوئی تقریر نہیں کرنی بلکہ چند حقائق ہیں جنھیں بلاتمہید کہنا چاہتا ہوں۔ آئینی اور غیر آئینی دنیا میں خواہ اس علاقے کا تعلق ایشیا سے ہو یا یورپ سے، اس وقت جو بحث چل رہی ہے، وہ یہ ہے کہ ہندستان کی ہندو اکثریت کو مسلم اقلیت سے جدا کر کے برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

قطع نظر اس کے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ مجھے پاکستان بن جانے کا اتنا ہی یقین ہے جتنا اس بات پر کہ صبح کو سورج مشرق ہی سے طلوع ہوگا۔ لیکن یہ پاکستان وہ پاکستان نہیں جو دس کروڑ مسلمانوں کے ذہنوں میں اس وقت موجود ہے اور جس کے لیے آپ بڑے خلوص سے کوشاں ہیں۔ ان مخلص نوجوانوں کو کیا معلوم کہ کل ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟

بات جھگڑے کی نہیں، سمجھنے اور سمجھانے کی ہے۔ سمجھا دو، مان لوں گا۔ لیکن تحریک پاکستان کی قیادت کرنے والوں کے قول وفعل میں بلا کا تضاد اور بنیادی فرق ہے۔ اگر آج مجھے کوئی اس بات کا یقین دلادے کہ ہندستان کے کسی قصبہ کی کسی گلی میں، کسی شہر کے کسی کوچہ میں، حکومتِ الٰہیہ کا قیام اور شریعت اسلامیہ کا نفاذ ہونے والا ہے تو رب کعبہ کی قسم! میں آج ہی اپنا سب کچھ چھوڑ کر آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔ لیکن یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جو لوگ اپنے جسم پر اسلامی قوانین نافذ نہیں کر سکتے، جن کا اُٹھنا بیٹھنا، جن کا سونا، جن کا جاگنا، جن کی وضع قطع، جن کا رہن سہن، بول چال، زبان وتہذیب، کھانا پینا اور لباس وغیرہ، غرض یہ کہ کوئی چیز بھی اسلام کے مطابق نہ ہو، وہ دس کروڑ افراد کے وطن میں کس طرح اسلامی قوانین نافذ کر سکتے ہیں؟ یہ ایک فریب ہے اور میں یہ فریب کھانے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں۔"

پھر حضرت امیر شریعت نے اپنی کلہاڑی کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر تقسیم کے بعد مشرقی اور مغربی پاکستان کا نقشہ سمجھانا شروع کیا اور فرمایا:

"اُدھر مشرقی پاکستان ہوگا، اِدھر مغربی پاکستان ہوگا۔ درمیان میں چالیس کروڑ ہندو کی متعصب آبادی ہوگی جس پر ان کی اپنی حکومت ہوگی اور وہ حکومت لالوں کی حکومت ہوگی۔ کون لالے؟ لالے دولت والے، لالے طاقت والے، لالے ہاتھیوں

والے، لالے مکار لالے۔ ہندو اپنی مکاری اور عیاری سے پاکستان کو ہمیشہ تنگ کرتے رہیں گے۔ اسے کمزور کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔

اس تقسیم کی بدولت آپ کا پانی روک دیا جائے گا۔ آپ کی معیشت تباہ کرنے کی کوشش کی جائے گی اور آپ کی حالت یہ ہوگی کہ بوقت ضرورت مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان کی اور مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان کی مدد سے قاصر ہوگا۔

اندرونی طور پر پاکستان میں چند خاندانوں کی حکومت ہوگی اور یہ خاندان زمینداروں، صنعت کاروں اور سرمایہ کاروں کے خاندان ہوں گے۔ انگریز کے پروردہ، فرنگی سامراج کے خودکاشتہ پودے، سروں، نوابوں اور جاگیرداروں کے خاندان ہوں گے۔ جو اپنی من مانی کارروائی سے محبِ وطن اور غریب عوام کو پریشان کر کے رکھ دیں گے۔ غریب کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ ان کی لوٹ کھسوٹ سے پاکستان کے کسان اور مزدور نان شبینہ کو ترس جائیں گے، امیر روز بروز امیر اور غریب غریب تر ہوتے چلے جائیں گے۔"

رات کافی بھیگ چکی تھی۔ امیر شریعت اپنی سیاسی بصیرت کے موتی بکھیر رہے تھے اور مستقبل سے ناآشنا مسلمان منہ کھولے انجانے واقعات کو حیرت واستعجاب کے عالم میں سن رہے تھے۔ آخر میں شاہ جی نے زوردار آواز میں کہا:

"کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سنیں اور یاد رکھیں! اگر آج تم باہم بیٹھ کر کوئی معاملہ طے کر لیتے تو وہ تمھارے حق میں بہتر ہوتا۔ تم الگ الگ رہ کر باہم شیروشکر رہ سکتے تھے۔ مگر تم نے اپنے تنازعہ کا انصاف فرنگی سے مانگا ہے اور وہ دونوں مملکتوں کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والا فساد ضرور برپا کر کے جائے گا۔ جس سے تم دونوں کبھی چین سے نہیں بیٹھ سکو گے اور آئندہ بھی تمھارا آپس کا کوئی ایسا تنازعہ باہمی گفتگو سے کبھی طے نہیں ہو سکے گا۔ آج انگریز سامراج کے فیصلے سے تم تلواروں اور لاٹھیوں سے لڑو گے تو آنے والے کل کو توپ اور بندوق سے لڑو گے۔ تمھاری اس نادانی اور من مانی سے اس برصغیر میں جو تباہی ہوگی، عورت کی جو بے حرمتی ہوگی، اخلاق اور شرافت کی تمام قدریں جس طرح پامال ہوں گی، تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے اور میں

دیکھ رہا ہوں کہ یہاں وحشت و درندگی کا دور دورہ ہوگا، بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو گا۔ انسانیت اور شرافت کا گلہ گھونٹ دیا جائے گا اور کسی کی عزت محفوظ نہیں ہوگی۔ نہ مال، نہ جان، نہ ایمان اور اس سب کا ذمہ دار کون ہوگا؟؟؟‘‘(2)

اسی صاحبِ فراست راہنما نے 2 ستمبر 1946ء کو بیرون دہلی دروازہ لاہور میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

’’لوگو! میری بات یاد رکھو، اگر مسٹر جناح! اپنی ضد پر اڑے رہے تو پھر ہندستان ہی نہیں پاکستان بھی تقسیم ہوگا۔ امرتسر تک کا علاقہ ہندستان لے جائے گا اور پاکستان پر رفتہ رفتہ وہی لوگ قابض ہو جائیں گے جو آج بھی انگریز کے غم خوار اور نمک خوار ہیں۔ یہ امرا کی ایک جنت ہوگی، لیکن ننانوے فیصد عوام کے لیے یہی شب و روز ہوں گے اور اسلام ایک مسافر کی طرح ہوگا۔

مسلم لیگ والو! تم ہندستان کے مسلمانوں کا حل پاکستان بتاتے ہو۔ میرا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کا مسئلہ تمھاری مجوزہ تقسیم سے کبھی حل نہیں ہوگا۔ ہاں! اس سے دس کروڑ مسلمان تین حصوں میں بٹ جائیں گے۔

جواہر لال نہرو کو تم ’’اشوک‘‘ کا تخت بچھا کر دے رہے ہو۔ ہندو کو اتنی بڑی سلطنت اشوک کے بعد کبھی نہیں ملی۔‘‘(3)

اس مردِ حق آگاہ نے مارچ 1947ء کو لاہور میں ایک اجلاس سے نہایت کرب انگیز لہجے میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

’’مجھے صاف نظر آ رہا ہے، میں دیکھ رہا ہوں کہ دور دور تک آگ لگی ہوئی ہے۔ مکان جل رہے ہیں، دکانیں لوٹی جا رہی ہیں اور قزاق عصمتیں اڑائے سرپٹ دوڑ رہے ہیں۔ ماں بیٹے کو چھوڑ چکی، باپ بیٹی کو ہار چکا ہے۔ بھائی بہن کو بھول گیا ہے اور خاوند بیوی سے الگ ہو گیا ہے۔ سب رشتے ٹوٹ گئے ہیں، چاروں طرف قیامت کا صور پھنک گیا ہے، دریاؤں میں خون ہے، ہواؤں میں دھواں، دھرتی طوطا چشم ہو گئی ہے۔ سیاست دانوں نے جغرافیائی نقشہ اٹھا کر اس پر ضرب و تقسیم کی ہے لیکن اس کی بدولت بڑی مدت کے لیے انسان مر گیا ہے۔ برصغیر میں تبلیغ کا دروازہ بند اور جذبۂ جہاد ختم

کرنے کی سازش ہو رہی ہے۔ ہم نے سیاسی حقوق کے حصول کی خاطر دینی فرائض سے بغاوت کر دی ہے۔ مسلمانوں کو تیاری کے بغیر ایک ایسی آگ میں جھونک دیا گیا ہے جس کا واحد نتیجہ ہمہ گیر تباہی ہے۔ اگر مسلمانوں کے ساتھ بدعہدی کی گئی تو پاکستان سیاسی مفاد پرستوں اور قومی غداروں کی آماجگاہ بن جائے گا: لعنت بر پدرِ فرنگ۔

میاں! آج ہنستے ہو، کل روؤ گے۔ تم نہیں دیکھ سکتے، میں دیکھ رہا ہوں۔ جو کچھ بیت رہا اور جو کچھ بیتنے والا ہے۔ ایک وبا پھوٹ چکی اور ایک وبا آ رہی ہے۔ بند ٹوٹ چکا اور سیلاب کا رُکنا محال ہے۔

ہاں بھائی! انگریز کا مفاد اسی میں ہے کہ بستیاں کوئلہ ہو جائیں اور لوگ قتل ہوں۔ آخر جانے سے پہلے فرنگی بابا آزادی کی قیمت لے کر ہی جائے گا۔ تم نے آزادی مانگی تھی، یہ لو آزادی۔ یہ اس کی پہلی قسط ہے۔

قدرت کبھی معاف نہیں کرتی۔ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ میری آنکھیں بہت کچھ دیکھ چکی ہیں اور بہت کچھ دیکھ رہی ہیں۔ میں نے ہوا کا رُخ جس طرف دیکھا ہے تم اس کے برعکس دیکھو گے۔ برہنہ گفتگو کا موقع نہیں ورنہ جو کچھ جہدِ آزادی کے دور میں ہوتا رہا اور برطانوی سرکار نے خود کاشتہ خاندانوں کے لیے جو کچھ کیا یا ان خاندانوں نے برطانوی سرکار کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ روداد اتنی تلخ ہے کہ عرش و فرش کانپ اٹھتے ہیں۔‘‘(4)

بخاری صاحب نے 12 جون 1947ء کو اُردو پارک متصل شاہی جامع مسجد، دہلی میں مجلس احرار اسلام ہند کے آخری جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

’’دہلی والو! تمھیں یاد ہوگا کہ گزشتہ سال اسی جگہ میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے پاکستان بننے کا اسی قدر یقین ہے جس طرح آپ میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ فرنگی اپنی ضرورت کے لیے اس ملک کو تقسیم کرے گا۔ آج برطانیہ کے تازہ اعلان نے میری بات ثابت کر دی۔ مجھے یاد ہے میں نے یہ بھی کہا تھا کہ انگریز کو ثالث قرار دینے کی بجائے اگر آپس میں بات طے کر لیتے تو بہتر تھا۔ میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ جس

کام کو تم مستقل امن قرار دے رہے ہو یہ تمھارے لیے ہمیشہ کا عذاب بن جائے گا۔ تم نے میری بات نہیں مانی۔ اس وقت تم جذبات کی رو میں ہو اور اپنے راستے میں تم نے ایسے کانٹے بوئے ہیں کہ قیامت تک تمھارا دل اور ایمان زخمی ہوتے رہیں گے۔

پنجاب اور بنگال کی تقسیم نے زندگی کی راہوں کو مزید دور کر دیا ہے۔ یہ راہیں اگر محبت سے بنائی جاتیں تو ممکن ہے الجھاؤ پیدا نہ ہوتا۔ مگر دشمنی سے کھینچی ہوئی لکیر نے دوستی کے تمام رشتے منقطع کر دیے ہیں۔'' (5)

یہ بصیرت و فراست اس شخص کی تھی جو منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی نہیں بولتا تھا۔ جو ریلوے کے تیسرے درجے میں سفر کرتا تھا۔ جن کے دروازے پر کوئی قیمتی گاڑی از قسم Luxurious Limousine نہیں کھڑی ہوتی تھی ان کو تانگہ کی سواری ہی میسر آتی تھی اور جن کے قیام کے لیے کسی مسجد کا کوئی حجرہ ہی فائیوسٹار ہوٹل کا سویٹ (Suite) ہوتا تھا۔

ممتاز مسلم لیگی دانشور اور محقق جناب محمود احمد ظفر اپنی کتاب تاریخ پاکستان — پس منظر و پیش منظر میں شاہ جی کی دہلی میں کی گئی 1946ء کی بصیرت افروز تقریر کو نقل کرنے کے بعد بطور اعتراف لکھتے ہیں:

''اس تقریر کے الفاظ کو دو تین بار پڑھیں اور شاہ جی کی سیاسی بصیرت کی داد دیں، یوں پتہ چلتا ہے کہ حالات کا تجزیہ نہیں کر رہے بالکل مستقبل کے پردہ کو پھاڑ کر مسلمانوں کو دکھا رہے ہیں کہ تمھارے ساتھ کیا ہونے والا ہے، اور جو کچھ تمھیں بتایا جا رہا ہے وہ حقیقت نہیں بلکہ سراب ہے۔ یہ لوگ تم سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ یہ تمھارے لیے کچھ نہیں کر رہے بلکہ سب کچھ اپنے لیے کر رہے ہیں۔ اب بھی خوابِ غفلت سے بیدار ہو جاؤ، جذبات کو ترک کر کے ہوش مندی اور عقل و خرد سے کام لو، حقیقت کی دنیا میں لوٹ آؤ۔ لیکن ان کی دردمند صدائیں مسلمانوں کے بہرے کانوں سے ٹکرا کر واپس آ گئیں۔ کسی نے ان کی آواز پر کان نہ دھرا حالانکہ ان کی ایک ایک بات درست تھی اور مستقبل نے اس کی درستی کی تصدیق کر دی۔ وہی لوگ جنھوں نے قوم کے سامنے غفلت اور خود فراموشی کے جام لنڈھائے تھے اور ان کے کانوں کو سرمستی اور سرشاری کی پیہم دعوتیں دی تھیں، اب وہ ہندوستان کے گلی کوچوں میں نہیں مل رہے

تھے بلکہ قوم کو بے یار و مددگار چھوڑ کر فرار ہو آئے تھے۔ اور قوم انھیں وہاں ڈھونڈتی رہ گئی۔ یہ پاکستان دراصل ان کے لیے بنا تھا، اسلام کے لیے نہیں بنا تھا، یہ تو ایک دھوکہ تھا جو قوم کو دیا گیا۔'' (6)

اب اس شخص کی بصیرت کا حال بھی سن لیجیے جو مادری زبان کے علاوہ صرف انگریزی ہی روانی سے بول سکتا تھا، جو تھری پیس سوٹ پہنے بغیر اور شیو کیے بغیر دروازے سے قدم بھی باہر نہیں نکالتا تھا، جو ریلوے کے اول درجہ سے کم میں سفر کرنا اپنی توہین سمجھتا تھا، جس کے گھر کے صحن میں ایک سے زیادہ قیمتی کاریں کھڑی ہوتی تھیں اور وہ اپنے شہر سے باہر صرف اور صرف کسی فائیوسٹار ہوٹل کے سویٹ (Suite) میں یا کسی نواب کے ولا (Villa) میں قیام کرتا تھا اور جو برصغیر کے مسلمانوں کے نزدیک ان کا قائداعظم اور امام معصوم تھا۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور، 19 اپریل 2005ء میں جناب اختر مرزا کا ایک مضمون ''دریاؤں کا معاملہ'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں اختر مرزا نے بیان کیا ہے کہ ان کے والد مرزا محمد الدین نے قریباً بائیس برس تک سندھ کے محکمہ انہار میں بطور انجینئر ملازمت کی۔ اس مضمون میں مرزا صاحب اپنے والد محترم کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

''پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے کچھ عرصہ قبل یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ پنجاب اور بنگال دو حصوں میں بٹ جائیں گے، لہٰذا دریاؤں کا جھگڑا ان دو ممالک کے درمیان ضرور اٹھے گا۔ میرے والد بنیادی طور پر نہروں کے انجینئر تھے اور بخوبی جانتے تھے کہ دریاؤں کا رُخ کس طرح موڑا جا سکتا ہے اور قدرے سیاسی بصیرت کے پیش نظر وہ قائداعظم کو بتانا چاہتے تھے کہ ہندستان اپنے علاقہ (خاص کر پنجاب کے بالائی حصہ) سے دریاؤں سے نہریں نکال کر پاکستان کے سرسبز علاقوں کو صحرا بنا دے گا۔ انھی خطرات کے پیش نظر میرے والد نے قائداعظم سے ملاقات کرنا چاہی۔ سیکرٹری نے نام تو لکھ لیا مگر ملاقات نہ ہو سکی۔ انھی دنوں مسلم لیگ کی کمیٹی بلائے جانے پر سر ظفر اللہ اور میرے والد صاحب کی ملاقات بمبئی میں ہو گئی (ہمارا قادیانی فرقے سے کوئی تعلق نہیں) ان دونوں کی دیرینہ اچھی خاصی جان پہچان تھی۔ میرے والد صاحب نے سر ظفر اللہ کو دریاؤں پر پیدا ہونے والے جھگڑوں

اور زرعی بربادی کے بارے میں تفصیل سے بتایا جس کے جواب میں سر ظفر اللہ نے کہا کہ کل مسلم لیگ کے اجلاس کے بعد اگر موقع ملا تو میں قائداعظم سے آپ کے بتائے ہوئے تمام نکات (Points) پر بات کروں گا اور پھر جو بھی قائد نے کہا آپ کو بتاؤں گا۔ تیسرے روز میرے والد کی سر ظفر اللہ سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ آپ کے سارے نکات (Points) میں نے قائداعظم کو بتا دیے تھے جس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ ''کوئی ملک دوسرے ملک کے لیے دریاؤں کا بہاؤ نہیں روک سکتا اور اگر ہندستان نے ایسا کیا تو میں دیکھ لوں گا''۔(7)

یہ حال تھا ہمارے ''امام معصوم'' اور ''قائداعظم'' مسٹر جناح کی بصیرت کا، جس کے اتباع میں برصغیر کے مسلمان آنکھیں بند کر کے چل پڑے۔ اب بھارت نے دریاؤں کا پانی روک لیا ہے۔ اگر کوئی کسر باقی رہ گئی ہے تو وہ بھی جلد پوری ہو جائے گی۔ اب اہلِ پاکستان اپنے امام معصوم سے کیوں نہیں کہتے: ''یا امام! براہ کرم ایک نظر، ایک توجہ دریاؤں پر ڈالیے تاکہ بھارت نے ان پر جو ڈیم بنائے ہوئے ہیں وہ سب ٹوٹ جائیں اور ہمارے دریا پھر سے رواں ہو جائیں۔''

امر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ''قائداعظم'' کو اس کی پرواہ ہی نہیں تھی کہ پاکستان کے پنجاب کے کھیت کھلیانوں کا کیا حال ہوگا، اگر ان کو پانی نہ ملا۔ پنجاب جغرافیائی لحاظ سے ایک ناقابلِ تقسیم وحدت تھا کہ اس کے دریاؤں کے منابع مشرق میں تھے لیکن ان دریاؤں سے جو نہروں کا جال بچھایا گیا تھا وہ ان زمینوں کو سیراب کرتی تھیں جو پنجاب کے مغرب میں واقع تھیں اور یہ نظر آرہا تھا کہ پنجاب کو جس طرح تقسیم کیا جارہا تھا اس کے نتیجے میں دریاؤں پر مکمل کنٹرول بھارت کا ہوگا اور پاکستانی پنجاب کے کھیت پانی کے لیے بھارت کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ اس صورتِ حال کو مدِنظر رکھتے ہوئے باؤنڈری کمیشن کے چیئرمین ریڈکلف نے تجویز پیش کی کہ دریاؤں کا کنٹرول پاکستان اور بھارت مشترکہ طور پر کریں۔ یہ تجویز بھارتی قیادت کے لیے تو ناپسندیدہ تھی ہی لیکن ہماری قیادت کا اس مسئلہ میں ردِعمل کیا تھا، وہ بھی مطالعہ فرمالیجیے۔ لیونارڈ موزلے لکھتا ہے:

''ریڈکلف نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ پنجاب کی تقسیم کی وجہ سے یہاں کے نہری نظام کو بہت نقصان پہنچے گا۔ پنجاب کے بیشتر دریا جو مغربی پنجاب کی زمینوں کو پانی مہیا کرتے تھے وہ پنجاب کے مشرقی علاقے میں واقع تھے۔ یہ مشرقی پنجاب کا حصہ

ہندوستان کے حصے میں آرہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پنجاب کے دریا تو پنجاب کے ہندوستانی علاقے میں ہوں گے جبکہ ان دریاؤں کے پانی سے جن زمینوں کو سیراب کیا جاتا تھا انھیں پاکستان کے حصے میں چلے جانا تھا۔ ریڈکلف نے اس بارے میں فوراً ماؤنٹ بیٹن سے رابطہ کیا اور اُنھیں بتایا کہ وہ پنجاب کے نہری نظام کے بارے میں جناح اور نہرو کو ایک تجویز پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ریڈکلف نے تجویز کیا کہ پنجاب کو تقسیم کرنے والی لائن چاہے جہاں سے بھی گزرے لیکن پنجاب کی تقسیم کے اعلان سے پہلے یہ دونوں لیڈر اِس بات پر رضامند ہو جائیں کہ پنجاب کے نہری نظام کا انتظام دونوں ممالک مشترکہ طور پر سنبھالیں گے۔ اس طرح پنجاب کے دونوں حصوں میں رہنے والے لوگوں کے مفاد کا تحفظ ہو سکے گا اور وہ یہ کام ایک دوسرے سے بہترین تعاون کے ذریعے کرتے رہیں گے، جو آنے والے وقتوں میں ان کے لیے بہت سودمند ثابت ہو سکتا تھا۔

اس تجویز کو مسلم اور ہندو دونوں قوموں کے لیڈروں نے ناپسند کرتے ہوئے مسترد کر دیا۔ جناح نے ریڈکلف کو کہا کہ ''وہ صرف وہی کام کریں جو اُنھیں سونپا گیا ہے۔'' جناح نے مزید کہا کہ ''وہ پانی کے حصول کے لیے ہندوؤں کا احسان لینے کی بجائے اس بات کو ترجیح دیں گے کہ ان کے علاقے کی زمینیں پانی نہ ملنے کی وجہ سے صحرا ہی میں کیوں نا تبدیل ہو جائیں۔''(8)

ہماری قیادت کو تو اِس سے غرض ہی نہیں تھی کہ پاکستانی پنجاب کو پانی ملتا ہے یا نہیں۔ اسے تو اس سے غرض تھی کہ تقسیم ہو جائے، چاہے جیسی بھی ہو جائے، یہاں تک کہ اسے سندھ کے صحرا میں چند ایکڑ بھی قبول تھے۔ تقسیم کے نتیجہ میں برصغیر کے مسلمانوں پر کیا قیامت ٹوٹتی ہے یا پاکستانی پنجاب کی آئندہ نسلوں کا کیا حال ہوگا۔ یہ اس قیادت کا مسئلہ ہی نہیں تھا۔ پاکستانی پنجاب کو بہرحال پانی تو ان دریاؤں سے ہی ملنا تھا جو بھارتی پنجاب سے آرہے تھے، نہ کہ ایران یا جاپان سے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ ہماری قیادت ذہنی طور پر دریاؤں سے اسی وقت دستبردار ہو گئی تھی، تو اب ہم کس سے گلہ کریں۔

اب دو میں سے ایک بات یقینی ہے۔ یا تو ہماری قیادت میں بصیرت ہی نہیں تھی کہ وہ اندازہ

کر سکتی کہ تقسیم کے بعد پاکستان کی طرف آنے والے دریاؤں کا پانی روک لیا جائے گا اور اگر اسے اندازہ تھا تو اس صورت میں وہ ایک نہایت سنگدل قیادت تھی کہ اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ اہل پاکستان کا نصف صدی کے بعد کیا حال ہوگا۔

یہاں یہ اطلاع دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دریاؤں کا مسئلہ پاکستان کو ہی درپیش نہیں بلکہ ''اس دور کا'' مشرقی پاکستان'' اور آج کا بنگلہ دیش بھی اسی قسم کی صورتِ حال سے دوچار ہے۔ وہاں کے تمام دریاؤں کا ماخذ ہندستان ہی ہے۔ بنگلہ دیشی دانشور جناب عبدالرحمٰن چودھری لکھتے ہیں:

''بنگلہ دیش کے تمام دریاؤں کا ماخذ بھارت میں ہے۔ ان میں گنگا، جمنا اور برہم پترا نمایاں ہیں۔ یہ دریا چونکہ بھارت کی ریاستوں سے گزر کر بنگلہ دیش میں داخل ہوتے ہیں، اس لیے پہلے ان کا پانی بھارت کے تصرف میں رہتا ہے۔''(9)

روزنامہ نوائے وقت لاہور، 24 جون 2009ء میں شائع ہونے والی ایک خبر کا متن ملاحظہ ہو:

''ڈھاکہ (آن لائن) بنگلہ دیش کی اپوزیشن رہنما خالدہ ضیاء نے بھارتی وزیراعظم من موہن سنگھ کو خط لکھا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بھارت شمال مشرقی علاقے میں ڈیم تعمیر نہ کرے۔ واضح رہے کہ بھارت پاکستان کی طرح بنگلہ دیش کو پانی فراہم کرنے والے دریاؤں پر بھی ڈیم بنانے کا اعلان کر چکا ہے۔ جس سے بنگلہ دیش کے دریا کے خشک ہونے کا خدشہ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ بنگلہ دیشی اخبار ڈیلی سٹار کے مطابق خط بھارتی وزیراعظم کو روانہ کیا جا چکا ہے، جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ باراک دریا پر ریاست منی پور کے مقام پر ڈیم تعمیر نہ کرے۔''(10)

ایک بات تواتر کے ساتھ کہی جاتی ہے کہ اکثریت کبھی غلط فیصلہ نہیں کرتی جبکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اکثریت بھی کسی غلط نقطۂ نظر پر جمع ہو سکتی ہے، بلکہ اکثر ہوتی ہے۔ کیا حضرت نوحؑ کی قوم کی بہت بڑی اکثریت نے حضرت نوحؑ کی تکذیب کر کے غلط فیصلہ نہیں کیا تھا؟ کیا حضرت صالحؑ کی قوم نے ان کی تکذیب کر کے غلط فیصلہ نہیں کیا تھا؟ کیا یروشلم کے یہودیوں کی اکثریت نے حضرت عیسیٰؑ کے لیے صلیب دیے جانے کا پروانہ حاصل کر کے غلط فیصلہ نہیں کیا تھا؟ کیا مشرکین

مکہ کی اکثریت نے حضرت نبی اکرم ﷺ کی تکذیب کر کے ابتداً غلط فیصلہ نہیں کیا تھا؟ گزشتہ صدی کے عشرہ چہارم میں جرمن جیسی باشعور قوم نے اوڈلف ہٹلر کو الیکشن میں کامیاب کروا کر جو فیصلہ کیا، اس کی جرمن قوم کو بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔ یہی کچھ برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔ وہ بھی جرمن قوم کی طرح اپنے فیصلہ کی قیمت ادا کر رہے ہیں۔

پاکستان کے دونوں بازو دسمبر 1971ء تک ایک ملک کے طور پر اکٹھے رہے لیکن دسمبر 1971 میں مشرقی پاکستان ایک الگ آزاد ملک کے طور پر بنگلہ دیش کے نام سے معرضِ وجود میں آ گیا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی مغربی پاکستان کے دیگر اہل وطن کی طرح میرے لیے بھی صدمہ کا باعث تھی۔ صدمہ کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ کم و بیش ایک ہفتہ تک کوئی ٹھوس غذا میرے حلق سے نیچے نہ اُتر سکی۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اہل پاکستان مذہب کی بنیاد پر ایک قوم کی تشکیل میں ناکام ہو گئے۔ اس جاں گداز اور دل دوز سانحے سے مجھے تحریک ہوئی کہ میں برصغیر میں سیاسی کشمکش کی تاریخ کا مطالعہ کروں۔ اس مطالعہ کے نتیجہ میں چند سوالات میرے ذہن میں پیدا ہوئے ان سوالات کو میں نے ان اہل دانش کی خدمت میں پیش کیا جو دو قومی نظریہ کی وکالت کرتے رہتے تھے، لیکن کسی دانش ور نے ان سوالات کا جواب نہ دیا۔

کسی قاری کے ذہن میں یہ سوال آ سکتا ہے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد میرے ذہن میں یہ سوالات پیدا ہو گئے تھے تو میں نے اس سے قبل ان سوالات کو کسی صاحب دانش شخص کے سامنے کیوں نہ پیش کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس ملک کے بارے میں کسی حد تک پُراُمید تھا۔ میرا خیال تھا کہ مشیت ایزدی اس ملک سے اُمت مسلمہ کے لیے کوئی نہ کوئی خیر کا کام لے گی لیکن میں اب اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ میری اُمید بے جا تھی۔ چند سال قبل اتفاق سے امریکن ہسٹری کی ایک کتاب میری نظر سے گزری۔ کتاب کا نام ذہن میں نہیں رہا البتہ اس کتاب میں ایک واقعہ کا ذکر تھا جو میرے ذہن پر نقش ہو گیا۔ واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے کہ جب ریاست ہائے متحدہ امریکا (USA) کا آئین 1787ء میں مرتب کرنے کے بعد مختلف مقامات سے آئے ہوئے مندوبین (Delegates) واپس جا رہے تھے تو ایک مشہور مندوب بنجمن فرینکلن کو ایک خاتون نے روک لیا اور اس سے سوال کیا:

"Mr.Franklin, what sort of government you have

given us. Is it monarchy or republic?"

"It is Republic, Madam, provided you keep it."

ترجمہ: ''مسٹر فرینکلن! آپ نے ہمیں کس قسم کی حکومت دی ہے؟ بادشاہت یا جمہوریت؟''

بنجمن فرینکلن نے خاتون کو جواب دیا:

''جمہوریت۔ محترمہ! بشرطیکہ آپ اسے برقرار رکھ سکیں۔''

اس سے میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا کہ آزادی خیرات میں نہیں ملتی، اس کے لیے جدوجہد بلکہ جہاد کرنا پڑتا ہے اور اس کے بعد اس کی حفاظت بھی کرنا پڑتی ہے۔ جیسا کہ بنجمن فرینکلن نے اس خاتون کو جواب دیا تھا۔ ہمارا حال کیا ہے؟ 12 اکتوبر 1999ء کو پاکستان کے آرمی چیف پرویز مشرف نے دوتہائی اکثریت رکھنے والی حکومت کو بندوق کے زور پر برطرف کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا صرف اس لیے کہ وزیراعظم نے اپنا آئینی اختیار استعمال کرتے ہوئے اُسے ملازمت سے برطرف کر دیا تھا۔ اگلے روز میں ڈرتے ڈرتے گھر سے نکلا کہ شہر میں ہنگامے ہو رہے ہوں گے۔ آرمی چیف کے غیر آئینی اور غیر قانونی اقدام کے خلاف لوگ سڑکوں پر نکلے ہوئے ہوں گے۔ لیکن باہر نکل کر دیکھا تو پتا چلا کہ ہر چیز نارمل ہے۔ دکانیں کھلی ہیں۔ طالب علم سکول و کالج اور ملازمین دفاتر کو جا رہے ہیں۔ ٹریفک حسب معمول چل رہی ہے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس سے مجھے شدید مایوسی ہوئی کہ ہم نے نہ تو آزادی کے لیے جدوجہد کی اور نہ ہی اس کی حفاظت کر سکے، بلکہ تحریک آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والوں کو غدار کہا۔ جو قوم آزادی کی حفاظت نہ کر سکے اس سے آزادی چھن جاتی ہے۔ اس سے مجھے تحریک ہوئی کہ جو سوالات کئی برسوں سے میرے ذہن میں تھے ان کو میں دانش ور حضرات کے سامنے پیش کروں۔ یہ ہے باعث اس کتاب کی تحریر کا!

اس موضوع پر جو کچھ میں نے تحریر کیا وہ قارئین کے سامنے ہے۔ میں یہ واضح کر دوں کہ میرا اہل قلم کے قبیلہ سے تعلق نہیں ہے اس لیے میری تحریر میں کوئی خامی ہو یا کسی جگہ میں اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا ہوں، تو اس کے لیے پیشگی معذرت۔ میں یہ بھی واضح کر دوں کہ سقوطِ مشرقی پاکستان (1971ء) سے پہلے میں مسلم لیگی تھا، مسٹر جناح سے عقیدت اور دو قومی

نظریہ پر ایمان رکھتا تھا، لیکن اس کے بعد میرا کسی سیاسی یا مذہبی جماعت سے کوئی تعلق نہیں رہا اور نہ اب ہے۔ سیاست سے اب میری وابستگی صرف اس حد تک ہے کہ اگر الیکشن ہوں تو ووٹ کا حق استعمال کر لیتا ہوں، اس سے زیادہ نہیں۔

ایک ضروری وضاحت یہ بھی کرتا چلوں کہ تقسیم برصغیر کے بارے میں جو سوالات یا اشکالات وقتاً فوقتاً میرے ذہن میں پیدا ہوتے رہے انھیں میں خطوط کی شکل میں مختلف اہل علم و دانش (جو سب پی۔ ایچ۔ ڈی یا اسی علمی سطح کے تھے) کی خدمت میں اس لیے پیش کرتا رہا کہ اگر وہ دلائل سے میرے نقطۂ نظر کو غلط ثابت کر دیں تو میں اپنی رائے تبدیل کر لوں۔ بعد میں مَیں نے تمام خطوط کو مسودہ کی شکل دے کر، اس کے سیٹ بنوائے اور اُنھیں مسلم لیگی ذہن رکھنے والے درج ذیل حضرات کی خدمت میں بطورِ خاص نقد و تبصرہ کی غرض سے بھجوایا:

(1) ڈاکٹر صفدر محمود۔ لاہور (2) پروفیسر فتح محمد ملک۔ اسلام آباد (3) جناب شریف فاروق۔ پشاور (4) جناب مجیب الرحمٰن شامی۔ لاہور (5) جناب عطاء الحق قاسمی۔ لاہور (6) جناب خالد ہمایوں۔ لاہور (7) ڈاکٹر اے۔ آر۔ خالد۔ لاہور (8) ڈاکٹر شفیق جالندھری۔ لاہور (9) جناب مجید نظامی۔ لاہور (10) جناب عطاء الرحمٰن۔ لاہور (11) پروفیسر محمد مظفر مرزا۔ لاہور (12) جناب منیر احمد منیر۔ لاہور (13) جناب رفیق ڈوگر۔ لاہور (14) جناب عرفان صدیقی۔ اسلام آباد (15) جناب محمد اسلم سکھیرا۔ لاہور (16) سید سبط الحسن ضیغم۔ لاہور (17) ڈاکٹر امین اللہ وثیر۔ لاہور (18) پروفیسر افضل علوی۔ شیخوپورہ (19) محمد آصف بھلی ایڈووکیٹ۔ سیالکوٹ

لیکن افسوس کہ ان میں سے کسی نے بھی جواب نہ دیا، بلکہ کئی حضرات نے تو کھلے لفظوں میں اعتراف کیا کہ ان سوالات کا کوئی جواب ہے ہی نہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اگر ان حضرات میں سے کوئی صاحب مجھے مطمئن کر دیتے تو شاید آج یہ مواد کتابی صورت میں آپ کے ہاتھوں میں نہ ہوتا۔ لیکن بعد میں بعض مخلص احباب نے تقاضا کیا (جبکہ ایک دوست نے اشاعت کے اخراجات بھی دے دیے) کہ اسے ضرور کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے۔ ان کے اصرار پر میں نے اس مواد کو مسودہ کی شکل میں مرتب کر کے اشاعت کے لیے دے دیا۔ میں نے ان مضامین کے عنوان بھی مقرر نہیں کیے کیونکہ مسئلہ زیر بحث ایک ہی ہے، البتہ ہر مضمون میں کوئی نیا پہلو، کوئی

نئی بات ضرور ہے۔ اس وجہ سے قاری کو بعض نکات کی تکرار بھی ملے گی اور شاید ربط میں بھی کچھ کمی محسوس ہو جس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔

اکتوبر 2008ء

نور محمد قریشی (ایڈووکیٹ)



حوالہ جات

(1) روزنامہ جنگ لاہور/27 مارچ 2005ء

(2) روزنامہ الجمعیت دہلی/28 اپریل 1946ء

(3) روزنامہ انقلاب لاہور/4 ستمبر 1946ء

(4) پاکستان میں کیا ہو گا؟ (مجموعہ خطبات وبیانات مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری)/ ص 63-64

(5) کاروان احرار/جانباز مرزا/مکتبہ تبصرہ، لاہور/جلد:8، ص:303

(6) تاریخ پاکستان- پس منظر و پیش منظر/ حکیم محمود احمد ظفر/ نشریات، لاہور/ 2010ء/ ص 244

(7) روزنامہ نوائے وقت لاہور/19 اپریل 2005ء

(8) برطانوی راج کے آخری ایام/لیونارڈ موزلے (مترجمہ: سیّد فضل حسین)/ادارہ نقوش، لاہور/ ص:388-389

(9) پندرہ روزہ معارف فیچر، کراچی/16 فروری 2012ء/ ص:4

(10) روزنامہ نوائے وقت لاہور/24 جون 2009ء

شب گزیدہ سحر

[دیباچہ: جناب ملک احسان الحق]

میں یہ سطور سپرد قلم کرنے پر خود کو آمادہ نہیں پا رہا تھا کیوں کہ میں اس موضوع پر سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ ناخوش گوار ماضی کو کون یاد کرنا چاہتا ہے۔ کون چاہتا ہے کہ وہ جامعہ حفصہ اسلام آباد کا المیہ دوبارہ دیکھے۔ لاتعداد مسلمان معصوم بچیوں کو خاک وخون میں تڑپتا دیکھے۔ اسلام کے نام پر قائم مدرسہ کو بارود سے غبار بنتا ہوا دیکھے، لال مسجد پر پاک فوج کو حملہ آور ہوتے دیکھے صرف اس لیے کہ اسلام آباد میں فحش مواد اور فحش کاروبار کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے۔

کون چاہتا ہے کہ وانا اور وزیرستان کے درودیوار معصوم بچوں اور طلبا کے خون سے رنگین دیکھے اور خون آلود جوتوں، کپڑوں اور بستوں کی نمائش سے محظوظ ہو۔ کون چاہتا ہے کہ کارگل کی بلندیوں سے پستیوں کا سفر یاد کرے۔ کس کی آنکھ نیپال میں صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان کو بھارتی وزیراعظم سے زبردستی کا مصافحہ کرتے دوبارہ دیکھنا چاہتی ہے۔ میں بھی نہیں چاہتا تھا، مگر فرمائش ٹال نہیں سکتا تھا۔

کون دوبارہ سقوط ڈھاکہ کی ہتھیار ڈالنے کی تقریب دیکھنا چاہتا ہے۔ کون اپنے بچوں کو مشرقی پاکستان کے وجود سے آشنا کروانا چاہتا ہے۔ کون 1970-71 کے اخبارات کا مطالعہ دوبارہ کرنا چاہتا ہے اور وہ کون ہے جو دسمبر 71ء کے عالمی اخبارات کے تراشے اور اس دور کی T.V خبریں دیکھنا چاہتا ہے۔ کوئی بھی نہیں چاہتا اور میں بھی ایسا نہیں چاہتا تھا، مگر وہی مجبوری جو پہلے بیان کی ہے۔

کون یہ یاد کرنا چاہتا ہے کہ پاکستان کی قسمت میں مشرف مارشل لا، ضیاء مارشل لا، یحییٰ مارشل لا، ایوب مارشل لا کیسے اور کیوں لکھ دیے گئے۔ غالباً دنیا کا کوئی پسماندہ ترین ملک بھی اس

طرح مارشل لا کے تسلسل کی لعنت کا شکار نہیں ہوا تو یہ صرف پاکستان کا اعزاز ہی کیوں ہے؟ دنیا کی وہ کون سی قوم ہے جو اس سب کے باوجود پدرم سلطان بود کے سحر میں گرفتار ہے اور اپنی قیادت کو معصوم عن الخطا باور کرتی ہے، مگر! کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا۔ افسوس، صد افسوس۔

اس زیاں کو کون یاد رکھے۔ گاہے گاہے اخبارات میں یادِ ماضی کے تراشے کالم نگاروں کے قلم سے آئینہ کی مانند ظاہر ہو جاتے ہیں تو وہی کیفیت ہوتی ہے:

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

حافظہ چھن گیا تو موت واقع ہو گئی۔ کیا بحیثیت قوم ہم مرنا چاہتے ہیں یا ماضی کے بارے میں حقائق پر مبنی سوچ کو بروئے کار لا کر زندہ قوم کی طرح سفر کرنا چاہتے ہیں؟

آج بھی 14 اگست کو T.V پر ہجرت کے قافلوں کی فلم دیکھ کر کیوں دل کانپ جاتا ہے اس لیے کہ ہم اندر سے شرمندہ ہیں کہ منزل کیا بتائی گئی تھی اور پہنچ کہاں گئے ہیں۔ ایک قومی روزنامہ [جنگ، لاہور] میں منو بھائی کا کالم ''گریباں'' پڑھا جس کا عنوان ہے: ''مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی'' لکھتے ہیں:

''ساٹھ سال پہلے قیام پاکستان سے اگلے سال 1948 میں جو پہلا قومی منصوبہ بندی (پلاننگ) کمیشن بنایا گیا تھا۔ اس کے پندرہ میں سے گیارہ ارکان امریکی مشیر تھے۔ چنانچہ فیض احمد فیض نے کچھ غلط نہیں کہا تھا:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر

وطن عزیز کی معاشی پالیسیوں کو سامراجی مفادات اور مقاصد نے ابتدا ہی سے اپنے زیر اثر کر لیا تھا اور پاکستان کا اقتصادی ڈھانچہ شروع ہی سے ایسا بنا دیا گیا تھا کہ وہ مستقل طور پر امریکی حاکمیت کے تحت رہے اور یہ محتاجی اسے امریکا کا گماشتہ، فرماں بردار اور غلام ملک بنا دے اور یوں وہ انگریزوں کی غلامی سے نکل کر امریکا کی غلامی میں چلا جائے۔ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک جائے۔ کڑاہی سے اچھل کر آگ میں گر جائے۔ اور یہی کچھ ہوا۔

اس کے بعد مذکورہ کالم میں اُس لوٹ کھسوٹ کا ذکر ہے جو پہلے دن سے پاکستان کا مقدر چلی آ رہی ہے۔ یہ اس حالت زار کا ذکر ہے جس کی وجہ سے پورے خطے میں ہم ممتاز ہیں اور یہ حالتِ زار

خواہ سیاسی ہو، معاشی ہو، معاشرتی ہو یا سماجی۔۔۔ ہمارا طرۂ امتیاز ہے۔

منو بھائی ہوں یا کوئی اور۔ سب ہی رونا رو رہے ہیں اس حالت زار کا جو پچھلے ساٹھ سال سے ہمارا مقدر ہے۔ مگر اس معاملہ میں انفرادیت صرف جناب نور محمد قریشی صاحب ہی کو حاصل ہوئی ہے، جنھوں نے ''پردے کے اس پار'' دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ہماری موجودہ حالتِ زار کے بارے میں کوئی کلام نہیں، مگر ایسا کیوں ہوا۔ پودا بیمار ہے۔ ساٹھ سالوں میں پورا درخت نہیں بن سکا۔ کیوں؟ تمام دانش ور پتے، شاخیں اور تنے کو دیکھ رہے ہیں اور وجوہات تلاش کر رہے ہیں۔ میرے ناقص علم کی بنیاد پر ساٹھ سال میں سطح سے اوپر شواہد اور امراض تلاش کیے جاتے رہے ہیں۔ جناب نور محمد قریشی صاحب پہلے دانش ور ہیں جنھوں نے سطح زمیں سے نیچے اصل مرض تک رسائی حاصل کرنے کے لیے جڑوں کا معائنہ اور تجزیہ کیا ہے اور تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ اپنی اس تشخیص کو انھوں نے دوسرے دانش وروں کے سامنے پیش کیا ہے لیکن حیران کن انداز سے مایوس بھی ہوئے ہیں۔ مجھے ان کی دوسرے دانش ور حضرات سے خط و کتابت اور گفت و شنید میں شمولیت کا موقع ملا ہے اور میں ہمیشہ اس اُمید پر ہی ان کے ساتھ شامل ہوا کہ اللہ کرے قریشی صاحب کی تشخیص غلط ہو، جیسے کہ کینسر کا مریض اپنی لیبارٹری رپورٹ آنے سے پہلے دعا گو ہوتا ہے، مگر میں بھی ہمیشہ اپنے تمام دانش وروں سے مایوس ہی ہوا ہوں۔

دراصل نور محمد قریشی صاحب نے شخصیات کے سحر سے نکل کر اپنی تحقیق کو آگے بڑھایا ہے۔ یہ ان کا نظریہ ہے اور حق بھی یہی ہے کہ ماسوائے انبیاء دنیا کا کوئی شخص خطا سے مبرا نہیں اور فکری و عملی لحاظ سے سوائے انبیائے کرامؑ کے، کسی کو ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی حفاظت میسر نہیں۔

ہم بحیثیت قوم اپنی قومی شخصیات کو اور خصوصاً تحریک پاکستان کے قائدین کو معصوم کے درجہ پر فائز کر کے جن خطاؤں کا شکار ہوئے اور اب تک ہو رہے ہیں، وہی سوچ بطور وائرس ہمارے قومی جسد میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے قلم کاروں سے ساٹھ سالہ نوحے تو برآمد ہو رہے ہیں۔ ہماری قومی بیماریوں کے تذکرے بھی ہیں، مگر علاج نہیں۔ علاج کیسے ہو جب تشخیص ہی صحیح نہ ہو۔ تشخیص صحیح کیسے ہو جب سوچ ہی سطحی ہو اور سطحی سوچ کیوں نہ ہو جب جڑ اور بنیاد تک پہنچنے کی اجازت ہی نہ ہو۔ جذباتی فضا ہو اور شخصیات کا طلسم ہوشربا آپ کے ہوش اڑا کر رکھ دینے والا ہو۔ میرا خیال ہے کہ صرف نور محمد قریشی ہی ایسے قلندر لوگ ہیں جو ان حالات میں

بھی اپنے ہوش وحواس قائم رکھ کر شعور وادراک سے اس حقیقت کو سامنے لانے میں کامیاب ہوئے ہیں جو ہماری قومی بیماری کا باعث ہے۔

جب تک ہم اپنی سوچ کو 1947ء سے پہلے کے حالات وواقعات کے تجزیہ کے لیے استعمال نہیں کریں گے، اور غیر جانب دارانہ اور غیر جذباتی انداز میں پچھلے سو سال کے سفر کا تجزیہ نہیں کریں گے اس وقت تک ہم انھی بھول بھلیوں میں بھٹکتے پھریں گے۔ جب تک گزشتہ خطاؤں اور غلطیوں کو نہیں سمجھیں گے، آئندہ کا سفر تب تک صحیح سمت اختیار نہیں کرے گا۔ تقسیم سے پہلے کے چالیس سال بہت ہی اہم اور فیصلہ کن ہیں اس لیے کہ ہم اپنی غلطیوں کا اعادہ کرتے چلے جا رہے ہیں اگر واقعی وہ غلطیاں ہیں۔ مثلاً اگر ہم اس دور کے مندرجہ ذیل حقائق کو سوالیہ انداز سے حل کرنے کی کوشش کریں:

1) مسلم لیگ کے پہلے صدر سر آغا خان تھے۔ کیا یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے آغا خان ہی موزوں ترین شخص تھے؟

2) کیا یہ محض اتفاق ہے کہ قائداعظم کے خاندان والے بھی آغا خانی تھے؟

3) کیا امت مسلمہ کے نزدیک آغا خانی عقائد کے لحاظ سے مسلمان ہیں؟

4) کیا علامہ اقبال کی جذباتی شاعری نے مسلمانوں کے کسی مسئلہ کو حل کیا جبکہ ایک وقت میں وہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندستان ہمارا'' کا ترانہ گا رہے تھے؟

5) کبھی ہم نے سوچا کہ کیا انگریزوں یا مغرب کے مفاد میں تھا کہ پورا برصغیر ہندستان بطور ایک وحدت کے آزاد ہو یا دو تین ٹکروں میں بانٹ دینا ان کے مفاد میں تھا؟

6) کیا کشمیر کا قضیہ محض ایک اتفاق تھا یا سوچا سمجھا منصوبہ؟

7) قائداعظم نے کشمیر کو پاکستان کی شہ رگ قرار دیا۔ کیا انھوں نے تقسیم ہند فارمولا میں مہاراجا کشمیر کا یہ حق تسلیم نہیں کیا تھا کہ وہ الحاق کے لیے کسی بھی ملک کا انتخاب کرنے میں آزاد ہے؟

8) کیا دوقومی نظریہ کی صداقت 15 اگست 47ء کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے لیے بھی وہی رہ گئی جو موجودہ پاکستان کے مسلمانوں کے لیے اب بھی ہے؟

9) پاکستان کا مطلب کیا لاالٰہ الا اللہ کا نعرہ ووٹ لینے کے لیے تھا یا واقعی اصل مقصد بھی

یہی تھا؟

10) کیا 14 اگست 1947 کو اسی نعرے کی صداقت کا اظہار ایک ہندو کو وزیر قانون مقرر کر کے کیا گیا؟

11) پاکستان تمام مسلمان ممالک میں سب سے بڑا ملک تھا۔ اُمت مسلمہ میں اس کی نمائندگی اور لا الٰہ الا اللہ کی تفسیر ایک قادیانی وزیر خارجہ کے ذریعے کرائی گئی۔ ایسا کیوں کیا گیا؟

12) کیا قائداعظم نے سرکاری تقریبات میں شراب کے اہتمام کو روکا۔ یا ان کی موجودگی میں اسلامی جمہوریہ پاکستان کی سرکاری ضیافتوں میں شراب چلتی رہی؟

13) کیا برصغیر کی تقسیم سے قبل مسلم لیگ کے تمام مخالف مسلم علماء اور سیاسی قائدین انگریزوں اور ہندوؤں کے ایجنٹ تھے یا ان کی بصیرت کے مطابق تقسیم مسلمانوں کے مفاد میں نہیں تھی؟

بہر حال سوالات تو سیکڑوں کی تعداد میں ہیں لیکن مجھے ایک سوال بہت ہی پریشان کرتا ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ دنیا بھر کی تمام اقلیتیں اپنے ملک میں جداگانہ انتخابات کی ہمیشہ مخالفت کرتی ہیں، لیکن مسلم لیگی قیادت نے بطور خاص بلکہ لیگ کی تاسیس سے قبل ہی آغا خاں سوم نے مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کیا۔ ایسا کیوں ہوا؟

پوری دنیا میں مسلمانوں کی سب سے بڑی جمعیت برصغیر ہند میں تھی، ہم نے تقسیم کے عمل سے درحقیقت مسلمانوں کو تقسیم کیا اور ہندوؤں کو متحد کر کے قطعی برتری دلا دی۔ جہاں اب پاکستان ہے وہاں تو پہلے ہی مسلمان اکثریت میں تھے اور حکمران تھے۔ ہم نے علیحدگی سے کیا اضافی فوائد حاصل کیے؟

بیس کروڑ مسلمان بطور یرغمال مخالف ملک کے حوالے کر دیے اور لاکھوں عصمتوں کے گراں بہا نگینے چکنا چور کروا کر آج ساٹھ سال بعد بھی ہم کہاں کھڑے ہیں؟ آج ہم جہاں بھی کھڑے ہیں یہ قوم کے بچے بچے کو علم ہو چکا ہے۔ آگے کیا کرنا ہے یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ آگے کی سمجھ تب آئے گی جب ہم اپنی تحریک آزادی کی نسل اور اس کے قائدین کی فکر اور سوجھ بوجھ کا غیر جذباتی ہو کر تجزیہ کریں گے۔ نور محمد قریشی صاحب نے یہی کچھ کرنے کی کوشش کی ہے۔

ملک احسان الحق

4۔ اتحاد کالونی، ملتان روڈ، لاہور

نومبر 2008ء

1

قیام پاکستان کو 60 سال[1] سے کچھ زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اس عرصہ میں ہمارے حاصلات (Achievements) کیا ہیں اور اب ہم کس مقام پر کھڑے ہیں؟ آیئے اس بات کا مختصر سا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرا تعلق اہل قلم کے قبیلہ سے نہیں ہے اس لیے ممکن ہے کہ میری تحریر میں ربط نہ ہو، ادبی حسن نہ ہو، سلیقہ اظہار بھی کم ہو۔ میں درخواست کروں گا کہ ان سطور میں اگر کوئی سقم ہو یا زبان و بیان کی کوئی غلطی ہو تو اسے نظر انداز کر دیا جائے۔

1939ء سے 1945ء تک یورپ جنگ عظیم دوم کا مرکز رہا۔ ایک طرف جرمنی تھا تو دوسری طرف فرانس و برطانیہ تھے۔ امریکا ان کا اتحادی تھا۔ مشرق میں جاپان بھی جرمنی کی طرف سے جنگ میں شریک تھا۔ جرمنی کو مکمل شکست ہوئی۔ اسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ 6 سالہ عرصہ جنگ میں اتحادی فوجوں کی بمباری سے نہ تو جرمنی کی کوئی عمارت بچی، نہ کوئی پل، نہ سڑک، نہ کوئی کارخانہ سلامت رہا اور نہ ہی کوئی سکول یا ہسپتال باقی رہا۔ پورا ملک کھنڈر بن گیا۔ جاپان پر بھی 2 ایٹم بم گرائے گئے اور اسے تباہ حال کر دیا گیا، لیکن جرمنی اور جاپان آج دنیا میں کس مقام پر ہیں، سبھی کو معلوم ہے۔ دونوں ممالک ایک عظیم اقتصادی قوت بن چکے ہیں۔ ہمیں بھی تقریباً اتنا ہی عرصہ ملا ہے، لیکن اس عرصہ میں ہم تو اپنی آزادی بھی برقرار نہیں رکھ سکے۔ اقتصادی لحاظ سے ہم عالمی بینک کے غلام ہیں تو عملاً ہم امریکا کے کاسہ لیس بن چکے ہیں۔ امریکا سے آئی ہوئی ہر ٹیلیفون کال کے جواب میں ہمارا ہر حکمران صرف ''لیس سر، لیس سر'' کی گردان ہی کرتا ہے اور ایسا

1۔ یہ تحریر 2007ء کی ہے۔

نہ کرنے کا اس میں یارا ہی نہیں۔

آئینِ پاکستان:

2007ء تک ہم تقریباً 15 آئین بھگتا چکے ہیں جس کا جی چاہے گنتی کر لے۔ 15 سے 16 تو ہو جائیں گے، 14 نہیں ہوں گے۔ جن آئینی اُمور پر پاکستان کے ابتدائی سالوں میں بحث ہوا کرتی تھی، آج بھی وہی زیرِ بحث ہیں۔ یہ اعجوبہ صرف اور صرف اسی اعجوبہ ملک میں ہی ہوسکتا ہے کہ چیف آف آرمی سٹاف سرکاری ملازم ہونے کے باوجود ملک کا صدر بھی رہا ہے اور منتخب وزیرِاعظم جو 14 کروڑ عوام کا نمائندہ ہے وہ آرمی چیف کو باس کہتا رہا ہے۔ یہ 1999ء سے 2007ء تک کے عرصہ کی بات ہے۔ اگرچہ اس کے بعد بھی عملاً صورت حال میں کوئی جوہری تبدیلی نہیں آئی۔ پیپلز پارٹی کی حکومت بھی صدر جنرل پرویز مشرف کو ایک قیمتی اثاثہ کہتی رہی ہے جس طرح اس سے قبل کی حکمران پارٹی کہتی رہی۔

مسلم لیگ کی تاسیس 1906ء میں ہوئی اور 1947ء میں اس نے پاکستان حاصل کیا۔ 41 سال کے اس عرصہ میں نئے ملک کے لیے میرے علم کی حد تک کوئی ہوم ورک نہیں کیا گیا تھا۔ ہماری قیادت کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ آزادی کے بعد ایک نوزائیدہ مملکت کے کیا مسائل ہوں گے اور انھیں کس طرح حل کیا جائے گا۔ میرے علم کے مطابق ان 41 سالوں میں ہماری قیادت نے صرف ایک ہی فیصلہ کیا تھا کہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل "حضرت قائداعظم" محمد علی جناح ہوں گے۔ چنانچہ جب پاکستان حاصل کرلیا گیا تو ہمارا حال کچھ اس طرح کا تھا کہ جیسے افریقہ کے جنگل سے کسی شخص کو ہیلی کاپٹر کے ذریعہ اُٹھا کر لاہور کے قرطبہ چوک میں کھڑا کر دیا جائے جہاں سے آٹھ سڑکیں پھوٹتی ہیں اور وہ اُلو بن کر سوچتا رہے کہ کس طرف جاؤں۔ پاکستان کا آئین بنانے میں ہی 9 سال لگ گئے اور اسے صرف 18 ماہ بعد صدر پاکستان نے خود ہی منسوخ کر کے مارشل لا نافذ کر دیا، اگرچہ اس نے اس آئین کے تحفظ کی قسم کھائی تھی۔

پاکستان تو حاصل کرلیا گیا۔ لیکن ہمارے پاس اتنی تعداد میں بھی مردانِ کار نہیں تھے کہ پہلی کابینہ ہی مکمل کی جاسکتی۔ چنانچہ وزارتِ خزانہ کے لیے ایک بیوروکریٹ مسٹر غلام محمد کو حیدر آباد دکن سے امپورٹ کر کے مقرر کر دیا گیا اور وزارتِ خارجہ کے لیے چودھری ظفر اللہ خان (قادیانی) کو نامزد کیا گیا جو مسٹر جناح سمیت پاکستان کے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھتا تھا۔ یہ بات سوائے

ہماری قیادت کے ہر شخص جانتا تھا اور جانتا ہے کہ ہر قادیانی کی بنیادی اور پہلی وفاداری قادیانی اُمت کے امیر سے ہوتی ہے۔ ظفر اللہ نے بھی اپنے منصب سے خوب فائدہ اُٹھاتے ہوئے وزارتِ خارجہ کو قادیانیوں سے بھر دیا۔ پاکستان کی پہلی کابینہ میں ہمارا حسنِ انتخاب جوگندر ناتھ منڈل ایک ہندو تھا۔ وہ وزارتِ قانون سے استعفاء دیے بغیر ہی بھارت چلا گیا۔ وہاں جا کر بھارت کی شہریت اختیار کر لی تھی۔ میرا سوال یہ ہے کہ جب ہمارے پاس اتنے آدمی بھی نہیں تھے کہ پہلی کابینہ ہی مکمل ہو جاتی۔ اس کے لیے بھی بیوروکریٹس، ہندوؤں اور قادیانیوں کی مدد لینا پڑی تو ایک الگ ملک حاصل ہی کیوں کیا تھا اور وہ بھی کس قیمت پر؟ کیا ہماری قیادت کا اصل چہرہ ہی یہی تھا؟

پاکستان کی قیمت:

ایک نظر دیکھ لیا جائے کہ برّصغیر کے مسلمانوں نے پاکستان حاصل کرنے کی قیمت کیا ادا کی ہے۔ برصغیر کی تقسیم کے نتیجے میں کروڑوں مسلمان بے گھر ہوئے۔ 15 لاکھ مسلمان قتل ہوئے۔ تقریباً 90 ہزار مسلمان بیٹیاں بے آبرو کی گئیں۔ مشرقی پنجاب میں کئی مقامات پر جوان عورتوں کے سامنے ان کے بھائی، باپ، شوہر اور بچے قتل کیے گئے اور اس کے فوراً بعد ان کی اجتماعی آبروریزی (Gang Rape) کی گئی۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا ہماری قیادت کو اندازہ تھا کہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے ساتھ یہ کچھ ہوگا؟ اگر اندازہ نہیں تھا تو اس سے زیادہ بے بصیرت قیادت کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی اور اگر اندازہ تھا تو اس نے مسلمانوں کو اس آفت سے بچانے کے لیے کوئی تدبیر کیوں نہ کی۔ ایسی صورت میں تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس سے زیادہ نااہل اور بے حمیت قیادت کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ پاکستان کے لیے جو قیمت ادا کی گئی ہے، اس قیمت پر تو اگر پورا کرۂ ارض بھی پاکستان بن رہا ہوتا تو ایک غیرت مند مسلمان اسے قبول نہیں کر سکتا تھا۔ کاش اس قیادت کو کٹہرے میں کھڑا کر کے پوچھا جاتا:

کیا یہی ہے شاہکار تیرے ہنر کا

تقسیمِ برصغیر کے تسلسل میں ہی 1948ء میں حیدر آباد دکن میں 5 لاکھ مسلمان مارے گئے۔ اس کے بعد 1971ء میں مشرقی پاکستان میں 20 لاکھ پنجابی اور بہاری مسلمان، بنگالیوں نے قتل کیے۔ اس کے ردِعمل میں 25 لاکھ بنگالی پاکستانی فوج نے مار دیے(1) یہ قیمت ادا کرنے کے

بعد پاکستان نے اب تک اسلام یا مسلمانوں کی کیا خدمت کی ہے، سوائے اس کے کہ ہم نے مال روڈ کا نام شاہراہ قائداعظم، لٹن روڈ کا نام غازی علم دین شہید روڈ، کرشن نگر کا نام اسلام پورہ، ٹیمپل روڈ کا نام حمید نظامی روڈ، دھرم پورہ کا نام مصطفیٰ آباد، نہرو پارک کا نام افغان پارک، جین مندر چوک کا نام بابری چوک، لائل پور کا نام فیصل آباد اور منٹگمری کا نام ساہیوال رکھ دیا ہے۔ کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے یہ ایک معلوم اور معروف تاریخی حقیقت ہے کہ روافض کے ہاتھوں مسلمانوں کو بربادی کے سوا کبھی کچھ حاصل نہیں ہوا تو برصغیر کے مسلمان کیسے اس کلیہ سے مستثنیٰ ہو جاتے۔

وحدتِ پاکستان:

جب پاکستان قائم ہوا تو اس کے دو بازو تھے، مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان۔ لیکن ہم ملک کے دونوں بازو اکٹھے نہ رکھ سکے۔ بھارت سے ایک شرم ناک شکست کھا کر 90ہزار فوج + سویلین مشرکین کی قید میں دے کر ہم نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا دیا۔ اسے کیا کہا جائے کہ موجودہ پاکستان (جو کبھی صرف مغربی پاکستان تھا) میں 1972ء سے ہم ہر سال 16 دسمبر کو مرثیے پڑھتے ہیں، شامِ غریباں مناتے ہیں جبکہ مشرقی پاکستان کی اکثریت اس روز جشنِ آزادی منا رہی ہوتی ہے۔ کیا ہمیں اس بات کا دُکھ ہے کہ متحدہ پاکستان کی اکثریت بھٹو صاحب کے اسلامی سوشلسٹ دورِ حکومت سے مستفیض نہ ہو سکی یا ہمیں یہ غم ہے کہ وہ اکثریت پرویز مشرف صاحب کی گڈ گورننس کی برکات سے کیوں محروم رہی۔

برصغیر کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے 1947 میں ہی یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ مشرقی اور مغربی پاکستان زیادہ سے زیادہ 25 سال اکٹھے رہ سکیں گے۔ جبکہ ہم نے 25 بھی پورے نہیں ہونے دیے۔ حوالہ کے لیے دیکھیے: ''FREEDOM AT MIDNIGHT by
"Larry Collins and Dominique Lapierre page15
لکھا ہے کہ:

"Mountbatten remained convinced, however, that Jinnah`s two headed State could not survive. Some time later, he predicted to the man who would succeed him in Viceroy`s

House,C.R. Raja Gopal Acharia, that East Bengal would be out of Pakistan in a quarter of a century. The Bangladesh war of 1971 was to confirm his prediction with just one year to spare."

ترجمہ: ''ماؤنٹ بیٹن کو بہرحال یقین تھا کہ جناح کی یہ دو حصوں میں بٹی ہوئی ریاست قائم نہیں رہ سکے گی۔ کچھ عرصے بعد اس نے وائسرائے ہاؤس میں اپنے جانشین سی۔ آر۔ راج گوپال اچاریہ سے بات کرتے ہوئے پیش گوئی کی کہ مشرقی بنگال چوتھائی صدی کے اندر پاکستان سے الگ ہو جائے گا۔ 1971ء میں ہونے والی بنگلہ دیش کی جنگ نے ایک سال قبل ہی اس پیش گوئی کو درست ثابت کر دیا۔''

حیرت ہے کہ ماؤنٹ بیٹن جیسا شخص جو انڈیا کی سرزمین سے تعلق بھی نہیں رکھتا تھا اور جو ایک مختصر عرصے کے لیے برصغیر میں تعینات ہوا تھا اور انتقالِ اقتدار کے بعد اسے واپس چلے جانا تھا اسے تو نظر آ رہا تھا کہ پچیس سال بعد کیا ہوگا لیکن جناح صاحب کو نظر نہیں آ رہا تھا جن کا تعلق اسی سرزمین سے تھا اور جو برصغیر کے مسلمانوں کی قیادت بھی کر رہا تھا۔

معروف صحافی اور کالم نگار جناب میاں ظفیر احمد اپنے کالم ''سچی سچی باتیں'' میں لکھتے ہیں کہ ''بنگال میں تو قیامِ پاکستان سے قبل بھی بہت تعصب تھا۔'' (2) حیرت ہے کہ ہماری قیادت کو یہ نظر نہیں آیا۔ جو کام ہم نے اہلِ مشرقی پاکستان سے گالیاں کھا کر، تقریباً چالیس لاکھ بنگالی و غیر بنگالی مسلمان قتل کروا کر 90ہزار فوج مشرکین بھارت کی قید میں دے کر اور بھارت کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کھا کر کیا، وہ ہم پہلے روز ہی کر سکتے تھے۔ اگر اول روز سے ہی دو الگ الگ ملک بن جاتے تو اس میں کیا حرج تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو آج اس ملک کا نام بنگلہ دیش نہ ہوتا بلکہ مشرقی پاکستان ہوتا۔ کیا ہماری قومی قیادت میں بصیرت نام کی کوئی چیز بھی تھی یا نہیں؟

ہر چہ دانا کند، کند ناداں
لیک بعد از خرابیِ بسیار

اگر ابتدا ہی سے دو ملک بن جاتے تو نہ ہمیں بھارت سے شکست ہوتی، نہ ہماری 90ہزار

فوج قید ہوتی اور نہ اہل بنگلہ دیش کو ہی ہم سے وہ نفرت ہوتی جو اَب ہے۔

ہمارا ٹریک ریکارڈ:

نوائے وقت لاہور میں ہر روز ایک اشتہار بعنوان ''نوائے وقت فنڈ برائے محصورین پاکستان در بنگلہ دیش'' شائع ہو رہا ہے جس میں اپیل ہوتی ہے کہ بنگلہ دیش میں محصور سیکڑوں پاکستانی خاندان کھلے آسمان تلے زندگی بسر کر رہے ہیں لہٰذا ان کی مدد کے لیے مذکورہ فنڈ میں رقوم ارسال کیجیے۔ نوائے وقت 18 جنوری 2004ء میں مجلس محصورین پاکستان کے چیف آرگنائزر کا بیان بایں الفاظ شائع ہوا ہے:

''محصور پاکستانی بنگلہ دیش میں حیوانوں سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ لوگ 1971ء میں پاک فوج کے شانہ بشانہ مکتی باہنی (یعنی: سپاہ آزادی) سے لڑتے رہے۔ بے شمار قربانیاں دیں۔''

حکومت پاکستان کا مؤقف یہ ہے کہ انھیں صرف پاکستان سے محبت کی بنا پر پاکستان میں آباد نہیں کیا جا سکتا۔ جبکہ وہ 1972ء سے ہی پاکستان میں آباد ہونے کی اُمید لگائے بیٹھے ہیں۔ ان احمقوں کے ساتھ ایسے ہی ہونا چاہیے تھا۔ وہ مشرقی پاکستان آئے ہی کیوں تھے۔ ان میں اتنی بصیرت تو ہونی چاہیے تھی کہ وہ اندازہ کر لیتے کہ پاکستان بننے کے 23 سال بعد ان کے ساتھ کیا سلوک ہو گا۔ اگر آ ہی گئے تھے تو وہ پاکستان کی فوج کے شانہ بشانہ لڑے ہی کیوں تھے۔ ان کو تو مکتی باہنی کے شانہ بشانہ پاک فوج سے لڑنا چاہیے تھا۔ کیا ان کے سامنے اس وقت تک کا ہمارا ٹریک ریکارڈ نہیں تھا۔ ہماری قیادت نے ووٹ تو سارے برصغیر کے مسلمانوں سے ''پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللّٰہ'' کے نعرے پر لے لیے۔ پاکستان حاصل کرنے کے بعد بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں کو ہم اسی طرح بھول گئے جس طرح کوئی عورت کسی حرامی بچے کو کوڑے کے ڈھیر پر پھینک کر بھول جاتی ہے۔ اسی طرح ہم نے اہل کشمیر سے کیا۔ 1965ء میں ہم نے کشمیر میں کمانڈو داخل کر دیے۔ جنگ بندی کے بعد اپنے کمانڈو تو واپس بلا لیے، لیکن جن لوگوں نے ہمارے کمانڈوز سے تعاون کیا تھا ان کو بھارتی فوج کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ہمارے اس ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے بھی ان احمقوں نے پاک فوج کے شانہ بشانہ مکتی باہنی سے لڑائی کی تھی تو اب بھگتیں۔

روزنامہ ''پاکستان'' لاہور، 3 جنوری 2004ء کا ایک اداراتی نوٹ اس طرح ہے:

''کراچی میں مقیم 15 لاکھ سے زیادہ بنگالیوں کی نمائندہ جماعت ''پاک مسلم الائنس'' کے عہدہ داروں نے کہا ہے کہ وہ پیدائشی پاکستانی ہیں اور 16 دسمبر 1971ء سے پہلے سے کراچی میں مقیم ہیں، لیکن ان کے ساتھ وزارت داخلہ کے ماتحت ادارے ''نادرا'' کی طرف سے امتیازی اور ناروا سلوک کیا جا رہا ہے۔ انھیں پاکستانی کی بجائے غیر ملکی سمجھا جا رہا ہے۔''

لو کر لو بات۔ وہ بنگالی بھی پاکستانی نہیں ہیں جو مغربی پاکستان میں 16 دسمبر 1971ء سے قبل یہاں مقیم تھے یا اسی جگہ پیدا ہوئے تھے۔ کہاں غائب ہو گیا وہ دو قومی نظریہ جو پاکستان کی اساس ہے۔ کہاں گیا وہ نظریہ کہ قوم وطن سے نہیں مذہب سے بنتی ہے؟ کیا وہ ایک اضافی نظریہ تھا جو 14 اگست 1947ء کی شام کو اپنی موت مر گیا؟ یقیناً ایسا ہی ہوا۔

کشمیر:

تقسیم برصغیر کے وقت ہماری قیادت نے یہ اُصول تسلیم کر لیا تھا کہ ریاستوں کے الحاق کا فیصلہ ریاست کا سربراہ کرے گا۔ اس اُصول کی بنا پر جونا گڑھ اور مانا ودر کی ریاستوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کر لیا، لیکن بھارت نے ان ریاستوں پر زبردستی قبضہ کر لیا اور پاکستان تماشا دیکھتا رہ گیا۔ کشمیر کے الحاق کا فیصلہ بھی اس کے راجا نے کرنا تھا، لیکن پاکستان کی طرف سے اس کے ساتھ کسی نے رابطہ ہی نہ کیا۔ جناح صاحب تو ماشاء اللہ مسلمانوں کی تاریخ کے سب سے بڑے لیڈر تھے۔ ان کے تو شایانِ شان ہی نہیں تھا کہ وہ کشمیر کے معمولی سے راجہ سے ملنے جاتے۔ ہماری قیادت نے تو کسی چپڑاسی کو بھی اس کے پاس بھیجنا گوارا نہ کیا، نہ ہی اسے کوئی پیشکش کی۔ اس کے برعکس کانگریس کی قیادت نے نواب بہاولپور سے رابطہ کیا اور بھارت میں شامل ہونے کی پیشکش کی۔ جناب اقبال حسین لکھویرا لکھتے ہیں:

''پنڈت جواہر لعل نہرو نے نواب بہاولپور پر دباؤ ڈالا کہ وہ بہاولپور کو بھارت میں شامل کریں اور اس سلسلے میں اُنھوں نے نواب بہاولپور کو بڑی بھاری پیشکش بھی کی اور بلینک چیک تک پیش کیا۔ مگر نواب صاحب نے اس کو تج کر نہرو کو صاف صاف بتا دیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اور وہ ریاست کو پاکستان میں شامل کرنے کا پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہیں۔''(3)

ہماری قیادت کی طرف سے نہ تو کشمیر کے راجا سے رابطہ کیا گیا اور نہ ہی کوئی پیشکش کی گئی، لیکن بھارت نے فوراً اپنا آدمی بھیج کر راجا سے الحاق کی دستاویز پر دستخط حاصل کر لیے اور اپنی فوج کشمیر میں اُتار دی۔ یہ الگ بات ہے کہ اہل کشمیر میں سے ہی کچھ لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُنھوں نے کچھ علاقہ بھارت کے قبضہ میں نہ جانے دیا جو اَب آزاد کشمیر کہلاتا ہے۔ اوّل روز سے ہی کشمیر پاکستان اور بھارت کے درمیان بنیادی تنازعہ بنا ہوا ہے، لیکن ہم اس مسئلہ کو کس طرح حل کر رہے ہیں۔ جناب خالد جاوید مشہدی کے کالم سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"کشمیر کو بھارتی استبداد سے نکالنے کے لیے گزشتہ 14 برس سے جو جہاد جاری ہے اس کے لیے جان دینے میں نہ کشمیریوں نے کوئی کمزوری دکھائی اور نہ ہی پاکستانیوں نے۔ کتنے ہی قبرستان شہیدوں کے جسد ہائے خاکی سے آباد ہو چکے ہیں...... کشمیریوں پر ایک کوہِ غم اور بھی ٹوٹا کہ اپنے جگر گوشوں کو قربان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی بیٹیوں کی بے حرمتی کا صدمہ بھی سہنا پڑا۔ بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں بے حرمت ہونے والی نوجوان لڑکیوں کی تعداد بلاشبہ ہزاروں میں ہے۔" (4)

یہ سب کچھ ہونے اور کروانے کے بعد اب ہم کشمیر سے بالکل ہی دستبردار ہو گئے ہیں۔ اقوام متحدہ کی قراردادوں کو بھی ہم نے ایک طرف رکھ دیا ہے تاکہ بھارت سے دوستی ہو جائے۔ ہمارا سابقہ شیر دل آرمی چیف اور صدر پاکستان پرویز مشرف فرماتا ہے:

"تین روز قبل صدر پاکستان نے ترکی میں کہا کہ واجپائی سے اسلام آباد میں حالیہ ملاقات کے نتیجہ میں شیطانی چرخہ ٹوٹا ہے۔" (5)

جن شرائط پر شیطانی چرخے کو اب توڑا گیا ہے ان شرائط پر تو آج سے 50 سال قبل بھی اسے توڑا جا سکتا تھا۔ پھر ہم نے لاکھوں جوانوں کو شہید کیوں کروایا اور ہزاروں بیٹیوں کی بے حرمتی کیوں کروائی۔

ہر چہ دانا کند کند ناداں
لیک بعد از خرابیِ بسیار

ہمارے ٹریک ریکارڈ میں طالبان سے غداری بھی شامل ہے۔ وہ لوگ جو کل تک مجاہد تھے، جنھوں نے ہمیں تزویراتی گہرائی عطا کی تھی۔ ایک ٹیلیفون کال پر ہم نے انھیں دہشت گرد بنا دیا

اور انھیں پکڑ پکڑ کر امریکا کے حوالے کر دیا۔ اس کے عوض لاکھوں ڈالر وصول کیے۔ اس بردہ فروشی کا ذکر ہمارے سابق صدر اور آرمی چیف پرویز مشرف نے اپنی تالیف "IN THE LINE OF FIRE" میں بڑے فخر سے کیا ہے۔ یہی کچھ اس سے قبل ہم سکھوں کے ساتھ کر چکے تھے۔ ہم نے پہلے تو انھیں بھارتی حکومت کے خلاف کھڑا کیا۔ اس کے بعد ان کی فہرستیں بھارتی حکومت کے حوالے کر دیں جس نے چن چن کر ان کو ختم کر دیا۔

داخلی صورت حال:

کسی روز کا اخبار دیکھ لیجیے۔ بڑے شہروں میں دو چار درجن ڈاکے اور دو چار قتل تو معمول کی خبریں ہوتی ہیں۔ ملک میں ہمارے عوام کی چالیس سے ساٹھ فیصد تعداد غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کر رہی ہے۔ ہمارے وزیر خزانہ اکثر بیان دیتے رہتے ہیں کہ ملک میں اربوں ڈالر کا زرِ مبادلہ جمع ہو گیا ہے۔ لیکن حقیقی صورت حال یہ ہے کہ آئے روز بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی نہ کسی کی خودکشی یا خودسوزی کی خبر اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہے۔ ایسی کسی بھی خبر پر نہ تو حیرت ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی اس سے خاص اثر لیتا ہے۔ نمونے کے طور پر میں ایک خبر کا حوالہ دیتا ہوں:

"بچوں کو بھوک سے بلکتا دیکھ کر ماں نے خودکشی کر لی۔ سانده کی نسیم بی بی کے گھر فاقوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے، دل برداشتہ ہو کر زہریلی گولیاں کھا لیں۔ بچے ماں کی میت سے لپٹ کر روٹی نہ مانگنے کا وعدہ کر کے اُٹھنے کا واسطہ دیتے رہے" (6)

صورت حال 2008ء میں بھی وہی ہے جو چار سال قبل تھی اور معلوم نہیں کب اصلاح کی کوئی صورت پیدا ہوگی۔ نوائے وقت لاہور کی خبر ہے:

"غربت سے تنگ آ کر دولختِ جگر اور بیوی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ اسد خاں آٹے کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ مگر آٹا کہیں نہ ملا۔ گھر میں کئی روز سے فاقہ تھا"۔ (7)

پاکستان میں غربت و افلاس اور خودکشیوں کی بابت قومی اخبار روزنامہ جنگ لاہور کی ایک سروے رپورٹ ملاحظہ فرمائیں:

"لاہور (ریاض شاکر) ایک زمانہ تھا جب امتحان یا محبت میں ناکامی اور ماں باپ کی ڈانٹ ڈپٹ خودکشیوں کے اسباب تھے، لیکن اب غربت اور افلاس خودکشی کی سب

سے بڑی وجہ بن گئے ہیں۔ جــــنگ کے ایک سروے کے مطابق حالیہ دنوں میں لاہور میں ہونے والی خودکشیوں کے تمام واقعات کی بنیاد صرف اور صرف غربت ہے۔ ماہرین کے مطابق گھریلو جھگڑوں کی سب سے بڑی وجہ بھی بھوک اور افلاس ہے۔ طبی ماہرین کا کہنا ہے کہ غربت، بیماری، بے روزگاری اور گھریلو ناچاقی سے پیدا ہونے والے ڈپریشن سے انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کمزور ہو جاتی ہے۔ جنگ کی طرف سے چند غریب گھرانوں کا سروے کیا گیا۔ شیرا کوٹ، گلشن راوی کا ایک رکشہ ڈرائیور خلیل، جو ایک کمرے میں بیوی اور 5 بچوں کے ساتھ رہتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ اس کے کمرے کا کرایہ تین ہزار روپے ہے۔ ایک بلب اور ایک پنکھے کا بل ڈیڑھ سے دو ہزار روپے آتا ہے جبکہ روزانہ وہ زیادہ سے زیادہ سو روپے کماتا ہے۔ بچوں کو سکول نہیں بھجوایا۔ گھر میں گوشت پکے ایک سال ہو گیا۔ بڑی عید پر ہمسایہ نے قربانی کی تو گوشت بھجوایا تھا۔ روز کھانا تیار نہیں کیا جا سکتا، ایک دن ہانڈی پک کر کئی کئی دن کھاتے ہیں۔ جس دن دیہاڑی نہ لگے تو گھر میں کچھ پکتا بھی نہیں۔ بچے بھوکے سوتے ہیں۔ ضمیر کسی سے مانگنے کو تیار نہیں ہوتا۔ جوان بیوی کو کسی کے گھر کام کاج کے لیے نہیں بھیج سکتا۔ بچوں کی بھوک دیکھ کر خود کو ٹی بی ہو گئی ہے۔ خلیل نے کہا کہ ضروریات پوری کرنے کے لیے اپنا گردہ بھی بیچنے کو تیار ہوں۔ بچوں کے لیے روٹی پکے نہ پکے، بجلی پانی کے بل اور مالک کو دیہاڑی تو ہر صورت میں دینی ہی ہے۔ ایک نجی ادارے میں سکیورٹی کے ملازم موسیٰ نے بتایا کہ اسے 35 سو روپے تنخواہ ملتی ہے۔ گھر کا کرایہ 25 سو روپے ہے۔ وہ بچوں کو پڑھا نہیں سکتا۔ بچیاں جوان ہو رہی ہیں۔ ان کی شادی کی فکر ہم میاں بیوی کو دن رات کھائے جا رہی ہے۔ میں دن کو بھوکا رہتا ہوں اور رات کو داتا دربار کے باہر تقسیم ہونے والا لنگر گھر لے کر جاتا ہوں۔ چوبرجی کے باغیچے میں لیٹے ہوئے 45 سالہ رفیق نے بتایا کہ وہ بار برداری کر کے بچوں کے لیے روزی کماتا ہے۔ اب جسم میں اتنی طاقت نہیں کہ بوجھ اٹھا سکے۔ اس لیے کبھی دیہاڑی لگتی ہے اور کبھی نہیں۔ پیسے نہ ہونے کی وجہ سے بیوی بچوں میں روز جھگڑا ہوتا ہے۔" (8)

بی بی سی لندن سے نشر ہونے والی ایک رپورٹ، جسے نوائے وقت، لاہور نے نمایاں طور پر شائع کیا ہے، پڑھیے:

"لندن (بی بی سی ڈاٹ کام) پاکستان میں غربت کا دیو ہے جس کے نرغے میں آنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ بی بی سی نے پاکستان میں بڑھتی ہوئی غربت کے باعث خودکشیوں سے متعلق اپنی ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ پاکستان کے اخباروں میں ہر دوسرے دن ہولناک شہ سرخیاں شائع ہوتی ہیں کہ طالبان سے جاری جنگ میں کبھی مارکیٹوں میں بم دھماکے ہوتے ہیں تو کبھی مساجد کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ لیکن ایک ایسی آفت جو لاکھوں پاکستانیوں کو نگلتی جا رہی ہے، اسے کبھی نمایاں جگہ نہیں ملتی۔ لاہور میں غربت اور 60 ہزار روپے قرضہ کی واپسی میں ناکامی پر ایک بیٹے اور کمسن دو بیٹیوں کو زہر دینے کے بعد خودکشی کرنے والے رکشا ڈرائیور اکبر کی بیوہ مزمل بتاتی ہیں کہ جب اکبر بچوں کو زہر دے رہا تھا تو میں نے علم ہونے پر اسے کہا کہ یہ کیا ظلم ڈھا رہے ہو؟ تو جواب میں اکبر نے کہا تھا کہ میں انھیں اس لیے زہر دے رہا ہوں کہ اگر ہم نہ رہیں گے تو یہ بچے کیسے زندہ رہیں گے۔ بی بی سی نے اپنی رپورٹ میں مزید لکھا ہے کہ اکبر کی خبر تو اخبارات کے صفحہ اول میں شائع ہو گئی، لیکن عام طور پر ایسی خودکشیوں اور اموات کی خبریں اندرونی صفحات یا آخری صفحہ پر شائع ہوتی ہیں۔ حال ہی میں پانچ افراد کی موت کو ایک اخبار نے صرف پانچ سطروں میں شائع کیا جبکہ مزمل کا علاج کرنے والے ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ خودکشی کرنے والوں میں اکثریت غریبوں کی ہوتی ہے۔" (9)

19 جون 2010ء کے اخبارات میں قومی اسمبلی کی کارروائی شائع ہوئی ہے، جس میں لکھا ہے کہ:

"مسلم لیگ (ہم خیال) کی رکن کشمالہ طارق نے قومی اسمبلی کے اجلاس میں کہا کہ 2008ء سے اب تک دو سال میں 7 ہزار افراد بھوک و افلاس سے خودکشیاں کر چکے ہیں، ہم سب کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں، وزیر داخلہ ان ہلاکتوں پر پورے ایوان کے خلاف مقدمہ درج کرائیں کیونکہ ہم سب ان افراد کے قاتل

ہیں۔"(10)

یہ ہمارا ہی ملک ہے کہ جس میں جج صاحبان جیل معائنہ کے دوران تھوک کے حساب سے قتل یا زخمی کر دیے جاتے ہیں۔ ایک صوبائی وزیر اغوا ہو جاتا ہے اور ہفتوں معلوم نہیں ہوتا کہ اس کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ 5 فروری 2004ء کے اخبارات سے معلوم ہوا کہ موصوف میران شاہ نان کسٹم پیڈ گاڑی خریدنے گئے تھے اور کروڑوں روپیہ تاوان ادا کر کے واپس آئے ہیں۔ یہ اعزاز بھی ہمارے ہی ملک کو حاصل ہے کہ اس میں پورے ایک سو بچوں کو قتل کیا گیا اور کسی کو خبر ہی نہ ہوئی۔ گویا وہ انسان کے بچے نہیں تھے۔ بلکہ کیڑے مکوڑے تھے۔ بالآخر قاتل نے خود ہی انکشاف کیا۔ ہمارے ملک میں یہ عام سی بات ہے کہ بچوں کو اغوا کر کے خرکار کیمپوں میں جبری مشقت لی جائے۔ ایک خبر ملاحظہ کریں:

"بڑے خرکار کیمپ کا انکشاف، سیکڑوں لڑکیاں لڑکے قید ہیں۔ ہولناک اور مسلسل مشقت۔ فرار کی کوشش کرنے والے کے گردے نکال کر نعش جانوروں کے آگے ڈال دی جاتی ہے۔ کیمپ میں نوجوان لڑکیوں کی منڈی بھی لگتی ہے۔ بڑا خان ہیلی کاپٹر پر آتا ہے اور پسند کی لڑکیاں اُٹھا کر لے جاتا۔ بوڑھا ہونے پر ہاتھ پاؤں کاٹ کر بھیک منگوائی جاتی ہے۔"(11)

میرا صاحب دل حضرات سے سوال ہے کہ کیا دُنیا کے کسی اور ملک میں بھی یہ سب کچھ ہو رہا ہے جو پاکستان میں معمول کی بات ہے۔

1947ء سے قبل پرائمری تک تعلیم مفت تھی۔ ایک ہی نصاب تھا اور ایک ہی سکول۔ غریب کا بچہ بھی وہیں تعلیم حاصل کرتا اور رئیس کا بچہ بھی اسی جگہ پڑھ رہا ہوتا تھا۔ اب کالجوں کی بھی نجکاری کر دی گئی ہے یا کی جا رہی ہے۔ آج پاکستان میں تعلیم کی کیا صورتِ حال ہے یہ جاننے کے لیے روزنامہ جنگ میں شائع ہونے والی چشم کشا رپورٹیں پڑھیے۔ روزنامہ جنگ لاہور، 27 مئی 2010ء میں پاکستان سوشل اینڈ لیونگ اسٹینڈرڈ میژر منٹ سروے 8-2007ء کی رپورٹ شائع ہوئی ہے، جس میں بتایا گیا ہے:

"پاکستان کا شمار کم خواندگی کی شرح والے ممالک میں ہوتا ہے، جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ 42 فیصد پاکستانیوں نے کبھی سکول میں قدم ہی نہیں رکھا۔"

جبکہ جنگ لاہور، 8 ستمبر 2010ء میں "جنگ ڈویلپمنٹ رپورٹنگ سیل" کی تیار کردہ رپورٹ بعنوان "شرح خواندگی: دنیا کے 180 ممالک میں پاکستان 162 ویں نمبر پر۔ 40 فیصد بچے سکول ہی نہیں جاتے" شائع ہوئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

"لاہور (رپورٹ: نوید طارق) شرح خواندگی کے حوالے سے دنیا کے 180 ممالک میں پاکستان 162 ویں نمبر پر ہے۔ عالمی دن کے حوالے سے جنگ ڈویلپمنٹ رپورٹنگ سیل کی تیار کردہ رپورٹ کے مطابق پاکستان شرح خواندگی میں دنیا کے 162 اور پرائمری کی تعلیم کے معیار سے 116 ممالک سے نیچے ہے۔ قیامِ پاکستان سے شرح خواندگی 16.4 سے 2009ء تک 57 فیصد کی جا سکی، 74 فیصد شہری اور 48 فیصد دیہاتی، جبکہ 69 فیصد مرد اور 45 فیصد خواتین خواندہ ہیں۔ عالمی معاہدوں کے تحت شرح آئندہ 5 برس میں 85 فیصد تک کرنا ہے۔ جبکہ ملک میں 40 فیصد بچے سکول ہی نہیں جاتے۔ شرح خواندگی کے حوالے سے 180 میں سے 162 ممالک پاکستان سے بہتر ہیں۔ ورلڈ اکنامک فورمز گلوبل کمپیٹیٹوس کے مطابق پرائمری ایجوکیشن کے معیار کے حوالے سے دنیا کے 134 ممالک کی فہرست میں پاکستان کا نمبر 117 واں ہے۔ 20 فیصد پاکستانی تعلیم کی سہولت سے محروم ہیں۔ غیر سرکاری تنظیم سوسائٹی فار پروٹیکشن آف دی رائٹس آف دی چائلڈ کی رپورٹ کے مطابق سکول جانے کی عمر کے 40 فیصد تک بچے سکول نہیں جاتے۔"

سرکاری ہسپتالوں میں غرباء کو دوائی مفت ملتی تھی، بلکہ ہسپتال میں داخل مریضوں کو کھانا بھی ہسپتال سے مفت ملتا تھا۔ اب شفا خانے بھی خود مختار کیے جا رہے ہیں جہاں سے اہلِ ثروت ہی کو علاج میسر ہوگا۔ علاج معالجہ کی اب تک کی صورتِ حال کے بارے میں وزیر اعلیٰ پنجاب کے فرزند اور رکن قومی اسمبلی جناب حمزہ شہباز شریف نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل یونیورسٹی لاہور کی ایک سو پچاس ویں سالگرہ کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے:

"ملک کی 47 فیصد آبادی صحت کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہے۔ ماضی میں صحت کے شعبے کی بہتری کے لیے زبانی جمع خرچ کے سوا کچھ نہیں کیا گیا۔"(12)

انگریزوں نے لنڈی کوتل سے راس کماری تک سڑکیں بنائیں، ریل کی پٹڑیاں بچھائیں اور

اروں کی تعداد میں پل بنائے، لیکن کسی جگہ کوئی راہ داری ٹیکس نہیں لگا۔ پاکستان میں آج تک جتنے بھی نئے پل بنے ہیں سب پر راہ داری ٹیکس لگا ہوا ہے، بلکہ اب تو ان پلوں پر بھی راہ داری ٹیکس لگا دیا گیا ہے جو انگریزوں نے بنائے تھے۔ جو سڑک بھی نئی بنتی ہے یا کسی پرانی سڑک کی مرمت کر کے اُسے بہتر بنایا جاتا ہے تو اس پر راہ داری ٹیکس لگا دیا جاتا ہے۔ حکومت عوامی فلاح کے کسی کام کی ذمہ دار نہیں ہے۔ جناب مختار احمد بٹ اپنے کالم بعنوان ''رہنماؤ، قوم پر رحم کرو!'' لکھتے ہیں:

''انگریز جب برصغیر سے رخصت ہوا تو ہمیں ورثہ میں بہترین ریلوے نیٹ ورک، اری گیشن سسٹم، سڑکوں کا جال اور ڈاک کا بہترین نظام دے کر گیا۔ جب سے آپ نے ان اداروں کا انتظام سنبھالا ہے ان میں بہتری تو کیا آنی تھی سب نے مل کر نہ صرف ان کو لوٹا بلکہ ان سب کا ستیاناس کر کے رکھ دیا۔ 80 فیصد ٹرینیں بند ہو چکی ہیں، ڈاک کا انتظام اتنا بگڑا ہوا ہے کہ اس کی جگہ کوریئر کمپنیوں نے سنبھال لی ہے۔ نیشنل ہائی وے کا جو حال ہے کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ نہری نظام جو ہماری معیشت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا آج برباد ہو چکا ہے۔ رہی سہی کسر اب سیلاب نے پوری کر دی ہے۔ آنے والے دنوں میں ملک قحط کا شکار ہو سکتا ہے۔''(13)

ٹیکس جو وصول کیا جاتا ہے وہ تو خراج ہے جو فاتح مفتوح سے لیا کرتا ہے۔ 15 اگست 1947ء کو ہم پر ایک ڈالر بھی قرض نہیں تھا۔ اب اربوں ڈالر قرض ہے۔ لیکن اس قرض سے بنایا کیا گیا ہے کسی کو کچھ معلوم نہیں۔

پاکستان کی ایٹمی تنصیبات:

پرویز مشرف کے دور میں ایٹمی تنصیبات کو ختم کرنے کے پروگرام کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ ایٹمی سائنس دانوں کو جس طرح رُسوا کیا گیا ہے، دنیا بھر کی تاریخ میں اس کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ بھارت نے تو اپنے ایٹمی سائنس دان (ڈاکٹر عبدالکلام کو مسلمان ہونے کے باوجود) اپنا صدر بنا لیا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ اپنے ایٹمی سائنس دانوں (ڈاکٹر عبدالقدیر خاں اور ان کے ساتھیوں) پر مقدمہ چلانے کی تیاری کرتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ امریکا بہادر کی طرف سے ہمیں اس کا حکم مل

چکا ہے۔ ہمارے اندر تو اتنی جرأت بھی نہیں کہ امریکا کے کسی حکم کے جواب میں نوسر (No Sir) کہہ سکیں۔ جب تک امریکا سے حکم نہیں ملتا تھا، یہ سائنس دان قومی ہیرو تھے۔ جیسے ہی امریکا نے کہا کہ یہ مجرم ہیں تو ہماری سرکار نے بھی ان کی کردار کشی شروع کر دی۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ اسرائیل کو ہرگز گوارا نہیں کہ کوئی مسلمان ملک ایٹمی ہتھیاروں سے مسلح ہو۔ جس طرح پاکستان امریکا کے حکم کے جواب میں نوسر (No Sir) نہیں کہہ سکتا اسی طرح امریکا اسرائیل کی کسی خواہش کو رد نہیں کر سکتا۔ امریکا کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے۔ جس روز اسرائیل کا حکم بذریعہ امریکا موصول ہوا ہم اپنی ایٹمی تنصیبات ان کے حوالے کر دیں گے۔ ممکن ہے اسرائیل کو تسلیم بھی کر لیں۔

بھارت کے تابع مہمل بن جانے کی تیاری:

ہماری حکومت جس انداز سے امریکا کے آگے سپر انداز ہو گئی ہے اس سے بجا طور پر لوگ خدشہ محسوس کر رہے ہیں کہ پاکستان کو بھارت کا تابع مہمل بنا دیا جائے گا۔ معروف دانش ور جناب ڈاکٹر امین اللہ وثیر روزنامہ پاکستان، لاہور میں لکھتے ہیں۔

''راقم الحروف سارک کانفرنس سے چند روز پیشتر سپریم کورٹ کے ایک بہت سینئر وکیل کے پاس بیٹھا تھا۔ سیاسی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ اچانک کہہ اُٹھے: ''مجھے ڈر ہے کہ کہیں آئندہ جنوب مغربی ایشیا میں ''یونائیٹڈ سٹیٹس آف انڈیا'' کے قیام کی طرف نہ بڑھنے لگیں۔ میں نے عرض کیا: ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ لیکن مجھے اس وقت سخت تعجب ہوا جب میں نے لاہور کے ایک انگریزی روزنامہ کی اشاعت 24 دسمبر 2003ء میں جناب ارشاد ایچ بھٹی کا مضمون بعنوان United (U.S.S.A) States of Sout Asia! Why Not? کا مطالعہ کیا۔ مضمون نگار کا کہنا ہے کہ: ''ریاست ہائے متحدہ جنوبی ایشیا'' کا نظریہ نہ صرف دل پسند ہے، بلکہ اگر زیادہ جلد نہیں تو آئندہ دس سال تک عملی شکل بھی اختیار کر جائے گا۔ اپنے خیالات کی تائید میں اُنھوں نے صدر جنرل پرویز مشرف کے کشمیر کے سلسلہ میں اقوام متحدہ کی قراردادوں کے بارے میں حالیہ بیان کا حوالہ بھی دیا۔''(14)

روزنامہ پاکستان، لاہور، نے ہی جناب لطیف قریشی کا ایک کالم بعنوان ''جنوب مشرقی

ایشین یونین'' اپنے اداراتی صفحہ پر شائع کیا ہے، جس میں تقسیم برصغیر کی بعض وجوہ کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے:

''بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان کے مابین مسائل کا حل تینوں ممالک کی یونین قائم کرنے میں ہے۔ بعد میں اس یونین میں نیپال، بھوٹان، سری لنکا اور مالدیپ کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ اس سے امن اور خوشحالی آئے گی''۔(15)

اگر ہماری منزل بالآخر ایشین یونین ہی تھی تو ملک کو تقسیم کیوں کروایا گیا تھا۔ اس کے لیے وہ قیمت کیوں ادا کی گئی جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں۔ ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ ہمیں راستہ ہی سجھائی نہیں دے رہا۔ ہم تو بس حالات کے رحم وکرم پر ہیں۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

أَوْ كَظُلُمٰتٍ فِىْ بَحْرٍ لُّجِّىٍّ يَغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ط ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ط اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ط وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ. (سورۃ النور:40)

''یا وہ ایسے ہیں جیسے بڑے گہرے سمندر کے اندرونی اندھیرے کہ اس کو بڑی لہر نے ڈھانک لیا ہو۔ اس لہر کے اُوپر دوسری لہر۔ اس کے اُوپر بادل۔ اُوپر تلے بہت اندھیرے ہیں کہ اگر کوئی ایسی حالت میں اپنا ہاتھ نکالے (اور دیکھنا چاہے) تو نہ دیکھ سکے اور جس کو اللہ ہدایت نہ دے اسے کہیں سے روشنی میسر نہیں ہوسکتی''۔

ایک سوال:

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ قوم وطن سے نہیں، بلکہ مذہب سے بنتی ہے تو یہ خلاف واقعہ ہے کہ برصغیر میں صرف دو مذاہب کے لوگ آباد تھے۔ برصغیر میں ہندو مسلمان کے علاوہ سکھ، عیسائی، قادیانی اور پارسی بھی آباد تھے۔ اس صورت میں تو ہمیں دو قومی نظریہ کی بجائے کثیر القومی نظریہ پیش کرنا چاہیے تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ عیسائی، قادیانی اور پارسی آبادی بہت قلیل تھی اور اسے کسی جگہ بھی اکثریت حاصل نہیں تھی تو سکھوں کی آبادی تو اتنی کم نہیں تھی کہ اسے نظرانداز کردیا جاتا۔ جین مت اور بدھ مت کے پیروکار بھی کثیر تعداد میں موجود تھے، مگر مسلم لیگ کی قیادت نے انھیں بھی ہندو بنا دیا۔ اس صورت میں ہمیں کم از کم سہ قومی نظریہ پیش کرنا چاہیے تھا۔ ہمیں مطالبہ یہ کرنا چاہیے تھا کہ برصغیر کے تین ملک

بنائے جائیں اور جہاں سکھوں کی اکثریت ہے خواہ وہ دس مربع میل ہی کیوں نہ ہو، اُن کے لیے بھی اس جگہ علیحدہ ملک بنایا جائے۔ اگر ہماری طرف سے سہ قومی نظریہ پیش کیا جاتا تو کیا پھر بھی 1947ء میں سکھوں کا رویہ وہی ہوتا جو دوقومی نظریہ کی صورت میں انھوں نے اختیار کیا؟ اگر ہمارے نزدیک قوم مذہب سے بنتی تھی تو ہم نے سکھوں، پارسیوں، جینوں، بدھوں اور عیسائیوں کو دھکیل کر کیوں ہندوؤں میں شامل کردیا۔ اگر ہم نے سہ قومی نظریہ کا مقدمہ ہاتھ میں لیا ہوتا تو ممکن تھا کہ برصغیر کا نقشہ وہ نہ ہوتا جو اب ہے اور ہوسکتا ہے کہ بھارت اور مغربی پاکستان کے درمیان سکھوں کی ایک بفر سٹیٹ بن جاتی۔

دوسرا سوال:

آگے بڑھنے سے پہلے ایک دوسرے سوال پر بھی غور کرلیا جائے تو مناسب ہوگا۔ ہم نے برصغیر کے وہ علاقے جہاں مسلم آبادی کی اکثریت تھی، برصغیر سے علیحدہ کروا کر الگ ملک بنالیا۔ اگرچہ بعد میں پاکستان کا مشرقی بازو مرکز سے الگ ہوگیا، لیکن اس کے باوجود بھارت میں مدغم نہیں ہوا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں کے لیے نجات کی کوئی صورت ہے یا ان کے مقدر میں اب حشر تک کے لیے ہندو اکثریت کی غلامی لکھ دی گئی ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ان کے لیے نجات کا صرف اور صرف ایک ہی راستہ ہے۔ وہ راستہ یہ ہے کہ بھارت کے مسلمان اپنی اقلیت کو اکثریت میں تبدیل کرلیں۔ ورنہ حشر تک ہندو کی غلامی ان کا مقدر رہے گی۔ اس کے لیے ان کے پاس دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ شرح پیدائش میں مقابلتاً اضافہ اور دوسرا یہ کہ غیر مسلموں کو تبلیغ کے ذریعے مسلمان بنانا۔ آبادی میں اضافہ کرکے اپنی اقلیت کو اکثریت میں تبدیل کرنے کے علاوہ بھارت کے مسلمانوں کے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اس میں ان کو سو سال لگ جائیں یا ہزار سال، لیکن راستہ یہی ہے اور صرف یہی ہے۔ اس پر پھر یہ سوال سامنے آجاتا ہے کہ برصغیر کو تقسیم کروائے بغیر ہم زیادہ آسانی کے ساتھ اپنی اقلیت کو اکثریت میں تبدیل کرسکتے تھے اور اس سے وہ تناؤ بھی ہندو مسلم کے درمیان پیدا نہ ہوتا جو ہندوؤں کی ماں (بھارت ماتا) کو ذبح کرنے کی صورت میں پیدا ہوا۔ آخر ہم نے برصغیر کو تقسیم کروا کر اور علیحدہ ملک بنا کر گزشتہ 60 سالوں میں اسلام کی کیا خدمت کی ہے اور اسلام پر کس حد تک عمل کیا ہے۔ منافقت ہماری قومی پالیسی ہے، نام ہمارا اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔ اسلام دیکھنا ہو تو ٹی۔ وی

ڈرامے دیکھ لیے جائیں۔ جشن بہار کو دیکھ لیا جائے۔ جمہوریت کو دیکھنا ہو تو جنرل ایوب، جنرل یحییٰ، جنرل ضیا اور پرویز مشرف کے ادوار کو دیکھ لیا جائے۔ اس مسئلے پر ایک بزرگ نے یہ ردِّعمل ظاہر کیا کہ ہم گزشتہ ایک ہزار سال میں اگر اپنی اکثریت نہیں بنا سکے جب کہ ہم حکمران تھے تو محکوم ہو کر کس طرح اپنی اکثریت بنالیتے۔ اس معاملہ میں قابل غور بات یہ ہے کہ کیا ہم نے گزشتہ ایک ہزار سال میں برصغیر کی غیر مسلم آبادی پر حق تبلیغ ادا کر دیا تھا؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ پروفیسر تھامس آرنلڈ نے ''پریچنگ آف اسلام'' کے عنوان سے جو کتاب 1895ء میں لکھی تھی اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی پوری تاریخ میں تبلیغ اسلام کے بارے میں کوئی منظم کوشش ہی نہیں کی۔ اس نے لکھا ہے کہ جس طرح عیسائی مشنریز منظم طریقے سے دنیا بھر میں عیسائیت کی تبلیغ کر رہے ہیں اگر اس طرح مسلمانوں نے اسلام کی تبلیغ کی ہوتی تو دنیا میں ایک بھی غیر مسلم نہ رہتا۔ (16) گزشتہ ایک ہزار سال میں برصغیر میں اسلام کی تبلیغ کس طرح ہوئی ہے اس کو ڈاکٹر حبیب الرحمٰن علوی نے ''تصوف کی حقیقت تاریخ کی روشنی میں'' میں اس طرح بیان کیا ہے:

''ایران کی جانب مشرق تربیت یافتہ صوفیہ کو ایران کا ساختہ کردہ اسلام پھیلانے کے لیے بھیجا گیا۔ فرداً فرداً ہندستان میں جس جس جگہ مناسب سمجھا ہندوؤں کی سی فقیرانہ ٹھاٹھ کی کٹیا بنا کر بیٹھ گئے، لوگ ان کے گرد جمع ہونے لگے، کام چل پڑا۔ اُنھوں نے دیکھا کہ یہاں گرو اور چیلوں کا رواج ہے اور چیلے گرو کے لیے بہت بڑی طاقت ہیں، لہٰذا اُنھوں نے اس کی جگہ ایرانی اصطلاح میں پیری مریدی شروع کر دی۔ ان کے یہاں عبادت سے مراد بھجن گانا اور بجانا ہے۔ انھوں نے اس کا بدل قوالی کو اختیار کر لیا۔ ہندوؤں میں بجانے کے آلات ڈھول، گھنٹہ، ناقوس اور جل ترنگ تھے۔ ان کے علاوہ چند آلات مزامیر وغیرہ صوفی لوگ ایران سے اپنے ساتھ لائے اور کچھ انھوں نے یہاں ایجاد کیے جیسے امیر خسرو نے ستار ایجاد کیا۔ ہندو ہر سال اپنے مٹھوں اور تیرتھوں پر سالانہ جمع ہو کر تیرتھ مناتے تھے۔ صوفیوں نے پیروں کے نام سے مزار بنائے اور ان پر عرس کرنے لگے اور عرس کی فضیلت حج سے بڑھا دی اور حج کی فرضیت اس بہانے ختم کر دی کہ راستے دشوار اور غیر محفوظ ہیں۔ مزاروں میں

مدفون بزرگوں کے فیوض و برکات کا دور دور تک ڈنکا بجایا گیا۔ حاجت مند جمع ہونے لگے۔ چڑھاووں کی بھرمار سے مجاوروں کی آمدنی اور گلی چھرے دیکھ کر مزار بنانے کی وبا عام ہو گئی''۔ (17)

یہ تھا طریقہ تبلیغ جو گزشتہ ہزار سال میں مسلمانوں نے اختیار کیا۔ اس قسم کی تبلیغ سے متاثر ہو کر مسلمان ہونے والوں کی اکثریت مشرک کی مشرک ہی رہی۔ فرق صرف یہ ہوا کہ اسلام قبول کرنے سے قبل وہ بتوں کو پوجتے تھے۔ مسلمان ہو کر انھوں نے مقابر پر جا کر سجدے شروع کر دیے اور ہر مزار مسلمانوں کے لیے مسجود بن گیا۔ جب مسلمانوں نے گزشتہ ہزار سال میں اسلام کی تبلیغ کے لیے کوئی منظم کوشش ہی نہیں کی اور جو کچھ کوشش بھی کی وہ بھی اسلام کے ایرانی ایڈیشن کے لیے کی۔ ایسی صورت میں تو برصغیر میں اقلیت میں رہ جانے کی ذمہ داری بھی خود ان پر ہی عائد ہوتی ہے۔ حشر کے روز جب برصغیر کے غیر مسلم یہ کہیں گے کہ ان تک تو کسی نے اسلام پہنچایا ہی نہیں تھا تو کیا ہم ان کو جھوٹا ثابت کر سکیں گے؟ میری رائے میں قصور غیر مسلموں کا نہیں، بلکہ مسلمانوں کا اپنا ہے۔ غیر مسلم اسلام قبول کریں، یا نہ کریں اسلام کی تبلیغ ہر ایک مسلمان پر عین فرض ہے کیونکہ ختم نبوت کے بعد ہر مسلمان تبلیغ اسلام کے لیے مبعوث ہے۔ اسی لیے مسلمان کسی کا دشمن نہیں ہو سکتا، مسلمان کے دشمن تو ہو سکتے ہیں۔ نسل انسانی کی تمام غیر مسلم آبادی داعی اعظم نبی اکرم ﷺ کی امت دعوت ہے اور اس تک اسلام کی دعوت پہنچانا اور اتمام حجت کرنا ہر مسلمان کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ ان کی دنیوی اور اخروی نجات اب بھی اسی میں ہے کہ وہ اس فرض کو ادا کریں، اس کے بعد کسی کو ہدایت دینا یا نہ دینا اللہ تعالیٰ کا اپنا کام ہے۔

کیا قومیت کی تشکیل صرف مذہب سے ہوتی ہے؟

وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ کسی گروہ انسانی کو قوم کی صورت دینے میں مذہب واحد فیکٹر نہیں۔ یہ صرف ایک مفروضہ تھا کہ قوم صرف مذہب سے بنتی ہے۔ اگر قوم صرف مذہب سے بنتی تو مشرقی پاکستان کبھی علیحدہ نہ ہوتا۔ ہم تو موجودہ پاکستان (جو ایک جغرافیائی وحدت ہے) میں بھی ایک قوم کی تشکیل نہیں کر سکے۔ ہمارا تو یہ حال ہے کہ ہم ایک ڈیم بنانے پر اتفاق نہیں کر سکے۔ تھل کینال کی تعمیر کو روکنے کے لیے ہڑتالیں ہو رہی ہیں اور دھرنے دیے جا رہے ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ ہماری پوری تحریک وطن سے محبت کی نفی کی بنیاد پر چلتی رہی ہے۔ ہمارا تو موقف تھا:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن ہے اس کا وہ مذہب کا کفن ہے

ہمیں تو 14 اگست 1947ء تک یہ سبق پڑھایا جاتا رہا:

یہ بت کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے
غارت گرِ کا شانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے

لیکن 15 اگست 1947ء کی صبح سے ہم نے وطن کی بنیاد پر ایک پاکستانی قوم کی تشکیل کا پروگرام بنالیا۔ کیا ہم اس میں کامیاب ہوسکے یا ہوجائیں گے؟ سوچنے کی بات ہے کہ جب ہم تقسیم برصغیر کا مطالبہ کررہے تھے تو ہمارے مؤقف میں بھی ایک تضاد پوشیدہ تھا۔ ایک طرف نعرہ لگا رہے تھے:

ہر ملک ملک ما است کہ ملک خدائے ما است

لیکن ساتھ ہی ہم ایک الگ وطن کا مطالبہ بھی کررہے تھے۔ حیرت ہے کہ اس تضاد کا نوٹس ہی نہیں لیا گیا۔ اگر مذہب کی بنیاد پر مسلمان الگ قوم ہیں تو کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ افغانستان کا مسلمان اور پاکستان کا مسلمان ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ جواب نفی میں ہے۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوجاتا کہ دو قومی نظریہ ایک مفروضہ ہی تھا۔ 1947ء سے قبل برصغیر کے مسلمانوں کی جو حالت تھی اس کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان کیا ہے:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ط حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْــًٔـا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ط وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ. (سورۃ النور 39)

"اور جو لوگ ناشکر گزار ہیں ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے ایک چٹیل میدان میں چمکتی ہوئی ریت کہ پیاسا اس کو پانی خیال کرتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس آیا تو اس کو کچھ بھی نہ پایا اور پایا تو قضائے الٰہی (موت) کو پایا۔ سو اللہ نے اس کا حساب برابر چکا دیا اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے"۔

برصغیر کے مسلمانوں نے بھی ناشکری کی۔ ان کے پاس بھی ایک نعمت خداوندی (اسلام) تھی، لیکن انھوں نے نہ تو خود اس سے فائدہ اُٹھایا اور نہ ہی اسے دوسرے غیر مسلموں تک پہنچایا، بلکہ پاکستان کی شکل میں ایک سراب دیکھنا شروع کردیا اور تقسیم برصغیر کا مطالبہ کرکے عملاً یہ تسلیم کرلیا کہ اسلام اپنی قوت تاثیر کھو چکا ہے۔ اس لیے برصغیر میں مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہیں گے، لہٰذا جن علاقوں میں اتفاق سے نہ کہ اسلام کی قوت تاثیر سے مسلمان اکثریت میں ہیں ان کو علیحدہ کروالیا جائے اور جن علاقوں میں اقلیت میں ہیں ان کو مشرک اکثریت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ بھی ان کو سزا دے کر حساب برابر کیے جارہا ہے۔ بھارت میں رہ جانے والوں کو سزا ایک صورت میں مل رہی ہے تو پاکستان میں رہنے والوں کو دوسری صورت میں۔

جنرل یحیٰی کے دور حکومت میں کسی مغربی صحافی کا ایک مضمون پاکستانی اخبارات میں شائع ہوا تھا کہ پاکستانی قوم نابالغ ہے۔ وجہ اس نے یہ بیان کی تھی کہ صدر ایوب خان کی حکومت کے خلاف تحریک چل رہی تھی، جب تحریک بے قابو ہوگئی تو صدر ایوب نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر تقریر کرکے اعلان کردیا کہ وہ آئندہ صدارتی انتخاب نہیں لڑیں گے۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تحریک اگلے ہی روز ختم ہوجاتی کیونکہ صدارتی انتخاب میں صرف چند ماہ باقی تھے، لیکن ہوا اس کے برعکس کہ تحریک میں مزید شدت پیدا ہوگئی اور ملک میں مارشل لاء لگ گیا اور انجام ملک کے دولخت ہونے کی صورت میں ہوا۔ اگر ہماری قوم میں، بشرطیکہ ہمیں قوم کہا جاسکے، ساٹھ کے عشرے میں سیاسی بلوغت نہیں تھی تو چالیس کے عشرے میں کس طرح ہوسکتی تھی۔ جس طرح خدشہ ظاہر کیا جارہا ہے اگر ہم چند سال بعد انڈین یونین میں شامل ہوجائیں تو کیا یہ ثابت نہیں ہوجائے گا:

ہر چہ دانا کند کند ناداں
لیک بعد از خرابی بسیار

کیا اس اندھیرے سے نکلنے کی کوئی صورت ہے؟ یہ ہے وہ سوال جس کا جواب پاکستان کے اہل دانش کے ذمہ ہے۔



حوالہ جات

(1)ارمغان عجم/عزیز احمد صدیقی

(2)روزنامہ نوائے وقت،لاہور/16جنوری2004ء

(3)روزنامہ نوائے وقت،لاہور/31جنوری2004ء

(4)روزنامہ نوائے وقت، لاہور/23جنوری2004ء

(5)روزنامہ نوائے وقت، لاہور/23جنوری2004ء

(6)روزنامہ پاکستان لاہور3جنوری2004

(7)روزنامہ نوائے وقت، لاہور/جولائی2008ء

(8)روزنامہ جنگ، لاہور/26جون2010ء

(9)روزنامہ نوائے وقت، لاہور/5جولائی2010ء

(10)روزنامہ نوائے وقت، لاہور/19جون2010u

(11)روزنامہ نوائے وقت، لاہور/15جنوری2004ء

(12)روزنامہ نوائے وقت، لاہور/27دسمبر2010ء

(13)روزنامہ جنگ، لاہور/2ستمبر2010ء

(14)روزنامہ پاکستان، لاہور/21جنوری2004ء

(15)ایضاً/30جنوری2004ء

(16)پریچنگ آف اسلام/ص:408

(17)تصوف کی حقیقت: تاریخ کی روشنی میں/ص:12-11

2

میں اس کتاب کے پہلے مضمون میں عرض کر چکا ہوں کہ ہندستان سے برطانوی حکومت کی رخصتی کو دیکھتے ہوئے ہم نے اپنے آقاؤں سے یہ مطالبہ کر کے کہ ''اگر آپ برصغیر کو آزاد کر کے رخصت ہونا ہی چاہتے ہیں تو دوقومی نظریہ کی بنیاد پر ملک کو تقسیم کر کے جائیں'' اور بالآخر اس مطالبے کو تسلیم کروا کر ہم نے عملاً یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اسلام اپنی قوت تاثیر کھو چکا ہے، لہٰذا اب برصغیر میں مسلمان قیامت تک اقلیت میں رہیں گے۔ ہم نے تو یہ اعلان بھی کر دیا تھا کہ اسلام اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ اور پسندیدہ دینِ حق نہیں، بلکہ اسلام بھی بس اسی طرح کا ایک دھرم ہے جس طرح کے ''ہندومت'' یا ''بدھ مت'' دھرم ہیں۔ جس طرح ''ہندو'' صرف پیدائشی ''ہندو'' ہوتا ہے، کوئی غیر ہندو تبدیل (Convert) ہو کر ہندو نہیں ہو سکتا اسی طرح مسلمان بھی صرف پیدائشی مسلمان ہوتا ہے، کوئی شخص Convert ہو کر مسلمان نہیں ہو سکتا، میری رائے میں ایسا طرز عمل اختیار کر کے ہم برصغیر کے مسلمانوں نے ایک جرم عظیم کیا تھا جس کی سزا بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں کو اگر ایک طرح سے مل رہی ہے تو پاکستان میں آباد مسلمانوں کو دوسری شکل میں مل رہی ہے۔ میں نے اپنی تحریروں کا سیٹ (Set) کم وبیش پندرہ لیگی دانش ور حضرات کی خدمت میں ارسال کیا جو پی۔ ایچ۔ ڈی یا اسی علمی سطح کے تھے اور ان سے درخواست کی تھی کہ اگر میرا نقطۂ نظر غلط ہے تو وہ دلائل سے ثابت کر دیں، میں اپنی رائے تبدیل کر لوں گا، لیکن ان میں سے کسی صاحب نے بھی جواب نہیں دیا، حالانکہ ایک صاحب نے تو وعدہ بھی کیا تھا۔ حقیقت میں نہ تو دوقومی نظریہ الہامی تھا، نہ ہی تقسیم برصغیر اسلام کا تقاضا تھا اور نہ ہی یہ عمل برصغیر کے مسلمانوں کے

مجموعی مفاد میں تھا بلکہ روافض پر مشتمل ہماری قیادت نے برصغیر کے مسلمانوں سے ایک فراڈ کیا تھا۔ بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں کو تو پندرہ اگست 1947ء کی صبح ہی سمجھ آ گئی تھی کہ ان کے ساتھ ہاتھ ہو گیا ہے۔ بنگلہ دیش میں کیمپوں میں 1972ء سے پڑے ہوئے غیر بنگالی مسلمانوں کو بھی سمجھ آ چکی ہے کہ مسلم لیگ کو تقسیم برصغیر کا مینڈیٹ دے کر مسلمان ایک دھوکے کا شکار ہوئے تھے۔ اب رہ گئے پاکستان کے اس حصہ کے مسلمان جو کبھی مغربی پاکستان تھا۔ ان پر بھی کسی وقت یہ آشکار ہو ہی جائے گا کہ صحیح کیا تھا اور غلط کیا تھا۔

مجھے معلوم ہے کہ میری حقیقت بیانی بعض دانش ور حضرات کی طبائع پر بہت گراں گزری ہے اور گزرے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ''جیالے'' ہیں۔ ''جیالا'' بطور اصطلاح تو پیپلز پارٹی نے 1970ء کی انتخابی مہم میں متعارف کروایا لیکن جیالا کلچر مسلم لیگ نے 1940ء سے 1947ء تک کے عرصے میں متعارف کروایا۔ یہ کلچر ہے اپنی قیادت کو ''امام معصوم'' بنا کر پیش کرنا اور اس میں وہ خوبیاں بھی تصور کر لینا جو ان کے ''امام معصوم'' کے قریب سے بھی نہ گزری ہوں۔ اس کلچر کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ 1947ء میں مشرقی پنجاب میں تقریباً پندرہ لاکھ مسلمان قتل ہو گئے اور نوے ہزار مسلمان عورتیں بے آبرو ہو گئیں۔ 1970-71ء میں یہی تاریخ مشرقی پاکستان میں دہرائی گئی، لیکن 1947ء کے ''امام معصوم اور قائد اعظم'' محمد علی جناح کو اس کی پروا تک نہ تھی۔ 1947 ہو یا 1971ء تفصیلات اس قدر دردناک ہیں کہ پڑھتے ہوئے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم ذیل میں صرف ایک واقعہ درج کرتے ہیں۔ ستمبر 1947ء میں جب کہ ابھی لاکھوں مسلمان مہاجرین یا یہ کیمپوں میں پڑے تھے یا پھر جان و مال و عزت آبرو کو خطرے میں ڈال کر قافلہ در قافلہ پاکستان کی طرف مارچ کر رہے تھے، گورنر جنرل ہاؤس کراچی میں ایک سرکاری دعوت کا اہتمام کیا گیا جس میں سفیروں، اعلیٰ افسران اور وزراء کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس دعوت کا حال اس میں شرکت کرنے والے ایک مہمان جناب سری پرکاش (ہائی کمشنر بھارت برائے پاکستان) سے سنیے:

''میرا گمان تھا کہ یہ پرائیویٹ دعوت ہو گی، لیکن وہاں پہنچنے پر پتا چلا کہ اور بہت سے حضرات مدعو تھے۔ ڈنر سے پہلے سب مہمان ایک صف میں کھڑے ہوئے۔ مسٹر جناح اور ان کی بہن فاطمہ جناح آئیں اور سب سے مصافحہ کیا۔ چونکہ میں ترکاری کھاتا ہوں، اس لیے میرے لیے ذرا دقت تھی۔ اعلیٰ قسم کی شرابیں خوبصورت بوتلوں میں تھیں۔ شرابوں کے نام چاندی کی چھوٹی چھوٹی تختیوں پر کھدے ہوئے تھے۔ یہ تختیاں چاندی کی زنجیروں میں بوتلوں پر لٹک رہی تھیں۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ کچھ مہمانوں نے تو اپنے گلاس بھر لیے اور نہ پینے والے آگے بڑھا دیتے تھے۔''(1)

روم جل رہا تھا اور نیرو بنسری بجا رہا تھا۔ روافض کو مسلمانوں پر گزرنے والے کسی بھی المیے پر کیا دکھ ہو سکتا ہے۔ نہ پہلے کبھی ہوا ہے اور نہ آئندہ کبھی ہو گا۔ اس سب کچھ کے باوجود امام تو معصوم ہوتا ہے۔ اس لیے کسی نے آج تک نہیں پوچھا کہ: ''کیا یہی ہے شاہکار تیرے ہنر کا''۔

اب مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کے ساتھ یہ فراڈ کیسے ہوا اور اس کے لیے منصوبہ بندی کن لوگوں نے کی اور طریقِ کار کیا اختیار کیا۔ لیکن اس سے قبل مجھے تمہید کے طور پر کچھ عرض کرنا ہے۔

جداگانہ انتخاب کبھی کسی اقلیت کے مفاد میں نہیں ہوتا۔ خود پاکستان میں کوئی اقلیت جداگانہ انتخاب قبول کرنے کے لیے بخوشی تیار نہیں۔ ہمیشہ ان پر ٹھونسا جاتا ہے، اس کے برعکس مخلوط انتخاب کی صورت میں توازن اقلیت کے پاس ہوتا ہے اور ہر امیدوار اقلیت کے ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اقلیت کا ہر مطالبہ پورا کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔ جبکہ جداگانہ انتخاب اکثریت کے مفاد میں ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں اکثریت اقلیت کی بلیک میلنگ سے محفوظ ہو جاتی ہے۔ جداگانہ انتخاب کی صورت میں اقلیت کو اس کی آبادی کے تناسب سے نمائندگی تو مل جاتی ہے، لیکن اپنی کسی بات کو منوانے کے لیے بہرحال وہ اکثریت کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ مخلوط انتخاب کی صورت اقلیت کے لیے کس طرح مفید ہوتی ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ بھارت کے گزشتہ انتخاب میں وہاں کی مسلم اقلیت نے این بلاک کانگریس کو ووٹ دے کر بی جے پی کو اقتدار سے محروم کر دیا۔ بدقسمتی سے برصغیر کے مسلمانوں پر روافض کی قیادت نے جداگانہ انتخاب مسلط کروا دیا۔ اس طرح اکثریت کو مسلمانوں کے ووٹوں سے بے نیاز کر دیا۔

برصغیر میں انگریز کی حکومت کا جواز اور اس کی طوالت کا انحصار اس بات پر تھا کہ یہاں کے رہنے والے مسلمان اور غیر مسلم آپس میں لڑتے رہیں۔ مخلوط انتخاب کی صورت میں اس کا کوئی امکان نہیں تھا اگر تھا تو بہت کم کہ وہ آپس میں لڑیں۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی میں کوئی ہندو

مسلم فساد نہیں ہوا۔ بیسویں صدی میں جیسے ہی جداگانہ انتخاب متعارف کروائے گئے۔ ہندو مسلم فساد شروع ہوگیا اور لاکھوں مسلمان جان سے گئے اور ہزاروں مسلمان عورتیں بے آبرو ہوئیں۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ یہ تھا انعام جو روافض کی قیادت کی طرف سے برصغیر کے مسلمانوں کو عطا ہوا۔

اس تمہید کے بعد اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے میں عرض کرتا ہوں کہ 1905ء کے الیکشن میں لیبر پارٹی نے برطانیہ میں اکثریت حاصل کرلی جس کا منشور یہ تھا کہ کامیابی کی صورت میں وہ پارٹی برصغیر میں بھی منتخب ادارے متعارف کروائے گی۔ چنانچہ یکم اکتوبر 1906ء کو اپنے جیسے پینتیس افراد کا وفد لے کر ہز ہائی نیس سر سلطان محمد شاہ آغا خاں سوم وائسرائے ہند سے ملا اور برصغیر کے مسلمانوں کی طرف سے ان کے لیے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا:

"A deputation led by Agha Khan waited upon the Viceroy,Lord Minto,to express these views and to press the Muslims' claims to favour, through separate electorates and otherwise on the ground of their contribution to the defence of the empire and their traditions of past political greatness.The Viceroy expressed himself, entirely in accord,"I am as firmly convinced", he said, "as I believe you to be, that any electoral representation in India would be doomed to mischievous failure which aimed at granting personal enfranchisement, regardless of the beliefs and traditions of communities composing the population of this continent."(2)

ترجمہ: ایک وفد، جس کی قیادت آغا خان کر رہے تھے، وائسرائے سے ملا، تاکہ اپنے

خیالات کا اظہار کر سکے اور مسلمانوں کی جانب سے یہ تقاضا کر سکے کہ حکومت ان پر مہربانی کرتے ہوئے اور سلطنت کے دفاع کے لیے ان کی خدمات اور ان کی سابقہ سیاسی عظمت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، ان کے جداگانہ انتخابات اور دیگر مطالبات قبول کرلے۔ وائسرائے نے ان سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ ''مجھے بھی اس بات پر اتنا ہی یقین ہے جتنا آپ کو ہے کہ کوئی بھی ایسا انتخابی نظام جو اس برعظیم کے رہنے والوں کے عقائد اور روایات کو نظرانداز کرتے ہوئے، انفرادی رائے دہی کا حق دے گا، وہ بری طرح ناکام ہو جائے گا۔''

وائسرائے نے وفد کے مطالبہ سے مکمل اتفاق کا اظہار کیا اور اسے منظور کرنے کا وعدہ کیا۔

اس تمہید سے چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

1) آغا خاں صاحب کون تھے۔

2) مسلمانوں کی طرف سے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کرنے کا اختیار آغا خاں کو کس نے دیا اور کیا یہ اسلام کا تقاضا تھا؟

3) کیا آغا خاں اینڈ کمپنی نے یہ مطالبہ مسلمانوں کی ہمدردی کی بنا پر کیا یا اس کی وجہ کچھ اور تھی؟

آغا خاں اسمٰعیلی روافض کے پیشوا ہیں۔ روافض نے جب اسلام کا ایرانی ایڈیشن تیار کیا تو اس کی رُو سے نبوت کے ختم ہونے پر امامت شروع ہوگئی۔ ان کے نزدیک پہلے امام سیدنا حضرت علیؓ تھے۔ اس کے بعد امامت ان کی فاطمی اولاد میں شروع ہوگئی۔ نبوت کی طرح امامت بھی منصوص ہے اور ہر امام اپنی زندگی میں اپنے جانشین کو اللہ تعالیٰ سے اطلاع پا کر مقرر کر دیتا ہے جب امامت حضرت جعفر صادقؒ کو حاصل ہوئی تو انھوں نے اپنے بیٹے اسمٰعیل کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ اب ہوا یہ کہ جناب اسمٰعیل اپنے باپ کی زندگی میں فوت ہو گئے تو انھوں نے اپنے دوسرے بیٹے موسیٰ رضا کو امام مقرر کر دیا۔ روافض کے ایک گروہ نے اسے تسلیم کر لیا اور عقیدہ بدا گھڑ لیا جس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ بھول بھی جاتا ہے۔ یہ حضرات اثناء عشری کہلائے۔ جب امامت بارھویں امام تک پہنچی تو اس گروہ نے اپنے بارھویں امام کو غار میں داخل کر دیا جو ان کے عقیدے کے مطابق قربِ قیامت کو غار سے باہر نکلیں گے۔ دوسرے گروہ نے جناب اسمٰعیل کے کم سن بیٹے محمد کو امام تسلیم کر لیا اور اسمٰعیلی کہلائے اور اس گروہ میں امامت جناب محمد سے چلتی ہوئی

ہز ہائی نیس سر سلطان محمد شاہ آغا خاں سوم تک پہنچی۔

روافض کا یہ گروہ "حاضر امامئے" کہلاتا ہے جبکہ اثنا عشری "غائب امامئے" کہلاتے ہیں۔

اسمٰعیلی عقائد کی تفصیل ڈاکٹر زاہد علی نے اپنی تالیف "**ہمارے اسمٰعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام**" میں بیان کی ہے اس کا کچھ حصہ پیش خدمت ہے:

"آنحضرت ﷺ کے بعد آپ کی خلافت کے لیے ہر زمانے میں منصوص امام کی ضرورت ہے۔ ایسی امامت کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا اور کبھی منقطع نہ ہوگا۔ ہر امام اگلے امام پر نص کیے بغیر کبھی فوت نہ ہوگا یعنی اپنا جانشین بنا کر دنیا سے جائے گا۔ ہر امام میں وہی اوصاف ہونے چاہئیں جو آنحضرت ﷺ میں تھے۔ ہر امام وہی فرائض انجام دے گا جو آنحضرت ﷺ انجام دیا کرتے تھے (امام کے لیے لازم ہے کہ) آنحضرت ﷺ کی طرح وہ بھی معصوم ہو، عادل ہو، کوئی خطا اس سے سرزد نہ ہوئی ہو۔ اس کی اطاعت لوگوں پر اسی طرح واجب ہو جس طرح آنحضرت ﷺ کی اطاعت آپ کے عہد کے لوگوں پر تھی"(3)

ایک دوسری جگہ ڈاکٹر زاہد علی بیان کرتے ہیں:

"ائمہ معصومین کا مسئلہ یہ ہے کہ جن کے متعلق سیدنا جعفر بن منصور الیمن نے فرمایا ہے کہ ان سے ہرگز کوئی گناہ نہیں ہوسکتا۔ بخلاف انبیاء و مرسلین کے کہ جن سے گناہ ہوئے ہیں۔ ان انبیائے مرسلین میں موسیٰ تو ایک طرف خود آں حضرت ﷺ تک شامل ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہمارے آئمہ معصومین کی شان انبیائے مرسلین کی شان سے بدرجہا بلند ہے۔ دونوں میں مالک و مملوک کا فرق ہے۔ معصومین کی تشبیہ ملائکہ سے دی گئی ہے جن سے خطا سرزد نہیں ہوسکتی۔" [نقل کفر۔ کفر نباشد] (4)

اسلام کے ساتھ اسمٰعیلی روافض نے کیا سلوک کیا ہے۔ اس کے بارے میں فاضل مؤلف اس طرح بیان کرتے ہیں:

"جب دور محمدیؐ کے ائمہ کو گنو گے تو مولا محمد بن اسمٰعیل ساتویں ہوں گے اور ساتواں امام اپنے پہلے اماموں سے قوی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے آپ ناطق اور قائم اور "اسبوع" کے خاتم ہوئے اور آپ نے صاحب دور سادس (یعنی رسول اللہ ﷺ) کی

شریعت کے معنی بیان کر کے اور اس کے پوشیدہ باطن کو ظاہر کر کے انؐ کی شریعت کو منسوخ کر دیا"(5)

مزید بیان کرتے ہیں:

"جب امامت ثابت ہو جائے اور اس پر دلیلیں قائم ہو جائیں تو ہمیں ان کے (یعنی اماموں کے) افعال کی طرف نہ دیکھنا چاہیے۔۔۔امامت ایک نفسانی ریاست اور قدسانی درجہ ہے۔ یہ درجہ اللہ تعالیٰ کی تائید سے حاصل ہوتا ہے۔ امامت کے لیے عصمت ثابت ہے"(6)

امام کے رتبہ و مقام کے بارے میں فاضل مؤلف بیان کرتے ہیں:

"امام جب تک اپنے پیش رو سے منصوص یعنی مقرر نہ ہوا امام نہیں ہوسکتا۔ اسی وجہ سے ہم اہل نص و توقیف کہلاتے ہیں۔ اس نص و توقیف کا سلسلہ ہمارے یہاں آدم اول یعنی صاحب جثہ ابداعیہ سے شروع ہوا اور آپ ہی کی نسل میں یعنی باپ کے بعد بیٹے میں قیامت کبریٰ تک جاری رہے گا۔ یہ سلسلہ مولا ابوطالب تک پہنچا۔ آپ اپنے عہد کے مستقر امام تھے۔ آپ کے بعد حق امامت کے وارث آپ کے فرزند مولا علیؑ تھے لیکن اس موقع پر چونکہ ایک رسول کی ضرورت پیش آئی اس لیے آپ نے (یعنی مولا ابوطالب نے) اپنے بھتیجے حضرت رسول خدا ﷺ کو نبوت و رسالت کا رتبہ دے کر امام مستودع مقرر کیا اور آپ کو یہ وصیت کی کہ اپنے بعد مولا علیؑ کو قائم مقام بنائیں کیونکہ امامت کے حقیقی وارث مولا علیؑ ہی ہیں"۔(7)

آغا خانی عقائد کی رُو سے نبی اکرم ﷺ کو نبوت و رسالت بھی جناب ابوطالب نے عطا کی تھی جو اپنے وقت کے امام تھے اور مولا علیؓ کا مقام کیا ہے۔ اس کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"حضرت پیغمبر ﷺ کے اس قول سے کہ "اے علیؓ! اگر مجھے خوف نہ ہوتا کہ میری امت تمہارے متعلق وہ کہہ دے گی جو نصاریٰ نے عیسیٰؑ کی شان میں کہہ دیا تو میں تمہاری شان میں ایسی بات کہتا جس کی وجہ سے لوگ تمہارے وضو کا بچا ہوا پانی اور تمہارے پاؤں کے نیچے کی مٹی لیتے اور شفا حاصل کرتے"(8)

حاضر امام کا مقام و رتبہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''امام کی تعظیم خدا کی تعظیم ہے۔ مومنین اس کے سامنے زمین بوسی کرتے ہیں اور زمین بوسی سجود نہیں ہے، باوجود اس کے اگر کوئی مومن خدا کی تعظیم سمجھ کر امام کو سجدہ کرے تو یہ بات منکر یعنی بری نہیں ہے''(9)

ان حاضر امام حضرات کا کردار کیا تھا۔ اسے فاضل مؤلف نے اس طرح بیان کیا ہے۔ ان کے ایک امام مولا مستنصر کے عہد کے شاعر اشریف ابوالحسن نے ان کے سامنے عرفہ کے روز قصیدہ پڑھا تو:

''یہ قصیدہ سن کر آپ شراب کی مشکوں اور غنا کے آلات کے ساتھ عورتوں اور خدمت گاروں کو لے کر جُبّ عمیرہ کی طرف روانہ ہوئے جو قاہرہ کے قریب ایک سیر گاہ تھی جہاں آپ نے کعبہ کے نمونہ پر ایک مکان اور شراب کا حوض تیار کرایا تھا۔ آپ اس مکان میں بیٹھ کر شراب پیتے اور گانا سنتے اور یہ کہتے کہ یہ فعل حجر اسود کو گھورنے، قاریوں کی گنگناہٹ سننے اور زم زم کا خراب پانی پینے سے زیادہ مسرت بخش ہے''۔(10)

اسمٰعیلی آغا خانی حضرات نے بیت اللہ سے کیا سلوک کیا۔ اس کو فاضل مؤلف نے اس طرح بیان کیا ہے:

''مولا مہدی کے عہد میں کئی بار حاجیوں کو لوٹا۔ 317ھ میں یہ لوگ مکہ معظمہ پہنچے اور عین ترویہ کے روز منصور دیلمی کے ساتھ جو حاجی آئے تھے ان پر حملہ کر کے ان کا سب مال لوٹ لیا۔ ان میں سے کئی کو بیت اللہ اور مسجد حرام میں قتل کیا۔ حجر اسود نکال کر اپنے مستقر ہجر لے گئے۔ تاکہ اپنے شہر میں حج مقرر کریں۔۔۔۔ بیت اللہ کا دروازہ اور میزاب اکھاڑ ڈالے۔ مقتولین کے لاشے زم زم کے مبارک کنویں میں پھینک دیے اور چند بغیر غسل وکفن کے مسجد حرام کے صحن میں دفن کر دیے''(11)

یہ تو تھے آغا خانی حضرات کے عقائد اور مسلمانوں سے ان کا حسن سلوک۔ اب اپنے قائد، آل انڈیا مسلم لیگ کے پہلے صدر آغا خاں سوم کا ذاتی کردار بھی دیکھ لیا جائے۔ حاضر امام شراب و کباب کے بغیر ایک دن بھی نہیں گزار سکتے تھے۔ سال کا تقریباً تین چوتھائی حصہ یورپ میں گزارتے تھے۔ سردیوں کے موسم میں برصغیر کا دورہ فرمایا کرتے تھے۔ قیام یورپ کے دوران

ہمارے مہربان قائد آغا خاں نے ویسے تو ہمیشہ ہی کسی نہ کسی گوری لڑکی کو بطور گرل فرینڈ اپنے ساتھ رکھا، لیکن جنوری 1908ء کی ایک شام ان کی نظر مونٹے کارلو کی ایک رقاصہ ٹریسا میگ لیانو پر پڑی تو گھائل ہو گئے اور اسے مستقل طور پر اپنے لیے مخصوص کر لیا۔ اس داشتہ سے ایک لڑکا محمد مہدی 1909ء میں پیدا ہوا، لیکن اٹھارہ ماہ کا ہو کر فوت ہو گیا۔ 17 جون 1911ء کو دوسرا لڑکا پیدا ہوا جس کا نام علی سلمان رکھا گیا۔ چونکہ آغا خاں نے ٹریسا سے باقاعدہ شادی نہیں کی تھی اس لیے علی کی پیدائش کے سرٹیفکیٹ پر یہ لکھا گیا۔

''یہ بچہ ٹریسا میگ لیانو (عمر 22 سال غیر منکوحہ) جو یہاں اپنے آزادانہ ذرائع کے بل پر رہائش رکھتی ہے اور ہز ہائی نیس آغا خاں کے ملاپ کا نتیجہ ہے''(12)

اس خاتون سے آغا خاں نے باقاعدہ شادی 1923ء میں کی جب پرنس علی سلمان کی عمر گیارہ سال تھی۔ پرنس علی سلمان موجودہ آغا خاں چہارم پرنس کریم کے والد تھے انھوں نے پرنس کریم کی والدہ سے اس وقت شادی کی جب وہ تین ماہ کے حمل سے تھیں جس سے موجودہ آغا خاں پیدا ہوئے۔

''ٹریسا سے ملاقات کے ایک برس بعد آغا خاں نے ایک اور رقاصہ سے بھی تعلق قائم کر لیا اور اسے بھی بطور داشتہ رکھ لیا''۔(13)

''1910ء ہی میں آغا خاں نے ایک اور رقاصہ جوزفینا کو بھی گرل فرینڈ بنا لیا اور اس کے ساتھ داد عیش کے لیے مونٹے کارلو میں ایک بنگلہ بھی حاصل کر لیا''۔(14)

ہمارے قائد آغا خاں کی رنگین زندگی تو ایک پوری کتاب کا موضوع ہے لیکن میں اس سے زیادہ بیان کرنے کی ہمت نہیں پاتا۔ یہ ذکر ضرور کروں گا کہ آغا خانی گروہ (اسمٰعیلی روافض) نے مسلمانوں کے ساتھ کبھی خیر کا برتاؤ نہیں کیا۔ ہمیشہ مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپا۔ نورالدین زنگی جب عیسائیوں سے لڑ رہا تھا تو مصر کے فاطمی خلفا (جو ہمارے قائد آغا خاں کے اجداد تھے) عیسائیوں سے مل گئے اور نورالدین زنگی کی مشکلات میں بے پناہ اضافہ کر دیا چنانچہ زنگی کو اپنے بھتیجے صلاح الدین کو بھیج کر پہلے ان کا بندوبست کرنا پڑا۔(15)

آغا خانی حضرات ترکی کے سلطان کے خلاف بھی عیسائیوں کے لیے جاسوسی کرتے رہے تھے چنانچہ 1906ء میں ان کا ایک گروپ دمشق میں جاسوسی کے الزام میں گرفتار ہوا۔(16)

"مسٹر اے آر بٹلر جو وائسرائے کی کونسل میں ایجوکیشن ممبر تھے، کو آغا خاں نے ایک طویل خط 1911ء میں لکھا اور اس میں لکھا کہ اسمٰعیلی خوجے ایک سو سال سے سنی اور شیعہ دونوں کی بربریت کا شکار ہیں اور میرے پیروکاروں کے لیے یونین جیک کے سوا کوئی دوسرا ملک پناہ گاہ نہیں ہو سکتا۔" (17)

"مجھے یقین ہے کہ برطانوی حکومت کے لیے میری خدمات رائیگاں نہیں جائیں گی جبکہ معمولی اور حقیر خدمات انجام دینے والوں کو بھی انعامات سے نوازنے میں بخل سے کام نہیں لیا گیا تو جو خدمات میں نے انجام دی ہیں اور جن سے پوری دنیا واقف ہے، جن کے ٹھوس ثبوت میرے پاس برطانوی حکام کے خطوط کی شکل میں موجود ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ضائع ہونے دیا جائے گا"۔ (18)

ہمارے قائد اور آل انڈیا مسلم لیگ کے پہلے صدر آغا خاں کو برطانوی حکومت کی طرف سے ہز ہائی نیس اور دوسرے خطابات نیز سربراہ مملکت کا پروٹوکول مسلمانوں کی یا اسلام کی کسی خدمت کے صلے میں عطا نہیں ہوئے۔ یہ صرف اور صرف برطانوی حکومت کی خدمت کے صلہ میں عطا کیے گئے تھے، لہٰذا کوئی مسلمان بقائمی ہوش و حواس یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ ہز ہائی نیس اینڈ کمپنی نے جداگانہ طرز انتخاب کا مطالبہ مسلمانوں کے مفاد میں پیش کیا تھا۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ برصغیر میں برطانوی حکومت کا جواز اور طوالت کا انحصار اس ملک کی آبادی کے باہمی لڑائی جھگڑے پر تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک اعلیٰ برطانوی عہدے دار اور آغا خاں کے دوست لارڈ لمنگٹن نے ایک دوسرے برطانوی عہدے دار جان مورلے کو 1906ء میں لکھا:

"ہندستان میں ہمارے اقتدار میں رہنے کی گارنٹی اتنی ہی مضبوط ہے جتنا یہاں ذات پات کا نظام ہے اور مختلف قومیتوں کے متضاد رجحان اور عقائد اور ایک مقامی کا دوسرے پر عدم اعتماد اور بے اعتمادی ہی ہماری اصل گارنٹی ہے"۔ (19)

ہمارے قائد اور مسلم لیگ کے سب سے پہلے صدر ہز ہائی نیس آغا خاں اس بات کے لیے کس قدر فکر مند رہتے تھے کہ برصغیر میں برطانوی اقتدار کسی طرح کمزور نہ ہو۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی انتہائی خواہش اور پوری کوشش تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں

کبھی اتحاد اور تعاون نہ ہو کیونکہ اس سے برطانوی اقتدار کے کمزور ہو جانے کا خدشہ تھا۔ ہز ہائی نیس آغا خاں مخلوط طرز انتخاب کے خلاف اور جداگانہ طرز انتخاب کے خواہش مند کیوں تھے۔ اس کا اندازہ ان کی سوانح عمری کے درج ذیل اقتباس سے ہو جاتا ہے۔

"جب جان مورلے نے دسمبر 1908ء کو دارالامرا میں اپنی ان تجاویز کا اعلان کیا جن کے مطابق کونسل کے لیے انتخابات کا اصول تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس کے لیے انتخاب مخلوط طریق انتخاب اور متناسب نمائندگی کی بنیاد پر کرائے جانے تھے۔ ان تجاویز کو برطانیہ اور ہندستان میں مقیم حکومت کے اہل کاروں کی آشیر باد حاصل تھی اور مورلے کو پورا یقین تھا کہ یہ کسی قسم کی تنقید کی زد میں نہیں آئیں گی، لیکن آغا خاں اور امیر علی جیک پاٹ کی آس لگائے جداگانہ انتخاب کا ہتھیار استعمال کرنے کو تیار بیٹھے تھے۔ ان کا تعلقات عامہ کا شعبہ اتنا مضبوط تھا کہ اخبار "دی ٹائمز"، ٹوری پارٹی کے ارکان پارلیمنٹ اور اینگلو انڈین پریس نے فوراً ہی مورلے کی تجاویز پر حملے شروع کر دیے۔ آغا خاں اس میدان کا پرانا اور نہایت ہوشیار کھلاڑی تھا۔ پریس یا پارلیمنٹ کے ممبروں سے ملاقات میں وہ ان پر زور دیتا کہ مسلمان (بزعم خود مسلمان، حالانکہ آغا خاں اور جسٹس امیر علی دونوں رافضی تھے۔ ناقل) تو اصل میں ان کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مل جل کر رہنا غیر ممکن نہیں۔ یہ کہ اسلام اور ہندو ازم میں مفاہمت بھی خلاف توقع بات نہیں ہے، لیکن اس صورت میں راج (برطانوی راج) کا کیا بنے گا؟ لہٰذا جب مسلمانوں کے لیے الگ سلوک کرنے کی ضرورت پر زور دیا جاتا ہے تو اصل میں یہ برطانوی راج کے تسلسل کی یقین دہانی کی کوشش ہوتی ہے"۔ (20)

کیا اب بھی بلی تھیلے سے باہر نہیں آئی۔ ہز ہائی نیس آغا خاں کے مذکورہ بالا طرز عمل اور ہز ہائی نیس کے اس دوست لارڈ لمنگٹن کے خط کے مذکورہ بالا مندرجات سے یہ نتیجہ کیوں نہ نکالا جائے کہ جداگانہ طرز انتخاب کا مطالبہ کرنے کے لیے ہز ہائی نیس کی ڈیوٹی برطانوی حکومت کی طرف سے ہی لگائی گئی تھی اور اس مطالبے کو اسی لیے بلا پس و پیش برطانوی حکومت نے تسلیم کر لیا تھا اور 1916ء میں کانگریس نے بھی قبول کر لیا کیونکہ یہ برصغیر کی غیر مسلم اکثریت کے مفاد میں تھا نہ کہ

مسلم اقلیت کے مفاد میں۔ ہز ہائی نیس جداگانہ طرزِ انتخاب کے لیے تگ ودو اور مسلم لیگ کی تنظیم (جس کا وہ پہلا صدر تھا) کے لیے کاوش کر رہا تھا حالانکہ اپنے عقائد کی رو سے نہ تو وہ مسلمان تھا اور نہ ہی آغا خانیوں نے کبھی خود کو مسلمان سمجھا ہے اور نہ کبھی تاریخ میں انھوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ضائع کیا ہے۔

مخلوط یا جداگانہ انتخاب سے اسلام کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ جو منتخب یا غیر منتخب ادارہ نہ تو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کرتا ہو اور نہ ہی اس کی نازل کردہ کتاب اور اس کے رسول مقبول ﷺ کی سنت کو ماخذِ قانون کے طور پر قبول کرتا ہو اس کے ارکان کے انتخاب اور طرزِ انتخاب سے اسلام کا نہ تو کوئی تعلق ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس سے اسلام کا مفاد وابستہ ہو سکتا ہے۔ تاریخی ریکارڈ کے مطابق جداگانہ انتخاب کے حصول کے لیے مسلمانوں نے کبھی کوئی تحریک نہیں چلائی۔ کبھی اس مقصد کے لیے نہ کوئی جلسہ کیا اور نہ ہی جمعہ کے کسی اجتماع میں کوئی قرارداد پاس کی۔ روافض نے آغا خاں کی قیادت میں جداگانہ طرزِ انتخاب کے لیے تگ و دو برطانوی حکومت کے چند اعلیٰ افسران کے ایما پر کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برصغیر کے مسلمانوں نے غیر مسلم ہم وطنوں کو داعیِ اعظم نبی اکرم ﷺ کی اُمتِ دعوت سمجھنے اور خود نبی اکرم ﷺ کے سفیر کا کردار ادا کرنے کی بجائے انھیں اپنا دشمن سمجھنا شروع کر دیا۔ اس طرح ان روافض نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ اگر ایک طرف برصغیر کے مسلمانوں نے غیر مسلموں تک وہ پیغام پہنچانے کو فراموش کر دیا جو ان کے لیے فرضِ عین تھا اور ہے اور جس کے لیے امتِ مسلمہ کی تاسیس کی گئی تھی تو دوسری طرف غیر مسلموں بالخصوص ہندوؤں نے بھی ردِعمل کے طور پر اسلام کو از خود سمجھنے کے معاملے میں اپنے دل و دماغ پر قفل چڑھا لیا۔ اس طرح روافض نے وہ مقصد حاصل کر لیا جو برطانوی حکومت نے آغا خاں کے سپرد کیا تھا۔ مخلوط انتخاب کی صورت میں بھائی چارے کی وہ فضا یقیناً برقرار رہتی جو کئی صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔ علاوہ ازیں غیر مسلم اکثریت الیکشن میں مسلم ووٹوں کی محتاج بھی رہتی اور اس بات کا بھی قوی امکان تھا کہ ایک آدھ صدی میں برصغیر مسلم اکثریت کا ملک بن جاتا۔ اگر اب (2006ء) بھارت کا صدر مسلمان ہے اور وزیرِ اعظم سکھ ہے تو متحدہ ہندستان میں مسلمان وزیرِ اعظم کیوں نہیں ہو سکتا تھا۔ آخر ہماری لیگی قیادت نے 1906ء سے لے کر کم و بیش سو سال کے عرصے میں دینِ اسلام کی کیا خدمت کی ہے جس پر اسے تمغۂ حسنِ کارکردگی عطا کیا جائے۔ تاریخ

شاہد ہے کہ آغا خاں اور اس کی معنوی اولاد (مسٹر جناح اور ان کے رفقا جو بقول خود ان کے "کھوٹے سکے" تھے) نے جو کچھ کیا ہے اس سے مسلمانوں کو اب تک کیا فائدہ حاصل ہوا ہے سوائے اس کے کہ گلبرگ اور ڈیفنس میں پاکستان کی ایک فی صد آبادی کے عشرت کدے آباد ہو گئے ہیں جبکہ پاکستان کی چالیس فیصد سے زیادہ آبادی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہی ہے اور ہر روز کسی نہ کسی کی غربت کی بناء پر خودکشی کی خبر اخبارات میں چھپی ہوتی ہے۔ البتہ روافض نے ایک ایسا ملک ضرور فراہم کر دیا ہے جو یہود و نصاریٰ کے ایجنٹ کا کردار ادا کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہا ہے، یہاں تک کہ برادر اسلامی ملک افغانستان کو تباہ و برباد کرنے کے لیے یہود و نصاریٰ کو اپنے پورے وسائل فراہم کر چکا ہے۔ اس سے از خود یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ جس چیز میں اسلام کا کوئی مفاد نہ ہو، اس میں مسلمانوں کے لیے بھی کوئی خیر نہیں ہو سکتی۔ کوئی بھی شخص گزشتہ ایک صدی کی بیلنس شیٹ بنا کر معلوم کر سکتا ہے کہ مسلمانوں نے روافض کی قیادت قبول کر کے برصغیر میں کیا کھویا ہے اور کیا پایا ہے۔ چونکہ اس تقسیم کی تجویز آغا خاں اور اس کے ہم مشرب گروپ نے (جو سب انگریز کے پٹھو تھے) برطانوی حکومت کے اعلیٰ عہدہ داران کے ایما پر پیش کی تھی جو سب کے سب عیسائی تھے۔ (یہود اور نصاریٰ از روئے قرآن ایک دوسرے کے دوست اور مسلمانوں کے دشمن ہیں) تو یہ سب اسلام یا مسلمانوں کے مفاد میں نہیں کیا گیا تھا، بلکہ برطانوی مفاد میں کیا گیا تھا، اس لیے پاکستان اول روز سے ہی یہود و نصاریٰ کے کیمپ میں شامل ہے۔ پہلے اگر یہ بات ڈھکی چھپی تھی تو اب کھل گئی ہے۔ ہم مکمل طور پر امریکن اور بالواسطہ طور پر یہودیوں کے ایجنٹ بن گئے ہیں یہ سب ہمارے ہاتھوں کی کمائی ہے۔ خود کردہ را علاجے نیست۔ میرا دانش ور حضرات سے یہ سوال ہے کہ کیا ہم اس صورت حال سے کسی طرح نکل سکتے ہیں یا ہمیشہ امریکا کی پاپوش بوسی ہی کرتے رہیں گے۔



حوالہ جات

(1) پاکستان. قیام اور ابتدائی حالات/سری پرکاش/ص:56۔

(2) The Great Divide by H.V.Hudson page14

(3) ہمارے اسماعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام/ ص:342-341۔

(4) ایضاً/ص:366۔

(5) ایضاً/ص:104۔

(6) ایضاً/ص:215۔

(7) ایضاً/ص:331۔

(8) ایضاً/ص:213۔

(9) ایضاً/ص:371

(10) ایضاً/ص:243۔

(11) ایضاً/ص:194۔

(12) آغا خاں/ مہیر بوس،مترجمہ:حمید اختر/ص:151-150۔

(13) ایضاً/ص:154۔

(14) ایضاً/ص:157۔

(15) صلاح الدین/عبدالسلام خورشید۔

(16) آغا خاں/مہیر بوس/ص:145۔

(17) ایضاً/ص:167۔

(18) ایضاً/ص:74۔

(19) ایضاً/ص:138۔

(20) ایضاً/ص:149-148۔

3

جناب پروفیسر محمد مظفر مرزا کے تین مضامین (i) ''دلدوز داستان پاکستان'' مطبوعہ: نوائے وقت 23 مئی 2006ء، (ii) "Blood Brothers" مطبوعہ ''دی نیشن'' 5 جولائی 2006 اور (iii) ''بلڈ برادرز کون ہیں'' مطبوعہ نوائے وقت 6 جولائی 2006ء میرے سامنے ہیں۔ ان تینوں مضامین میں نفس مضمون تقریباً ایک ہی ہے۔ یہ نوحے ہیں جناح صاحب کی ناکامی کے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پروفیسر صاحب موصوف نے کھلے لفظوں میں اس ناکامی کا اعتراف نہیں کیا۔ میں ان مضامین کے مندرجات کے بارے میں مختصراً عرض کروں گا۔ 23 مئی کے مضمون میں موصوف فرماتے ہیں:

> ''بُت پرستی اور اوہام پرستی کی علمبردار بھارتی قوم نے اپنے سائنسی ایٹمی ہیرو کو صدر بنادیا۔ ہم نے اپنے سائنسی ایٹمی ہیرو کو تمام کائنات میں عبرت کا نشان بنادیا۔''

موصوف نے بجا فرمایا ہے۔ بھارت نے اپنے ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر عبدالکلام سے اپنی روایات کے مطابق سلوک کیا اور ہم نے اپنے ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں سے اپنی روایات کے مطابق سلوک کیا۔ ہم ابتدا سے ہی ایسا کرتے آئے ہیں۔ ہم نے تقسیم برصغیر کے لیے ووٹ تو برصغیر کے تمام مسلمانوں سے لیے، لیکن تقسیم کے بعد بھارت کے مسلمانوں کو ہم نے وہاں کی غیر مسلم مشرک اکثریت کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا کبھی پلٹ کر نہ پوچھا کہ ان کا کیا حال ہے۔ یہی کچھ ہم نے کشمیر کے مسلمانوں کے ساتھ کیا ہے اور یہی سلوک ہم مشرقی پاکستان کے غیر بنگالی مسلمانوں کے ساتھ کررہے ہیں۔ یہ لوگ جو 1972ء سے کیمپوں میں پڑے جانوروں کی سی

زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اسی مضمون میں موصوف فرماتے ہیں:

''ہمارا عالم یہ ہے کہ ہم اپنے قائد محمد علی جناح کو سیکولر کہتے ہیں، انگریز کا ایجنٹ تصور کرتے ہیں اور لاکھوں مسلمانوں کے قتل کا مجرم کہتے نہیں تھکتے''

میری گزارش یہ ہے کہ اگر لوگ جناح صاحب کو سیکولر کہتے ہیں تو اس میں غلط کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر میں شراب خود بھی نوش کروں اور مہمانوں کو بھی پیش کروں۔ اگر میں سؤر کے گوشت کے سینڈوچ رغبت سے کھاؤں۔ اگر میں نماز بھی صرف عید کی پڑھوں، وہ بھی اخبارات میں تصویر کی اشاعت کے لیے۔ اگر میں زکوٰۃ ادا نہ کروں جبکہ میرے پاس مال بھی جمع ہو۔ اگر میں استطاعت کے باوجود حج یا عمرہ ادا نہ کروں۔ جبکہ یورپ کے کئی چکر لگالوں، لیکن زبان سے ہر وقت مجاہدِ اسلام ہونے کا دعویٰ کرتا رہوں تو لوگ مجھے کیا کہیں گے؟ لوگ مجھے منافقِ اعظم کہیں گے اور بہت رعایت کریں گے تو سیکولر کہہ دیں گے۔ جو لوگ جناح صاحب کو سیکولر کہتے ہیں وہ بھی ان کے ساتھ رعایت ہی کرتے ہیں۔ جب یہ تسلیم ہے کہ جناح صاحب شراب خود بھی پیتے تھے اور مہمانوں کو بھی پیش کرتے تھے۔ جب یہ تسلیم ہے کہ جناح صاحب نماز بھی صرف عید کی پڑھتے تھے، وہ بھی تصویر بنوانے کے لیے۔ اس سے بھی کسی کو انکار نہ ہوگا کہ جناح صاحب نے زندگی میں نہ حج کیا نہ عمرہ جبکہ یورپ کے کئی چکر لگائے۔ اس سے بھی کسی کو انکار نہ ہوگا کہ روافض زکوٰۃ سے انکاری ہیں اور جناح صاحب بھی روافض میں سے تھے، اس لیے انھوں نے کبھی زکوٰۃ بھی ادا نہیں کی ہوگی۔ اب صرف ایک حرام باقی ہے جس کا ثبوت پیش خدمت ہے:

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ حکومت پاکستان نے جناح صاحب کی بائیوگرافی لکھنے کے لیے مسٹر ہیکٹر بولیتھو (Hector Bolitho) کی خدمات بڑے معاوضہ پر حاصل کی تھیں۔ اس لیے ہیکٹر بولیتھو کو جناح صاحب کا آفیشل بائیوگرافر کہا جاتا ہے۔ اس شخص نے جناح کری ایٹر آف پاکستان (Jinnah: Creator of Pakistan) کے عنوان سے جو کتاب لکھی، اُس پر نظر ثانی کے لیے حکومت پاکستان نے ایک کمیٹی مقرر کی، جس نے اس کتاب کو کانٹ چھانٹ کے بعد 1984ء میں شایع کیا تھا۔ دوسری کتاب مسٹر سٹینلے والپرٹ (Stanely Wolpert) نے جناح آف پاکستان (Jinnah of Pakistan) کے نام سے لکھی اور شایع ہوئی۔ بعد میں اسے آکسفورڈ پریس، کراچی نے حکومت پاکستان کی خصوصی اجازت سے

پاکستان میں شایع کیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد حکومت نے ہی ملک میں اس کتاب کی اشاعت و تقسیم پر پابندی لگادی تھی۔ اتفاق سے مجھے اس کی فوٹو کاپی مل گئی۔ اس میں والپرٹ نے مسٹر چھاگلا (جناح صاحب کے معاون وکیل) کی کتاب Roses In December (صفحہ 119-118) کے حوالے سے، جب جناح صاحب بمبئی میں 1923ء کی انتخابی مہم چلا رہے تھے، لکھا ہے:

"Rattie tried to see more of him after she returned from abroad, but nothing she attempted ever seemed to work. During that election campaign, for example, one afternoon as Jinnah and Chagla were going out for lunch " Mrs. Jinnah drove up to the Town Hall in Jinnah's luxurious limousine, stepped out with a tiffin basket, and coming up the steps ... said"J" (that is how she called him) guess what I have brought for you for lunch. Jinnah answered" How should I know" and she replied" I have brought for you some lovely HAM sandwiches". Jinnah, startled, exclaimed" My God! what have you done? Do you want me to lose my election? Do you realize I am standing from a Muslim separate electorate seat, and if my voters were to learn that I am going to eat HAM sandwiches for lunch, do you think I have a ghost of a chance of being elected"? At this Mrs. Jinnah's face fell, she quickly took back the tiffin basket,

ran down the steps and drove away ... We decided to go to Cornaliga's, which was a very well known restaurant in Bombay ... Jinnah ordered two cups of cofee, a plate of pastry and a plate of pork sausgages ... As we were drinking our cofee and enjoying our sausages, there came an old bearded muslim with a young boy of ten years of age, probably his grandson. They came and sat down near Jinnah. It was obvious that they had been directed from Town Hall ... I then saw boy's hand reaching out slowly but irresistibly towards the plate of pork sausage. After some hesitation, he picked up one, put it in his mouth, munched it and seemed to enjoy it tremendously. I watched this uneasily ... After some time they left and Jinnah turned to me and said angrily. Chagla, you should be ashamed of yourself." I said "what did I do?" Jinnah said " how dare you allow the young boy eat sausage?" I said " look Jinnah, I had to use all my mental faculties at top speed to come to a quick decision. The question was: should I let Jinnah lose his election or should I let the boy go to eternal damnation? And I decided in your

favour". (1)

ترجمہ: ''بیرون ملک سے واپسی کے بعد رتی نے ان سے ملاقاتیں بڑھانے کی کوششیں کیں لیکن ان کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ انتخابی مہم کے دوران ایک سہ پہر جب جناح اور ایم.سی. چھاگلا دوپہر کے کھانے کے لیے نکل رہے تھے بیگم جناح (رتی) ان کی قیمتی لیموزین گاڑی میں ٹاؤن ہال پہنچی، کھانے کی ٹوکری ہاتھ میں لیے گاڑی سے اتریں اور کہا: ''جے'' (وہ جناح کو ''جے'' کہہ کر پکارتی تھی) معلوم ہے میں تمھارے لیے کیا لائی ہوں؟ جناح نے کہا: مجھے کیا معلوم؟ رتی نے کہا: میں تمھارے لیے سؤر کے گوشت کے مزیدار سینڈوچ لائی ہوں۔ جناح پریشان ہوکر کہنے لگے: خدا کی پناہ، یہ تم کیا کر رہی ہو؟ کیا تم مجھے الیکشن ہروانا چاہتی ہو؟ تمھیں معلوم نہیں کہ میں مسلمانوں کی جداگانہ نشست پر کھڑا ہوں اور اگر ووٹروں کو معلوم ہو گیا کہ میں دوپہر کے کھانے میں سؤر کے گوشت کے سینڈوچ کھانے والا ہوں تو کیا میری کامیابی کا کوئی امکان باقی رہ جائے گا؟ یہ سب سن کر بیگم جناح کا منہ لٹک گیا۔ انھوں نے فوراً کھانے کی ٹوکری اٹھائی اور تیزی سے سیڑھیاں اُتر کر گاڑی میں بیٹھیں اور روانہ ہو گئیں...... ہم نے Cornaligas جانے کا فیصلہ کیا جو بمبئی کا ایک مشہور ریستوران تھا۔ جناح نے دو کپ کافی ایک پلیٹ پیسٹری اور ایک پلیٹ سؤر کے گوشت کے سموسوں کا آرڈر دیا۔ ہم اپنی کافی اور سموسوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ اسی دوران ایک ڈاڑھی والا بوڑھا مسلمان اور اس کے ساتھ ایک دس سالہ بچہ جو غالباً اس کا پوتا ہوگا، اندر داخل ہوئے اور آ کر جناح کے قریب بیٹھ گئے۔ ظاہر ہے کہ انھیں ٹاؤن ہال سے یہاں کے بارے میں معلوم ہوا ہوگا...... میں نے دیکھا کہ بچے کا ہاتھ سموسوں کی پلیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ تھوڑی سی جھجک کے بعد اس نے ایک سموسہ اٹھا لیا، منہ میں رکھا اور کھانے لگا اور بظاہر اسے پسند بھی آیا۔ میں اس صورت حال کو گھبراہٹ سے دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ لوگ اٹھ کر چلے گئے۔ جناح میری طرف مڑے اور غصے سے کہنے لگے: چھاگلا! تمھیں شرم آنی چاہیے۔ میں نے پوچھا: میں نے کیا کیا ہے؟۔ جناح کہنے لگے: تم نے لڑکے کو سموسہ کیوں کھانے دیا؟ میں

نے کہا: دیکھو جناح! مجھے اپنی تمام ذہنی صلاحیتوں کو پوری رفتار سے استعمال میں لا کر کسی نتیجہ پر پہنچنا تھا۔ سوال یہ تھا کہ میں جناح کو الیکشن جیتنے دوں یا اس لڑکے کو دوزخ کی آگ میں جلنے دوں! اور میں نے فیصلہ تمھارے حق میں کیا۔"

یہ تھے جناح صاحب اپنی نجی زندگی میں۔ وہ لڑکی جو جناح صاحب سے عمر میں ستائیس سال چھوٹی تھی اور جسے جناح صاحب نے اس وقت ورغلا کر اپنی محبت میں گرفتار کر لیا تھا۔ جب اس کی عمر صرف پندرہ سولہ سال تھی۔ وہ بھی کیا سوچتی ہوگی کہ اس کے شوہر کا نجی زندگی میں تو کوئی مذہب ہی نہیں جبکہ سیاسی زندگی میں وہ مجاہد اسلام ہونے کا مدعی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً پانچ سال کی رفاقت کے بعد ہی اس نے جناح صاحب سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور اس صدمے پر قابو پانے کے لیے اس نے نشہ کرنا شروع کر دیا تھا جو اسے جوانی میں ہی اس دنیا سے لے گیا۔
ملاحظہ ہو:

"By the mid 1920`s,Jinnah seems to have been interested in little outside his work.Ruttie took to spending much of her time with one of her husband`s political supporters kanji Dwarkadas. Still in her twenties, and unable to gain her husband`s attention she tried to communicate with spirits,and may have developed a drug dependency ... By late 1920`s he and Ruttie had almost estranged and were spending little time with each other.He was ageing rapidly,and suffered from broncial infections.Ruttie moved out of their house and rented a suite at the luxurious Taj Mahal Hotel in Bombay.Then she sailed to Paris with her mother,where she

became seriously ill and returned to India virtually bedridden. Jinnah spent February 1929, the month between his rejection by Congress and his rejection by the Muslim League, in a flat in New Delhi.On 20 February, on his young wife`s twentyninth birthday, he received a telephone call saying that she had died." (2)

ترجمہ: ''بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے وسط تک صورتِ حال یہ ہو چکی تھی کہ جناح کو اپنے کام کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ رتی کا زیادہ تر وقت اپنے شوہر کے ایک سیاسی مددگار کانجی دوارکا داس کے ساتھ گزرنے لگا۔ رتی ابھی اپنی عمر کی تیسری دہائی ہی میں تھی اور اپنے شوہر کی عدم توجہی کے سبب اس نے ''روحوں کے ساتھ رابطے'' کی کوشش شروع کر دی اور شاید منشیات کی عادت بھی ڈال لی...... دوسری دہائی کے آخر تک رتی اور جناح کے تعلقات میں خاصا کھچاؤ پیدا ہو چکا تھا اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ بہت کم وقت رہتے تھے۔ وہ (یعنی جناح) تیزی سے بوڑھا ہو رہا تھا اور پھیپھڑوں کی سوزش کا مریض تھا۔ رتی نے گھر چھوڑ دیا اور بمبئی کے مہنگے ہوٹل تاج محل میں ایک سویٹ (Suite) لے کر رہنا شروع کر دیا۔ پھر وہ اپنی والدہ کو ساتھ لے کر پیرس چلی گئی لیکن وہاں وہ شدید بیمار ہو گئی اور ہندستان اس حالت میں واپس آئی کہ تقریباً بستر سے لگ چکی تھی۔ فروری 1929ء کا مہینہ جس میں جناح کو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے رد کر دیا تھا، جناح نے نئی دہلی کے ایک فلیٹ میں گزارا۔ یہیں 20رفروری کو انھیں ٹیلی فون آیا اور اطلاع ملی کہ ان کی جوان بیوی رتی اپنی انتیسویں (29) سالگرہ کے دن وفات پا گئی ہیں۔"

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ جناح صاحب سؤر کے گوشت سے بنے لذیذ سینڈوچ (Lovely Ham Sandwiches) بہت رغبت سے تناول فرماتے تھے اور یہ ڈش ان کے گھر اکثر تیار کی جاتی تھی۔ البتہ جناح صاحب اس بات کا اہتمام ضرور کرتے تھے کہ ان کے

حلقہ انتخاب کے مسلمان اس بات سے بے خبر ہیں۔

اگر مسٹر چھاگلا کو معلوم تھا کہ جناح صاحب خورد ونوش میں حرام وحلال کی تمیز روا نہیں رکھتے تو مسلم لیگ کی طبقہ اولیٰ کی قیادت میں ان کے ساتھیوں کو بھی ضرور معلوم ہوگا، لیکن انھوں نے اس سے صرفِ نظر کیا تو کیوں؟ اس کی ایک ہی وجہ ہوسکتی ہے اور وہ وجہ یہی ہے کہ وہ تقریباً سب کے سب خود بھی خورد ونوش میں حرام وحلال کی تمیز سے بے نیاز ہوں گے۔

اس کا مطلب واضح ہے کہ اب ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، جس کے لیے اہلِ پاکستان اکثر نوحہ کناں رہتے ہیں، ٹھیک ہی ہو رہا ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے جب ایک گمراہ کو رہنما بنالیا تھا تو پھر ان کا یہی حال ہونا تھا جو ہو رہا ہے۔ جناح صاحب نے اس لڑکی کے ساتھ، جس نے جوش جوانی میں اپنا آبائی مذہب اور اپنے ماں باپ اور عزیز واقارب تک چھوڑے، جو سلوک کیا ویسا ہی سلوک جناح صاحب نے برصغیر کے مسلمانوں کے ساتھ کیا۔ پورے برصغیر کے مسلمانوں کا یہ حال ہوگیا تھا کہ ''وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ'' اور ان کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

اب رہ گئی یہ بات کہ ''لوگ جناح صاحب کو انگریز کا ایجنٹ تصور کرتے ہیں'' عرض ہے کہ اگر لوگ ایسا تصور کرتے ہیں اور کہتے ہیں تو اس میں غلط کیا ہے؟ بلاشبہ وہ برصغیر میں انگریز سامراج کے آخری سب سے بڑے ایجنٹ تھے جنھیں انگریز نے برصغیر کی تقسیم کا مشن سونپا تھا۔ انگریز برصغیر کو اپنے خاص مقاصد کے لیے تقسیم کرنا چاہتا تھا۔ جناح صاحب کی انگریز نوازی پر میں اس کتاب میں کافی لکھ چکا ہوں، لیکن یہاں تقسیم ہند و قیامِ پاکستان کے حوالے سے تین نامور پاکستانی، بلکہ مسلم لیگی شخصیات کے اعترافِ حقیقت پر مبنی خیالات پیش کرتا ہوں، جن سے تقسیم ہند، قیامِ پاکستان اور جناح صاحب کی اصلیت بالکل واضح ہوجائے گی اور یہ بات بھی اظہر من الشمس ہوجائے گی کہ انگریز کن مقاصد کے لیے ہندستان کی تقسیم اور پاکستان کا قیام چاہتا تھا۔

پاکستان مسلم لیگ فنکشنل کے سربراہ ممتاز سیاست دان جناب پیر پگاڑا نے روزنامہ جنگ کے پینل [جس میں جناب سہیل وڑائچ، جناب زاہد حسین اور جناب عارف الحق عارف شامل تھے] کو انٹرویو دیتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا وہ مع سوالات درج ذیل ہیں:

''س: پیر صاحب! آپ متحدہ مسلم لیگ کے صدر رہے ہیں، اس حوالے سے گفتگو کا آغاز تحریک پاکستان سے کرتے ہیں؟

ج: اس حوالے سے پہلے یہ واقعہ سن لیں پاکستان بننے سے پہلے تین جگہ پر ہندو مسلم فسادات ہوئے ان میں سے ایک علی گڑھ میں ہوا۔ یہ 1945ء کا واقعہ ہے کہ میں علی گڑھ کی نئی بستی میں بیٹھا ہوا تھا، اتنے میں علم ہوا کہ ایک سندھی قتل ہوگیا، ہم وہاں گئے کہ ہم سندھی کی لاش کو سنبھالیں۔ ہم نے پوچھا کہ کیا ہوا تو پتا چلا کہ یہاں پتھراؤ ہوا ہے۔ تھوڑی دیر میں ڈی سی صاحب اور ایس پی صاحب آگئے۔ یہ ایس۔ پی ٹیکسن صاحب تھے۔ ان کے بارے میں کسی نے بتایا کہ یہ وہ ایس پی ہیں جو انگلینڈ سے اپنے دوست کی بیوی ورغلا کر لائے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ اچھے خون والا بندہ ایسا کام نہیں کرسکتا۔ تو خیر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایس پی صاحب نے خود ہی توڑ پھوڑ شروع کردی اور اسی دوران بازار میں آگ لگ گئی اور فساد شروع ہوگیا تو اس واقعہ کا تو میں خود عینی شاہد ہوں کہ کس طرح ایک انگریز نے ایک سندھی کی بازار میں ذاتی لڑائی کو ہندو مسلم فساد بنا دیا۔ میں اس واقعے کا عینی شاہد ہوں اور یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ فساد پاکستان کے لیے نہیں تھا۔ یہ تو کروایا گیا تھا۔

س: پیر صاحب! اس واقعہ سے تو یوں لگتا ہے کہ جیسے سب کچھ انگریزوں نے کیا؟

ج: دیکھو بھئی اگر تو لوگوں کو خوش کرنا ہے تو اور بات ہے اور اگر سچ سننا ہے تو میری معلومات یہی ہیں کہ برطانوی حکومت ہندستان میں ایک مسلم اسٹیٹ بنانے کا فیصلہ بہت پہلے کرچکی تھی۔ یہ فیصلہ قراردادِ پاکستان منظور ہونے سے بہت پہلے ہوچکا تھا۔ ولی خان نے جب اس بارے میں بیان دیا تو جنرل ضیاء الحق نے انھیں اس معاملے پر گفتگو کی دعوت دی۔ ولی خان نے جواباً ایک فوٹو سٹیٹ کاپی انھیں بھیجی جس میں واضح طور پر یہ لکھا تھا کہ مسلم اسٹیٹ بنانے کا فیصلہ 1940ء سے پہلے ہوچکا تھا۔ اس کے بعد ضیاء الحق خاموش ہوگئے۔ میں نے لندن جا کر تو تحقیق نہیں کی، لیکن میری معلومات یہی ہیں۔

س: پیر صاحب! کیا آپ کو احساس ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں یعنی پاکستان

انگریزوں نے بنایا تھا؟

ج: دیکھو بھئی سچ سننا ہے تو وہ تو یہی ہے ورنہ میں بھی آپ کو کوئی کہانی سنا دیتا ہوں۔

س: اس بات کا کوئی ثبوت ہے؟

ج: دیکھو بھئی برطانوی وزیر اعظم چرچل کی پنجاب کے اس وقت کے وزیر اعظم سر سکندر حیات سے قاہرہ میں ملاقات ہوئی تو چرچل نے کہا کہ مسلمانوں نے سلطنت برطانیہ کے لیے جو قربانیاں دی ہیں ان کی بلڈمنی کے طور پر انھیں الگ ریاست دی جائے گی۔ میں نے یہ بات سر سکندر حیات کے بیٹے سردار شوکت حیات سے پوچھی تو انھوں نے تصدیق کی کہ چرچل نے سردار سکندر حیات سے یہ بات کی تھی۔

س: پیر صاحب! آپ مسلم لیگ کے صدر رہے ہیں، آپ بھی وہ بات کہہ رہے ہیں جو قوم پرست کہتے ہیں۔

ج: دیکھو بھئی سچ سے تکلیف تو ہوتی ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ جس طرح دیگر بااثر لوگوں کو انگریز نے مسلم لیگ میں بھیجا تھا۔ علامہ اقبالؒ بھی اسی طرح مسلم لیگ میں آئے تھے۔ آپ یہ بتائیں کہ علامہ اقبالؒ کس کے کہنے پر قائداعظمؒ کے پاس گئے تھے۔ دیکھو بھئی جتنے بھی بااثر لوگ تھے، وہ انگریزوں کے کہنے پر مسلم لیگ میں آئے تھے۔

س: تو کیا آپ دو قومی نظریے سے انکار کرتے ہیں۔

ج: دیکھو بھئی ایک ہندو قوم تھی جو گئو ماتا کو پوجتی تھی دوسری قوم مسلمان تھی جو گئو ماتا کو کھاتی تھی تو دونوں قومیں تو الگ تھیں، البتہ پاکستان اسلام کے نام پر نہیں لبرل معاشرے کے قیام کے لیے بنا۔

س: تو کیا پاکستان بنانے میں مسلم لیگ کا کردار نہیں تھا؟

ج: مسلم لیگ بااثر لوگوں کی جماعت تھی۔ یہ عوامی جماعت نہیں تھی کہ جس کے ووٹر ہوں، بااثر لوگوں کے ماننے والے اسے ووٹ دیتے تھے۔ مسلم لیگ اس وقت سے لے کر آج تک جماعت نہیں بن سکی، نہ یہ کبھی جماعت بن سکے گی۔ ملک میں اقتدار انگریز کے وفاداروں کے ہاتھ میں رہا، وہی پالیسی آج تک چل رہی ہے، کچھ بھی

تبدیل نہیں ہوا۔“(3)

اس انٹرویو کی اشاعت کے بعد جناب پیر پگاڑا پر روزنامہ نوائے وقت نے خوب لے دے کی۔ اسی دوران لاہور کے ایک اخبار نویس نے جب ان سے دریافت کیا کہ وہ اپنے اس بیان پر کیا اب بھی قائم ہیں کہ پاکستان انگریز نے بنایا تھا؟ تو پیر پگاڑا نے اپنے مخصوص انداز میں کہا:

”اور کیا آپ کے باپ نے بنایا تھا؟“

اس رپورٹ کے مطابق انھوں نے یہ بھی کہا:

”پاکستان انگریزوں نے ہی بنایا تھا، قائداعظم تو انگریز کا ایجنٹ تھا، مسلمانوں کا پاکستان کے بنانے میں کوئی کردار نہیں۔“(4)

جناح صاحب کے رفیق خاص جناب سید محسن شاہ مرحوم کے فرزند سابق چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس (ر) جناب نسیم حسن شاہ نے ایوان کارکنانِ تحریک پاکستان لاہور میں تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے بارے میں نہایت جرأت کے ساتھ جن خیالات کا اظہار کیا، وہ روزنامہ انصاف لاہور میں بعنوان ”پاکستان مسلم لیگ نے نہیں بنایا، تقسیمِ ہند انگریز کا پلان تھا“ نمایاں رپورٹ ہوئے۔ ذیل میں مطالعہ فرمائیے:

”لاہور (وقائع نگار خصوصی) سابق چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس ریٹائرڈ نسیم حسن شاہ نے کہا ہے کہ پاکستان مسلم لیگ نے نہیں بنایا تھا، تقسیم ہند انگریز کا پلان تھا، جس پر تمام پارٹیاں متفق ہو گئیں اور پاکستان بن گیا۔ ان خیالات کا اظہار انھوں نے گزشتہ روز ایوانِ کارکنانِ تحریک پاکستان میں منعقدہ ایک تقریب سے خطاب کے دوران کیا۔ ان کے اس متنازعہ بیان پر ان سے وضاحت طلب کرنے کے لیے انھیں سٹیج پر دوبارہ بلایا گیا، لیکن وہ بدستور اپنے بیان پر اڑے رہے، بلکہ وضاحت سے انھوں نے دوبارہ اپنا بیان مزید پیچیدہ کر لیا اور اعادہ کر گئے کہ پاکستان مسلم لیگ نے نہیں بنایا جس پر ایم اے صوفی نے وضاحت کی کہ اس میں کوئی شک نہیں پاکستان مسلم لیگ نے بنایا ہے۔“(5)

جسٹس (ر) شاہ صاحب کے مذکورہ بیان کے ساتھ اسی بیان سے متعلق ایک رپورٹ

چوکٹے میں چھپی تھی، اسے بھی پڑھیے:

''لاہور (وقائع نگار خصوصی) جسٹس (ر) نسیم حسن شاہ کے متنازعہ بیان پر نمائندہ انصاف نے کھڑے ہو کر احتجاج کر کے ان سے سٹیج چھوڑنے سے قبل وضاحت کی اپیل کی، لیکن وہ وضاحت کیے بغیر اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ بعد میں گورنر بلوچستان اور دیگر رہنماؤں نے انھیں وضاحت کرنے پر مجبور کیا، لیکن وہ بیان پر اَڑے رہے اور نمائندہ انصاف سے پوچھنے لگے کہ اب وضاحت ہوگئی؟ جس پر نمائندہ انصاف نے کہا کہ مزید پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے۔ تقریب میں صحافی اور شرکا بھی کھڑے ہوگئے کہ جسٹس (ر) نسیم حسن شاہ کا بیان بدستور متنازعہ ہے۔ تاہم تقریب کے اختتام پر انھیں ہال سے باہر لے جا کر ایک کمرے میں دیگر مقررین نے سمجھایا۔ سرتاج عزیز نے نمائندہ انصاف کو بتایا کہ انھیں سمجھا دیا ہے کہ وہ غیر ذمہ دارانہ بیان نہ دیں۔''(6)

سابق سیکرٹری خارجہ، ممتاز دانش ور اور روز نامہ نوائے وقت اور دی نیشن کے کالم نگار جناب شمشاد احمد خاں نے جناب سہیل وڑائچ سے اپنے ایک انٹرویو (مطبوعہ جنگ) میں تقسیم ہند اور قیامِ پاکستان کے بارے میں بہت چشم کشا گفت گو کی۔ ذیل میں اس انٹرویو کا موضوع سے متعلق حصہ نقل کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''س: پاکستان کی 1947ء سے لے کر 1956ء تک کی جو فارن پالیسی بن رہی تھی، اس حوالے سے جو ڈاکیومنٹس سامنے آئے کہ قائداعظم نے امریکا کو خط لکھا تھا اور پھر امریکا کی طرف سے بطور تحفہ پنکھے آئے تھے، پھر دو بڑے واقعات اور ہوئے جن میں سے ایک لیاقت علی خاں کا دورہ امریکا تھا۔ انھوں نے روس کے دورے کو مسترد کیا تو یہ جو ہماری پالیسی تھی، اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

ج: 1947ء کو ہمیں اچانک آزادی ملی۔ اچانک سے مراد یہ ہے کہ جدوجہد تو چل رہی تھی، لیکن جس عجلت کے ساتھ انگریزوں نے برصغیر چھوڑا، میں سمجھتا ہوں کہ قائداعظمؒ بھی ذہنی طور پر تیار نہیں تھے کہ اتنی بڑی ذمے داری ان پر پڑ جائے۔ شروع ہی سے ملک مسائل میں گھر گیا، یعنی اندرونی تصادم شروع ہوگئے اور حکومت، فوج اور جاگیردارانہ نظام تشکیل پا گیا۔ قائداعظم کی اپنی لیڈرشپ کے خلاف کابینہ میں گڑبڑ

شروع ہوگئی۔ یہ چیزیں تاریخ میں تو درج نہیں لیکن یہ حقائق ہیں، ان کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

س: کابینہ میں قائداعظم کے خلاف کون لوگ باتیں کرتے تھے؟

ج: کسی کا نام تو نہیں لیا جا سکتا، ہم نے تو سنا ہے کہ اس وقت کابینہ کے ارکان قائداعظم پر تنقید کیا کرتے تھے کہ یہ کیا کہ رہے ہیں، کیا کر رہے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی بیماری بھی اتنی بڑھی اور پھر آپ کو بھی ایک واقعہ یاد ہوگا کہ ہم لوگ تو اتنی احسان ناشناس قوم ہیں کہ قائداعظمؒ کے آخری چند گھنٹے کے دوران انھیں کوئی حکومتی مدد تک نہیں دی گئی۔ بس ان کا ایک پرسنل سیکرٹری ان کے پاس تھا، ڈاکٹر بھی موجود نہ تھا۔ میں تو پوری قوم ہی کو ذمے دار ٹھہراؤں گا۔

س: یہ بات کس حد تک درست ہے کہ لیاقت علی خاں اور قائداعظم کے درمیان بھی کشمکش شروع ہو چکی تھی؟

ج: یہ تو میں نہیں جانتا، لیکن جو کتابیں آئی ہیں، ان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کشمکش پیدا ہو چکی تھی۔ قائداعظم تو چلے گئے، لیکن پاکستان میں معیشت کا بحران اسی طرح موجود رہا۔ نئی ریاست کے لیے پیسے ہی نہیں تھے۔ یہ جو ذہنیت آپ دیکھ رہے ہیں، ملکی مسائل کے حل کے لیے ہم ہمیشہ باہر کی طرف دیکھتے ہیں تو اس وقت 1949ء میں، روسی سربراہ اسٹالن کی طرف سے ہمیں پیغام آیا کہ آپ ہماری طرف آیئے۔ لیکن سرد جنگ چونکہ عروج پر تھی، اس لیے ہماری طرف سے تھوڑا محتاط رویہ اپنایا گیا کہ کہیں امریکا ناراض نہ ہو جائے۔ جون یا جولائی 50ء میں لیاقت علی خاں کا دورہ امریکا ہوا۔ ایک دعوت نامے کو ہم نے نظرانداز کر دیا تو لیاقت علی خاں نے صرف اندرونی بحران سے نکلنے کے لیے سوچا کہ امریکا جا کر اپنے مسائل حل کروائے جائیں۔

س: آپ کے خیال میں لیاقت علی خاں کا روس سے پہلے امریکا کا دورہ کرنا غلط تھا؟

ج: میرے خیال میں اگر لیاقت علی خاں خود فیصلہ کرتے تو درست کرتے، لیکن اصل میں پرانے سامراجی دور کے سول اور ملٹری ذہن کے لوگ موجود تھے، ان کی سوچ حاوی رہی۔ لیاقت علی خاں اس وقت ملکی نظام کے حوالے سے بہت مصروف تھے، وہ

پاکستان کے مستقبل کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ جب کہ فارن پالیسی کی تشکیل سامراجی دور کے لوگوں کے ذمے تھی۔

س: کئی لوگوں کا خیال ہے کہ پاکستان نے امریکا کے ساتھ اتحادی بننے کا جو فیصلہ کیا، وہ درست تھا، جب کہ بھارت کا روس کے ساتھ جانے کا فیصلہ غلط تھا، بعد میں امریکا زیادہ ترقی یافتہ ملک بنا؟

ج: میرا خیال ہے کہ اس بات کا فیصلہ میں اور آپ نہیں کر سکتے، اس کا فیصلہ تاریخ ہی کرے گی۔

س: تو آپ کے خیال میں بہترین راستہ غیر جانب داری ہوتا، بھارت کی طرح؟

ج: بالکل، بھارت کی طرح غیر جانب دار ہی رہنا پاکستان کے لیے بہتر ہوتا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں جمہوریت کا راستہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔ میں سارے مسائل اور بحران کی ذمے داری اس سوچ پر ڈالتا ہوں جس کی وجہ سے ہم نے جمہوریت کا راستہ چھوڑ کر آمریت کی راہ اپنائی۔ بدقسمتی سے ہم نے تو آمریت بھی سویلین آمریت سے شروع کی۔ غلام محمد ملک کی آمریت سے یہ سفر شروع ہوا۔ سویلین غلام محمد ملک نے پہلا تختہ الٹا، اسی نے پارلیمنٹ کو توڑا۔ قائداعظم کی زندگی تو آئینی جدوجہد سے عبارت تھی اور وہ اسی کے ذریعے آگے چلنا چاہتے تھے اور یہی باتیں انھوں نے مارچ 1948ء میں فوج سے بھی کہیں کہ آپ کی ذمے داری ہے کہ اپنے حلف کی پاس داری کریں۔

س: جنرل ضیاء کے دور میں پاکستان کی افغان پالیسی درست تھی یا غلط؟

ج: اس وقت ہماری سوچ یہی تھی کہ روس گرم پانیوں تک پہنچنا چاہتا ہے اور افغانستان کے بعد اس کا اگلا ہدف پاکستان ہوگا لیکن اب میری یہ سوچ نہیں ہے۔

س: اب آپ کیا سوچتے ہیں؟

ج: اب میری سوچ بالکل بدل گئی ہے۔ بہت کچھ پڑھنے کے بعد، سوچنے کے بعد، تاریخ پر نظر ڈالنے کے بعد، اب میرے ذہن میں کچھ اور خیالات ہیں۔ میرے خیال میں پاکستان کی آزادی کے 60, 62 سالوں میں ہم کرائے کے سپاہی بن گئے ہیں یا

اُردو میں اس کے لیے ''طفیلی ریاست'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ اب میں اندر رہ کر اور اندر کی چیزیں دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ واقعی ہم طفیلی ریاست تھے۔ 50 کی دہائی میں یعنی 54ء سے 61ء تک ہمیں جو دو ملین ڈالر دیے گئے، اسی کے بدلے ہم نے امریکا کے لیے روس کی جاسوسی کی۔ یہاں سے اڈے دیے گئے اور پورے سوویت یونین کی نقشہ کشی کی گئی۔ اس کے علاوہ جب میں دو کو دو سے ملاتا ہوں تو کچھ اور ہی تصور سامنے آتا ہے۔

س: وہ کیا تصور ہے؟

ج: دوسری جنگِ عظیم کے بعد انگریزوں نے جانا تھا، نوآبادیاتی نظام ختم ہو رہا تھا، تو وہ بھارت کو ایک بڑے دیو کے طور پر نہیں چھوڑ کر جانا چاہتے تھے۔ جاپان کو تو انھوں نے شکست دے کر اپنی جگہ بٹھا دیا، مگر ایک طرف چین تھا، جو ان کے سروں پر سوار تھا کہ کمیونسٹ کی طاقت وہاں آ گئی ہے، یہ ہمارے لیے مسئلہ بن جائے گی۔ بہت بڑا ملک چین اور بہت بڑا ملک بھارت، تو یہ طاقتیں تو ہم نہیں سنبھال سکیں گے۔ یہ میری اپنی سوچ ہے، میرے پاس کوئی دستاویز نہیں، بس ایک تصور ہے تو انھوں نے ایک فیصلہ کر لیا تھا کہ بھارت کو ہم نے توڑنا ہے اور بہترین موقع ان کو تب ملا جب بھارت کے مسلمانوں نے الگ ملک کا مطالبہ کیا، یہ 1940ء کا وقت تھا اور 1940ء تک تو ہمارا مطالبہ آزادی کا نہیں تھا۔

س: آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ 1945ء سے پہلے انگریزوں کی سوچ تقسیم کی نہیں تھی۔ جنگِ عظیم کے بعد ان کی سوچ یہ ہوئی کہ بھارت کو توڑا جائے تاکہ چین اور روس دونوں پر نظر رکھی جا سکے؟

ج: بالکل نظر بھی رکھی جا سکے اور بھارت کو بھی مستقبل کے چیلنج کے طور پر نہ رہنے دیا جائے۔ ایک طرف مشرقی پاکستان ہوگا اور دوسری طرف مغربی پاکستان۔ اس طرح ہم سے توقع تھی کہ بھارت کو مفلوج کر دیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ تقسیم سے ہم ایک طاقت کے دو حصے بنا دیں گے۔ اسی لیے ان علاقوں کو پاکستان کی شکل دی گئی، جہاں سے ان کی فوج ہمیشہ بھرتی ہوتی تھی۔ انھوں نے یہ منصوبہ بنا لیا تھا کہ جب بھی سرد

جنگ کی آخری معرکہ آرائی ہوگی، اس علاقے کو ہم آخری جنگ کا آلہ کار بنائیں گے اور ہوا بھی کچھ یوں ہی کہ سرد جنگ کی آخری لڑائی افغانستان میں ہوئی، جس میں روس کو شکست ہوئی۔

س: آپ کے خیال میں افغان جنگ میں حصہ لینے کا فیصلہ ہمارا نہیں بلکہ امریکا کا تھا؟

ج: میں اس نتیجے پر پہنچ گیا ہوں کہ انھوں نے وہ علاقے مغربی پاکستان بنائے، جہاں سے فوج کی بھرتی ہوتی تھی یا جن کا بارڈر روس کے ساتھ ملتا تھا۔ شاید مقصد سوویت یونین کی جاسوسی کی خاطر ہمیں استعمال کرنا تھا۔

س: فرض کریں آپ کی سوچ درست ہے تو کیا 1979ء میں جب روسی فوجیں افغانستان میں آئیں تو پاکستان خاموش رہتا؟

ج: افغانستان میں مکمل استحکام تھا۔ ظاہر شاہ بادشاہ تھا۔ اصل گیم 1973ء میں شروع ہوئی، جب امریکا کی تمام حکمت عملی وغیرہ ہماری مدد سے مکمل ہوگئی اور امریکا نے اپنے باقی تمام انٹرنیشنل سردرد ختم کر لیے۔ ویت نام سے وہ فارغ ہو چکا تھا، اسے آخری جنگ لڑنی تھی، چنانچہ سب سے پہلے ظاہر شاہ کو گرایا تاکہ افغانستان میں اپنا بندہ لایا جائے۔ اپنے بندے سے مراد، ایک خلا پیدا کیا جائے۔ پہلے تو داؤد خاں ٹھیک رہا لیکن آہستہ آہستہ وہ اکھڑ گیا، آزاد ہوتا گیا، پھر اس کو اتارا گیا پھر نور محمد ترکئی آیا، حفیظ اللہ امین آیا۔

س: عام طور پر تو کہا جاتا ہے، یہ سب روس نے کروایا؟

ج: میری تو تھیوری یہ ہے کہ یہ روس نے نہیں، امریکا نے کروایا، خلا پیدا کرنے کی خاطر۔

س: کیا روس پاکستان میں کبھی نہیں آنا چاہتا تھا؟

ج: میرے خیال میں اس کی کبھی ہمت نہ ہوتی، جب تک کہ افغانستان میں خلا پیدا کر کے اس کو لالچ نہ دیا جاتا۔ مچھلی کی طرح جب شکار کانٹے میں آگیا تو روس کے لیے بھی گرم پانی کا لالچ بہت بڑی چیز تھی۔

س: پاکستانی جرنیل تو فخریہ کہتے ہیں کہ افغان پالیسی سوچ سمجھ کر بنائی گئی اور ہم نے

جنگ جیتی بھی؟

ج: بالکل درست ہے۔ ہم نے جنگ جیتی ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ ہم نے آزاد دنیا کے لیے جنگ جیت کے، جنگ کی فتح کے سارے ثمرات ان کے حوالے کر دیے اور خود منشیات اور مہاجرین کا صلہ لے کر بیٹھ گئے۔ تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ افغانستان کی جنگ ایک کھیل تھا، جو مغرب نے رچایا۔ جس کا مقصد آخری لڑائی میں سوویت امپائر کا خاتمہ کرنا تھا اور وہ کر دیا گیا۔'' (7)

جو لوگ مسٹر جناح کو لاکھوں مسلمانوں کا قاتل کہتے ہیں، قاتل اعظم کہتے ہیں تو وہ بھی کیا غلط کہتے ہیں۔ کیا کسی کو اس سے انکار ہے کہ جناح صاحب کی قیادت کے طفیل 1947ء میں خاص طور سے مشرقی پنجاب میں لاکھوں مسلمان قتل ہوئے اور ہزاروں مسلمان خواتین بے آبرو ہوئیں۔

مظفر مرزا صاحب کا انگریزی اخبار روزنامہ نیشن ——— کا 5 جولائی 2006ء کا مضمون ''Blood Brothers'' اور نوائے وقت کا 6 جولائی 2006ء کا مضمون ''بلڈ برادرز کون ہیں'' مندرجات کے لحاظ سے ایک ہی ہیں۔ اس میں انھوں نے ایم جے اکبر صاحب کو ان کی کتاب Blood Brothers پر کوسنے دیے ہیں۔ اس پر میں یہی عرض کر سکتا ہوں کہ اگر موصوف بھی گزشتہ چھ عشروں سے بھارت میں رہائش پذیر ہوتے تو موصوف بھی یہی کچھ لکھتے۔ آخر ہم نے پندرہ لاکھ مسلمان قتل کروا کر اور تقریباً نوے ہزار مسلمان خواتین بے آبرو کروا کر کیا تیر مارا ہے؟ اس مضمون میں موصوف فرماتے ہیں:

''سوال یہ ہے کہ اگر ہندو کا برتاؤ اور ناروا سلوک اسلامیانِ ہند سے برادرانہ ہوتا تو شاید اسلامیانِ ہند کو ایک علیحدہ اور آزاد خود مختار وطن کی ضرورت محسوس نہ ہوتی لیکن دکھ تو اس بات کا ہے کہ ہندو نے مسلمان کو ملیچھ، راکشس اور نامعلوم کیا کیا نفرت انگیز خطابات سے نوازا''۔

سوال یہ نہیں کہ ہندو کا برتاؤ مسلمانوں سے کیا تھا، بلکہ سوال یہ ہے کہ ہم نے ہندو کو ہندو کیوں رہنے دیا۔ ہم نے اس پر تبلیغ کے ذریعے کیوں نہ واضح کیا کہ اس کا عقیدہ غلط ہے۔ ہم نے اس صورتِ حال کو قبول کیوں کیا۔ برصغیر کی تقسیم کے بجائے تبلیغ کے ذریعہ اپنی اقلیت کو اکثریت میں تبدیل کرنے

کی کوشش کیوں نہ کی؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا ایک علیحدہ "آزاد، خودمختار" ملک نے برصغیر کے تمام مسلمانوں کو محفوظ اور مضبوط کر دیا؟



حوالہ جات

(1) Jinnah of Pakistan by Stanley Wolpert, Page 78-79

(2) Liberty or Death. India`s Journey to Independence and Division by Patrick Frend page 63

(3) روزنامہ جنگ (سنڈے میگزین) لاہور/16 جولائی 2000ء

(4) روزنامہ نوائے وقت لاہور/12 اگست 2000ء

(5) روزنامہ انصاف لاہور/5 جون 2004ء

(6) ایضاً

(7) روزنامہ جنگ (سنڈے میگزین) لاہور/22 فروری 2009ء

4

جناب رانا فضل الرحمٰن نعیم نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ہمارے قائداعظم عاشق قرآن تھے۔ نوائے وقت، لاہور، 24 ستمبر 2006 میں اشاعت پذیر مولانا غلام مرشد کے مضمون بعنوان "قائداعظم اور قرآن مجید" کی طرف توجہ دلائی ہے۔

اس مضمون کے مطالعہ کے بعد سب سے پہلا تاثر جو میرے ذہن میں آیا، وہ یہ تھا کہ رانا صاحب موصوف بہت ہی بھولے، بلکہ بھولے بادشاہ ہیں۔ موصوف کے تصور کے مطابق جناح صاحب عاشقِ قرآن تھے۔ گویا تراویح کی نماز تو انھوں نے زندگی میں کوئی چھوڑی ہی نہیں تھی اور ہر سال رمضان المبارک کا آخری عشرہ حرم میں جا کر گزارا کرتے تھے۔ چونکہ موصوف کے تصور کے مطابق جناح صاحب عاشقِ قرآن تھے، اس لیے جب اگلے روز میں عدالت میں گیا تو دیکھا کہ ہر جج کے سامنے قرآن مجید کھلا رکھا ہے اور وہ تمام فیصلے قرآن کے مطابق کر رہا ہے۔ اس کے بعد میں ایک بینک میں گیا تو وہاں بھی یہ منظر تھا کہ بینک کا تمام کاروبار قرآن کے مطابق ہو رہا ہے۔ اسی روز ایک سرکاری دفتر جانے کا موقع ملا، وہاں بھی قرآنِ کریم کی عملداری دیکھنے میں آئی۔ ایک مارکیٹ میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں بھی تمام کاروبار قرآن کے مطابق ہوتے دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے کیا خوب فرمایا ہے:

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِىْ فِى الصُّدُوْرِ.

(سورۃ حج/آیت:46)

"......پس آنکھیں اندھی نہیں ہو جایا کرتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں اندھے ہو جایا

کرتے ہیں''۔

اگر میری بھی دل کی بینائی سلب ہوگئی ہوتی تو مجھے بہت پہلے نظر آجاتا کہ جناح صاحب کے عاشقِ قرآن ہونے کی وجہ سے پاکستان کے دونوں (مشرقی اور مغربی) حصوں میں تمام کام قرآن کریم کے مطابق ہورہے ہیں۔ میں افسوس کررہا ہوتا کہ میں اب تک اندھیرے میں ہی رہا۔ لیکن کیا واقعی ایسا ہورہا ہے جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو اس کی وجہ کیا ہے؟

امرِ واقعہ یہ ہے کہ ہر سیکولر سیاستدان کو مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے علمائے کرام کی حمایت بھی درکار ہوتی ہے۔ ہمارے جناح صاحب کو بھی علمائے کرام کی حمایت حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اب برصغیر کے عام مسلمانوں کو تو ''پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الٰہ الا اللہ کا نعرہ لگا کر بے وقوف بنالیا گیا تھا (یہ نعرہ بھی اس نے خود کبھی نہیں لگایا تھا۔ دوسرے تیسرے نہیں، شاید چوتھے یا پانچویں بلکہ دسویں درجے کے لیڈر لگایا کرتے تھے)۔ لیکن علمائے کرام کی حمایت تو صرف ایک نعرے کی بنیاد پر حاصل نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس کے لیے جناح صاحب کو قرآن کا حوالہ دینے کی ضرورت تھی۔ علماء کی تائید بائیبل کا حوالہ دے کر تو حاصل نہیں کی جاسکتی تھی۔ جناح صاحب کا بھی اپنے سیاسی مقاصد کے لیے علماء کی تائید حاصل کیے بغیر کام نہیں چلتا تھا۔ 1946ء کے ڈائریکٹ ایکشن کے حوالہ سے ڈاکٹر عائشہ جلال لکھتی ہیں:

"He (Jinnah) had neither party organization nor resources to direct a movement which the more formidable it looked, the less he controlled. To make something of 'Direct Action' day' the ramshackle provincial leagues had to call in the mullahs and the peers. The meetings under the League's banner had nearly all taken place in and around mosques after the customary F riday prayers. There was talk of jihad."(1)

ترجمہ: ''ان کے (یعنی جناح کے) پاس نہ تو وہ جماعتی تنظیم تھی اور نہ ہی وسائل جن کی مدد سے وہ اس تحریک پر قابو رکھ سکتے جو جتنا زور پکڑتی جاتی تھی اسی قدر اس پر ان کا اختیار کم ہوتا جاتا تھا۔ راست اقدام کے دن کو کامیاب کرنے کے لیے خستہ حال صوبائی لیگیوں نے مولویوں اور پیروں کو ساتھ ملایا۔ مسلم لیگ کے بینر تلے بیشتر جلسے مسجدوں میں یا مسجدوں کے آس پاس نمازِ جمعہ کے بعد منعقد ہوئے جن میں جہاد کا ذکر کیا گیا۔''

اپنے سیاسی مقاصد کے لیے جناح صاحب نے قرآن کا حوالہ دے کر علمائے کرام کی تائید حاصل کی، ورنہ قرآن سے ان کا کیا تعلق؟ جناح صاحب تو پیدائشی آغا خانی تھے۔ آغا خانی روافض تو مدعی ہیں کہ حاضر امام آغا خاں کی صورت میں ان کے پاس بولتا قرآن موجود ہے جبکہ مسلمانوں کے پاس خالی کتاب ہے۔ جس کی ان کو ضرورت نہیں۔ گاندھی اپنی عوامی پرارتھنا میں باقاعدگی سے گیتا کے ساتھ قرآن کا بھی کوئی حصہ پڑھا کرتا تھا تو کیا اس بنا پر اسے عاشقِ قرآن تسلیم کرلیا جائے۔ Arthur J. Arberry نے انگریزی زبان میں جو ترجمہ قرآن کیا ہے وہ Classics میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے پیش لفظ میں اس نے قرآنِ کریم کے بارے میں تحریر کیا ہے:

"I have been at pains to study the intricate and richly varied rhythms which - apart from the message itself - constitute the Koran's undeniable claim to rank amongst the greatest literary master pieces of mankind"

ترجمہ: ''میں نے قرآن کے اس پیچیدہ، گراں بہا اور متنوع آہنگ کے مطالعہ پر بہت محنت صرف کی ہے جو اس کے پیغام سے قطع نظر قرآن کے اس ناقابلِ تردید دعویٰ کا ثبوت ہے کہ یہ انسانیت کے عظیم ترین ادبی شہ پاروں میں سے ایک ہے۔''

آگے چل کر وہ رقم طراز ہے:

"I have called my version an interpretation, conceding the orthodox claim that the Koran

(like all other master pieces) is untranslatable:"

ترجمہ: ''میں نے اس روایتی دعویٰ کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے کہ (تمام عظیم شہ پاروں کی طرح) قرآن کا ترجمہ ممکن نہیں، اپنی تحریر کو ترجمانی قرار دیا ہے۔''

کیا Arberry کی قرآن کے بارے میں مندرجہ بالا رائے کی وجہ سے اس کو عاشق قرآن تسلیم کرلیا جائے؟ یقیناً اس سوال کا جواب نفی میں ہوگا۔ میرا احساس یہ ہے کہ رانا صاحب موصوف کی زندگی کا زیادہ حصہ حالت اعتکاف میں ہی گزرا ہوگا، ورنہ وہ صرف اس بات پر خوش نہ ہو جاتے کہ جناح صاحب کبھی کبھی قرآن کا نام بھی لے لیا کرتے تھے۔ جناح صاحب کا قرآن سے کوئی تعلق ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟ یہ جاننے کے لیے ہمیں جناح صاحب کا تعارف حاصل کرنا پڑے گا۔

جناب جی الانہ اپنی تالیف Our Freedom Fighters کے صفحہ 227 پر جناح صاحب کے تعارف کے ضمن میں اس طرح لکھتے ہیں:۔

"In the sleepy little village lived at this time a hard working old man, Poonja Bhai, an Ismaili Khoja, and there had lived, worked and died his forefathers. Agriculture was the main occupation of the Paneli. Poonja Bhai being among the few exceptions, as he owned some hand looms, on which he worked long and tiring hours ... Poonja Bhai had three sons. Valji Bhai , NATHOO BHAI, Jinnah Bhai and one Daughter, MAN Bai. Jinnah Bhai the youngest was born around 1850 and he was more dynamic than his two brothers".

ترجمہ: ''چھوٹے سے پرسکون گاؤں میں ایک محنتی بوڑھا رہتا تھا جس کا نام تھا پونجا بھائی۔ وہ ایک اسمٰعیلی خوجہ تھا۔ اس کے بڑے بوڑھے بھی اسی گاؤں میں پلے بڑھے۔ کام کرتے رہے اور اپنے اپنے وقتِ آخر تک پہنچے۔ پانیلی میں بیشتر لوگوں

کا ذریعہ معاش زراعت تھا، لیکن پونجا بھائی کا نہیں۔ انھوں نے چند کھڈیاں لگا رکھی تھیں جن پر وہ پہروں شدید محنت کیا کرتے تھے...... پونجا بھائی کے تین بیٹے تھے، والجی بھائی، نتھو بھائی اور جناح بھائی۔ ایک بیٹی تھی مان بائی۔ سب سے چھوٹے جناح بھائی 1850ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے جو بھائیوں میں سب سے متحرک طبیعت کے مالک تھے۔''

جی الانہ مسٹر جناح کے والدین کے بارے میں لکھتے ہیں:

"The two parents decided that Jinnah Bhai should get married before he left Paneli. Their search for suitable match took them to Dhraffa, a village about ten miles from Paneli, where lived Mithibai, a girl from a respectable Ismaili Khoja family ... and Jinnah Bhai was married to Mithibai in Dhraffa around 1874 ... Mithibai was now with child and her first born, a son ... they named the boy, Mohammad Ali."

ترجمہ: ''والدین نے فیصلہ کیا کہ جناح بھائی کو پانیلی چھوڑنے سے قبل شادی کر لینی چاہیے۔ مناسب رشتہ کی تلاش انھیں پانیلی سے تقریباً دس میل دور واقع گاؤں دھرافہ لے گئی جہاں ایک معزز اسمٰعیلی خوجہ خاندان کی لڑکی مٹھی بائی رہتی تھی... جناح بھائی کی شادی 1874ء کے لگ بھگ مٹھی بائی سے ہوگئی... مٹھی بائی کی پہلوٹھی کی اولاد ایک لڑکا تھا جس کا نام محمد علی رکھا گیا۔''

یہ تھے بانی پاکستان جن کا آبائی مذہب اسمٰعیلی تھا۔ اب اسمٰعیلی روافض کا قرآن سے جو تعلق ہو سکتا ہے وہ ایک اشتہار سے ظاہر ہے جو انھوں نے ''آغا خانی مذہبی عبادات کا پیغام'' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ اس میں لکھتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ پر لکھتے ہیں:

''ہمارے پاس تو بولتا قرآن یعنی حاضر امام موجود ہے۔ مسلمانوں کے پاس تو خالی

کتاب ہے۔"

یہ اشتہار آغا خانی روافض کی طرف سے ایک زمانے میں وسیع پیمانے پر تقسیم کیا گیا تھا اور اس میں غائب امامی روافض کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ غائب امام کا انتظار ترک کر کے حاضر امام کی امامت قبول کرلیں۔ آغا خانی حضرات کے اس اعلان سے واضح ہے کہ قرآن کی ان کو ضرورت نہیں۔ قرآن پر ان کا ایمان بھی نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔ کوئی صاحب دانش یہ تو بتائے کہ جناح صاحب نے آغا خانی عقائد سے توبہ کر کے اسلامی عقائد قبول کرنے کا اعلان کب کیا تھا؟ ستم ظریفی یہ ہے کہ انتخابی فہرستوں میں آغا خانی حضرات کا اندراج بھی مسلمان کے طور پر ہوتا ہے، حالانکہ وہ خود کو مسلمان نہیں کہتے۔ یہ درست ہے کہ جناح صاحب نے مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے خود کو بطور اثنا عشری شیعہ متعارف کروایا۔ اس لیے نہیں کہ اس نے تقابلی مطالعہ کے بعد آغا خانی عقائد کو غلط اور اثنا عشری عقائد کو برحق پایا، کیونکہ اثنا عشری (غائب امامیہ) مسلمان ہونے کے مدعی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جناح صاحب نے کبھی بھی کسی مجلس میں نہ آغا خانی عقائد سے برأت کا اور نہ اثنا عشری عقائد قبول کرنے کا اعلان کیا تھا اور نہ کبھی بعد میں وہ کسی مجلس عزا یا کسی ماتمی جلوس میں شریک ہوئے ورنہ جو شخص مذہب تبدیل کرتا ہے وہ اپنے مذہب ثانی میں بہت سخت اور بہت پختہ ہوتا ہے اور وہ اپنے مذہب ثانی کی عبادات و معمولات کا انتہائی پابند ہوتا ہے جس کی تازہ مثال اور نمونہ محمد یوسف (کرکٹر) ہیں جبکہ جناح صاحب میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ان کا مذہب تبدیل کرنا محض مسلمانوں کو دھوکا دینا تھا۔

امریکا میں پاکستان کے پہلے سفیر ایم اے ایچ اصفہانی نے سندھ ہائی کورٹ میں ایک مقدمہ میں بطور گواہ بیان دیتے ہوئے کہا:

> "میں سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں کیمبرج میں انڈر گریجویٹ کے طور پر تعلیم حاصل کر رہا تھا جب مجھے قائداعظم سے رابطے کا شرف حاصل ہوا۔ ایک شام ان سے میری ان کے مسلک پر بات چیت ہوئی اور انھوں نے مجھے بتایا کہ ان کا تعلق آغا خانی خوجوں سے رہا ہے۔۔۔1896 میں بار ایٹ لا کرنے کے بعد وہ انگلینڈ سے واپس آئے اور آغا خانی مسلک سے تعلق جاری رکھنے کے سوال پر غور و خوض

> کے بعد انھوں نے اسے چھوڑنے اور اثنا عشری عقیدہ اپنانے کا فیصلہ کیا"(2)

اثنا عشری شیعہ حضرات کا بھی اس قرآن پر ایمان نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے جو 'الحمد' سے شروع ہو کر 'والناس' پر ختم ہوتا ہے۔ اثنا عشری (غائب امامیہ) اگرچہ مسلمان ہونے کے مدعی ہیں۔ انتخابی فہرستوں میں بھی ان کا اندراج بطور مسلمان کے ہی ہوتا ہے لیکن وہ مسلمان نہیں ہیں کیونکہ:

1) وہ اپنے اماموں کا مقام تمام انبیاء سے بھی بلند اور نبی اکرم ﷺ کے برابر رکھتے ہیں۔

2) ان کے امام بھی انبیاء کی طرح معصوم ہوتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ سے انبیاء کی طرح ہی بذریعہ وحی رابطہ رکھتے ہیں اور یہ عقیدہ ختم نبوت سے متصادم ہے۔

3) ان کے عقیدے کی رو سے موجودہ قرآن جو مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے محرف ہے۔ اصل قرآن ان کے بارھویں امام کے پاس ہے جو غائب ہے۔ موجودہ قرآن کو نہ تو وہ حفظ کرتے ہیں اور نہ ہی وہ تراویح پڑھتے ہیں۔

4) قرآن پر ایمان نہ رکھنا اثنا عشری حضرات (غائب امامیہ) کی ضروریات دین میں سے ہے کیونکہ اس قرآن کو غیر محرف تسلیم کرنے کی صورت میں ان کا مذہب ہی باطل ہو جاتا ہے۔ جبکہ ایک مسلمان کے لیے اس قرآن کو غیر محرف تسلیم کرنا ضروریات دین میں سے ہے ورنہ وہ مسلمان ہی نہیں۔

5) ہم مسلمانوں سے اثنا عشری حضرات ہر معاملے میں اختلاف رکھتے ہیں۔ کلمہ، وضو، نماز، اوقات نماز، نکاح، طلاق، وراثت غرضیکہ ہر مسئلے میں وہ ہم مسلمانوں سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ان کا اسلام ایرانی ایڈیشن پر مبنی ہے، نہ کہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ۔

جناح صاحب بھی اثنا عشری شیعہ ہونے کے مدعی تھے اور اثنا عشری کا قرآن پر ایمان ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کوئی اثنا عشری قرآن پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ صرف اور صرف "تقیہ" کے نام پر منافقت ہوتی ہے۔ جو ان کے مذہب میں ایک نیکی ہے اور باعث ثواب ہے۔

جناح صاحب نے تو قرآن کریم کو کبھی چھوا بھی نہیں تھا، ورنہ وہ قرآن کریم سے کچھ تو واقف ہوتے۔ قرآن کریم کی ایک مشہور ترین آیت ہے:

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ. [سورہ:8، آیت:46]

ترجمہ: اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ورنہ تم کمزور پڑ جاؤ گے اور تمھاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔

آزادی سے پہلے کے فرقہ وارانہ حالات میں اس آیت سے ہر مسلمان بخوبی واقف تھا۔ اس کے ترجمہ سے آگاہ تھا لیکن اگر اس آیت سے کوئی بے خبر تھا تو وہ مسلمانوں کا قائداعظم محمد علی جناح تھا۔ جب جناح صاحب کو اِس آیت کا ترجمہ پڑھ کر سنایا گیا تو اُنھوں نے ترجمہ سنانے والے سے بہت حیرت سے پوچھا کہ کیا واقعی یہ قرآن میں ہے؟۔ حقیقت تو یہی ہے کہ جناح صاحب قرآن کریم سے بالکل نابلد تھے۔ ذیل میں جو حوالہ پیش کیا جا رہا ہے، اس سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جناح صاحب علامہ اقبال کے انتہائی مشہور شعر:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

سے بھی ناواقف تھے، حالانکہ اس زمانے میں یہ مشہور شعر ہر مسلم کی زبان پر تھا، جلسوں میں اکثر مقرر اس شعر کو سامعین کے گوش گزار کرتے تھے۔ تقریباً ہر روز ہی یہ شعر اخبارات میں شایع ہوتا تھا۔ اب آگے حوالہ پڑھیے:

"یہ 1939ء کا ذکر ہے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ شریف رانا ایک نامور مصور ہوئے ہیں۔ وہ فیڈریشن کے رکن اور طالب علم رہنما تھے۔ تحریک پاکستان میں انھوں نے بھرپور حصہ لیا۔ اس دور میں انھوں نے قرآن پاک کی آیات مبارکہ اور مفکر پاکستان علامہ محمد اقبالؒ کی نظموں کے حوالے سے پینٹنگز بنانے کا آغاز کیا۔ بعدازاں یہی پینٹنگز ان کی قائداعظم محمد علی جناحؒ سے ملاقات کا باعث بنیں۔

یہ رانا صاحب کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ وہ اسلامیہ کالج میں زیر تعلیم تھے۔ یہ وہ دور تھا جب آزادی کی تحریک لا الٰہ الا اللہ کے نعرے کے ساتھ ایک تازہ ولولے اور جذبے کے ساتھ ابھر رہی تھی۔ رانا صاحب نے مسلمانوں کو مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع کرنے اور ان میں ایک اسلامی ریاست کے قیام کی جدوجہد میں حصہ لینے کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے جیومیٹریکل ڈرائنگ کی مدد سے ایسی پینٹنگز تیار کیں جو قرآنی آیات اور قومی اشعار پر مبنی تھیں۔

قرآنی آیات اور قومی شعرا کے کلام کے اشتراک سے تیار کی جانے والی ان پینٹنگز کی نمائش فیڈریشن کے سالانہ اجلاس کے موقع پر کی گئی تھی۔ اجلاس کے اختتام پر طالب علم رہنماؤں نے قائداعظمؒ کو یہ پینٹنگز دکھائیں۔ نواب ممدوٹ، ممتاز دولتانہ اور حسن امام بھی قائداعظم کے ہمراہ تھے۔

ان پینٹنگز کو دیکھتے دیکھتے قائداعظم ایک جگہ رکے تو انھوں نے اس طالب علم سے جو ان تصاویر کا پس منظر بیان کر رہا تھا، یا ترجمہ و تشریح کر رہا تھا، سے کہا: "سٹاپ"۔

یہ پینٹنگ "امت واحدہ" کی ترجمانی کرتی تھی۔ اس کے ذریعے امت کو فرقہ بندی سے بچنے اور گروہوں میں تقسیم ہونے سے باز رہنے کا پیغام دیا گیا تھا۔ یہ علامہ محمد اقبالؒ کے ایک شعر:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

اور قرآن پاک کی آیت: وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْھَبَ رِیْحُکُمْ کے اشتراک سے تیار کی گئی تھی۔

قائداعظم نے طالب علم سے آیت کا ترجمہ دوبارہ پڑھنے کے لیے کہا۔ اس نے آیت کا ترجمہ یوں پڑھا، "اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ورنہ تم کمزور پڑ جاؤ گے اور تمھاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔"

ترجمہ سن کر قائداعظم نے بڑے تجسس اور حیرت سے دریافت کیا: "کیا قرآن یہ پیغام دیتا ہے؟" ہاں میں یہ جواب ملنے پر انھوں نے فرمایا: "اگر یہ پیغام قرآن پاک میں ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہماری منزل قریب ہے۔ یہی تو وہ پیغام ہے جو میں قوم کو دینا چاہتا ہوں کہ باہم منظم اور متحد رہو۔" انھوں نے پینٹنگ کو دوبارہ غور سے دیکھا۔ ان کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو گیا۔

انھوں نے نواب ممدوٹ کو کندھے سے پکڑا اور کہا، "I want to see this Mullah"۔ اس نے میرے دل کی بات تخلیق کی ہے۔ شریف رانا اس وقت نمائش میں موجود نہ تھے۔ رانا صاحب دوسرے دن نواب ممدوٹ کی کوٹھی پر گئے، قائداعظم

سے ملاقات کی اور انھیں بتایا کہ میں شریف رانا ہوں۔ قائد اعظم نے انھیں غور سے دیکھا اور حیرانی سے دریافت کیا: "Is that your venture?" انھوں نے اثبات میں سر ہلایا تو قائد نے پوچھا: ''وہ شعر کس کا ہے؟'' رانا صاحب نے جواب دیا کہ یہ شعر علامہ محمد اقبال کا ہے۔ یہ سنتے ہی قائد نے خوشی سے "Hurrah" کہا اور انھیں سینے سے چمٹا لیا۔ پھر نواب ممدوٹ سے مخاطب ہو کر بولے:

"I have reached the goal. Pakistan definitely with us."

(میں منزل کے قریب پہنچ گیا ہوں، یقیناً پاکستان بن کر رہے گا)۔''(3)

یہ تھا جناح صاحب کا مبلغ علم کہ وہ قرآن کریم سے تو کیا، وہ تو قرآن کی مشہور ترین آیت سے بھی ناواقف تھے۔ حتیٰ کہ وہ تو علامہ اقبال کے مشہور شعر سے بھی نابلد تھے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جناح صاحب کو تو قرآن کی ہوا بھی نہیں لگی تھی اگر اس نے ایک دفعہ بھی قرآن کریم کا سمجھ کر مطالعہ کیا ہوتا تو کبھی دو قومی نظریہ کی وکالت نہ کرتا۔ کبھی یہ نہ کہتا کہ برصغیر کے مسلمان بر بنائے مذہب الگ قوم ہیں اور تمام غیر مسلم (اختلاف مذاہب کے باوجود) ایک الگ قوم ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ایک دفعہ بھی مسلمانوں کو ''یا قوم المسلمین'' کہہ کر مخاطب نہیں کیا۔ انبیاء میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ مجھ پر ایمان لانے والے الگ قوم ہیں اور میری تکذیب کرنے والے الگ قوم ہیں۔ مثلاً:

1) وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ط قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ط اَفَلَا تَتَّقُوْنَ. قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ. قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ. (سورۃ الاعراف/ آیت: 65-67)

''ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا۔ انھوں نے کہا کہ اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں کیا تم ڈرتے نہیں ہو۔ ان کی قوم کے سربرآوردہ جو کافر تھے انھوں نے کہا کہ ہم تم کو عقل میں کمزور دیکھتے ہیں اور تم کو جھوٹوں میں سے خیال کرتے ہیں۔ انھوں (ہودؑ) نے کہا۔ اے میری قوم مجھ

میں ذرا بھی عقل کی کمی نہیں، لیکن میں تو پروردگار عالم کا رسولؐ ہوں۔''

قرآن کریم کی ان آیات میں خطیب ہیں حضرت ہودؑ اور مخاطب ہے ان کی قوم جو ان کی تکذیب کر رہی ہے، لیکن وہ یہ نہیں کہتے کہ میری تکذیب کی وجہ سے تمھاری قومیت مختلف ہوگئی ہے اور میری اور مجھ پر ایمان لانے والوں کی قومیت مختلف ہوگئی ہے۔

2) وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ. (سورۃ اعراف/ آیت: 73)

''اور ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالحؑ کو بھیجا اور انھوں نے کہا کہ اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔''

یہاں بھی حضرت صالحؑ اپنی قوم میں سے ان لوگوں کو جو ان کی تکذیب کر رہے ہیں ''میری قوم'' کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں۔ یہ نہیں کہتے میری تکذیب کی وجہ سے تمھاری قوم بدل گئی ہے۔ یا میری قومیت بدل گئی ہے۔

3) وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ. (سورۃ یونس/ آیت: 71)

''آپ ان کو نوحؑ کا قصہ پڑھ کر سنائیے جبکہ انھوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم اگر تم کو میرا رہنا اور احکام خداوندی کی نصیحت کرنا گراں گزرتا ہے تو میرا اپنے اللہ پر بھروسہ ہے سو تم مع اپنے شرکاء کے متفقہ فیصلہ کر لو۔''

اس آیہ کریمہ میں بھی حضرت نوحؑ اپنی تکذیب کرنے والے حضرات کو اپنی قوم کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں۔

میں نے بخوف طوالت قرآنِ کریم سے صرف تین حوالے دیے ہیں، لیکن ہر شخص خود قرآن کریم کا مطالعہ کر کے تصدیق کر سکتا ہے کہ کسی بھی رسول نے اپنی تکذیب کرنے والوں سے یہ نہیں کہا کہ تبدیلی مذہب کی وجہ سے تمھاری قوم مختلف ہے اور میری اور مجھ پر ایمان لانے والوں کی قوم مختلف ہے۔ اگر جناح صاحب نے ایک دفعہ بھی قرآن کریم کا سوچ سمجھ کر مطالعہ کیا ہوتا تو وہ کبھی یہ نہ کہتا کہ برصغیر کے مسلمان الگ قوم ہیں اور غیر مسلم الگ قوم ہیں کیونکہ قرآن سے اس نظریے کی

تائید ہی نہیں ہوتی، بلکہ تردید ہوتی ہے۔

برصغیر کی سیاسی کشمکش کے مطالعے سے مجھ پر یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ جناح صاحب نے قیادت نہیں بلکہ صرف وکالت کی تھی۔ یہ ان پر الزام ہے کہ انھوں نے قیادت کی تھی۔ میری اس رائے کی تائید جناب شریف الدین پیرزادہ نے ایک سیمینار میں تقریر کرتے ہوئے کردی ہے جو نوائے وقت لاہور، 17 ستمبر 2006 میں رپورٹ ہوئی ہے اور عنوان ہے ''قائداعظم عظیم وکیل تھے، پاکستان کا مقدمہ جس خوبصورتی سے جیتا اس کی مثال نہیں ملتی''۔ واقعی بہت خوبصورتی سے جیتا۔ صرف پندرہ لاکھ مسلمان ہی قتل ہوئے۔ صرف نوے ہزار مسلمان عورتیں ہی بے آبرو ہوئیں۔ اس سے مقدمہ کی خوبصورتی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ رانا صاحب موصوف جیسے بھولے بادشاہوں کے لیے یہ کوئی زیادہ قیمت بھی نہیں۔ ویسے بھی یہ جناح صاحب کا مسئلہ ہی نہیں تھا کہ اس مقدمہ کی کامیابی کے نتیجہ میں مسلمانوں پر کیا گزرتی ہے۔ ایک وکیل قتل کے ملزم کی صفائی میں دلائل پیش کرنے کے بعد جب فیصلہ سنتا ہے۔ تو اگر جج ملزم کو بری کردے تو وکیل جھک کر کہتا ہے: "Thank you my lord" اور اگر جج ملزم کو پھانسی کی سزا سنا دے تو بھی وکیل جھک کر کہتا ہے: "Thank you my lord for giving me a patient hearing"۔ ہر دو صورتوں میں وکیل نے تو جج کا شکریہ ہی ادا کرنا ہوتا ہے۔ یہی کچھ جناح صاحب نے پاکستان کے مقدمہ میں کیا تھا کہ جو مل گیا شکریے کے ساتھ قبول کرلیا اور گورنر جنرل بن کر فیس وصول کرلی۔

جناح صاحب نے پاکستان میں اسلامی نظام کے بارے میں آل انڈیا مسلم لیگ کو کبھی کوئی Commitment نہیں کرنے دی تھی۔ جب بھی ورکنگ کمیٹی میں مولانا عبدالستار خاں نیازی جیسے کسی بنیاد پرست نے اسلام کے بارے میں کوئی قرارداد پیش کی تو جناح صاحب نے اس کو یہ کہ کر پاس نہ ہونے دیا کہ پاکستان میں نظام کا فیصلہ پاکستان کے لوگوں کی رائے سے ہوگا۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر عائشہ جلال لکھتی ہیں:

"In October 1944, Abdus Sattar Niazi called a meeting in Lahore to discuss making Pakistan an Islamic State. The Civil and Military

Gazette(4) saw this an open rebellion against Jinnah and League. It had a point. In April 1943 at League's Delhi Session, Jinnah had carefully skated around the issue, arguing that; the constitution and the government of Pakistan will be what the people will decide. A resolution, which would have committed the League to basing the future constitution of Pakistan on Islamic principles, was quietly withdrawn at Jinnah's instance"(5)

ترجمہ: ''اکتوبر 1944ء میں عبدالستار نیازی نے لاہور میں پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کے حوالے سے ایک اجلاس طلب کیا۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ کو یہ بات جناح اور لیگ کے مقابلے میں کھلی بغاوت محسوس ہوئی اور ایسا ہونا بجا تھا کیونکہ اپریل 1943ء میں لیگ کے دہلی میں ہونے والے اجلاس میں جناح اس موضوع پر گفتگو کر چکے تھے اور انھوں نے کہا تھا کہ پاکستان کی حکومت وہی ہوگی جو لوگ چاہیں گے اور پاکستان کے آئندہ آئین کو اسلامی اصولوں پر تیار کرنے کی ایک قرارداد جناح کے اشارے پر خاموشی سے واپس ہوچکی تھی۔''

برصغیر کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کے لیے ووٹ تو پورے برصغیر کے مسلمانوں سے مانگے جارہے تھے، لیکن پاکستان کے آئین کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق صرف پاکستان کے شہریوں کو دیا جارہا تھا۔ ایں چہ بوالعجبی است۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جلسوں میں اور اخباری بیانات میں اسلام کا نام لیا جاتا تھا تو وہ عام مسلمانوں کو اور مولانا غلام مرشد جیسے لوگوں کو احمق بنانے کے لیے لیا جاتا تھا۔ بلاشبہ اس میں جناح صاحب کامیاب رہے۔ 1940ء سے لے کر 1947ء تک کوئی ایسی قرارداد آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے پاس ہی نہیں کی کہ پاکستان کا آئین قرآن وسنت پر مبنی ہوگا۔ کسی کو اللہ تعالیٰ توفیق دے تو وہ ان اصحاب کی فہرست پر ایک نظر ڈال لے

جو 1906ء میں مسلم لیگ کی تاسیس کے لیے ڈھاکہ میں جمع ہوئے تھے۔ یہ فہرست شریف الدین پیرزادہ کی تالیف Foundation of Pakistan کے صفحہ 11 پر موجود ہے۔ الا ماشاء اللہ ایک سے بڑھ کر ایک انگریز کا پٹھو موجود ہے۔ انگریز کے ان ازلی وفاداروں نے انگریز کے سب سے بڑے پٹھو آغا خاں کو اپنا پہلا صدر بنالیا (جو مسلمان بھی نہیں تھا)۔ ایسے لوگوں کا اسلام سے تعلق معلوم۔ ان حضرات سے یا ان کی معنوی اولاد سے نہ تو مسلمانوں کا بھلا ہو سکتا تھا اور نہ ہوا۔ اگر کوئی فائدہ اسلام کو یا برصغیر کے مسلمانوں کو ان کے ذریعے سے حاصل ہوا ہے تو کوئی صاحب نشان دہی کر دیں۔ میں شکر گزار ہوں گا اور اُن کی بات مان جاؤں گا۔

تقسیم برصغیر کا ایک تو نظریاتی پہلو ہے اور ایک عملی پہلو۔ اگرچہ نظریاتی لحاظ سے کسی طرح بھی دو قومی نظریہ کا تعلق اسلام سے ثابت نہیں ہوتا (اگر اس نظریے کا اسلام سے کوئی تعلق ہوتا تو وہ لوگ جن کی ساری زندگی مسجد کی چٹائی پر بیٹھ کر "قال اللہ وقال الرسول ﷺ" کہتے گزری تھی، وہ کبھی اس کی مخالفت نہ کرتے۔ کیا یہ ستم ظریفی نہیں کہ "دو قومی نظریہ" کی وکالت کرنے والے وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنی پوری زندگی میں ایک رات بھی کسی مسجد میں نہیں گزاری تھی)۔ لیکن نظریاتی پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ امر دریافت طلب ہے کہ دو قومی نظریہ عملی لحاظ سے بھی مسلمانوں اور اسلام کے لیے نفع بخش ثابت نہیں ہوا۔ اگر ہوا ہے تو کوئی صاحب ثابت کر دیں۔ اس کے لیے گلبرگ اور ڈیفنس کے عشرت کدوں کی مثال نہ دی جائے۔ جبکہ روزنامہ نوائے وقت کے چیف ایڈیٹر جناب مجید نظامی اپنی تقاریر اور انٹرویوز میں اکثر ڈیفنس اور گلبرگ کا ہی حوالہ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر 16 اپریل 2009ء کو ایوان کارکنانِ تحریک پاکستان لاہور میں نظریہ پاکستان ٹرسٹ کے دس سال مکمل ہونے اور دوسرے عشرے کے آغاز کی مناسبت سے منعقدہ تقریب سے اپنے صدارتی خطاب میں انھوں نے کہا:

"لوگ پوچھتے ہیں کہ پاکستان نے ہمیں کیا دیا؟ میں کہتا ہوں کہ پاکستان نے ہمیں سب کچھ دیا ہے۔ ہم نے یہ لاہور شہر تقسیم ہند سے پہلے بھی دیکھا تھا۔ جو لوگ تحریک پاکستان کے کارکن ہیں، تب انھوں نے ڈیفنس دیکھا ہوگا، نہ گلبرگ، نہ ہی انھوں نے کسی کے گھر میں کئی کئی گاڑیاں دیکھی ہوں گی۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پاکستان کی برکت سے ہی ہے۔ ہمیں ایک ناشکری قوم نہیں بننا چاہیے بلکہ اللہ تعالیٰ کا

شکر ادا کرنا چاہیے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے میرے پاس ڈاکٹر جاوید اقبال [فرزندِ اقبال] تشریف فرما ہیں۔ ان کے بہنوئی میاں صلاح الدین کے والد اور میرے مہربان میاں امیر الدین مرحوم لاہور کے رئیسِ اعظم کہلاتے تھے۔ لیکن ان کے پاس بھی گاڑی کی بجائے ایک رئیسی ٹانگہ ہوا کرتا تھا۔ اگر کسی مسلمان کے پاس یہاں گاڑی تھی تو وہ کامریڈ میاں افتخار الدین تھے جو پہلے کانگریس کمیٹی کے صدر تھے، مگر پاکستان بننے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انھیں عقل اور فہم عطا کی کہ وہ تحریک پاکستان میں شامل ہو جائیں اور وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پاکستان سے پہلے مسلمانوں کے پاس کیا تھا اور آج پاکستان کی وجہ سے مسلمان کس طرح امیر و کبیر بھی ہیں اور رئیس بھی ہیں۔ ٹھیک ہے کہ ان میں غرباء بھی ہیں، ان کی روٹی کا مسئلہ بھی ہے اور آج کل یہ بحث چل رہی ہے کہ روٹی ایک روپے کی ہونی چاہیے یا دو روپے کی۔"(6)

مجید نظامی اپنے مذکورہ بیان میں گلبرگ، ڈیفنس اور ایک گھر میں کئی کئی گاڑیوں کو قیامِ پاکستان کا ثمر قرار دیتے ہیں۔ ہم اُن کی یہ بات من و عن تسلیم کرتے ہیں، مگر گلبرگ اور ڈیفنس کے بنگلے اور ایک گھر میں کئی کئی گاڑیاں کرپشن کا ثمر ہیں اور یہ کرپشن پاکستان میں ہی ممکن تھی۔ کاش مجید نظامی کسی عملِ خیر اور مالِ حلال کو پاکستان کا ثمر بتا دیتے تو ہم ضرور بالضرور اُن کی بات پر غور کرتے اور پاکستان کے قیام کو مثبت حوالے سے دیکھنے کی کوشش کرتے۔ اب پاکستان کے بہت بڑے حامی کرپشن کو پاکستان کا شیریں ثمر کہتے ہیں۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں:

متفق گردید رائے بوعلی با رائے من

قیامِ پاکستان کی مخالفت کرنے والے راہنما یہی تو کہتے تھے کہ پاکستان پر انگریز کے پروردہ جاگیردار اور سرمایہ دار مسلّط ہوں گے، عیش کریں گے، امیر امیر تر ہوگا اور غریب غریب تر ہو جائے گا۔ کسان اور مزدور دو وقت کی روٹی کو بھی ترسیں گے۔ نظامی صاحب کس فخر سے پاکستان میں امیر کے امیر تر ہونے اور غریب کے دو وقت کی روٹی کو ترسنے کا ذکر کر رہے ہیں۔ مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری نے قیامِ پاکستان سے پہلے 1946ء میں دہلی کی شاہی جامع مسجد کے سامنے پارک میں جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے کس قدر صحیح فرمایا تھا:

''اندرونی طور پر پاکستان میں چند خاندانوں کی حکومت ہو گی اور یہ خاندان زمینداروں، صنعت کاروں اور سرمایہ کاروں کے خاندان ہوں گے۔ انگریز کے پروردہ، فرنگی سامراج کے خود کاشتہ پودے، سروں، نوابوں اور جاگیر داروں کے خاندان ہوں گے۔ جو اپنی من مانی کارروائی سے محبِ وطن اور غریب عوام کو پریشان کر کے رکھ دیں گے۔ غریب کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ ان کی لوٹ کھسوٹ سے پاکستان کے کسان اور مزدور نان شبینہ کو ترس جائیں گے۔ امیر روز بروز امیر اور غریب غریب تر ہوتے چلے جائیں گے۔''(7)

نیز بخاری صاحب نے 2 ستمبر 1946ء کو بیرون دہلی دروازہ لاہور میں ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''پاکستان پر وہی لوگ قابض ہو جائیں گے جو آج بھی انگریز کے غم خوار اور نمک خوار ہیں، یہ امرا کی ایک جنت ہو گی لیکن ننانوے فیصد عوام کے لیے یہی شب و روز ہوں گے اور اسلام ایک مسافر کی طرح ہو گا۔''(8)

تقسیم ہند سے قبل سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری نے جو کچھ فرمایا اس کی تصدیق مسلم لیگ (ن) کے مرکزی رہنما اور رکن قومی اسمبلی جناب مخدوم جاوید ہاشمی کے ایک بیان سے ہوتی ہے، انھوں نے ملتان میں صحافیوں سے گفت گو کرتے ہوئے کہا:

''غریب عوام کی آواز کو کمزور کر دیا گیا ہے جس کے ذمہ دار سیاست دان ہیں۔ جب قیادت ٹھیک طرح سے نہ چلے تو پھر قومیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ بیش تر لیڈر اقتدار میں آنے کے بعد آگے بڑھے۔ ان کے اثاثے، ان کی دولت، طاقت، شوگر و ٹیکسٹائل ملیں بڑھتی جا رہی ہیں اور ملک کے غریب پہلے سے غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ لیڈروں کے اثاثے اور شوگر ملیں بڑھی ہیں مگر غریب روٹی کو ترس رہا ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ملک کا غریب آگے نہیں بڑھ رہا۔''(9)

جناب نظامی کے اپنے اخبار نوائے وقت میں ہر روز معاشی بدحالی پر کالم لکھے جاتے ہیں، تجزیے چھپتے ہیں، ہر روز معاشی حالات سے مجبور ہو کر خودکشی کرنے والوں کی خبریں شائع ہوتی ہیں۔ نوائے وقت میں ہی عالمی ادارہ خوراک کی رپورٹ شائع ہوئی ہے جس کا عنوان ہے:

''پاکستان میں غذائی قلت کے شکار افراد کی تعداد 70 فیصد تک پہنچ سکتی ہے۔ 49 فیصد افراد کو مناسب خوراک دستیاب نہیں۔ قبائلی علاقوں میں تناسب 68، خیبر پختون خواہ میں 58 فیصد ہے۔'' رپورٹ کا متن پڑھیے:

''اسلام آباد+لندن (مانیٹرنگ نیوز+ وقت نیوز+ بی بی سی ڈاٹ کام) عالمی ادارہ برائے خوراک نے خدشہ ظاہر کیا ہے کہ سیلاب کے باعث پاکستان میں مناسب خوراک تک رسائی نہ رکھنے والے افراد کی تعداد کل آبادی کے 70 فیصد تک پہنچ سکتی ہے۔ ادارے نے بتایا کہ پاکستان میں مجموعی طور پر 49 فیصد افراد غذائی عدم تحفظ کا شکار ہیں، یعنی انھیں مناسب اور ضروری خوراک میسر نہیں ہے۔ ایس ڈی پی آئی اور ایک سوئس ادارے کے تعاون سے ہونے والی اس تحقیق کے مطابق قبائلی علاقوں میں رہنے والے افراد سب سے زیادہ تعداد میں غذائی قلت کا شکار ہیں جہاں ایسے افراد کا تناسب 68 فیصد ہے۔ بلوچستان میں 61 فیصد افراد اور صوبہ خیبر پی کے کی کل آبادی کے 56 فیصد کو مناسب خوراک تک رسائی نہیں ہے۔ اسلام آباد کے شہریوں کا صرف 23 فیصد غذائی اشیا تک عدم رسائی کا شکار ہے جبکہ ایسے افراد کی سب سے زیادہ شرح بلوچستان کے ضلع ڈیرہ بگٹی میں رہتی ہے جہاں 82 فیصد افراد کو کافی کھانا نہیں ملتا۔ پاکستان میں مہنگائی میں اضافے کے باعث متوسط طبقے کے افراد اور غریب لوگوں کے کھانے پر اخراجات کم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔''(10)

ملک کی اس قدر بدترین معاشی صورتِ حال کے باوجود نظامی صاحب کا پاکستان کا جواز ثابت کرنے کے لیے امرا اور روسا اور ان کے رہائشی علاقوں ڈیفنس اور گلبرگ کا حوالہ دینا بڑی ڈھٹائی کی بات ہے۔

اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اور اس نے دل کی آنکھیں کھول کر یہ گوشوارہ بنایا کہ برصغیر کے مسلمانوں نے حاضر امام آغا خان اور اس کے معنوی فرزند کی اقتدا میں کیا پایا اور کیا کھویا تو معلوم ہو گا کہ:

1) ہم برصغیر کے مسلمان جو انفرادی طور پر بھی اور من حیث الجماعت بھی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے سفیر اور آپ کے دین کے داعی و مبلغ تھے اور ہمارا فرض یہ تھا کہ اس پیغام کو تمام غیر

مسلموں تک پہنچادیں جو ہمیں آنحضرت ﷺ نے دیا تھا۔ حاضر امام آغا خاں سوم اور اس کے معنوی فرزند (مسٹر جناح) کی قیادت کے طفیل ہم اس منصب سے ہی دستبردار ہوگئے جو لاریب ہمارے لیے دنیا اور آخرت دونوں جگہ خسارے کا موجب ہے۔

2) ہم نے برصغیر کے غیر مسلموں کو نبی کریم ﷺ کی امتِ دعوت کی حیثیت دینے سے انکار کر دیا اور انھیں اپنا دشمن تصور کر لیا اور یہ تسلیم کر لیا کہ اسلام بھی اسی طرح کا ایک دھرم ہے جس طرح کا ہندو دھرم ہے اور مسلمان بھی صرف پیدائشی مسلمان ہوتا ہے اور کوئی غیر مسلم Convert ہو کر مسلمان نہیں ہو سکتا۔ جناح صاحب نے برصغیر کے مسلمانوں کو تین حصوں میں تقسیم کروا کے مسلمانوں کی عددی طاقت کو بے اثر کر دیا۔ اس کے برعکس غیر مسلموں کو مسلمانوں کے خلاف متحد کر کے ایک بڑی طاقت بنا دیا۔

3) ہم نے جناح صاحب کی قیادت کی برکت سے تقسیم برصغیر کے موقع پر پندرہ لاکھ مسلمان قتل کروائے اور نوے ہزار مسلمان عورتیں بے آبرو کروائیں۔ بھارت میں مسلمانوں کے قتل عام کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور معلوم نہیں کب تک جاری رہے گا۔ حالانکہ جناح صاحب کی قیادت قبول کرنے سے قبل غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے خوشگوار معاشرتی تعلقات تھے اور انیسویں صدی میں ایک بھی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا تھا۔

4) ہم نے برصغیر کے ایک تہائی مسلمانوں کو مستقل طور پر مشرکوں کی غلامی میں دے دیا اور اصولاً اس کو حق بجانب بھی تسلیم کر لیا جبکہ مسلمانوں نے تاریخ میں کبھی بھی غیر مسلموں کی حکومت کو جائز تسلیم نہیں کیا۔ ہم نے ان مسلمانوں سے تقسیم برصغیر کے حق میں ووٹ تو لیے اور اس کے بعد ان کو بھلا دیا اور ان کو مشرکوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ یہ تھا انعام جو بھارت کے مسلمانوں کو جناح صاحب کی طرف سے حاصل ہوا۔

5) مسلم قومیت کے نظریہ کو ہم نے 14 اگست 1947ء کی شام کو ہی دفن کر کے وطنی قومیت کو، جو اس سے قبل کفر تھا، اختیار کر لیا تھا یہاں تک کہ افغانی مسلمانوں کے قتل عام کے لیے یہود و نصاریٰ کے حوالے اپنے تمام وسائل کر دیے وغیرہ وغیرہ۔

اس کے عوض جناح صاحب نے ہمیں Motheaten, Truncated پاکستان لے کر دیا جو پرویز مشرف کے دور میں روشن خیال ہو گیا ہے۔ جس کی چالیس فیصد آبادی غربت کی لکیر

سے نیچے زندگی گزار رہی ہے، جس کے ہر چوک میں کم و بیش ایک درجن بھکاری سارا دن ہاتھ پھیلائے کھڑے رہتے ہیں اور جس کا بین الاقوامی کردار امریکا کی پاپوش بوسی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ انسان وہی کچھ دیکھتا ہے جو وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ نہ دیکھنا چاہے تو سامنے موجود ہمالیہ پہاڑ بھی اسے نظر نہیں آئے گا۔ جن دانش وروں نے کم و بیش چھ عشرے ایک شخص کو قائداعظم اور امام معصوم تصور کرتے ہوئے اس کی قصیدہ گوئی کی ہے اب وہ کیسے تسلیم کر لیں کہ جو قصیدہ گوئی انھوں نے کی تھی وہ غلط فہمی پر مبنی تھی۔



حوالہ جات

(1)The Sole Spokesman Page 216-217

(2) قائداعظم کے خاندانی تنازعے / خالد احمد / ص:24۔

(3) ماہنامہ ذہن لاہور، قرارداد لاہور نمبر / ص:17

(4) یہ لاہور کا ایک انگریزی اخبار تھا جو بند ہو گیا۔ مال روڈ پر جہاں اس کا دفتر تھا وہاں اب پنوراما سنٹر تعمیر ہو چکا ہے۔

(5) The Sole Spokesman Page 95-96.

(6) روزنامہ نوائے وقت لاہور /17 اپریل 2009ء

(7) روزنامہ الجمعیت دہلی /28 اپریل 1946ء

(8) روزنامہ انقلاب لاہور /4 ستمبر 1946ء

(9) روزنامہ نوائے وقت لاہور /20 ستمبر 2010ء

(10) روزنامہ نوائے وقت لاہور /26 ستمبر 2010ء

5

جناب کموڈور طارق مجید نے اپنی تالیف بعنوان "The Divine Imprint on the birth of Pakistan جمعۃ الوداع 27 رمضان المبارک 1366ھ" عنایت فرمائی تا کہ میں ان کی تالیف کے بارے میں اپنی رائے سے ان کو آگاہ کروں۔ میں نے اس تالیف کا ایک سے زیادہ مرتبہ مطالعہ کیا اور مجھے اس کتاب میں تو صرف اور صرف اس بات کی تکرار نظر آئی:

> "This country was brought into being at a most blessed time ... " (p. 69)

یعنی: "یہ ملک ایک نہایت مبارک ساعت میں قائم ہوا۔"

اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ پاکستان کو برطانیہ کی طرف سے ایک بہت ہی مبارک وقت میں اقتدار منتقل ہوا تو پھر بھی سوال یہ ہے کہ اس مبارک گھڑی کی وجہ سے اہل پاکستان کو کیا فوائد حاصل ہوئے اور اہل بھارت کو کیا نقصان ہوا اور یہ کہ موصوف کو کس وجہ سے یقین ہو گیا کہ "14، 15 اگست 1947ء کی درمیانی شب جو انڈیا میں 27 رمضان تھی، لازماً لیلۃ القدر ہی تھی"؟ اس کے لیے موصوف نے کوئی دلیل پیش نہیں کی۔

ہم سب جانتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق لیلۃ القدر رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں کوئی ایک طاق رات ہے جس میں اللہ تعالیٰ سے کی گئی مناجات کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے قبول فرماتا ہے، لیکن کوئی شخص کیونکر یقین سے کہہ سکتا ہے کہ 27 رمضان المبارک

بمطابق 14، 15 اگست 1947ء کی درمیانی شب ہی لیلۃ القدر تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس سال 29,25,23,21 رمضان میں سے کوئی شب لیلۃ القدر ہو۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ انڈیا میں 1947ء کے سال 14 اور 15 اگست کی درمیانی شب 27 رمضان ہی لیلۃ القدر تھی۔ یہی شب دو گھنٹہ کا سفر کر کے جب سعودی عرب پہنچی تو وہ 28 رمضان تھی کیونکہ وہاں چاند عام طور پر ایک روز قبل نظر آ جاتا ہے اور وہی شب چار گھنٹہ قبل ملائیشیا اور انڈونیشیا میں 26 رمضان تھی کیونکہ وہاں چاند ہم سے بھی ایک روز بعد نظر آتا ہے۔ لہٰذا وہی رات نہ تو سعودی عرب میں رمضان کے آخری عشرہ کی طاق رات تھی اور نہ انڈونیشیا میں تھی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ لیلۃ القدر کس مقام سے شروع ہوئی اور کس مقام پر ختم ہوئی کیونکہ زمین سپاٹ / ہموار تو ہے نہیں کہ دن اور رات سب جگہ ایک ہی وقت میں شروع ہوتے ہوں۔ دن اور رات تو آگے پیچھے بندھے ہیں۔ اگر ہمارے ہاں دن ہے تو زمین کے آدھے حصے پر رات ہے۔ اس مسئلہ کو کموڈور طارق مجید جیسے چند دانش ور حضرات نے جو اہمیت تقسیم برصغیر کے معاملے میں دے رکھی ہے وہ فہم سے بالا ہے۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ آخر 14، 15 اگست 1947ء کی درمیانی شب کے لیلۃ القدر ہونے کا برصغیر کے مسلمانوں کو کیا فائدہ ہوا۔ کیا اس سے مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتلِ عام رک گیا؟ کیا لیلۃ القدر کی برکت سے مسلم خواتین مشرقی پنجاب میں بے آبرو ہونے سے بچ گئیں؟ کیا لیلۃ القدر کی وجہ سے کشمیر کا پاکستان سے الحاق ہو گیا؟ اگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تو اس بات کو کہ "پاکستان کا قیام لیلۃ القدر کی مبارک شب کو ہوا تھا" دہرائے چلے جانے کا فائدہ؟

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے قیام کی تاریخ اور دن 27 رمضان المبارک / جمعۃ الوداع ہونا جزا کے نہیں، سزا کے طور پر تھا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہندستان ایک ایسا ملک دیا تھا جو میدانِ دعوت و تبلیغ تھا۔ یہ ہمارا ملک تھا، جس پر ہمیں فخر تھا۔ ہمارے بزرگ، ہمارے صوفیہ و علماء صدیوں سے ہندستان کو اپنا ملک قرار دیتے چلے آ رہے تھے۔ ان کی محنت، توجہ اور کوششوں سے ہندو اور سکھ اسلام قبول کرتے چلے آ رہے تھے۔ اس ملک میں مسلمانوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ یقین واثق تھا کہ عنقریب ہندستان میں مسلمانوں کی اکثریت ہو جائے گی۔ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب تفہیمات الٰہیہ میں اپنا الہامی کشف تحریر فرمایا ہے:

"ایک وقت آئے گا کہ ہندستان کی اکثریت کے شرفاء اسلام قبول کر لیں گے اور

تاتاریوں کی طرح اس قوم کے ہاتھ میں بھی توحیدِ اسلامی کا پرچم ہوگا۔" (1)

1920ء میں ہندوؤں نے "شدھی" کی جو تحریک چلائی تھی اُس شر میں خیر کا پہلو یہ سامنے آیا کہ مسلمان خوابِ غفلت سے بیدار ہو گئے اور انھوں نے دعوت و تبلیغ کے بھولے کام کو سنبھالا۔ تبلیغی جماعت جیسی تحریک معرضِ وجود میں آ گئی۔ دعوت و تبلیغ کا کام عام ہوا۔ یہی وہ دور تھا جب انگریز سامراج کے خلاف تحریک جاری تھی۔ انگریز کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ زیادہ عرصہ برصغیر پر قابض نہیں رہ سکے گا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس خطہ میں آنے والا دور مسلمانوں کا ہوگا۔ انھوں نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ دو قومیت کا نظریہ پیش کیا۔ ان ایجنٹوں نے الگ ملک کے لیے تحریک چلائی۔ اس میں تمام مسلم روایات کو بُری طرح پامال کیا گیا۔ تحریک آزادی کے حقیقی راہ نماؤں کی توہین کی گئی۔ ان کو بے عزت کیا گیا۔ ان پر شراب پھینکی گئی۔ ان کی داڑھیوں کو نوچا گیا۔ ان پر تھوکا گیا۔ انھیں گالیاں دی گئیں۔ ان کی پگڑیوں اور ٹوپیوں کو پاؤں تلے روندا گیا۔ ان کے سامنے ننگا ہو کر ناچا گیا۔ رذالت کی انتہا یہ ہے کہ 1943ء میں مولانا ابوالکلام آزاد جیل میں تھے، اس اثنا میں ان کی عفت مآب رفیقۂ حیات کا انتقال ہو گیا۔ مسلم لیگی بدمعاش لاٹھیاں لے کر آ گئے۔ یہ کہ کر لوگوں کو جنازے اور تدفین سے منع کیا کہ جو شرکت کرے گا، اس کی ٹانگیں توڑ دیں گے۔ وہ اکابر رہنما جنھوں نے آزادی کے لیے دس دس سال جیلیں کاٹیں، انھیں غدار کہ کر بدنام کیا گیا۔ نواب آف قلات، گورنر بلوچستان اور مسٹر جناح کے رفیقِ خاص جناب احمد یار خاں بتاتے ہیں:

"کانگریس کے زیرِ اثر مسلمانوں کو وہ (یعنی جناح صاحب) غدار کہا کرتے تھے۔" (2)

یہ بات کس قدر تکلیف دہ ہے کہ غدار، وفادارانِ ملک و ملت کو غدار کہ کر بدنام کر رہے تھے، نا صرف بدنام کر رہے تھے بلکہ اُنھیں طرح طرح سے تکلیفیں اور اذیتیں پہنچا رہے تھے۔ لیکن وقت اور حالات نے ثابت کر دیا کہ غدار وہ تھے جو کہ رہے تھے نا کہ وہ جنھیں غدار کہا جا رہا تھا۔ تقسیمِ ہند و قیامِ پاکستان کی تاریخ نے بھی واضح کر دیا کہ موقف بھی اُنھی کا درست تھا جنھیں غدار کہ کر بدنام کیا جا رہا تھا۔ علمائے حق کی سیاسی بصیرت و فراست کا اعتراف 1947ء سے اب تک مسلسل کیا جا رہا ہے۔ لیکن بعض بیمار ذہنیت کے لوگ بڑی ڈھٹائی سے سب کچھ واضح ہو جانے کے باوجود اُن اکابر علماء اور اُن کے پیروکاروں کو آج بھی طعن و تشنیع کا نشانہ بنانے سے باز نہیں آتے۔ اس حوالے

سے ممتاز عالمِ دین اور مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی کی روایت اور ان کے ریمارکس اور اس پر تنظیم اسلامی پاکستان کے بانی ڈاکٹر اسرار احمد کا تبصرہ لائقِ مطالعہ ہے اور چشم کشا بھی۔ اس سے یہ بات بھی آشکار ہو جاتی ہے کہ ہم پاکستانیوں پر ہر لحہ آفات و بلیات کی بارش جو ہوتی رہتی ہے تو اس کی اصل وجہ اور سبب کیا ہے؟ مولانا اصلاحی مولانا سیّد حسین احمد مدنی کے حلقۂ ارادت سے وابستہ نہیں تھے، بلکہ وہ مولانا مدنی کے مخالف کیمپ کے آدمی تھے۔ وہ جماعت اسلامی کے بانی رکن تھے جبکہ ڈاکٹر صاحب تو تھے ہی بڑے کٹر مسلم لیگی۔ وہ آخر وقت تک دو قومی نظریہ کے علم بردار رہے۔ انھوں نے قیامِ پاکستان کے جواز اور دو قومی نظریہ کے حق میں چھوٹی بڑی دس بارہ کتابیں تالیف کی تھیں۔ چونکہ ہر دو حضرات مولانا مدنی کے مقام و مرتبہ سے آگاہ تھے اس لیے ان کے مداح اور معترف تھے۔ واضح ہو کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ تحریر 1970ء کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''ان حضرات پر (یعنی وابستگانِ جمیۃ علمائے اسلام پاکستان پر) ''کانگریسی مولوی'' کی پھبتی سن کر خدا جانتا ہے کہ دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے، اس لیے کہ اس کی اوّلین زد مولانا حسین احمد مدنیؒ ایسے اکابرِ ملت، مجاہدینِ حریت اور زعمائے دین پر پڑتی ہے، جن کے سیاسی موقف سے چاہے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے علم و فضل، تقویٰ و تدیّن، خلوص و بے نفسی، عزم و ہمت، جانفشانی و تندہی، قربانی و ایثار اور حلم و تواضع کی کوئی دوسری مثال مسلم ہند کی ماضیٔ قریب کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔ مولانا مدنیؒ کی زیارت کا شرف ہماری گنہگار آنکھوں کو تو حاصل نہیں ہوا لیکن ان کی اس ''کرامت'' کا مشاہدہ ہم نے بچشم سر کیا ہے کہ کتنے ہی مخلص اور متدیّن لوگوں کی آنکھوں سے ان کا نام سنتے ہی آنسوؤں کا دریا بہہ نکلتا ہے۔ اور حلقہ دیوبند کے مدارس کی وہ زیرِ تعلیم نوجوان نسل جس نے مولانا کو نہ دیکھا، نہ سنا، ان کی توہین پر مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ اور ذاتی طور پر ہمارے لیے تو سب سے بڑی شہادت مولانا امین احسن اصلاحی کی ہے جن کے الفاظ میں، ''مولانا مدنیؒ صرف اپنی سیاسی رائے کے سوا ہر اعتبار سے ایک مثالی شخصیت تھے۔''

اس سلسلے میں ایک واقعہ بھی ایک مرتبہ مولانا اصلاحی نے سنایا کہ جن دنوں کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش زوروں پر تھی اور مولانا مدنیؒ اور اُن کے رفقاء تنقید و استہزاء کا ہدف بنے ہوئے تھے، ایک روز خبر آئی کہ کچھ لیگی نوجوانوں نے مولانا کے ساتھ نہایت توہین و تذلیل کا معاملہ کیا۔ ان دنوں دارالاسلام سرنا، پٹھان کوٹ میں عام معمول یہ تھا کہ شام کے وقت ہم سب لوگ اکٹھے سیر کے لیے نہر پر جایا کرتے تھے، گویا یہ ان دنوں کی مرکز جماعت اسلامی کی شام کی نشست تھی۔ وہاں مولانا مودودی سمیت کچھ لوگوں نے اس خبر پر خوش گپی کے انداز میں تبصرے کرنے شروع کیے، لیکن میں خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد مولانا مودودی نے مجھ سے بھی کچھ کہنے کی فرمائش کی تو میں نے کہا کہ ''میں اور تو کچھ نہیں جانتا لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ جس قوم نے مولانا مدنی ایسے شخص کی توہین کی ہے اس پر یقیناً کوئی بہت بڑی آفت آنے والی ہے!'' اس پر پوری مجلس پر خاموشی طاری ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا مودودی نے کہا کہ ''مولانا! آخر جو لوگ قوم کے احساسات و جذبات کا بالکل لحاظ نہ کریں ان کے ساتھ قوم کبھی گستاخی بھی کر گزرے تو کونسی بڑی بات ہے!'' اس پر میں نے مزید تو کچھ نہ کہا لیکن اپنے اس فقرے کو دُہرا دیا: ''میں اور تو کچھ نہیں جانتا، صرف یہ جانتا ہوں کہ جس قوم نے مولانا مدنی ایسے شخص کی توہین کی ہے اس پر یقیناً کوئی بہت بڑی آفت آنے والی ہے!''

ذاتی تقویٰ و تدیّن کے علاوہ اب تو ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو اِن حضرات کے سیاسی موقف کے بارے میں بھی اپنی رائے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ خود مولانا احتشام الحق تھانوی نے آج سے تقریباً تین سال قبل جامعہ اشرفیہ لاہور میں جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کچھ ایسے الفاظ کہے تھے کہ ''اب جو حالات پیش آ رہے ہیں ان کو دیکھ کر تو خیال ہوتا ہے کہ تحریک پاکستان کے بارے میں ان حضرات کی رائے زیادہ درست تھی جو کہتے تھے کہ پاکستان میں فروغ اسلام کو نہیں، فرقِ باطلہ اور الحاد و اباحیت کو حاصل ہوگا!'' لیکن بات یہاں تک نہ پہنچے تو بھی کم از کم اتنا تو ہونا چاہیے کہ اس وقت کی ضدم ضدا میں جو زیادتیاں ایک دوسرے پر ہو گئی تھیں، اب کم از کم ان کا اعادہ تو نہ ہو۔

ہم خود اپنا یہ ذاتی احساس بھی اس مقام پر بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ بقیہ تمام

معاملات اور قیل وقال ایک طرف، کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں کے مسئلے کے اعتبار سے تو کبھی کبھی شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ کہا تھا کہ ''پاکستان کی سکیم سے ہندوستان کے مسلمانوں کی قوت جو پہلے ہی تہائی ہے وہ تو تین حصوں میں بٹ کر مزید کم ہو جائے گی اور ہندوؤں کی طاقت بالکل یکجا اور مجتمع رہے گی!'' ان کا خیال کس قدر درست تھا!

اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ جب بھی ہندوستان کے مسلمانوں کے کسی تازہ قتل عام کی خبر آتی ہے دوسرے لاکھوں اور کروڑوں حساس مسلمانوں کی طرح راقم الحروف کے دل پر بھی چھریاں چل جاتی ہیں اور نہ صرف یہ کہ یہاں کا شکھ چین کاٹ کھانے کو دوڑنے لگتا ہے بلکہ سیّدنا مسیحؑ کی تمثیل کے عین مطابق ہر کھانا ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کا گوشت اور ہر مشروب ان کا خون نظر آنے لگتا ہے!

ہمیں دوسروں سے تو کوئی گلہ نہیں لیکن حیرت ناک افسوس ہوتا ہے حلقہ دیوبند ہی کے ان اکابر پر جو نہ صرف درس وافتاء بلکہ تلقین وارشاد کی مسندوں پر رونق افروز ہوتے ہوئے بھی ایسے کٹھور دِل واقع ہوئے ہیں کہ کچھ سیاسی یا زود پہلی مصلحتوں کی بنا پر اب بھی ان خادمانِ دین وملت پر کانگریسی مولوی ایسی تحقیر آمیز پھبتی کسنے سے باز نہیں رہتے!''(3)

جناح کی تربیت ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ مسلم لیگیوں نے تحریک پاکستان [1940ء تا 47ء] میں نہ صرف اسلامی شخصیات کی توہین کی، بلکہ اسلامی شعائر کو بھی بری طرح پامال کیا۔ انھوں نے تو رمضان ایسے مبارک مہینے کا احترام بھی ملحوظ نہیں رکھا۔ لوگ مسجدوں میں تراویح پڑھ رہے ہوتے، تہجد پڑھ رہے ہوتے، اعتکاف میں عبادت کر رہے ہوتے، شب بیداری میں مصروف ہوتے، ایسے میں بازاروں میں مسلم لیگ کے جلسے ہو رہے ہوتے، جلوس نکل رہے ہوتے۔ ان میں ہندو مسلم منافرت پر مبنی اشتعال انگیز نعرے لگتے تھے کہ مر کے لیں گے پاکستان، مار کے لیں گے پاکستان وغیرہ وغیرہ۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی اپنی آپ بیتی یاد ایام میں لکھتے ہیں:

''یہ ناکارہ چچا جان [حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی] نور اللہ مرقدہٗ [بانی تبلیغی جماعت] کے وصال کے بعد سے عزیزم مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ [امیر ثانی

تبلیغی جماعت] کے اصرار پر اکثر پورا رمضان بستی نظام الدین دہلی اعتکاف میں گزارتا تھا، لیکن 64ھ کے رمضان کا نصف حصہ سہارن پور گزارا۔ لیگیوں کا یہ نعرہ پاکستان لے کر رہیں گے، مر کر لیں گے، مار کر لیں گے، خون سے لیں گے، ہر جلوس کا خاص نعرہ تھا۔ لیکن رمضان کی راتوں میں تراویح کے بعد سے لے کر سحر کے وقت تک یہ نعرے کانوں میں پڑتے رہتے تھے۔ میں نے بہت لوگوں سے منع کروایا اور بار بار کہلوایا کہ رمضان مبارک کی یہ راتیں اجابتِ دعا کی ہیں، اس کے درمیان میں تم پاکستان ضرور مانگو مگر مار کر، خون سے نہ مانگو۔ لیکن ایک جوش اور خمار سوار تھا۔ حدیث پاک میں آیا ہے کہ اپنی اولاد اور مال کو بددعائیں نہ دیا کرو۔ اللہ جل شانہٗ کے لیے بعض اوقات ایسے ہوتے ہیں جس میں جو مانگو وہ ملتا ہے۔ فَاِنَّ لِلّٰہِ سَاعَاتٍ لَا یَرُدُ فِیْھِنَّ سَائِلًا۔ یہ مضمون متعدد الفاظ کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ مشکٰوۃ شریف میں بروایت مسلم حضرت جابرؓ سے نقل کیا گیا کہ اپنے نفسوں پر بددعائیں نہ کرو اور اپنے مال واولاد پر بددعائیں نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ تمھاری بددعا ایسے وقت میں ہو جس میں اللہ تعالیٰ شانہٗ قبول کر لے...... بہر حال لیگیوں کی بددعائیں قبول ہوئیں اور ہندستان تقسیم ہوا، لیکن وہی ہوا جو رمضان کی مبارک راتوں میں مانگا تھا۔ مار کر، مر کر اور خون بہا کر پاکستان لیا۔''(4)

مسلم لیگی رمضان المبارک ایسے مقدس ومبارک مہینے کی مبارک ساعتوں میں ایسے جلوس جلسے سہارنپور میں ہی نہیں، بلکہ پورے ہندستان میں کرتے تھے، جن میں ہندو مسلم منافرت کو فروغ، اکابر علماء کو گالیاں اور اسلامی شعائر کی توہین کی جاتی تھی۔ مساجد کے سامنے آکر تو یہ لوگ زیادہ اُدھم مچاتے تھے۔ زیادہ خباثت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ واقعی وہی ہوا جس کا خدشہ مولانا کاندھلوی محسوس کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جزا کے طور پر نہیں، بلکہ سخت سزا کے طور پر رحمت و مغفرت اور عظمت والی رات کو اور عظیم ترجمۃ الوداع کے دن کو قیام پاکستان کا اعلان کروایا اور اس موقع پر جو قتل وغارت ہوئی، جو تباہی مچی، اس کی مثال پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اگر اس رحمت ومغفرت اور عظمت والی رات اور عظیم تر دن کو پاکستان کا بننا ہمارے لیے باعثِ خیر وفلاح ہوتا تو پندرہ لاکھ کی تعداد میں مسلمان قتل نہ ہوتے۔ ہماری 90 ہزار بہنیں بیٹیاں اغوا نہ ہوتیں۔

ہماری لاکھوں مسجدیں، مدرسے، کتاب خانے (علمی ذخائر)، مکتبے (اشاعتی ادارے) اور مزارات وقبرستان تباہ وبرباد نہ ہوتے؟ اگر آپ میں ہمت اور تاب ہے تو تقسیم ہند کے موضوع پر لکھی گئی سوسوا سو کتابوں میں سے قدرت اللہ شہاب کی کتاب یاخدا، مرتضیٰ احمد خاں میکش کی کتاب اخراج اسلام از ہند، باری نجیب آبادی کی کتاب محشر ستانِ ہند اور شبیر احمد خاں میواتی کی کتاب 1947ء میں مسلمانانِ میوات کا قتلِ عام پڑھیے۔ آپ بے اختیار پکار اُٹھیں گے کہ واقعی پاکستان کا قیام 27 رمضان المبارک اور جمعۃ الوداع کو جزا کے طور پر ہرگز نہیں بلکہ سزا کے طور پر تھا۔ جزا کے طور پر بنتا تو ہم پاکستانی 47ء سے اب تک مسلسل حالتِ عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔ ہمارا کوئی لمحہ تو چین سکون سے گزرا ہوتا۔ ہماری ڈھٹائی کی حد ہے کہ ہم سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کا 27 رمضان المبارک اور جمعۃ المبارک کو بننا خاص انعام ربی اور مشیت ایزدی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم یہ کہہ کر اللہ تعالیٰ کے قہرو غضب کو دعوت دے رہے ہوتے ہیں جبکہ ہمارے قائدین نے تو جن مقاصد کے لیے تحریک پاکستان کے دوران مسلمانوں سے ووٹ لیے تھے اور حلفاً جو وعدے کیے تھے، ان میں سے کسی ایک کو بھی پورا نہیں کیا۔ مسٹر جناح سے لے کر مسلم لیگ کے اب تک کے تمام لیڈران میں سے کسی ایک نے بھی اس طرف توجہ نہیں دی۔ کیا پاکستان میں اسلامی قوانین کا نفاذ ہوا؟ کیا یہاں معاشی خوش حالی آئی؟ وغیرہ وغیرہ۔

47ء سے لے کر آج تک ہم پر ایک سے بڑھ کر ایک بُرے لوگ حکمرانی کرتے چلے آرہے ہیں۔ دراصل یہ بھی سزا کے طور پر ہو رہا ہے۔ ہم نے اکابر راہ نماؤں کی ناقدری کی، ان کی توہین کی، گم راہ لوگوں کو اپنا قائد بنایا تو اللہ تعالیٰ نے بطور سزا کے ہم پر کیسے کیسے لوگ مسلط کیے اور اب تک کرتے چلے آرہے ہیں۔ 2008ء میں الحمرا ہال لاہور میں منعقدہ یوم حمید نظامی کی تقریب سے مسلم لیگی خاتون سیاست دان محترمہ تہمینہ دولتانہ نے خطاب کرتے ہوئے نہایت تاسف کے ساتھ کہا تھا کہ ”معلوم نہیں ہم پاکستانیوں سے کیا گناہ سرزد ہوا جس کی پاداش میں آصف علی زرداری ایسا کرپٹ شخص ہم پر حکمران بنا۔“ ہم پاکستانیوں سے گناہ آج نہیں بلکہ 47ء سے پہلے ہی ہوئے تھے، جن کی سزا مسلسل مل رہی ہے۔ غدار اعظم میر جعفر کے پوتے سکندر مرزا کا پہلے گورنر جنرل آف پاکستان بننا اور پھر پاکستان کا پہلا صدر بن جانا کیا محض اتفاق تھا؟ کیا پرویز مشرف

جیسے کمینے شخص کا صدرِ پاکستان بن جانا بھی محض اتفاق ہے اور اب آصف علی زرداری جیسے کرپٹ ترین شخص کا بطور صدرِ پاکستان ہم پر مسلط ہو جانا بھی محض اتفاق ہی ہے؟؟ ہرگز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بطور سزا کے ایسے لوگوں کو پاکستان پر مسلط کیا تھا اور کر رہا ہے۔ اس سلسلہ میں اور کس کس کا نام لیا جائے۔

یہاں یہ وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ سکندر مرزا، میر جعفر کا پوتا ہی نہیں تھا، جناح صاحب کا خاص معتمد بھی تھا۔ اُس نے مسلم لیگ کو منظم کرنے میں بطور ڈی۔سی پشاور کیا کچھ کیا، ایک الگ موضوع ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم برصغیر کے مسلمانوں نے مسلم لیگ کی بے دین و بے عمل قیادت کے زیر اثر آتے ہی اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں اور ناراضیوں کا ارتکاب شروع کر دیا تھا۔ ہم نے نہ صرف 1940ء سے 47ء تک تحریک پاکستان کے دوران بہت زیادہ عظمت وفضیلت والے ماہِ مقدس کا احترام نہیں کیا بلکہ 1947ء سے آج تک ہم اس ماہِ مبارک کے تقدس کو بُری طرح سے پامال کرتے چلے آرہے ہیں۔ دنیا بھر میں لوگ (بہ شمول مسلمان) اپنے تہواروں، اپنے مبارک دنوں میں ضروریاتِ زندگی کی اشیاء کو سستا کر دیتے ہیں، پاکستان دنیا بھر میں ایک ایسا ملک ہے جس میں ہم اس مقدس ومحترم مہینے میں اشیائے خورد ونوش اور دیگر ضروریات زندگی کو انتہائی مہنگا کر دیتے ہیں۔ اتنا مہنگا کہ یہ چیزیں ایک غریب تو کیا، متوسط الحال آدمی کی قوتِ خرید سے بھی بہت دور ہو جاتی ہیں۔ کیا ہم ایسا کر کے اللہ تعالیٰ کے قہر وغضب کو دعوت نہیں دیتے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہمارے ہاں پاکستان میں لوگ معاشی حالات سے مجبور ہو کر رمضان مبارک میں ہی سب سے زیادہ خودکشیاں کرتے ہیں۔ ایسا تو ہندستان میں بھی نہیں ہوتا۔ وہاں کی حکومت رمضان المبارک کے احترام میں اشیائے ضرورت کو سستا کر دیتی ہے۔ جناب قمر علی عباسی اپنے کالم ”اور پھر بیاں اپنا“ میں لکھتے ہیں:

> ”ہندوستان میں نہ انتخابات کا موسم ہے، نہ کوئی بڑا سانحہ ہوا ہے، اس کے باوجود ڈاکٹر من موہن سنگھ دلی میں پرائم منسٹر ہاؤس کے قریب واقع ایک مسجد میں پہنچ گئے، عام مسلمانوں سے ملاقات کی، قیمتوں کے بارے میں دریافت کیا اور ایک حکم کے ذریعے ماہِ رمضان میں استعمال ہونے والی اشیاء سفید چنا، کالا چنا، لوبیا، مسور، ماش کی دال،

ارہر کی دال، سوجی، چینی، گڑ، ہر قسم کے مشروبات کی قیمتوں پر ساٹھ فیصد کمی کا حکم دیا۔ دلی، لکھنؤ، ممبئی، کانپور، احمد آباد، بڑودہ، گوہرہ، گوہاٹی، پٹنہ، رانچی، کلکتہ، حیدرآباد، دکن، بنگلور کے شہروں میں ہر قسم کی دال پینتالیس روپے کلو، گڑ بارہ روپے کلو، چینی اٹھارہ روپے، سوجی نو روپے، بیسن اٹھائیس روپے، ارہر کی دال اٹھائیس، سفید چنا بائیس اور کالا چنا چودہ روپے فی کلو فروخت ہونے لگا۔ ہندو مسلم سویٹ ایسوسی ایشن نے اعلان کیا ہے کھجلہ پھینی ستر روپے کلو اور خالص گھی کا کھجلہ پھینی ایک سو دس روپے کلو، پورے ملک میں فراہم کیا جائے گا۔ عید کے لیے مٹھائیاں تیس فیصد رعایت سے دستیاب ہوں گی۔ دلی کے دودھ فروشوں نے دودھ پچیس روپے اور دہی چھبیس روپے کلو فروخت کرنے کا اعلان کیا ہے۔ ہندو مسلم بیکرز نے اپنی اشیاء پر چالیس فیصد رعایت دینے کی بات کی ہے۔''(5)

پاکستان کا 27 رمضان المبارک اور جمعۃ الوداع کو بننا اگر مبارک تھا تو کم از کم اس حوالے سے ہی رمضان المبارک کا احترام تو ہم کر رہے ہوتے۔ اس مبارک مہینے کے تقاضے تو ہم پورے کر رہے ہوتے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ ہم برصغیر کے مسلمانوں نے مسلم لیگ کی قیادت کے زیر اثر آتے ہی اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں اور ناراضیوں کا اِرتکاب شروع کر دیا تھا اور پھر کرتے ہی رہے جن کی سزا اللہ تعالیٰ نے ہمیں 1947ء میں 27 رمضان المبارک اور جمعۃ الوداع کو دی اور 1947ء سے اب تک مختلف صورتوں میں مسلسل دیتا چلا آ رہا ہے۔ ہم پاکستانیوں کا ہر لمحہ حالاتِ عذاب وعتاب میں گزرتا ہے۔ 2005ء کے ماہِ رمضان المبارک میں جو تباہ کن زلزلہ آیا تھا وہ بھی عذاب وعتاب تھا۔ جس میں اقوامِ متحدہ کے ذیلی ادارے ورلڈ والنٹیئر زویب کی رپورٹ کے مطابق 73 ہزار اَموات اور 30 لاکھ افراد بے گھر ہوئے۔(6) اور اب 2010ء میں جو تباہ کن سیلاب آیا وہ بھی یہ عذاب وعتاب ہی تھا، جو شب برات سے قبل شروع ہوا اور پورے رمضان المبارک میں تباہی مچاتا رہا۔ اقوام متحدہ کی مذکورہ رپورٹ میں اس سیلاب کو ملکی ہی نہیں، انسانی تاریخ کا بدترین سیلاب اور 2005ء کے زلزلہ سے بھی بڑی آفت قرار دیا گیا ہے۔ اقوام متحدہ کی دوسری رپورٹ کا متن پڑھیے:

''جنیوا (اے پی پی) اقوام متحدہ نے 2010ء کو قدرتی آفات کے لحاظ سے گزشتہ دو

دہائیوں کا بدترین سال قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ 2010ء میں قدرتی آفات کے دوران 2 لاکھ 97 ہزار افراد ہلاک ہوئے جبکہ 100 بلین ڈالر کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ رپورٹ کے مطابق پاکستان میں تباہ کن سیلاب سے ملکی معیشت کو ساڑھے 9 ارب ڈالر کا نقصان پہنچا۔''(7)

چونکہ قیامِ پاکستان کی طرح زلزلہ اور سیلاب بھی رمضان المبارک میں ہی آئے تو کیا انھیں انعام خداوندی کہا جائے؟؟؟

اس سیلاب کی مرتبہ تو یومِ آزادی (14 اگست) بھی رمضان المبارک میں ہی آیا تھا، تو کیا یہ بھی انعامِ خداوندی ہے؟ تعجب ہے کہ ہمارے مسلم لیگی تو ان عذاب وعتاب اور آفاتِ سماوی کو بھی انعامِ خداوندی سمجھتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی ایک نافرمان اور بداعمال قوم ہیں، ہم سے واقعی جناح صاحب کی قیادت کو قبول کرنے کی غلطی اور گناہ سرزد ہوا ہے، ان کی قیادت میں ہم نے کبیرہ نافرمانیاں، بداعمالیاں اور گناہ کیے ہیں، جن کی سزا قیامِ پاکستان سے اب تک مل رہی ہے، ہمیں توبہ واستغفار کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ سے معافی کا طلبگار ہونا چاہیے لیکن ہمیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے معافی تب ہی ملے گی جب اپنے گناہوں کا اقرار کریں گے۔ مسٹر جناح اور ان کے رفقا سے برأت ونفرت کا برملا اظہار کریں گے۔

میں یہاں قیامِ پاکستان کی تاریخ کے حوالے سے مسلم لیگ کی ایک احمقانہ کرشمہ سازی کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں، وہ یہ ہے کہ آزادیٔ ہند وقیامِ پاکستان کی تاریخ عیسوی حساب سے 15 اگست اور ہجری حساب سے 27 رمضان تھی اور جمعۃ الوداع کا دن تھا۔ ہم پاکستان میں کئی سال تک 15 اگست کو ہی یومِ آزادی مناتے رہے۔ بعد میں ہم پر یہ منکشف ہوا کہ چونکہ اسی تاریخ کو ہندستان کا یومِ آزادی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی عیسوی تاریخ 15 سے 14 اگست میں تبدیل کر لینی چاہیے۔ جبکہ ہجری 27 رمضان المبارک اور جمعۃ الوداع کا دن ہی ہو۔ اس انتہائی مضحکہ خیز حماقت پر نامور محقق جناب ضیاء الدین لاہوری نے ایک کتابچہ بعنوان پاکستان 15 اگست کو قائم ہوا تھا! لکھا ہے، جو قابلِ مطالعہ ہے۔ ہم یہاں اس حوالہ سے ممتاز کالم نگار جناب حسن نثار کے ایک کالم سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔ پڑھیے اور عبرت حاصل کیجیے!

''...... بھارت بھی 15 اگست کو یومِ آزادی مناتا تھا، اس لیے 1949ء میں پاکستانی

کابینہ نے 14 اگست کو یومِ آزادی منانے کا فیصلہ کیا...... یہ کابینہ تاریخی شعور کے حوالہ سے یقیناً ''نابینا'' تھی، ورنہ اتنا احمقانہ فیصلہ نہ کرتی کہ:

جو تاریخ کو مسخ کرتے ہیں، تاریخ انھیں مسخ کر دیتی ہے؛
جو تاریخ کا مذاق اڑاتے ہیں، تاریخ اُن کا مذاق اُڑاتی ہے؛
جو تاریخ تبدیل کرتے ہیں، تاریخ اُن کے جغرافیے تبدیل کر دیتی ہے؛
جو تاریخ کی نہیں سنتے، تاریخ اُن کی چیخ تک نہیں سنتی؛
جو تاریخ کو سنجیدگی سے نہیں لیتے، تاریخ اُن کو سنجیدگی سے نہیں لیتی؛
اور تاریخ کا ایک سبق یہ بھی ہے کہ جو تاریخ سے سبق نہیں سیکھتے، تاریخ انھیں خود سبق سکھاتی ہے۔

اور ہم مسلمانوں کے ساتھ صدیوں سے یہی ہو رہا ہے۔ بھارت کی وجہ سے اپنا ''یومِ آزادی'' تبدیل کرنا بالکل اسی طرح ہے جیسے دو حریفوں کے گھر ایک ہی دن دو بچے جنم لیں اور اُن میں سے ایک نابینا اپنے بچے کا برتھ ڈے صرف اس لیے تبدیل کر دے کہ دونوں بچوں کی سالگرہ کا دن مختلف ہو جائے۔ تاریخ کے ساتھ ڈنڈی مارنے والوں کو تاریخ ڈنڈے مارتی ہے...... ہم یہ ڈنڈے اور گنڈے ساتھ ساتھ کھا رہے ہیں لیکن سمجھ نہیں رہے!''(8)

سوال یہ ہے کہ تقسیم برصغیر سے قبل برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی مسائل کیا تھے؟ میرے نزدیک برصغیر کے مسلمانوں کا ایک ہی مسئلہ تھا اور وہ تھا انگریزوں کی رخصتی کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کا ہندو غلبہ سے ان صوبوں میں تحفظ جہاں وہ اقلیت میں تھے۔ پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان، اور بنگال میں تو وہ اکثریت میں تھے اور ان صوبہ جات میں مسلمان ہی حکمران تھے۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا تقسیم کے بعد پاکستان کی وجہ سے بھارت کے مسلمانوں کو گزشتہ ساٹھ سال میں کوئی تحفظ حاصل ہوا یا ان کا کوئی مسئلہ حل ہوا یا آئندہ کوئی امکان ہے کہ پاکستان بھارت کے مسلمانوں کو کوئی تحفظ فراہم کر سکے گا؟ یہ سوال جواب طلب ہے کہ تقسیم برصغیر اور قیامِ پاکستان نے برصغیر کے مسلمانوں کا کون سا مسئلہ حل کیا ہے؟ مجھے تسلیم ہے کہ گلبرگ اور ڈیفنس میں مسلمانوں نے جو عشرت کدے بنا لیے ہیں وہ شاید نہ بن پاتے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ جناح صاحب نے

مولانا ابوالکلام آزاد کے سوال کے جواب میں کہا تھا کہ ''بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں کا تحفظ تلوار سے کیا جائے گا۔'' تو کیا ہم کر سکے؟ واقعی شیخ چلی جیسے لوگ ہر دور میں ہوتے ہیں۔ جناح صاحب بھی ان سے مختلف نہیں تھے۔ جناح صاحب کو تو اس سے غرض ہی نہیں تھی کہ اس کی سیاست کے نتیجہ میں مشرقی پنجاب میں مسلمانوں سے کیا سلوک ہوگا۔ پاکستان کا دستور اساسی کیا ہوگا۔ بھارت کے مسلمان تو جناح صاحب کا مسئلہ کبھی تھے ہی نہیں۔ اسی لیے اس نے دہلی سے کراچی کے لیے پرواز کرتے ہوئے اپنے بیان میں بھارت کے مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اب بھارت کے وفادار شہری بن کر رہیں۔ تقسیم سے قبل بھارت میں رہ جانے والوں کے بارے میں جناح صاحب کس قدر فکر مند تھے وہ چھاگلا صاحب سے سن لیجیے:

" I remember once asking Jinnah: " you are fighting for Pakistan mainly in the interest of Muslim majority states. But what happens to the Muslims in the States particularly Utter Pradesh,where they are in small minority? " I will never forget the answer he gave me. He looked at me for a while and said "They will look after themselves. I am not interested in their fate."(9)

ترجمہ: ''مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں نے جناح سے پوچھا: آپ پاکستان کے لیے لڑائی مسلم اکثریت کے صوبوں کے مفاد کے لیے لڑ رہے ہیں لیکن ان مسلمانوں کا کیا ہوگا جو مسلم اقلیتی صوبوں، بالخصوص اتر پردیش میں رہتے ہیں۔ انھوں نے مجھے جو جواب دیا وہ میں کبھی نہیں بھول پاؤں گا۔ انھوں نے تھوڑی دیر میری طرف دیکھا اور کہا: وہ اپنا خیال خود رکھیں گے مجھے ان کے مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

کیا ہم نے واقعی بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں کے ساتھ وہی سلوک نہیں کیا جو اوپر دیے گئے جناح صاحب کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے؟

یہی بات چودھری خلیق الزماں نے (جو جناح صاحب کے بعد پاکستان مسلم لیگ کے صدر بنے) جناح صاحب کے بارے میں بیان کی ہے:

''وہ (یعنی جناح صاحب) ہندستان کی مسلم اقلیت کو اکثر اپنی گفتگو میں کہہ چکے تھے کہ انھوں نے ان کو رائٹ آف کر دیا ہے (یعنی اپنی ذمہ داری سے خارج کر دیا ہے۔'' (10)

سوال یہ ہے کہ جناح صاحب اور اُن کے ہم نوا حضرات مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں سے جب پاکستان کے لیے ووٹ مانگ رہے تھے تو اس وقت ان کو بتایا تھا کہ پاکستان بن جانے کے بعد جناح صاحب خود تو پاکستان کے گورنر جنرل بن جائیں گے لیکن بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں کو رائٹ آف (Write Off) کردیں گے؟ یعنی لاتعلق ہوجائیں گے، اپنی ذمہ داری سے خارج کردیں گے۔ اگر نہیں تو اسے دھوکا دہی کے علاوہ کیا نام دیا جاسکتا ہے۔

اندراگاندھی نے تو 1971ء میں پاکستان کو فوجی شکست دے کر یہ کہا تھا کہ ''میں نے دوقومی نظریہ کو خلیج بنگال میں غرق کردیا ہے'' درحقیقت جناح صاحب تو اس نظریہ کا کریا کرم اپنی زندگی میں ہی کر چکے تھے جب انھوں نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس میں اعلان کردیا تھا کہ:

" I think we should keep in front of us as our ideal and you will find that in the course of time Hindus would cease to be Hindus and Muslims would cease to be Muslims, not in religious sense, because that is the personal faith of each individual but in the political sense as citizen of the State."(11)

ترجمہ: ''میرا خیال ہے کہ ہمیں اس بات کو اپنے نصب العین کے طور پر سامنے رکھنا چاہیے کہ وقت کے ساتھ ہندو، ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے مذہبی حوالے سے نہیں، کیونکہ وہ تو ہر فرد کا ذاتی معاملہ ہے بلکہ سیاسی حوالے سے ایک

ریاست کے شہری ہونے کی حیثیت سے۔''

سوال یہ ہے کہ اگر کچھ مدت گزرنے کے بعد پاکستان میں ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے تو پھر وہ کیا بن جائیں گے؟ اس کا جواب ظاہر ہے کہ وہ پاکستانی بن جائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان میں بھی ہم وطن کی بنیاد پر ایک پاکستانی قوم تشکیل دیں گے یعنی وطنی قومیت کا نظریہ اختیار کرلیں گے جو متحدہ ہندستان میں مسلمانوں کے لیے حرام تھا اور اس کے علمبردار مسلمانوں کے دشمن تھے، لیکن پاکستان میں وہ عین مطلوب ہوگیا۔ متحدہ برصغیر میں جو ناخوب تھا، وہ پاکستان میں خوب ہوگیا۔ جو ناحق تھا وہ عین حق ہوگیا۔

اگر ہم نے یہی کچھ کرنا تھا تو پندرہ لاکھ مسلمان کس خوشی میں قتل کروائے؟ اور تقریباً نوے ہزار مسلمان عورتیں کس خوشی میں بے آبرو کروائیں؟ کیا کوئی صاحب دانش بتاسکیں گے؟ کیا وقت نے ثابت نہیں کردیا کہ آغا خان، جو بلاشبہ انگریز کے ایجنٹ تھے، اور اس کے معنوی فرزند، جو نہ اسلام کے خیر خواہ تھے اور نہ مسلمانوں کے، انھوں نے پاکستان کے نام سے ایک کٹھ پتلی ریاست (BANANA STATE) اس لیے تخلیق کی تھی کہ وہ یہود و نصاریٰ کے آلہ کار کا کردار ادا کرتی رہے۔ مجھے بتایئے کہ اگر پاکستان میں سو فیصد غیر مسلم آبادی ہوتی تو بھی یہ ملک افغانستان کے مسلمانوں کے ساتھ اس سے زیادہ برا سلوک کیا کرتا جو ہم نے مسلمان ہو کر کیا؟ اس کے باوجود ہم مسلمان ہیں اور ہمارا حکمران مجاہد اسلام۔ خدارا کچھ تو اہل پاکستان کو غور کرنا چاہیے اور خوابوں سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آجانا چاہیے۔ کیا روشن خیالی کے نام سے جو کچھ ہورہا ہے، یہ ہمارا ایجنڈا ہے یا یہود و نصاریٰ کا؟

قابل غور سوال یہ ہے کہ ''کیا ہم نے برصغیر کی تقسیم کا مطالبہ کر کے یہ تسلیم نہیں کرلیا تھا کہ اسلام اپنی قوت تاثیر کھو چکا ہے، یا اس میں کبھی کوئی تاثیر تھی ہی نہیں، لہٰذا اب برصغیر میں مسلمان قیامت تک اقلیت میں رہیں گے اور اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ اب غیر مسلم اسلام قبول کرلیں اور یہ مسلم اکثریت کا ملک بن جائے۔ جو مسلمان برصغیر کی تقسیم کے وقت برصغیر میں موجود تھے، وہ سب باہر سے آئے تھے۔ یہاں کی مقامی آبادی میں سے کسی نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ لہٰذا جن علاقوں میں اتفاق سے، نہ کہ اسلام کی قوت تاثیر کی وجہ سے، مسلمان اکثریت میں ہیں ان علاقوں کو انگریزوں سے علیحدہ کروا کے الگ ملک بنوالیا جائے؟'' اسلام کو ایک دھرم تسلیم کرنا اور یہ تسلیم

کرنا کہ مسلمان صرف پیدائشی ہوتا ہے کوئی شخص CONVERT ہو کر مسلمان نہیں ہو سکتا۔ میرے نزدیک یہ تصور ایک جرم عظیم تھا جس کی سزا ہمیں فوری طور پر یہ ملی کہ مشرقی پنجاب میں تقریباً پندرہ لاکھ مسلمان قتل ہوئے اور کم و بیش نوے ہزار مسلمان عورتیں بے آبرو ہوئیں۔ اس کے بعد بھی برصغیر کے مسلمان کسی نہ کسی شکل میں اس جرم کی سزا بھگت رہے ہیں۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ ہمارے مطالبہ تقسیم برصغیر کی بنیاد دو قومی نظریہ تھی کہ قوم مذہب سے بنتی ہے نہ کہ وطن سے اور یہ کہ برصغیر میں دو مذاہب کے لوگ آباد ہیں۔ یہ واقعتاً غلط تھا اور غلط ہے۔ برصغیر میں کئی مذاہب کے لوگ آباد تھے۔ ہم نے کثیر القومی نظریہ پیش کرنے کی بجائے دو قومی نظریہ کی بنیاد پر تمام غیر مسلموں کو دھکیل کر کیوں ہندوؤں میں شامل کر دیا؟ اگر جملہ غیر مسلم (سکھ، عیسائی، پارسی، بدھ، جین) اختلاف مذہب کے باوجود ہمارے نزدیک ایک قوم ہو سکتے تھے تو مسلمان ان میں کیوں شامل نہیں ہو سکتے تھے؟

اب کچھ کموڈور صاحب موصوف کی تالیف کے بارے میں، موصوف فرماتے ہیں:

"Quaid-e-Azam was a spiritually elevated personage. This aspect of his character was concealed from public view by deliberate efforts of a nasty but resourceful lobby, unfortunately, including a band of Mullahs, who wants to portray him as secularist.(p. 12)

ترجمہ: ”قائداعظم ایک بلند پایہ روحانی شخصیت تھے، ان کی شخصیت کا یہ پہلو ایک بدنیت لیکن وسائل رکھنے والے حلقے نے عوام کی نگاہ سے پوشیدہ رکھا ہوا تھا۔ اس (حلقے) میں بدقسمتی سے کچھ ملاّ بھی شامل ہیں جو انھیں ایک سیکولر شخصیت کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں۔“

واقعی یہ ایک المیہ ہے کہ ملاّ حضرات کے ایک باوسائل حلقے نے اس امر پر دانستہ پردہ ڈالے رکھا اور عوام کو اس سے آگاہ نہ ہونے دیا کہ جناح صاحب ایک بلند پایہ ”روحانی شخصیت“ بھی تھے۔ جناح صاحب کی اعلیٰ درجہ کی روحانیت کے بارے میں لوگوں کو علم ان کے قریبی رفقاء

(جی۔ الانہ/ایم۔ سی چھاگلا) کے ذریعہ سے ہوا۔ حال ہی میں جناح صاحب کے ایک اور رفیق نے ان کی روحانیت کی تصدیق کر دی ہے۔ وہ ہیں جناب یوسف ہارون جو سر عبداللہ ہارون کے صاحبزادے ہیں۔ کچھ عرصہ کے لیے لاہور کے گورنر ہاؤس میں بطور گورنر بھی تشریف فرما رہے تھے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً نوے برس ہے۔ پرانے مسلم لیگی ہیں۔ جناب یوسف ہارون نے روزنامہ ”پاکستان“ لاہور کو ایک پینل انٹرویو دیا، جو اس اخبار کے سنڈے میگزین میں 12 اکتوبر 2008ء کو شائع ہوا۔ مبشر میر، نعیم الدین اور نجم مرزا اس پینل میں شامل تھے۔ اس انٹرویو میں پینل نے جناح صاحب کی روحانیت کے بارے میں بھی سوال کیا۔ میں وہ سوال اور جناب یوسف ہارون کا جواب درج کر رہا ہوں:

”سوال: کیا قائداعظم محمد علی جناح لبرل تھے؟

جواب: ہاں، وہ لبرل تھے۔ پہلی دفعہ جب انھوں نے نماز پڑھی تو میرے ساتھ جامع مسجد گئے تھے اور کہنے لگے کہ یوسف! کس طرح نماز پڑھتی ہے۔ میں نے کہا کہ جس طرح میں کروں اسی طرح آپ کرتے رہیں۔ امام صاحب نے جب دیکھا کہ قائداعظم نماز پڑھ رہے ہیں انھوں نے نماز ہی لمبی کر دی“۔(12)

حقیقت یہ ہے کہ مسٹر جناح کو نہ نماز آتی تھی نہ وہ پڑھتے تھے۔ وہ تو رواروی میں بھی نماز نہیں پڑھتے تھے۔ ان کی بے عملی کا ایک اور حوالہ پڑھیے۔ جناح صاحب کے ایک شیدائی، بیوروکریٹ جناب ایم۔ اقبال اپنی آپ بیتی گونج میں لکھتے ہیں:

”ایک روز الطاف حسین کے ساتھ ہارڈنگ روڈ پر واقع لیاقت علی خاں کی کوٹھی پر جانے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت وہاں مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں کیبنٹ مشن دہلی میں موجود تھا اور برصغیر کی تقدیر کے فیصلے ہو رہے تھے۔ مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں منعقد تھی۔ باہر لان میں ملکی اور بیرونی اخباری نمائندے موجود تھے۔ مغرب کی نماز کا وقت ہوا تو مولانا شبیر احمد عثمانی باہر نکلے۔ ملازمین نے صفیں بچھا دیں۔ اذان ہوئی، مولانا عثمانی امامت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ خبر نہیں ورکنگ کمیٹی کے کتنے ممبر باقاعدگی سے نماز ادا کرتے ہوں گے، لیکن اس روز سبھی وضو کرتے دکھائی دیے۔ ان میں لیاقت علی خاں، حسین

امام، عبدالستار سیٹھ، ایوب کھوڑو وغیرہ شامل تھے لیکن قائداعظم نظر نہ آئے۔ وہ سگار سلگائے ڈرائنگ روم میں اکیلے بیٹھے کسی سوچ میں مستغرق تھے۔'' (13)

نماز کے بارے میں آغا خانی روافض کا طرزِ عمل کیا ہے، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوجاتا ہے۔ ہوا یہ کہ کراچی میں چند آغا خانی نوجوانوں نے اسلام قبول کرلیا۔ نوجوانوں کا خون گرم ہوتا اور ایک نومسلم تو ویسے ہی پرجوش ہوتا ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی طرح تمام دنیا کے غیر مسلم فوراً اسلام قبول کرلیں۔ کراچی کے ان نومسلم نوجوانوں کو معلوم نہیں کیا سوجھی کہ انھوں نے اپنے آغا خانی جماعت خانہ میں باجماعت نماز پڑھنے کا اعلان کردیا۔ انتظامیہ نے ان کو جماعت خانہ میں نماز کی ادائیگی سے منع کردیا۔ ان نوجوانوں نے کراچی ہائی کورٹ میں درخواست دے دی کہ ان کی مدد کی جائے۔ ان نوجوانوں کی طرف سے محمد اثر حسین و مظفر الحق ایڈووکیٹس بطور وکیل پیش ہوئے۔ جماعت خانہ کی انتظامیہ کی طرف سے جے ایچ رحمت اللہ اور کبیر الدین ایڈووکیٹس پیش ہوئے اور نوجوانوں کی درخواست کو رد کرنے کی استدعا کی۔ دونوں اطراف سے عدالت کے سامنے دلائل پیش کیے گئے۔ عدالت کی طرف سے اس مقدمہ میں 9 اگست 1990ء کو جو عبوری حکم جاری کیا گیا اس کا وہ حصہ جو ہمارے موضوع سے متعلق ہے۔ درج ذیل ہے:

''یہ ایک درخواست ہے جو حکم نمبر 39 رول نمبر 1-2 ہمراہ سیکشن 151 سی۔ پی۔ سی کے تحت داخل کی گئی ہے کہ عارضی حکم امتناعی جاری کیا جائے جس کے تحت مدعا علیہان کو منع کیا جائے کہ وہ مدعیان کو نہ تو جماعت خانہ میں باجماعت نماز ادا کرنے سے روکیں اور نہ ہی ان کو اس مقدمہ کے فیصلہ ہونے تک جماعت خانہ میں داخلہ سے منع کریں ... یہ بات کسی طرح بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی شخص حقیقی اسلامی اقدار کو بھی اپنائے اور ساتھ ہی ساتھ اسمٰعیلی آغا خانی بھی ہو ... میرے اندازوں کے مطابق مدعیان کی عارضی دادرسی نہیں کی جانی چاہیے ... یہ فیصلہ ایک باقاعدہ کارروائی سے قبل کسی طور بھی مناسب نہیں ہوگا ... دستخط سید عبدالرحمٰن جج'' (14)

سندھ کی عدالت عالیہ کے مذکورہ بالا فیصلہ سے بھی واضح ہوجاتا ہے کہ آغا خانی حضرات نماز نہیں پڑھتے اور نہ ہی کسی کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ ان کے جماعت خانہ میں نماز ادا کرے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ عدالت عالیہ نے بھی یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص

حقیقی اسلامی اقدار کو بھی اختیار کرے اور ساتھ ہی آغا خانی بھی رہے۔ جناح صاحب بھی پیدائشی آغا خانی تھے۔ ان کو بچپن میں نہ تو نماز سکھائی گئی اور نہ ہی کبھی انھوں نے نماز پڑھی۔ اگر کبھی وہ نماز کی جماعت میں شامل بھی ہوئے تو صرف تصویر بنوانے کے لیے۔ جناح صاحب نے نہ تو کبھی آغا خانی اسمٰعیلی عقائد سے توبہ کی اور نہ ہی کسی مجلس میں اسلامی عقائد قبول کرنے کا اقرار اور اعلان کیا۔

مذکورہ حالات میں یہ قابل فہم بھی ہے کہ جناح صاحب کے لیے نماز صرف اٹھک بیٹھک ہی تھی کیونکہ آغا خانی مذہب میں نماز کا تصور تک نہیں ہے اس لیے وہ نماز پڑھتے ہی نہیں، نہ اپنے بچوں کو نماز سکھاتے ہیں۔ جناح صاحب کہاں سے نماز سیکھ لیتے۔ ان لوگوں میں تو نماز سکھائی ہی نہیں جاتی۔ اس کے باوجود کموڈور صاحب کی معلومات کے مطابق وہ اعلیٰ پایہ کی روحانی شخصیت تھے۔ ہم یوسف ہارون صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے جناح صاحب کی روحانیت کی تصدیق کردی اس لیے ہم مان لیتے ہیں۔

جناب کموڈور صاحب اپنی تالیف میں جناح صاحب کے بارے میں مزید فرماتے ہیں:

"His thoughts on building up Pakistan were derived from Islamic teachings".

ترجمہ: ''پاکستان کی تعمیر کے بارے میں ان کے خیالات اسلامی تعلیمات سے اخذ کیے گئے تھے۔''

واقعی پاکستان میں جگہ جگہ اسلامی تعلیمات (Islamic teachings) کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں اور مشرف کے دور حکومت میں چودھری پرویز الٰہی کی زیر نگرانی لاہور میں جو مخلوط میرا تھن دوڑ ایک سے زیادہ مرتبہ ہوئی۔ وہ بھی قرآن و سنت کے احکامات کے مطابق ہوئی۔ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ موصوف کا فرمانا یہ ہے کہ یہ مت دیکھو کہ پاکستان میں کیا ہو رہا ہے۔ صرف اس بات پر خوش ہوتے رہو کہ پاکستان 27 رمضان المبارک کی مبارک شب کو وجود میں آیا تھا۔ موصوف فرماتے ہیں کہ جناح صاحب جو کچھ کر رہے تھے وہ اسلام کے لیے کر رہے تھے۔ میرا سوال یہ ہے کہ پہلے یہ تو بتائیں کہ جناح صاحب نے اسلام قبول کب کیا تھا؟ وہ تو پیدائشی آغا خانی تھے۔ اسلام ان کا آبائی مذہب تھا ہی نہیں۔ ان کے والد جینا بھائی، ان کے دونوں

چچا ولجی بھائی اور نتھو بھائی، دادا پونجا بھائی، ان کی والدہ مٹھی بائی اور ان کی پہلی بیوی ایمی بائی سب آغا خانی تھے اور آغا خانی تو دعویٰ ہی نہیں کرتے کہ وہ مسلمان ہیں۔ قرآن پر ان کا نہ ایمان ہے اور نہ ہی قرآن کی ان کو ضرورت ہے۔ ان کے پاس تو بولتا قرآن حاضر امام کی شکل میں موجود ہے۔ اب یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ جناح صاحب نے اسلام کب کہاں اور کس کے سامنے قبول کیا تھا اور قبول اسلام کے بعد ان کی زندگی میں کیا تبدیلی آئی تھی؟

جناح صاحب نہ صرف شراب پیتے تھے، بلکہ انھوں نے گورنر جنرل ہاؤس میں ستمبر 1947ء میں، جب ہندستان سے بالخصوص مشرقی پنجاب سے لاکھوں مسلمان آگ اور خون کا دریا عبور کرتے ہوئے پاکستان آرہے تھے، جو دعوت دی تھی اس میں اعلیٰ اقسام کی شراب سے مہمانوں کی تواضع کی گئی تھی۔ جناح صاحب سؤر کے گوشت کے سینڈوچ بھی بڑی رغبت سے کھایا کرتے تھے۔ جناح صاحب کو اسلامی معاشرت کا کس قدر لحاظ تھا وہ عرض کیے دیتا ہوں:

" The Jinnahs had been invited to dinner at Bombay's Government House soon after returning from their honeymoon. Ruttie wore one of her lowest cut Paris evening gowns, and Lady Willingdon was quick to order her servant to bring a "wrap to cover-up Mrs. Jinnah ... in case she felt cold. " Jinnah did not wait for the servant's return, jumping up from table to inform his hostess, " when Mrs. Jinnah feels cold , she will say so, and ask for a wrap herself." He escorted his wife from the room."(15)

ترجمہ: ''اپنے ہنی مون سے واپسی پر جناح خاندان کو بمبئی کے گورنمنٹ ہاؤس میں ایک عشائیے پر مدعو کیا گیا۔ رتی نے ایک انتہائی کھلے گلے کا پیرس کا سلا ہوا ایوننگ گاؤن پہن رکھا تھا اور لیڈی ولنگڈن نے فوراً اپنے ملازم کو مسز جناح کے جسم ڈھانپنے

کے لیے کوئی کپڑا لانے کا حکم دیا تا کہ انھیں سردی نہ لگ جائے۔ مسٹر جناح نے نوکر کی واپسی کا انتظار نہیں کیا وہ فوراً اپنی میز سے اٹھے اور میزبان سے کہنے لگے: ''جب بیگم جناح کو سردی لگے گی وہ خود چادر منگوالیں گی۔'' اور اپنی بیگم کو لے کر کمرے سے باہر چلے گئے۔''

محترمہ بیگم جناح کے گاؤن کا گلا اس قدر گہرا کٹا ہوا تھا کہ ایک انگریز خاتون (بیگم گورنر) کو بھی اس پر شرم آگئی اور اس نے چاہا کہ سردی کے بہانے کوئی چادر منگوا کر اس کے کندھے پر ڈال دے تا کہ اس کی نظر آتی ہوئی چھاتیاں چھپ جائیں۔ جناح صاحب کو اپنی بیگم کے جسم کی نمائش پر شرم تو کیا آنا تھی۔ اس نے اس بات پر بھی برا منایا کہ گورنر کی بیگم نے اس کی بیگم کے لیے چادر کیوں منگوائی۔ وہ احتجاج کے طور پر غُراتے ہوئے دعوت چھوڑ کر چلے گئے۔

جناح صاحب اسلامی معاشرت کا کس قدر احترام کرتے تھے، اس کا اندازہ ذیل کی سطور سے ہو جائے گا۔ چھاگلا صاحب لکھتے ہیں:

" I also remeber a Muslim League's meeting in the Globe Cinema in Bombay when Jinnah was the President of the League and I was Secretary. I was in the hall early as I had to look after the arrangements, and in walked Ruttie, dressed in the manner I have just described, up to the platform where she took her seat. The hall was full of bearded Molvies and Moulanas and they came to me in great indignation and asked me who that woman was. They demanded that she should be asked to leave, as the clothes she flaunted constituted an offence to Islamic eyes. I told them that they

should shut their eyes as the lady in question was the President's wife, and I could not possibly ask her to leave the hall."(16)

ترجمہ: ''مجھے یہ بھی یاد ہے کہ بمبئی کے گلوب سینما میں مسلم لیگ کا ایک اجلاس تھا۔ اس وقت جناح لیگ کے صدر اور میں سیکرٹری تھا۔ مجھے چونکہ انتظامات کا جائزہ لینا تھا، لہٰذا میں قبل از وقت ہی ہال میں پہنچ گیا۔ رتی اس قسم کے لباس میں جس کے بارے میں، میں پہلے ہی بتا چکا ہوں، وہ پلیٹ فارم پر گئیں اور اپنی نشست پر بیٹھ گئیں۔ ہال ڈاڑھی والے ملّاؤں اور مولاناؤں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ غصّے میں میرے پاس آئے اور پوچھا کہ یہ عورت کون ہے، اسے یہاں سے جانے کے لیے کہا جائے۔ کیونکہ ان کا لباس اسلامی نگاہوں کے لیے نامناسب ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ اپنی آنکھیں بند کرلیں کیونکہ یہ خاتون مسلم لیگ کے صدر (مسٹر جناح) کی بیوی ہے اور میں ان سے جانے کے لیے نہیں کہہ سکتا۔''

بیگم رتی جناح عام طور پر کس قسم کے لباس میں گھوما کرتی تھیں اس کا ذکر جناب قاضی محمد عدیل عباسی نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میں ایک پھاٹک پر اپنا پاس دکھانے کے لیے لائن میں کھڑا تھا کہ ایک نہایت خوبصورت خاتون نیم برہنہ لباس میں آئیں اور اندر جانا چاہا۔ والنٹیئر نے پاس مانگا تو انھوں نے انگریزی میں کہا کہ میں مسز جناح ہوں۔ والنٹیئر نے انگریزی میں بڑی لجاجت سے کہا کہ ''میں اپنے فرض کی انجام دہی سے مجبور ہوں کہ کسی کو بغیر پاس جانے نہ دوں''، اتنے میں بہترین سوٹ میں ملبوس خود مسٹر جناح تشریف لائے۔ خاتون نے ان کی جانب مخاطب ہوکر انگریزی میں کہا'' جے (J) یہ مجھ سے پاس مانگتے ہیں اور اندر جانے نہیں دیتے''۔ مسٹر جناح نے نہایت خاموشی سے اپنا پاس ان کو دے دیا۔ وہ اندر چلی گئیں''۔(17)

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جناح صاحب کو اسلامی اقدار کا کس قدر لحاظ تھا، لیکن بعض دانش ور حضرات پھر بھی دعویٰ کرتے ہیں ہے کہ جناح صاحب روحانیت سے بھرے ہوئے تھے۔

اگر یہ دانش ور حضرات بھی 1972ء سے بنگلہ دیش کے کسی کیمپ میں پڑے ہوتے تو پھر ان کو جناح صاحب کی روحانیت کا صحیح اندازہ ہوتا۔ بہرحال میں بھی جناح صاحب کی روحانیت کا قائل ہوجاؤں گا جب مجھے علم ہوجائے گا کہ جناح صاحب نے کب، کہاں اور کس کے سامنے اسلام قبول کیا تھا اور اس کے بعد ان کی زندگی میں کیا تبدیلی آئی تھی۔

مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو جناح صاحب کی قیادت کے طفیل جس عذاب سے گزرنا پڑا اس کی توجیہہ جناب طارق مجید نے اپنی تالیف میں صفحہ 58 پر اس طرح کی ہے:۔

" People who do not want to tax their minds or are just simple minded ask, if Pakistan is a gift of God to Muslims and is a Divine Plan, why was its birth accompanied with so much bloodshed and suffering? Yes, it is true, at the time of partition the muslims were subjected to terrible suffering and colossal losses in lives and property. However one may ask why is it that a most marvelous act of creation, the birth of a baby, is accompanied with the severest pains? Why did the first Islamic State face great strife and adversity in the process of its creation and stabilization and why did its founder, the Prophet of Islam (pbuh) and his followers had to suffer immence hardship and pain for many years before and after the establishment of the State of Madinah?"

ترجمہ: ''وہ لوگ جو اپنے ذہنوں پر زور نہیں ڈالنا چاہتے یا ذرا کند ذہن ہیں وہ یہ

پوچھتے ہیں کہ اگر پاکستان مسلمانوں کے لیے خدا کا تحفہ ہے اور ایک خدائی منصوبہ ہے تو پھر اس کے قیام کے ساتھ اس قدر خون خرابہ اور تکالیف کیوں ہوئیں؟ ہاں! یہ درست ہے کہ تقسیم کے موقع پر مسلمانوں کو بے انتہا مصائب اور جانی و مالی نقصان برداشت کرنا پڑا لیکن یہ بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ آخر تخلیق کے انتہائی شاندار عمل یعنی ایک بچے کی پیدائش کے موقع پر اس قدر تکلیف کیوں ہوتی ہے اور یہ کہ پہلی اسلامی ریاست کو اپنے قیام اور حصولِ استحکام کے دوران اس قدر مصائب اور مشکلات کا سامنا کیوں کرنا پڑا؟ اور اس ریاست کے بانی پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کے ساتھیوں کو مدینہ کی ریاست کے قیام سے پہلے اور بعد میں مسلسل کئی برس تک بے انتہا مشکلات اور مصائب کا سامنا کیوں کرنا پڑا؟“

میں نے جب مذکورہ بالا سطور پڑھیں تو مجھے مؤلف موصوف کی جرأت اور جسارت پر ازحد حیرت ہوئی کہ یہ سطور ان کے قلم سے کیسے نکل گئیں۔ بے اختیار میرے ذہن میں یہ شعر آ گیا:

حیران ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

ریاست مدینہ کے قیام کے وقت ایک انسان بھی قتل نہیں ہوا البتہ قیام کے بعد دس سالوں میں کل 1018 لوگ قتل ہوئے جن میں مسلم اور مشرک دونوں شامل ہیں۔ مشرقی پنجاب میں پندرہ لاکھ مسلمان پاکستان کے لیے لڑتے ہوئے شہید نہیں ہوئے تھے اور نہ مسلمان عورتیں پاکستان کی جدوجہد میں شامل ہونے کی بنا پر بے آبرو ہوئیں۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر یہ آفت اس وقت ٹوٹی تھی جب پاکستان بن چکا تھا۔ ریاست مدینہ کی تشکیل اور تعمیر کے لیے تو ایک مسلمان عورت بھی بے آبرو نہیں ہوئی تھی۔ اگر ایسا ہوا تھا تو کوئی دانش ور اس کا نام بتا دیں۔ یہاں تقریباً نوے ہزار مسلمان عورتیں بے آبرو ہوئیں اور ان میں سے بعض کبھی بازیاب نہ ہو سکیں۔
میں اس پر بھی حیرت زدہ ہوں کہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر نازل ہونے والی آفت کو مؤلف نے ایک عورت کی زچگی کی تکلیف سے کس طرح مماثل قرار دے دیا۔ ایک عورت جب اپنے خاوند سے بارور ہونے کے عمل سے لطف اندوز ہو رہی ہوتی ہے تو اس وقت سے ہی اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس عمل کے نتیجہ میں اسے زچگی کی تکلیف اٹھانا پڑے گی اور وہ اس کے لیے بخوشی

رضا کارانہ طور پر آمادہ ہو چکی ہوتی ہے۔ یہی اس کا مقصد تخلیق ہے۔ زچگی کی تکلیف اس پر اچانک نازل نہیں ہوتی۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہوا، کیا اس کا بھی ان کو پہلے سے علم تھا اور وہ اس کے لیے بخوشی تیار ہوئے تھے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو ان پر جو قیامت ٹوٹی، اس کو موصوف زچگی کی تکلیف کے کیسے مماثل قرار دے رہے ہیں۔ جو چاہے سو آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

تقسیم ہند کے موقع پر مسلم لیگ کی سیاستِ بد کے نتیجہ میں ہونے والے قتل و غارت کے حق میں اس بیہودہ اور شرمناک توجیہہ کو پیش کرنے والے جناب طارق مجید پہلے شخص نہیں۔ تقسیم ہند کے بعد ہر مسلم لیگی کی زبان و قلم پر یہ توجیہ تھی۔ اس پر جماعت اسلامی کے بانی مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے جون 1948ء میں لکھا تھا:

”کیا یہ سب کچھ جو واقع ہوا محض ایک اتفاقی حادثہ تھا؟ جو لوگ پچھلے تیس سال سے اس ملک کی رہنمائی کرتے رہے ہیں، اور جن کی قیادت میں یہ انقلاب رونما ہوا ہے، وہ ایسا ہی کچھ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اس فسادِ عظیم کے اسباب کی بحث کو باتوں میں ٹالنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کی ایک شاعرانہ توجیہہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ کشت و خون اور ظلم و ستم کا مظاہرہ کوئی غیر معمولی چیز نہیں ہے جس پر کچھ فکر مند ہونے کی ضرورت ہو، یہ تو ایک آزاد قوم کی ولادت کے درد ہیں جو ایسے موقع پر ہوا ہی کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر یہ ولادت کے درد ہی تھے تو یہ دنیا کو ایک درندے کی پیدائش کی خوشخبری دے رہے تھے، نہ کہ ایک انسان کے تولّد کی۔ انھوں نے دنیا کو جو اطلاع دی وہ اس بات کی نہ تھی کہ کچھ انسان ہیں جن کا بندِ اسیری ٹوٹا ہے بلکہ دراصل یہ اس بات کی اطلاع تھی کہ کچھ بھیڑیے قید تھے جن کا پنجرہ کھل گیا ہے۔ اس کے بعد لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندستان کے باشندے اپنی فطرت اور اپنے مزاج ہی کے لحاظ سے کمینے، بدمعاش اور سفاک ہیں، یا ان کو ایسا بنا دیا گیا ہے؟ پہلا الزام ثابت کرنے کے لیے اُس سے زیادہ قوی ثبوت کی ضرورت ہے جو پچھلے دو سال کے واقعات نے فراہم کیا ہے۔ آخر ہندستانیوں کی پچھلی سینکڑوں برس کی تاریخ موجود ہے۔ اپنے ماضی میں انھوں نے کب ایسی ذلیل صفات کا مظاہرہ کیا تھا؟ پھر اگر یہ

الزام ثابت نہیں ہے تو یقیناً دوسرا الزام آپ سے آپ ثابت ہے، یعنی یہ کہ ہمارے ملک کی آبادی کو اس اخلاقی پستی کے گڑھے میں گرایا گیا ہے۔ یہی وہ نتیجہ ہے جس سے بچنے کے لیے پچھلے دردناک واقعات کے اسباب کی بحث کو باتوں میں اڑانے کی کوشش کی جاتی ہے، کیونکہ یہ بحث ان سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنھوں نے پچھلی ربع صدی میں ہمارے ملک کی سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔''(18)

جناب طارق مجید فرماتے ہیں:

" That Pakistan is a unique country with a special mission was evident from its Islamic foundation and the extra-ordinary cirumstances and timing of its creation."

ترجمہ: ''پاکستان ایک منفرد ملک ہے جس کا خصوصی مشن اس کی اسلامی اساس اور اس کے قیام کے غیر معمولی وقت اور حالات سے ظاہر ہے۔''

جناح صاحب اگر اسلام کا نام لیتے رہے تو وہ لوگوں کو احمق بنانے کے لیے لیتے رہے۔ انھوں نے تو آل انڈیا مسلم لیگ کو کبھی کوئی ایسا ریزولوشن پاس ہی نہ کرنے دیا جس سے مسلم لیگ پاکستان میں نفاذ اسلام کے لیے پابند ہو جاتی۔ اسلام کے بارے میں جناح صاحب کی سنجیدگی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں ''اسلام کے مطابق'' قانون سازی کے لیے انھوں نے ایک ہندو جوگندر ناتھ منڈل کو وزیر قانون بنایا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تقسیم برصغیر کا اعلان ہوتے ہی جناح صاحب اسلام کے بارے میں اپنے اعلانات سے انحراف (Back-out) کر گئے تھے۔ پاکستان دستور ساز اسمبلی کے پہلے ہی اجلاس میں جناح صاحب فرماتے ہیں:

" Now if we want to make this State of Pakistan happy and prosperous, we should wholly and solely concentrate on the well being of the people and especially of the masses and the

poor ... and in the course of time all these angularities of the majority and minority communities, the Hindu community and the Muslim community ... and soon will vanish ... you are free to go to your temples, you are free to go to your mosques or any other place of worship in this State of Pakistan ... You may belong to any religion or cast or creed that has nothing to do with the business of the State ... We are starting in the days when there is no discrimination, no distinction between one community and another ... "(19)

ترجمہ: ''اب ہم اس ریاستِ پاکستان کو پُر از مسرت اور خوشحال بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی تمام تر توجہ اس ملک کے عوام اور بالخصوص غریب عوام کی بہتری پر صرف کرنا ہوگی......اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ تمام تفاوت اور اقلیت و اکثریت کے پہلو......ہندو اور مسلمان کے طبقاتی فرق ختم ہو جائیں گے۔ پاکستان کی ریاست میں آپ اپنے مندروں میں جانے کے لیے آزاد ہیں، اپنی مسجدوں میں جانے کے لیے آزاد ہیں یا دیگر عبادت گاہوں میں جانے کے لیے آزاد ہیں۔ آپ کا تعلق کسی بھی مذہب، کسی بھی ذات پات، کسی بھی عقیدے سے ہو، کاروبارِ ریاست پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ ہم ایک ایسے دور میں آغاز کر رہے ہیں جب کسی بھی قسم کی تفریق اور امتیاز مختلف گروہوں کے مابین روا نہیں رکھا جائے گا......''

ملاحظہ فرمائیے کہ ہندو اور مسلمان جو برصغیر کی تقسیم سے قبل 14 اگست 1947ء کی شام تک قومیں (Nations) تھیں، تقسیم کا اعلان ہوتے ہی Nations سے منقلب ہو کر طبقات (Communities) بن گئے۔ جب تک وہ قومیں (Nations) تھیں تو نہ ان کو مساجد

میں جانے کی آزادی تھی اور نہ مندروں میں جانے کی آزادی تھی اور جیسے ہی وہ طبقات بن گئے تو ان کو مساجد میں جانے کی آزادی بھی مل گئی اور مندروں میں جانے کی آزادی بھی۔ گویا کہ تقسیم کا واحد مقصد مساجد اور مندروں میں جانے کی آزادی حاصل کرنا تھا اور اسی مقصد کے لیے پندرہ لاکھ افراد قتل کروائے اور نوے ہزار مسلمان عورتیں بے آبرو کروائیں۔ دراصل جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ تو یہ ہے کہ جناح صاحب نے پاکستان اس لیے حاصل کیا تھا کہ برطانیہ اور امریکا کے آلہ کار کا کردار ادا کرتا رہے اور گزشتہ چھ عشروں سے وہ یہی کردار ادا کر رہا ہے۔ آج تک پاکستان نے یہود و نصاریٰ کی کوئی فرمائش نہیں ٹالی۔ یہی جناح صاحب کی خواہش تھی۔ خود جناح صاحب نے امریکا کو بھی اسی طرح کی یقین دہانی کروائی تھی۔ ثبوت حاضر ہے:

" On 18th May 1947 two Americans, Ronald A, Hare, Head of the Division of South Asian Affairs and Thomas E. Weil Second Secretary of U.S. Embassy in India, visited Jinnah. A detailed account of this visit was sent by American Charge D' Affairs to Marshall, the Secretary of State. According to this account Jinnah stated that under no condition was he prepared to accept the scheme for a united and federated India. The Muslim League had decided to insist upon the creation of Pakistan. He (Jinnah) sought to impress on his visitors that the emergence of an independent sovereign Pakistan would be in consonance with American interests. Pakistan would be a muslim country. Muslim countries would stand

together against Russian aggression. In that endeavour they would look to the United States for assisstance, he added" Venkataraman, American Role in Pakistan Page I.(20)

ترجمہ: ”18 رمئی 1947ء کو دو امریکی، Ronald A. Hare جو جنوب ایشیائی معاملات کی ڈویژن کا سربراہ تھا اور Thomas E. Weil جو ہندستان میں امریکی سفارت خانے کا انڈر سیکرٹری تھا جناح سے ملنے کے لیے آئے۔ اس ملاقات کا تفصیلی احوال امریکی Charge D`Affairs نے سیکرٹری آف سٹیٹ مارشل کو بھجوایا تھا جس کے مطابق جناح نے کہا کہ وہ ایک متحد ہندستان کا منصوبہ کسی بھی صورت میں قبول نہیں کریں گے۔ مسلم لیگ نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ قیامِ پاکستان پر اصرار کرے گی۔ جناح نے اپنے مہمانوں کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ پاکستان کا قیام امریکی مفادات کے لیے بہتر ہوگا۔ مسلمان ممالک روسی جارحیت کے خلاف متحد ہوں گے اور اس کوشش میں وہ امریکی مدد کے متمنی ہوں گے۔“

جناح صاحب نے پاکستان کا اقتدار حاصل کرنے کے بعد ہی امریکا کے سامنے بغیر کسی ہوم ورک کے کشکول پھیلا دیا۔ اس کا حال بھی سن لیجیے:

"Two months late the Proud Governor General of Pakistan confronted the United States Government with a startling request. Apparently the Quaid was now ready to tell the Americans what he wanted from them. As the State Department saw it, Jinnah's request, if approved, would mean nothing less than the assumption by the United States of responsibility of Pakistan's

Military Forces."

"According to State Department's documents, the Pakistani request related to the following:

Army: $17,00,00,000/- To provide for a regular army of 1,00,000 to consist of one armoured division, five infantry divisions partly motorized, and a small cavalary establishment and to provide for replacement and remodeling of existing arms and equipments, supplies and ammunition, equipment for ordnance factories, raw materials and payment of personnel.

Air Force: $7,50,00,000/- To provide for twelve fighter squadrons (150 planes), four fighter reconnaissance squadrons (70 planes), three bomber squadrons (50 planes), four training wings (200 planes) together with necessary replacements, ground facilities and payment of personnel.

Navy: $6,00,00,000/- To provide for four light cruisers, sixteen destroyers, four corvettes, twelve coast guard gunboats, three submarines, 1,20,000 tons of miscellaneous facilities with necessary ammunition, base equipment etc."(21)

ترجمہ: ''دو ماہ بعد پاکستان کے پُرغرور گورنر جنرل نے ریاست ہائے متحدہ کی حکومت

کو ایک درخواست پیش کر کے حیران کر دیا۔ بہ ظاہر قائد اب امریکیوں کو یہ بتانے کے لیے تیار تھے کہ انھیں ان سے کیا درکار ہے۔ (لیکن) اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے نقطۂ نظر سے جناح کی تجویز، ''اگر منظور ہو جاتی''، اس کے معنی سوائے اس کے کچھ نہ ہوتے کہ پاکستانی افواج کی تمام تر ذمہ داری ریاست ہائے متحدہ قبول کر لے۔ امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کی دستاویزات کے مطابق پاکستان کی درخواست میں درج ذیل مطالبات شامل تھے۔

بری افواج: سترہ کروڑ ڈالر، جس سے ایک لاکھ افراد پر مشتمل باقاعدہ فوج کے اخراجات پورے کیے جائیں گے۔ یہ فوج ایک آرمرڈ ڈویژن، پانچ انفنٹری ڈویژن (جو جزوی طور پر متحرک ہوں گی) ایک چھوٹی کیولری پر مشتمل ہوگی، موجودہ اسلحہ اور دیگر ساز و سامان تبدیل اور بہتر کیا جائے گا۔ اسلحہ ساز کارخانوں کے لیے مشینیں اور خام مال خریدا جائے گا اور تنخواہیں ادا کی جائیں گی۔

فضائیہ: ساڑھے سات کروڑ ڈالر، برائے چار لڑاکا سکواڈرن (150 طیارے)، چار لڑاکا جاسوسی سکواڈرن (70 طیارے)، تین بمبار سکواڈرن (50 طیارے)، چار تربیتی ونگ (200 طیارے) مع ضروری اضافی سامان اور زمینی سہولیات اور تنخواہیں۔

بحریہ: چھ کروڑ ڈالر، برائے چار عدد ہلکے کروز، 16 لڑاکا بحری جہاز، چار چھوٹے لڑاکا بحری جہاز، بارہ ساحلی محافظ گن بوٹس، تین آبدوزیں، 1,20,000 ٹن دیگر سہولیات مع ضروری اسلحہ ـــــ وغیرہ۔''

آج اگر حکومت پاکستان خیرات کے حصول کے لیے امریکا کے سامنے ہمہ وقت دامن پھیلائے رکھتی ہے تو اس کا آغاز جناح صاحب نے ہی کیا تھا۔ خیرات کے حصول کے لیے امریکا میں اپنے سفیر مسٹر اصفہانی کی مدد کے لیے جناح صاحب نے اپنے خصوصی نمائندے میر لائق علی خاں کو بھی امریکا بھیجا۔ ان دونوں حضرات نے امریکا سے زیادہ سے زیادہ امداد (AID) کے نام پر خیرات لینے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے دونوں حضرات نے State Department کے افسران سے ملاقات کی۔

"On 17 October (1947) the Ambassador and Laik Ali were received by Willard L. Throp, Roy Thurston and Two other representatives of the office of near Eastern Affairs, Laik Ali told the officials that the Government of Pakistan desired to receive from the United States a loan of 2 billion"(22)

ترجمہ: ''17 اکتوبر (1947) کو پاکستان کے سفیر اور میر لائق علی خاں نے Willard L. Thorp، Roy Thurston اور مشرق قریب کے معاملات سے متعلق محکمے کے دو دیگر اہل کاروں سے ملاقات کی۔ لائق علی نے ان اہل کاروں کو بتایا کہ حکومتِ پاکستان ریاست ہائے متحدہ سے دو بلین کا قرضہ حاصل کرنے کی خواہش مند ہے۔''

اس مقصد کے لیے پاکستان کے نمائندگان نے ایک تحریری یادداشت بھی پیش کی۔ اس یادداشت میں کہا گیا تھا:

"The memorandum made it clear that the Government of Pakistan was willing to designate the United States as its principal economic and military benefactor. It said:
Primarily defence and secondly, economic development are the two vitally essential features of Pakistan's life and for both of these she has to look firstly to U.S.A. and then to Great Britain for assistance. (American Role in Pakistan, page 17-18)

"It was in this fashion that barely two months after Pakistan was born, the Government Headed by Jinnah turned to the United States as a regular source of Finance for industrial development and expansion of its military force."(23)

ترجمہ: ''اعلامیے سے یہ بات واضح تھی کہ حکومتِ پاکستان ریاست ہائے متحدہ کو اپنا حقیقی معاشی اور دفاعی مربی یا سرپرست بنانے کے لیے تیار ہے۔ اس میں کہا گیا تھا کہ: اوّلاً دفاع اور ثانیاً معاشی ترقی وہ دو اُمور ہیں جو پاکستان کی بقا کے لیے ناگزیر ہیں اور ان دونوں کے لیے اسے سب سے پہلے امریکا اور پھر برطانیہ کی جانب دیکھنا ہوگا۔''

''قیامِ پاکستان کے دو ماہ کے اندر ہی جناح کی سربراہی میں حکومت پاکستان نے امریکا کی طرف اس طرح دیکھنا شروع کر دیا کہ گویا امریکا پاکستان کی معاشی ترقی اور دفاعی ضروریات پورا کرنے کا ایک مستقل ذریعہ ہے۔''

پاکستان کے سفیر اور خصوصی نمائندے میر لائق علی خاں کی تمام کوششوں کے باوجود امریکا سے پاکستان کو وہ مطلوبہ امداد نہ مل سکی جس کی درخواست کی گئی تھی۔ State Department کی طرف سے جواب موصول ہوا:

"... Laik Ali had been informed verbally several weeks earlier that U.S Government was not authorized to extend credit to a foreign country of such magnitude as Pakistan had requested without prior congressional approval and appropriation. The Department was not willing to recommend such congressional action at this

time."(24)

ترجمہ: "......کئی ہفتے قبل ہی لائق علی کو زبانی مطلع کیا جا چکا تھا کہ امریکی حکومت کے لیے کسی دوسرے ملک کو اتنا بڑا قرضہ، جتنا پاکستان حاصل کرنا چاہتا تھا، دینے کا اختیار نہیں تھا، جب تک کہ کانگریس سے اس کی باقاعدہ منظوری اور تخصیص نہ ہو جائے اور محکمہ فی الحال کانگریس کو اس منظوری کی تجویز پیش کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔"

پاکستان کو امداد تو نہ ملی لیکن جناح صاحب کی سربراہی میں ہماری قیادت نے اپنی اوقات امریکی انتظامیہ پر واضح کر دی۔ اس طرح یہ معاملہ اس وقت تو ختم ہو گیا۔ لیکن آگے پڑھیے:

"On this note ended Pakistan's first effort to obtain substantial military and economic assistance from United States, Jinnah's bid to make the United States the "prime source of military strength" for his country, a move that was viewed by American policy makers as involving the assumption by the United States of virtual military responsibility for Pakistan, ended in a total fiasco. All that the venture accomplished was that it enabled the men in Washington to get the measure of the men in Karachi and their deep yearning for a protector to lean on."(25)

ترجمہ: "اور اس طرح پاکستان کی جانب سے قابلِ ذکر قسم کی امریکی فوجی اور معاشی امداد حاصل کرنے کی پہلی کوشش کا خاتمہ ہوا۔ جناح کی یہ کوشش کہ امریکا کو "پاکستان کی فوجی قوت کا بنیادی ذریعہ" بنایا جائے، امریکا کے پالیسی ساز اس کو پاکستان کی دفاعی ذمہ داریاں امریکا کے سر منڈھنے کی کوشش سمجھتے تھے، بری طرح ناکام ہو گئی۔ اس پوری کوشش کے دوران حاصل صرف یہ ہوا کہ واشنگٹن والوں کو کراچی والوں کی

اوقات کا بھی اندازہ ہو گیا اور کسی محافظ اور سہارے کی شدید خواہش کا بھی۔"

قاری کے ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہو گا کہ پاکستان کی طرف سے امداد کی درخواست کا امریکا کی انتظامیہ نے یہ حشر کیوں کیا؟ کیا امریکی حکومت کو امداد کی درخواست کرنے سے قبل کوئی ہوم ورک کیا گیا تھا۔ امر واقعہ تو یہی ہے کہ ہماری قیادت نے برصغیر کو تقسیم کروانے سے قبل ایک نئے ملک کا انتظام چلانے کے لیے کسی قسم کا کوئی ہوم ورک کیا ہی نہیں تھا۔ اگر پاکستان کی حکومت حاصل کرنے کے فوراً بعد ہی امریکا سے امداد کی درخواست کرنا تھی تو اس کے لیے ضروری تھا کہ تقسیم برصغیر سے قبل ہی امریکا کی انتظامیہ کے اہم عہدہ داروں سے راہ و رسم پیدا کی جاتی، تاکہ جب پاکستان کی طرف سے امداد کی درخواست آتی تو وہ اس پر ہمدردانہ غور کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوتے لیکن ایسا نہیں ہوا کیوں:

"Jinnah had, of course, no way of knowing what views the American Joint Chief of Staff (JCS) held on the prospects of his country and its potential usefulness to the United States. ---when Jinnah presented his request for massive aid to the United States, the Joint Strategic Plans Committee of JCS was peering into the crystal ball in order to propose an "Estimate of probable Development in the world political situation up to 1957. "Referring to Pakistan (and India), the report of the committee, dated 11 December 1947 (JSPC814/3) predicted that "by the end of the decade they will have rendered themselves, because of their mutual animosities and political, economic and social

dislocations, even less capable of assisting the western powers in the event of war than was India during World War II. To the JCS, a substantial American investment at that point in the modernization and expansion of Pakistan armed forces appeared to be unwarranted."(26)

ترجمہ: ''ظاہر ہے، جناح کے پاس یہ جاننے کا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ ان کے ملک، مستقبل میں اس کے امکانات اور امریکا کے لیے اس کی ممکنہ افادیت کے بارے میں امریکی جوائنٹ چیف آف سٹاف (JCS) کے خیالات کیا ہیں؟...... جب جناح ایک بہت بڑی امداد کے لیے امریکی حکومت کو درخواست پیش کر رہے تھے اس وقت JCS کی Joint Strategic Plans Committee مستقبل میں جھانک کر ''عالمی سیاسی صورتِ حال میں 1957ء تک آنے والی ممکنہ تبدیلیوں کا جائزہ'' تیار کرنے میں مصروف تھی۔ پاکستان (اور ہندستان) کے حوالے سے اس کمیٹی کی رپورٹ مورخہ 11 دسمبر 1947ء (JSPC 814/3) میں پیش کی گئی تھی کہ دہائی کے اختتام تک، اپنی باہمی عداوتوں اور اپنی سیاسی، معاشی اور سماجی ابتری کے سبب، جنگ کی صورت میں مغربی قوتوں کے لیے یہ ممالک اتنے بھی کارآمد نہیں ہوں گے جتنا کہ ہندستان دوسری جنگِ عظیم میں تھا۔ JCS کی رائے میں پاکستانی مسلح افواج کی ترقی اور توسیع میں اتنی بڑی سرمایہ کاری کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔''

جناح صاحب کی فکر و نظر میں کس قدر گہرائی تھی، اس کا اندازہ اس رپورٹ سے ہو جاتا ہے جو پاکستان میں متعین امریکی سفیر نے 22 مارچ 1948ء کو اپنی حکومت کو ارسال کی۔ اس رپورٹ کی وجہ یہ ہوئی کہ جناح صاحب نے امریکی سفیر کو دعوت دی کہ محترم سفیر، اس کی اہلیہ اور اس کی بیٹی گورنر جنرل کی کراچی کے ساحلی پُرفضا مقام Sandspit پر واقع Beach Cottage میں 17 مارچ 1948ء کو چائے نوش کرنے کے لیے تشریف لائیں جسے امریکی سفیر نے قبول کر لیا۔ اس موقع پر جو سب سے اہم مسئلہ جناح صاحب کی طرف سے بحث کا موضوع

تھا وہ بزبانِ سفیر سن لیجیے:

"Mr. Jinnah inquired whether we were making progress in the acquisition of Government property here. I told him... "we had mapped out a tentative programme. Both he and his sister then enquired whether we were interested in their house "Flagstaff" which he had told me a few days previously would be available for purchase. I explained that our negotiation for the purchase of an Ambassador's residence at No. 1 Bruns Road had progressed so far, before we had knowledge that "Flagstaff" was available, that it had proved impossible to withdraw. He then asked if "Flagstaff" would not be suitable for the use of other personnel of Embassy. In reply, I said that we had, of course, explored that possibility but that our building expert felt he could not justify the purchase of an extensive property for any of the subordinate personnel."(27)

ترجمہ: ''مسٹر جناح نے دریافت کیا کہ کیا ہمیں یہاں سرکاری جائیداد کے حصول میں کامیابی ہو رہی تھی؟ میں نے انھیں بتایا کہ ہم نے ایک آزمائشی پروگرام ترتیب دیا ہے۔ پھر انھوں نے اور ان کی ہمشیرہ دونوں نے دریافت کیا کہ کیا ہمیں ان کے مکان ''فلیگ سٹاف'' کے خریدنے میں دلچسپی ہوگی؟ جس کے بارے میں ہمیں چند روز قبل

بتایا گیا تھا کہ برائے فروخت ہے۔ میں نے وضاحت کی کہ "فلیگ سٹاف" کی دستیابی کے بارے میں علم ہونے سے پہلے ہی سفیر کی رہائش گاہ کے لیے 1- برنس روڈ کے حوالے سے بات چیت اتنی آگے بڑھ چکی تھی کہ اب پیچھے ہٹنا ہمارے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ انھوں نے پھر دریافت کیا کہ کیا "فلیگ سٹاف" دیگر عملے کی رہائش کے لیے مناسب نہ ہوگا؟ میں نے جواب دیا کہ ہم اس امکان پر بھی غور کر چکے ہیں، لیکن ہمارے ماہر کا خیال ہے کہ ماتحت عملے میں سے کسی کے لیے اتنے بڑے مکان کا جواز نہیں بنتا۔"

امریکی سفیر کی مذکورہ بالا رپورٹ کے مطالعے کے بعد امریکی حکومت کے ذمہ دار حضرات کو جناح صاحب کی شخصیت اور ذہنی حدود اربعہ کا اندازہ ہو گیا اور انھوں نے جناح صاحب کی عزت افزائی کے لیے اپنے سفیر کو ہدایت کی، جو اس طرح تھی:

"A thoughtful Secretary of State called American Embassy in Karachi to hand-over four twelve-inch oscillating fans (220 volts, of course) with the compliments of the Government of the United States."(28)

ترجمہ: "ایک سمجھ دار قسم کے (امریکی) سیکرٹری آف اسٹیٹ نے کراچی میں امریکی سفارت خانے سے رابطہ کیا اور انھیں ہدایت کی کہ وہ چار عدد بارہ انچ کے گھومنے والے پنکھے (ظاہر ہے 220 وولٹ کے) امریکی حکومت کی نیک خواہشات کے ساتھ (حکومتِ پاکستان کے) حوالے کر دیں۔"

بہرحال دو سال بعد برطانوی حکومت کی سفارش پر امریکن پالیسی میں تبدیلی آئی اور امریکی امداد جاری ہو گئی۔ لکھا ہے:

"It was the British Government that set the process in-motion, On 4 April 1949 at the State Department Foreign Ministers Ernest Bevin sat

down for wide ranging discussions with Dean Acheson who had succeeded Marshal as Secretary of State: Bevin spoke of the importance of a common Anglo American policy to safeguard and develop important resources needed for westren defence. Particularly oils. Towards that end efforts must be made to keep Arabs, in 'line'. The Arabs were Muslims and Bevin was "convinced that 100 million Muslims were one of the biggest potential forces in the world." Sixty percent of the people of South East Asia too were Muslim and "Russia has an opening there." Britain, Bevin said, was "the best window" towards the Muslim areas. It could move constructively and exercise influence through one of the Muslim countries- Pakistan."(29)

ترجمہ: "یہ تو برطانوی حکومت تھی جس کی وجہ سے اس معاملے میں کچھ تحرک پیدا ہوا۔ 4 اپریل 1949 کو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں وزیر خارجہ ارنسٹ بیون اور ڈین ایچی سن، جو سیکرٹری آف اسٹیٹ مارشل کے جانشین تھے، کے مابین وسیع تر معاملات پر مذاکرات ہوئے۔ بیون نے ایک مشترکہ برطانوی امریکی پالیسی کی تشکیل پر زور دیا تاکہ مغرب کے دفاع کے لیے درکار اہم وسائل کا تحفظ اور ترقی ممکن ہو سکے، خاص طور پر تیل۔ اس حوالے سے عربوں کو "سیدھا رکھنے" کی کوشش کی جانی چاہیے۔ عرب مسلمان تھے اور بیون کی رائے تھی کہ 100 ملین مسلمان ممکنہ طور پر دنیا کی عظیم ترین قوتوں میں سے ایک تھے۔ جنوب مشرقی ایشیا کی ساٹھ فی صد آبادی بھی مسلمان تھی

اور یہاں ''روس کے پاس ایک دروازہ موجود تھا۔'' بیون کی رائے میں برطانیہ مسلمانوں کی جانب کھلنے والا بہترین دروازہ تھا۔ کیونکہ یہ ایک مسلمان ملک ''پاکستان'' کے ذریعے تعمیری طور پر آگے بڑھ سکتا تھا اور اپنا اثر ورسوخ استعمال کرسکتا تھا۔''

اس طرح پاکستان کا امریکا کی پناہ میں آنے کے لیے راستہ کھلا۔ وہ دن اور آج کا دن، پاکستان نے امریکا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے، امریکا کے ہر حکم کی تعمیل کرنے کے لیے اپنا قبلہ واشنگٹن کی طرف راست کیا ہوا ہے۔

کیا دنیا میں پاکستان کے علاوہ کوئی دوسرا ملک بھی ہے جو اپنے شہریوں کو پکڑ پکڑ کر بغیر کسی عدالتی کارروائی کے امریکا کے حوالے کرتا رہتا ہو۔ یہاں تک کہ ملا عبدالسلام ضعیف جو پاکستان میں افغانستان کے سفیر تھے اس کو بھی پکڑ کر ہمارے ''بہادر جرنیل'' اور ''محبوب'' سابق صدر جنرل پرویز مشرف نے امریکا کے حوالے کردیا۔ نوائے وقت یکم جنوری 2007ء میں وہ سلوک بیان کیا گیا ہے جو امریکیوں نے نام نہاد اسلامی جمہوریہ پاکستان کے تعاون سے ملا ضعیف کے ساتھ کیا۔ جو درج ذیل ہے:

''پشاور (بی بی سی اردو ڈاٹ کام) ''امریکیوں نے مجھے مارا پیٹا اور بے لباس کردیا مگر اسلام کے یہ محافظ میرے سابق دوست (پاکستانی حکام) یہ تماشا دیکھتے رہے، ان کی زبان پر لگے تالے میرے لیے نا قابل فراموش ہیں، یہ وہ لمحات تھے جن کو میں قبر میں بھی نہیں بھول سکوں گا، وہ اتنا تو کہہ سکتے تھے کہ یہ ہمارے مہمان ہیں، ہماری موجودگی میں ان کے ساتھ یہ سلوک نہ کیا جائے'' یہ اقتباس پاکستان میں طالبان دورِ حکومت کے آخری افغان سفیر ملا عبدالسلام ضعیف کی گوانتانا موبے جیل کی یادداشتوں پر مشتمل کتاب سے ہے۔ ملا ضعیف بگرام، قندھار اور گوانتانا موبے جیل میں تقریباً 4 سال گزارنے کے بعد 2005ء میں رہا ہوئے تھے، انھیں جنوری 2002ء میں پاکستانی حکام نے اسلام آباد سے حراست میں لے کر امریکی حکام کے حوالے کیا تھا۔ انھوں نے یہ کتاب گوانتانا موبے جیل سے رہائی پاتے وقت امریکی حکام کی خاموش رہنے کی ہدایت کو نظر انداز کرتے ہوئے لکھی ہے۔ انھوں نے کتاب میں امریکا پر، اپنی

ذات پر ہونے والے تشدد اور غیر انسانی حالات میں رکھنے کا الزام لگایا ہے۔ ان کے مطابق انھیں اسیری کے ابتدائی دنوں میں کئی کئی روز تک بھوکا پیاسا رکھا جاتا، برہنہ تصاویر بنائی جاتیں، قرآن مجید کی بے حرمتی کی جاتی اور بار بار تفتیش میں اسامہ بن لادن اور ملا محمد عمر کے بارے میں دریافت کیا جاتا۔ کتاب میں امریکا کے علاوہ پاکستان پر تنقید کی گئی ہے۔ ان کے بقول گوانتانا موبے کے قیدی پاکستان کو ''مجبورستان'' کہہ کر پکارتے تھے۔ قید کے دوران انھیں امریکا کے لیے جاسوسی کرنے کے عوض بھاری رقم اور رہائی دینے کی پیشکش بھی کی گئی جو انھوں نے ٹھکرا دی تھی۔ 4 برس قید کے بعد رہائی کے بدلے ان سے ایک کاغذ پر دستخط کے لیے کہا گیا جس پر لکھا تھا کہ قیدی اپنے جرم کا اقرار کرتا ہے، امریکا سے معافی کا طلب گار ہے اور القاعدہ یا طالبان کا ساتھی تھا لیکن مستقبل میں ان سے تعلق نہیں رکھے گا، جیسی شقیں درج تھیں، البتہ سابق سفیر نے ان پر دستخط کرنے سے انکار کردیا جس پر امریکیوں نے انھیں اپنی مرضی کی تحریر لکھنے کو کہا۔ جس پر انھوں نے لکھا ''میں مجرم نہیں ہوں، کبھی کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا، ایک مظلوم مسلمان ہوں جس کے ساتھ پاکستان اور امریکا نے ظلم کیا اور چار سال قید میں رکھا ہے، میں یقین دلاتا ہوں کہ میں امریکا کے خلاف سرگرمیوں میں حصہ نہیں لوں گا''۔ تقریباً اسی قسم کی باتیں گوانتانا موبے کے دو اور سابق قیدیوں عبدالرحیم مسلم دوست اور ان کے چھوٹے بھائی استاد بدرالزمان بدر کی کتاب گوانتانا موبے کی ٹوٹی زنجیریں میں بھی لکھی گئی ہیں۔ ملا ضعیف نے اپنی کتاب میں بھی ان دو بھائیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کا طالبان سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن پاکستانی حکومت پر تنقید کی وجہ سے انھیں گرفتار کیا گیا۔ اپنی رہائی کے کچھ عرصہ بعد گزشتہ ستمبر سے عبدالرحیم مسلم دوست پھر لاپتہ ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی کا کہنا ہے کہ ان کی کتاب میں کی گئی تنقید پاکستانی حکام کو پسند نہیں آئی اس لیے انھیں دوبارہ حراست میں لیا گیا ہے''۔ (30)

جناب تنویر قیصر شاہد روزنامہ پاکستان لاہور، 5 جنوری 2007 میں لکھتے ہیں:

''ہمارے حکمرانوں نے اپنے ہی ملک میں بسنے والے اپنے بے گناہ شہریوں کو پکڑ پکڑ

کر امریکا کے حوالے کیا تاکہ دہشت گردی کے خلاف برپا کردہ امریکی جنگ میں سرخرو ہوسکیں اور امریکی حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کی جاسکے۔ اس ضمن میں کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن تازہ مثال عبدالرحیم مسلم دوست کی سامنے آئی ہے۔ عبدالرحیم مسلم دوست پیشے کے اعتبار سے اخبار نویس ہیں۔ پاکستان کے حکمرانوں نے اسے اور اس کے بھائی بدرالزمان بدر کو کڑی سزا دی ہے۔ نومبر 2001 میں دونوں بھائیوں کو پشاور سے پاکستان کی ایک خفیہ ایجنسی نے یہ الزام لگا کر پکڑ لیا کہ ان کا تعلق القاعدہ سے ہے۔ جس وقت انھیں گرفتار کیا گیا اس وقت وہ نماز ادا کر کے مسجد سے نکل رہے تھے۔ گرفتاری کے بعد انھیں پاکستان کے حاکموں نے امریکی فوج کے حوالے کر دیا جو انھیں کئی ماہ تک افغانستان میں تشدد کا نشانہ بناتے رہے اور بعد ازاں انھیں گوانتانا موبے کی عالمی سطح پر بدنام زمانہ امریکی جیل میں منتقل کر دیا۔ بہت سے بے قصوروں کی طرح یہ دونوں بے قصور بھائی عبدالرحیم مسلم دوست اور بدرالزمان بدر بھی پانچ سال تک گوانتانا موبے کی قید میں تعصب اور تشدد کا نشانہ بنتے رہے۔ بعد ازاں امریکیوں نے انھیں بے گناہ قرار دے دیا اور یوں گزشتہ سال کے آغاز میں دونوں رہا کر کے پشاور بھیج دیے گئے۔ جس وقت یہ دونوں بھائی سرحد کے صوبائی دارالحکومت پہنچے ان کی ہیئت کذائی دیدنی تھی۔ امریکیوں نے ان سے جو سلوک کیا تھا اس کی گواہی ان کے بدن دے رہے تھے۔"(31)

ہم تو امریکا کے اس حد تک تابع فرمان ہیں کہ امریکا پاکستان کے کسی شہر یا گاؤں پر راکٹ برسائے تو ہم اس کو اپنی کارروائی قرار دیتے ہیں اور سینہ پھلا کر کہتے ہیں کہ "ایہ وی یاراں دا ہی کم اے۔" ایسی بے غیرتی دنیا نے کاہے کو دیکھی ہوگی۔

امریکا نے برادر اسلامی ملک افغانستان پر حملہ کرنے کے لیے جو کچھ پاکستان سے مانگا، پاکستان نے بلا حجت پیش کر دیا۔ میں اہل پاکستان سے دریافت کرتا ہوں کہ کل کلاں امریکا اگر چین پر حملہ کرنا چاہے اور بھارت سے مطالبہ کرے کہ وہ اپنے تمام ہوائی اڈے امریکا کے حوالے کر دے تو کیا بھارت ایسا کرے گا؟ میں کہتا ہوں کہ امریکا یہ مطالبہ زبان پر لانے کی جرأت بھی نہیں کرے گا۔ کیا اب بھی آپ کو شک ہے کہ برصغیر کو آغا خان اور اس کے معنوی فرزند جناح نے اس لیے تقسیم

کروایا تھا کہ اس کا ایک حصہ (پاکستان) ہمیشہ یہود و نصاریٰ کے آلۂ کار کا کردار ادا کرتا رہے۔

امریکا کے لیے پاکستان کی خدمات اور قربانیوں کی وجہ سے امریکیوں کے دلوں میں پاکستان کی جو "عظمت و محبت" جاگزیں ہوئی ہے اس کا اعتراف و اظہار امریکا کے معروف اخبار واشنگٹن ٹائمز نے ایک کارٹون شایع کر کے کیا تھا، لیکن میں اسے عبرت کے لیے نوائے وقت کے شکریہ کے ساتھ کتاب میں شامل کر رہا ہوں۔ ممکن ہے جناح صاحب کی ذُرّیت نے تو اس کارٹون کو اپنے لیے "تمغۂ حسن کارکردگی" سمجھا ہو، لیکن اسے دیکھ کر میرا خون کھول اٹھتا ہے اور سر شرم سے بے اختیار جھک جاتا ہے۔



[امریکی اخبار واشنگٹن ٹائمز میں پاکستان کے بارے میں شائع ہونے والا توہین آمیز کارٹون]

دو قومی نظریہ کی کچھ برکات میجر (ر) سکندر خان بلوچ نے ایک مضمون میں بیان کی ہیں، جو درج ذیل ہیں۔ امید ہے اس کے مطالعہ سے ہر شخص پر دو قومی نظریہ کا "برحق" ہونا پوری طرح واضح ہو جائے گا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"1971ء کی جنگ پر کچھ کتابیں فوجی افسران نے لکھیں لیکن وہ زیادہ تر جنگی

نقطۂ نظر سے لکھی گئیں۔ خاص کر جنگ کے ان سیکٹرز کے متعلق جن میں وہ تعینات تھے چند ایک سویلین نے بھی اس ضمن میں کوششیں کیں لیکن وہ محض اخباری رپورٹوں کی مدد سے واقعات کی تفصیل ہے۔ کسی صحیح سکالر کی کتاب تاحال میری نظر سے نہیں گزری جو حالات کی تہ میں جا کر حالات و واقعات کا صحیح تجزیہ پیش کرے۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ شاید ہم نے میدان جنگ میں بھارت سے اتنی شکست نہیں کھائی جتنی میڈیا اور پروپیگنڈہ کے محاذ پر کھائی ہے۔ 1971ء کی جنگ بھی موثر میڈیا کی کلاسک مثال ہے۔ بھارتی میڈیا نے ہمارے خلاف ایسے ایسے الزامات لگائے جو انسانی بس میں ہی نہیں تھے۔ پاکستان کو منظم طریقے سے بدنام کیا۔ محیر العقول قسم کے الزامات لگا کر پوری دنیا کو ہمارے خلاف کر دیا اور بالآخر پاکستان کو دولخت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پاکستانی فوج کے خلاف تین بڑے الزامات لگائے گئے۔ اول یہ کہ تیس لاکھ بنگالیوں کو فوج نے بیدردی سے قتل کیا۔ دوم تین لاکھ عورتوں کی آبروریزی کی اور سوم یہ کہ گاؤں کے گاؤں جلا دیے۔ یہی کچھ بھارتی میڈیا نے بین الاقوامی میڈیا کو فیڈ کیا اور بین الاقوامی میڈیا نے بغیر تفتیش کیے پاکستان کے تشخص کو اس برے طریقے سے مسخ کیا کہ ہم پوری دنیا میں نہ صرف تنہا رہ گئے، بلکہ پوری دنیا کی نفرت کا نشانہ بنے۔ سب سے پہلا کام تو بھارتیوں نے یہ کیا کہ اس ساری بغاوت کو ''جنگ آزادی'' کا نام دیا اور اس لفظ نے ہمیں محرم سے مجرم بنا دیا۔

بنگلہ دیش کے ایک مشہور اسکالر ڈاکٹر عبدالمنعم چودھری نے ''جنگ آزادی'' پر اپنی مشہور کتاب "Behind The Myth of 3 Million" میں لکھا ہے کہ مجیب الرحمن جب جنگ کے بعد مغربی پاکستان سے رہا ہوئے اور 8 جنوری 1972ء کو ڈھاکہ آنے کے لیے لندن پہنچے تو انھوں نے وہاں بیان دیا ''بنگلہ دیش میں دس لاکھ افراد مارے گئے ہیں'' لیکن دس جنوری کو جب وہ ڈھاکہ پہنچے اور بھارتی ایجنسیوں سے ملے تو انھوں نے اپنا بیان تبدیل کر لیا اور کہا '''اس جنگ میں تیس لاکھ آدمی مارے گئے اور تاریخ میں آزادی کے لیے اتنی عظیم قربانی کی مثال کہیں نہیں ملتی'' پھر اس دن جب ایجنسیوں نے مزید برین واش کیا تو جناب مجیب الرحمن نے

اپنے بیان میں مزید اضافہ کیا اور فرمایا کہ ''تیس لاکھ آدمی قتل ہوئے اور تین لاکھ عورتوں کی عزتیں برباد کی گئی ہیں۔'' یہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا جھوٹ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی فوج وہاں پر غیر ملک میں نہیں، بلکہ اپنے ہی ملک میں تعینات تھی اور اپنے ملک میں چاہے حالات جیسے بھی ہوں، اتنی بڑی گھناؤنی کارروائی کرنا ممکن نہیں۔ نہ فوج کو اس مقصد کے لیے تیار کیا جاتا ہے اور نہ اسے اس قسم کے جرائم کی اجازت دی جاتی ہے۔

12 مارچ 1971ء تک مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کی فوج کی کل تعداد محض ایک ڈویژن یعنی 12 ہزار نفوس سے زیادہ نہ تھی۔ ان میں ایک بڑی تعداد بنگالیوں کی بھی شامل تھی۔ ان میں لڑاکا فوج کے جوانوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ 8 ہزار تھی باقی سب سروسز کے لوگ تھے، جب مارچ میں تحریک سول نافرمانی شروع ہوئی اور مکتی باہنی (یعنی: سپاہ آزادی) کے تربیت یافتہ غنڈوں نے مغربی پاکستان کی فوج اور سویلین آبادی کو تہ تیغ کرنا شروع کیا تو فوج کی طاقت محض یہی کچھ تھی۔ ان کے مقابلے میں ایک لاکھ لڑاکا تربیت یافتہ ایسٹ بنگال رجمنٹ، ایسٹ پاکستان سول آرمڈ فورسز اور ایسٹ پاکستان رائفلز کے لوگ موجود تھے۔ مشرقی پاکستان کی پولیس اس کے علاوہ تھی اور یہ سب بنگالی تھے۔ بھارت کی ایسٹرن کمانڈ کے چیف آف جنرل سٹاف جنرل جیکب جو بھارتی جنگی منصوبہ بندی کے منتظم اعلیٰ بھی تھے کے مطابق تقریباً ڈیڑھ لاکھ کے قریب بھارت میں مکمل تربیت یافتہ اور مسلح مکتی باہنی اور ان کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں مغربی بنگال کے گوریلا موجود تھے جو مختلف مقامات پر گھیراؤ جلاؤ کے لیے بھیجے گئے تھے۔ یہ لوگ پورے علاقے میں مختلف راستوں سے مغربی پاکستان، پاکستان کو پسند کرنے والی بنگالی آبادی اور سب سے بڑھ کر بہاری آبادیوں سے پوری طرح واقف تھے۔ ان لوگوں نے مغربی پاکستانیوں کے لیے پرو پاکستانی بنگالیوں کے لیے اور خاص کر بہاریوں کے لیے قیامت ڈھا دی۔ ان کی دکانیں جلا دی گئیں۔ مردوں کو قطاروں میں کھڑا کر کے مار دیا گیا۔ عورتوں کی برے طریقے سے آبروریزی کے بعد رائفل کی سنگینوں سے پیٹ چاک کیے گئے اور ملٹری

ایکشن سے پہلے تک جو اعداد وشمار سامنے آئے، ان کے مطابق 15 ہزار محب وطن پاکستانی سانتاہار کے علاقے میں، 10 ہزار چٹاگانگ کے علاقے میں، 900 سراج گنج کے علاقے میں اور 2 ہزار میمن گنج کے علاقے میں شہید کر دیے گئے۔ باقی علاقوں کی حالت اس سے مختلف نہ تھی۔ شہید ہونیوالے تمام لوگ مغربی پاکستانی، بہاری اور پاکستان پسند بنگالی تھے۔ یہ سب قتل پاکستان کے ذمے لگائے گئے۔ بڑی حیران کن بات ہے۔ کیا پاکستانی فوج پاگل ہوگئی تھی کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے لوگوں کو شہید کرتی؟ نہیں! ہرگز نہیں۔ یہ تمام کارروائی بھارت کی تربیت یافتہ مکتی باہنی نے کی اور اس کا الزام پاکستانی فوج پر لگا دیا گیا جس کی بیرونی میڈیا میں خوب تشہیر کی گئی۔

جب ایسٹ بنگال رجمنٹ اور ایسٹ پاکستان رائفلز نے ہتھیاروں سمیت بغاوت کی تو انھیں پاکستانی فوج کے ٹھکانوں کا پوری طرح علم تھا، جہاں کہیں پاکستانی فوج کی چھوٹی ٹکڑیاں تھیں، انھیں بے دردی سے مار دیا گیا۔ مثلاً پبنہ (Pabna) میں 300 جوان اور کشتیا میں 150 جوان بیدردی سے اڑا دیے گئے۔ کرنل عبدالرشید جنجوعہ ایک ایسٹ بنگال رجمنٹ کی کمان کر رہے تھے۔ میجر ضیاالرحمٰن سابق صدر بنگلہ دیش نے رات کو انھیں اپنے بنگلے سے پکڑا، باندھ کر دفتر لایا، اپنے دفتر میں کرسی پر بٹھا کر سنگین سے چھلنی کر دیا۔ فوج دار ہاٹ کیڈٹ کالج کے پرنسپل کرنل فضل حق کے بنگلے پر رات کو حملہ کیا گیا اور ان کے اپنے بنگالی اردلی نے ان کے پیٹ میں چاقو کے وار کیے۔ اس قسم کے بے شمار کیس رونما ہوئے جن کا تاریخ میں کہیں بھی ذکر نہیں۔ ان لوگوں کو جہاں کہیں بھی موقع ملا انھوں نے بے دردی سے مغربی پاکستانیوں، پرو پاکستانیوں اور بہاریوں کو قتل کیا، اسی طرح پتا چلا کہ ایک میڈیکل کالج کے ہاسٹل میں کچھ مغربی پاکستانی طالبات مکتی باہنی نے پکڑ رکھی تھیں۔ ایک کپتان صاحب کو چند سپاہیوں کے ساتھ انھیں بچانے کے لیے بھیجا گیا، جب وہ ہوسٹل کا گیٹ پھلانگ کر اندر داخل ہوا تو دروازے اندر سے بند تھے۔ لڑکیوں کے کمرے کا دروازہ توڑ کر اندر گیا تو 8 میں سے 4 غائب تھیں اور بقیہ 4 محض انڈر ویئر میں چارپائیوں کے ساتھ بندھی تھیں۔ انھیں ہمارے جوان بستر کی چادروں میں لپیٹ کر

حفاظتی ایریا میں لے گئے۔ کپتان صاحب اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے۔ ہاسٹل کا چکر لگایا، کچھ بنگالی نوجوان رائفلوں کے ساتھ پہرہ دے رہے تھے، اس نے غصے میں سب کو اڑا دیا، اسی طرح ایک جگہ پر اطلاع ملی کہ کچھ بہاری خاندانوں کو مکتی باہنی والوں نے قید کر رکھا ہے۔ ایک میجر صاحب اور کچھ جوانوں کو بھیجا، گیا مگر افسوس کہ ان کے پہنچنے سے پہلے یہ لوگ قتل ہو چکے تھے۔ تمام مردوں کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، عورتیں بالکل ننگی تھیں۔ ریپ کے بعد ان کی چھاتیاں کاٹ دی گئی تھیں حتیٰ کہ معصوم بچوں کو نہ صرف قتل کیا گیا، بلکہ ان کے جسم کے سوراخوں میں بانس کے ڈنڈے دے دیے گئے تھے۔ میجر صاحب یہ سب کچھ دیکھ کر ذہنی توازن کھو بیٹھے۔ انھیں علاج کے لیے سی ایم ایچ بھیجنا پڑا۔ ان حالات کا ذکر تاریخ میں کیوں نہیں کیا گیا؟ ہماری نوجوان نسل کو ان غیر انسانی اور وحشیانہ کارروائیوں کی تفصیل سے بے خبر کیوں رکھا گیا؟ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ان تمام کارروائیوں کے پوری طرح فوٹو لیے گئے، فلمیں بنائی گئیں اور پاکستانی فوج کے مظالم کے نام سے بین الاقوامی میڈیا میں تشہیر کی گئی اور نوجوان بنگالیوں میں پاکستانی فوج کے خلاف نفرت پھیلائی گئی۔

اسی طرح بنگالی میجر صفی اللہ 2 ایسٹ بنگال رجمنٹ کا سیکنڈ ان کمانڈ تھا۔ یہ شخص مغربی پاکستانیوں کے سخت خلاف تھا۔ اس کے بہت پہلے سے بھارتیوں سے رابطے قائم ہو چکے تھے اور باقاعدگی سے اگرتلہ جاتا رہا تھا۔ یہ خفیہ طور پر بنگالی افسروں اور جوانوں کو بھی منظم کرتا رہا۔ اس نے مغربی پاکستانیوں کو قتل کرنے اور بغاوت کی باقاعدہ منصوبہ بندی کی۔ 27 مارچ کو اس شخص نے زبردستی یونٹ کی کمان سنبھال لی۔ اس یونٹ کے ساتھ مغربی پاکستان کے چار آفیسرز، کچھ جے سی اوز اور تقریباً تیس کے قریب جوان تھے، اس نے ان سب کو گھیر کر شوٹ کر دیا۔ کچھ آفیسرز اور جوانوں نے فیملیز ساتھ رکھی ہوئی تھیں، ان سب کو بے حرمتی کے بعد بے دردی سے ذبح کیا۔ جب مغربی پاکستانی فوج وہاں پہنچی تو بھیانک منظر دیکھ کر جوان اپنے حواس قابو میں نہ رکھ سکے اور پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ ایک نوجوان کپتان کی بیگم مادر زاد ننگی پڑی تھی۔ اس کا پیٹ چاک تھا، پاؤں کٹے تھے، جسم جگہ جگہ سے نوچا ہوا تھا اور اس کا معصوم بچہ

اس کی خشک چھاتیوں سے دودھ پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ کپتان صاحب خون میں لت پت مردہ پڑا تھا۔ یہی حالت تقریباً باقی فیملیز کی تھی۔

ایک صوبیدار صاحب کی چار جوان بیٹیاں تھیں۔ انھیں گینگ ریپ کے بعد بیدردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ سب کے پیٹ چاک اور انتڑیاں باہر نکلی ہوئی تھیں، گلے میں رسیوں کے ساتھ کارڈ بندھے ہوئے تھے، ان پر لکھا ہوا تھا: ''پنجابی کے لیے تحفہ''۔ میجر جنرل سکھونت سنگھ نے اپنی کتاب "India's Wars Since Independence" میں لکھا ہے کہ اس یونٹ نے سب سے زیادہ مغربی پاکستانیوں کو قتل کیا۔ اسی طرح میمن سنگھ کیڈٹ کالج میں ایک پنجاب رجمنٹ کے کپتان صاحب بطور ایڈجونٹ تعینات تھے۔ ان کے گھر پر حملہ کیا گیا۔ خاوند کے سامنے اس کی بیوی کی بے حرمتی کرنے کے بعد اسے ایذائیں دے دے کر ذبح کیا گیا۔ اس دوران اس کا چھوٹا سا بچہ ماں کی چیخیں سن کر چلاتا رہا لیکن کسی کو رحم نہ آیا۔ ماں کو ختم کرنے کے بعد ان ظالموں نے بچے کو ہوا میں اچھالا اور نیچے بندوق کی سنگین پر روکا۔ تھوڑی دیر کے لیے بچہ تڑپا اور پھر اللہ کو پیارا ہو گیا۔ کپتان صاحب کو پکڑ کر باری باری اس کی ٹانگیں کاٹیں پھر بازو کاٹے اور آخر میں اس کے گلے میں رسی ڈال کر جیپ کے پیچھے باندھ دیا۔ چند منٹوں کے بعد وہ بھی اپنی فیملی سے جا ملا۔ (انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔)

27 مارچ کو چٹاگانگ میں 2 کمانڈو بٹالین کے پچاس آدمی شہید کر دیے گئے جن میں کمانڈنگ آفیسر سمیت 3 اور آفیسرز بھی شامل تھے۔ اتنے ہی لوگ زخمی ہوئے۔ فوجی بھی آخر انسان ہیں کوئی فرشتے تو نہیں، جب ان کے سامنے ان کے ساتھی، ان کی بیٹیاں، بیویاں، بہنیں اس طرح بیدردی کے ساتھ قتل کی جائیں گی، انھیں گینگ ریپ کیا جائے گا تو وہ اپنے حواس کو کیسے قابو میں رکھ سکتے تھے''؟ (32)

یہ ہے وہ گواہی جو دو قومی نظریہ کے ''برحق'' ہونے کے بارے میں تاریخ میں محفوظ ہو گئی ہے۔ کیا ٹھوس ''شہادت'' ہے کہ قوم مذہب سے بنتی ہے نہ کہ وطن سے۔ کس قدر ''ہمدرد'' تھے جناح صاحب اور ان کے ہم نوا برصغیر کے مسلمانوں کے، کہ تقریباً نصف صدی ان کو یہ سبق

پڑھاتے رہے:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن ہے اس کا وہ مذہب کا کفن ہے

پاکستان کے اندر کیا حالت ہے؟ جناب فیروز الدین احمد فریدی اپنے مضمون بعنوان ''پبلک سروس کمیشن'' مطبوعہ روزنامہ نوائے وقت، لاہور، 9 جنوری 2007ء میں انکشاف کرتے ہیں:

''آج دنیا کے 163 ممالک میں سے رشوت کے میدان میں پاکستان ترقی کرتے ہوئے 142 نمبر پر آن پہنچا ہے اور ہم سے بدتر راشی صرف 21 دوسرے ممالک ہیں۔''

لاہور سے ایک خاتون کو اغوا کر کے قبائلی علاقے میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس کی بازیابی کے لیے اغوا کنندگان ایک لاکھ روپے تاوان کا مطالبہ کرتے ہیں۔ خاتون کے باپ کی طرف سے نوائے وقت، لاہور، یکم جنوری 2007ء میں اپیل شائع ہوتی ہے جس کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ ہم کسی مہذب ملک کے شہری نہیں ہیں، بلکہ افریقہ کے جنگل میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں جنگل کا قانون جاری ہے، وہ اپیل ''مصیبت میں مبتلا نوجوان عورت کی مدد کیجیے'' کے عنوان سے شائع ہوئی اور اس طرح ہے:

''تھانہ مصطفیٰ آباد میاں میر کالونی نمبر E-19 میں رہائش پذیر محمد یوسف پاک فوج کے ریٹائرڈ سپاہی کی بیٹی صائمہ کو بتاریخ 19-7-06 کو اغوا کر لیا گیا۔ صائمہ جو دکھوں کی ماری پہلے ہی شادی کے تین سال بعد طلاق یافتہ ہو چکی تھی اپنے دو کم سن بچوں بہ عمر دو اور تین سال کو کپڑوں کی سلائی کر کے پال رہی تھی، انسانی درندوں کے ہاتھوں اغوا ہو گئی۔ پانچ ماہ گزرنے کے بعد صائمہ کا فون پر اپنے والدین کے ساتھ رابطہ ہوا جس نے بتلایا کہ اس کے علاوہ اور بھی بہت ساری خواتین کو اغوا کر کے فروخت کر دیا گیا ہے اور وہ اس وقت بلوچستان کے قبائلی علاقے ''رکھنی'' میں موجود ہے۔ صائمہ کا والد جو ریٹائرڈ ہونے کے بعد سیکورٹی گارڈ کی ڈیوٹی کر کے مبلغ 3500/- روپے ماہانہ کما کر صائمہ کے اور اپنے کنبہ کا پیٹ پال رہا تھا بیٹی کے اغوا کے بعد اس کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا اور اس کی نوکری ہاتھ سے جاتی رہی۔ ٹیلی فون پر

اس کی بیٹی کی آواز سن کر فوراً قبائلی علاقے میں اسے ملنے کے لیے چلا گیا۔اس کے ساتھ مصطفیٰ آباد تھانہ کی پولیس کے کچھ اہلکار بھی شامل تھے۔دور دراز علاقے کے سفر کے بعد اغوا کنندگان کے پاس ''رکھنی'' پہنچے۔اغوا کنندگان صائمہ کے والد یوسف اور چچا کو اپنے ساتھ لے کر پہاڑوں میں صائمہ سے ملاقات کے لیے لے گئے۔اس کے بعد صائمہ کو واپس بھجوانے کے لیے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کیا۔صائمہ کا والد جو پہلے ہی کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزار رہا ہے، پریشان ہو کر واپس آ گیا۔اس سلسلے میں آپریشنل آئی جی اور ڈی آئی جی انوسٹی گیشن محمد اعظم سرویا سے بھی بات کی کہ وہ اس کی بیٹی کو بازیاب کرائیں۔چونکہ اس کے پاس ایک لاکھ روپیہ نہیں ہے لیکن ہر طرف سے ناکامی کا سامنا ہوا۔اب میں آپ کے ذریعے درد دل رکھنے والے خواتین و حضرات سے گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ صائمہ کی بازیابی ممکن بنانے کے لیے ایک لاکھ روپے کا عطیہ دے کر قوم کی اس بے گناہ اور مظلوم بیٹی کو آزادی دلائی جائے تاکہ اس کے کم سن بچے اپنی والدہ کے ساتھ عید منا سکیں۔اس کے باپ محمد یوسف جس کا فون نمبر 0345-4083782 ہے، کسی بھی خدا کے بندے کی جانب سے مدد کا منتظر ہے''۔(33)

کموڈور طارق مجید فرماتے ہیں کہ پاکستان جو کچھ کر رہا ہے اور پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے آنکھیں بند رکھو اور صرف اس بات پر خوش رہو کہ پاکستان کا قیام لیلۃ القدر 27 رمضان جمعۃ المبارک کے دن ہوا تھا۔حتیٰ کہ آپ پاکستان کے غیر مسلم شہریوں سے بھی یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ لیلۃ القدر کی برکات کے گن گایا کریں۔چنانچہ موصوف اپنی تالیف کے صفحہ 68 پر فرماتے ہیں:

" Pakistanies and this includes all citizens. muslims and non-muslims, and where ever they may be located. You belong to this country brought into being at a most blessed time chosen by Almighty Creator himself."

ترجمہ:''اے پاکستانیو!اور اس میں پاکستان کے تمام شہری شامل ہیں،وہ مسلمان ہوں

یا غیر مسلم اور خواہ وہ کہیں بھی رہتے ہوں، تمھارا تعلق ایک ایسے ملک سے ہے جو انتہائی بابرکت وقت میں وجود میں آیا تھا جس کا انتخاب اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا تھا۔''

ع: اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا

یہاں موصوف فرما رہے ہیں کہ پاکستان کے وجود میں آنے کا وقت اللہ تعالیٰ نے خود طے کیا تھا لیکن اپنی کتاب کے صفحہ 40-39 پر موصوف نے ایک اخباری نمائندے اور ماؤنٹ بیٹن کے درمیان ڈائیلاگ نقل کیا ہے جس میں ماؤنٹ بیٹن نے کہا ہے:

" Yes, he said , I have selected a date for transfer of power" ... " The final transfer of power to Indian hands will take place on 15th August 1947."

ترجمہ:''ہاں'' اس نے کہا ''میں نے ٹرانسفر آف پاور کی تاریخ طے کر دی ہے......
ہندستانیوں کو حتمی اختیارات 15/اگست 1945ء کو منتقل کر دیے جائیں گے۔''

اب میں سمجھ نہیں سکا کہ موصوف کی دونوں میں سے کون سی بات درست ہے۔15 اگست کی تاریخ کا فیصلہ تو ماؤنٹ بیٹن نے اس لیے کیا تھا کہ اس روز جاپان کی شکست کی دوسری برسی پڑتی تھی۔موصوف نے ایک ہی سانس میں دونوں باتیں کہہ دی ہیں کہ اقتدار کی منتقلی کے بارے میں تاریخ کا تعین اللہ تعالیٰ نے کیا تھا اور ماؤنٹ بیٹن نے بھی۔اگر موصوف یہ کہیں کہ ماؤنٹ بیٹن سے یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ نے کروایا تھا تو پھر تسلیم کرنا پڑے گا کہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام اور مسلم خواتین کے بے آبرو ہونے کا فیصلہ بھی اللہ تعالیٰ نے کروایا تھا۔ہلاکو خان کے ہاتھوں بغداد کی تباہی کا فیصلہ بھی اللہ تعالیٰ نے کروایا تھا اور اب عراق اور افغانستان کی امریکا کے ہاتھوں بربادی کا فیصلہ بھی اللہ تعالیٰ نے کروایا ہے۔اس طرح تو دنیا میں نہ تو کوئی داد کا مستحق ہے اور نہ کوئی بیداد کا۔اہل پاکستان کو تو پھر بلاوجہ ہی ماؤنٹ بیٹن پر غصہ آتا ہے۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ تقسیم برصغیر نے برصغیر کے مسلمانوں کا کون سا مسئلہ حل کیا ہے اور اس سے اسلام کو کیا فائدہ پہنچا ہے؟ مجھے اس سوال کا جواب بھی موصوف کی تالیف سے نہیں ملا۔جبکہ ہمارے جناح صاحب کو تو سندھ کے صحرا میں چند ایکڑ بھی مل جاتے تو وہ اس پر بھی راضی تھا۔

ملاحظہ فرمائیں:

" Quaid was to be told that he was getting Pakistan for which he had been fighting for so many years and attributing to the leader the words of his Lieutenant, that he had once said that he would sooner have a few acors of the Sindh desert provided it was his very own rather than have a united India with a majority rule."(34)

ترجمہ: ''قائد کو بتایا جانا تھا کہ وہ پاکستان حاصل کرنے والے ہیں، جس کے لیے انھوں نے اتنے برس مسلسل کوشش کی اور ایک نائب کے الفاظ رہنما سے منسوب کرتے ہوئے جس نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ وہ سندھ کے چند ایکڑوں پر بھی قناعت کر جائے گا، بشرطیکہ وہ اس کے اپنے ہوں بجائے اس کے کہ اسے پورا ہندستان مل جائے جس پر حکومت اکثریت کی ہو۔''

جناب ولی خاں اور ڈاکٹر عائشہ جلال نے جو کچھ کہا ہے اس کی تائید وائسرائے ہند کے ریکارڈ سے بھی ہوتی ہے۔ تقسیم ہند کے بارے میں جو دستاویزات شائع ہوئیں ان کا اُردو ترجمہ ممتاز محقق اور دانش ور جناب محمد فاروق قریشی نے ''تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار'' کے عنوان سے کیا ہے۔ اس کے صفحہ 89-88 پر دستاویز نمبر 65 درج ہے۔ یہ ایک میٹنگ کا احوال ہے جو 3 اپریل 1947ء کو ماؤنٹ بیٹن اور لیاقت علی خاں کے درمیان ہوئی۔ اس میں ماؤنٹ بیٹن نے لیاقت علی خاں سے دریافت کیا کہ اگر وہ کانگریس کو کابینہ مشن کے سولہ مئی کے بیان کو صدق دل سے قبول کرنے پر آمادہ کر لے تو کیا اس صورت میں مسٹر جناح بھی اصل معاہدے کی طرف لوٹ آئیں گے۔ اس پر لیاقت علی خاں نے جواب دیا:

''فرقہ وارانہ تلخی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ وہ (یعنی مسٹر جناح) محسوس کرتے ہیں کہ اب اس کا موقع نہیں۔ اس پر ماؤنٹ بیٹن نے لیاقت علی خاں سے سوال کیا کہ: اگر وہ میری جگہ ہوتے تو انتقال اقتدار کے لیے کیا حل پیش کرتے۔ لیاقت علی خاں نے

جواب میں بیان کیا کہ: جب سے میرا واسطہ عبوری حکومت کے کانگریسی وزرا سے پڑا ہے مجھے اس حقیقت کا احساس ہو چلا ہے کہ ان کے ساتھ کام کرنا قطعاً ناممکن ہے، ان میں مفاہمت اور منصفانہ طرزِ عمل کا فقدان ہے۔ ان میں سے اکثر یہ سوچتے رہتے ہیں کہ کس طرح سے مسلم لیگ کو نیچا دکھایا جائے اور اپنی پوزیشن کو بہتر بنایا جائے۔ لیاقت علی خاں نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ: میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ صورت حال اس قدر ناگفتہ بہ ہو چکی ہے کہ اگر عزت مآب (ماؤنٹ بیٹن) مسلم لیگ کو صرف سندھ کا صحرا دے دیں تو میں اب بھی اس کو قبول کرنے کو ترجیح دوں گا اور ایک الگ ریاست بنانا پسند کروں گا بجائے اس کے کہ کانگریس کے ساتھ بندھ کر زیادہ معقول مراعات کے ساتھ کام کروں۔''(35)

برصغیر کی تقسیم اس لیے نہیں کروائی جا رہی تھی کہ یہ مسلمانوں کے یا اسلام کے مفاد میں تھی۔ اصل مسئلہ اقتدار کے حصول کا تھا۔ اس مقصد کے لیے خواہ صرف سندھ کا صحرا ہی ملے۔ اس کے نتیجے میں برصغیر کے مسلمانوں پر کیا گزرتی۔ یہ اس قیادت کا مسئلہ ہی نہیں تھا۔ جناح صاحب تو ہر قیمت پر برصغیر کا سرجیکل آپریشن چاہتے۔ خواہ اس کے نتیجہ میں لاکھوں مسلمان قتل ہو جائیں اور ہزاروں مسلمان عورتیں بے آبرو ہو جائیں۔ جناح صاحب نے ماؤنٹ بیٹن سے 10 اپریل 1947ء کی میٹنگ میں یہ کہا:

''کابینہ مشن منصوبہ کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ ہم نے (یعنی ماؤنٹ بیٹن نے) ان (یعنی مسٹر جناح) کی تقسیم ہند کی خواہش کو لفظی طور پر پرکھنے کی کوشش کی۔ مسٹر جناح نے کہا کہ دراصل وہ عمل جراحی چاہتے ہیں جس سے گروپ ''بی'' اور ''سی'' کے علاقوں کے پانچ صوبوں کو کاٹ کر پاکستان میں شامل کر دیا جائے اور باقی چھ صوبے ہندستان کے حوالے کر دیے جائیں۔''(36)

اسی طرح ایک اور موقع پر بھی جناح صاحب نے ماؤنٹ بیٹن سے یہ کہا:

''آپ کو عمل جراحی کے ذریعے ہندستان اور اس کی مسلح افواج کو لازمی طور پر نصف نصف کاٹنا پڑے گا اور ایک نصف مجھ کو دے دیں جو مسلم لیگ کا حصہ بنتا ہے۔''(37)

ایک دوسرے موقع پر جناح صاحب نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا:

''مجھے اس کی پروا نہیں کہ آپ مجھ کو کس قدر چھوٹا (پاکستان) دیتے ہیں۔اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ جو کچھ بھی مجھے دیں وہ مکمل صورت میں ہونا چاہیے۔میں کوئی غیر پسندیدہ تجویز آپ کے سامنے نہیں رکھنا چاہتا،لیکن آپ یہ تو خیال کریں کہ نیا پاکستان سلطنت برطانیہ میں ڈومینین کا درجہ حاصل کرنے کے لیے استدعا کرے گا''۔(38)

جب ماؤنٹ بیٹن نے توجہ دلائی کہ تقسیم برصغیر (Surgical Operation) کے نتیجہ میں وسیع پیمانے پر قتل وغارت ہوگی تو جناح صاحب نے جواب میں جو کچھ کہا وہ ان کے ''صاحب بصیرت'' ہونے کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ملاحظہ فرمایئے:

"Mountbatten and Jinnah did agree on one point at the outset- the need for speed.India, Jinnah declared,had gone beyond the stage at which a compromise solution was possible. There was only one solution, a speedy`surgical operation. Otherwise, he warned, India would perish."(39)

ترجمہ:''جناح اور ماؤنٹ بیٹن بہرحال ایک بات پر متفق تھے اور وہ تھی تیز رفتاری کی ضرورت۔جناح اعلان کر چکے تھے کہ ہندستان سمجھوتے کے امکانات کی حدود پار کر چکا تھا۔اب ایک ہی حل تھا- جلد از جلد کی جانے والی جراحی- بصورت دیگر انھوں نے خبردار کیا کہ ہندستان فنا ہو جائے گا۔''

جناح صاحب۔ کے سرجیکل آپریشن کے مطالبہ پر ماؤنٹ بیٹن نے کیا کہا وہ بھی سن لیجیے:

"When Mountbatten expressed concern lest partition might produce bloodshed and violence, Jinnah reassured him. Once his` surgical operation had taken place,all troubles would cease and India`s two halves would live in

harmony and hapiness. It was, Jinnah told Mountbatten, like a court case he had handled between two brothers, embittered by the shares assingned to them under their father`s will.Yet, two years after the court had adjudicated their dispute, they were the greatest friends. That, he promised the Viceroy, would be the case in Inidia." (40)

ترجمہ:''جب ماؤنٹ بیٹن نے ان خدشات کا اظہار کیا کہ تقسیم کے نتیجے میں تشدد اور خون خرابہ ہو سکتا ہے تو جناح نے انھیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا کہ جب ایک مرتبہ ان کا سرجیکل آپریشن مکمل ہو جائے گا تو تمام مسائل ختم ہو جائیں گے اور ہندستان کے دونوں حصے اتفاق اور خوش اُسلوبی سے رہنے لگیں گے۔جناح نے کہا کہ اس کی مثال ان کے ایک مقدمے کی سی تھی جو دو بھائیوں کے اپنے والد کی جائداد کی تقسیم کے تنازعے کی بنا پر تھا۔جب عدالت نے مقدمے کا فیصلہ کر دیا تو دو سال بعد دونوں آپس میں بہترین دوست بن گئے۔انھوں نے وائسرائے کو یقین دلایا کہ ہندستان میں بھی یہی صورتِ حال ہوگی۔''

ہمارے جناح صاحب توقع کر رہے تھے کہ تقسیم کے بعد پاکستان اور بھارت اسی طرح ہنسی خوشی رہنا شروع کر دیں گے جس طرح وہ دو بھائی جو موروثی جائیداد کی تقسیم کے مسئلہ پر ایک دوسرے سے ناراض تھے اور وہ عدالتی فیصلہ کے آنے کے بعد دو سال کے اندر آپس میں دوست بن گئے،لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے واقعی بصیرت عطا کی تھی،ان کی بھی سن لیجیے:

"Gandhi did not oppose partition simply out of some mystical devotion to Indian unity. His years in the villages of India had given him an intiutive feeling for the soul of his country. Partition, that intiution told

him , was not going to be the surgical operation.Jinnah has promised Mountbatten,it would be a sickening slaughter that would turn friend on friend, neighbour on neighbour,stranger on stranger,in thousands of these villages he know so well.Their blood would be shed to achieve an abhorrent,useless end ,the division of the sub-continent into two antagonistic parts condemned to gnaw at each other`s entrails.Genrations of Indians for the decades to come, Gandhi believe, would pay the price of the error they were preparing to commit."(41)

ترجمہ: ''گاندھی کے تقسیم کی مخالفت کرنے کا سبب ہندستان کی وحدت سے کوئی روحانی لگاؤ نہیں تھا۔ ہندستان کے دیہات میں گزارے ہوئے برسوں کے تجربے کے نتیجے میں انھیں ہندستان کی روح سے ایک وجدانی آگاہی حاصل ہو چکی تھی اور اس وجدان کی وجہ سے انھیں اندازہ تھا کہ تقسیم اس قسم کا سرجیکل آپریشن نہیں ہوگا جس کا وعدہ جناح وائسرائے سے کر رہے ہیں، بلکہ یہ ایک مکروہ قسم کی قتل وغارت ہوگی اور ان ہزاروں دیہات میں، جنھیں وہ بخوبی جانتے تھے، دوست دوست کا، پڑوسی اپنے پڑوسی کا اور اجنبی اجنبی کا گلا کاٹے گا۔ یہ خون ایک لایعنی مقصد کے حصول کی خاطر بہایا جائے گا۔ برصغیر کی دو ایسے دشمن حصوں میں تقسیم ہوگی، جو ہمیشہ ایک دوسرے کو کچا چبا جانے کے لیے تیار ہوں گے۔ گاندھی کا خیال تھا کہ جو غلطی وہ (یعنی جناح صاحب اور اُن کے ساتھی) کرنے جا رہے ہیں اس کا خمیازہ آنے والی نسلیں کئی دہائیوں تک بھگتیں گی۔''

وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ بصیرت سے محروم کون تھا اور کس کی بات درست ثابت ہوئی۔ وہ کون تھا جو حصولِ اقتدار کے لیے (خواہ اُسے سندھ کا صحرا ہی مل جائے) کروڑوں

مسلمانوں کی جان و مال، عزت و آبرو کے بارے میں بے حس تھا اور وہ کون تھے جو مسلمانوں کو آنے والی تباہی کے بارے میں خبردار کر رہے تھے۔

جناح صاحب کو اس سے غرض نہیں تھی کہ ان کو جو پاکستان ملے گا اس کا رقبہ کتنا ہوگا اور اس سے مسلمانوں کا کوئی مسئلہ حل ہوگا یا نہیں۔ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ بے شک ان کو چھوٹا سا پاکستان ہی مل جائے، لیکن وہ ان کے مکمل قبضۂ اقتدار میں ہونا چاہیے اور جس کے وہ بانی کہلائیں۔ اس کے لیے ان کو سرجیکل آپریشن بھی قبول تھا۔ سرجیکل آپریشن کے نتیجہ میں اگر لاکھوں مسلمان قتل ہو جاتے ہیں اور ہزاروں مسلمان عورتیں بے آبرو ہو جاتی ہیں تو جناح صاحب کو اس کی بھی پروا نہیں تھی۔ جناح صاحب کی نہ تو اپنی بہو تھی نہ بیٹی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹی عطا کی تھی، اسے جناح صاحب نے ہوٹلوں میں آزاد چھوڑ رکھا تھا۔ مجاہد اسلام کو اس بات کی کوئی پریشانی بھی نہیں تھی کہ اس کی تعلیم و تربیت کن عقائد کے مطابق ہو رہی ہے کیونکہ ذاتی زندگی میں جناح صاحب کا کوئی مذہب تھا ہی نہیں، البتہ سیاسی زندگی میں وہ مجاہد اسلام تھے۔ ایک راسخ العقیدہ مسلمان کبھی یہ برداشت کر ہی نہیں سکتا کہ اس کی اولاد میں سے کوئی غیر مسلم ہو جائے۔

جناح صاحب کا مطالبہ ماؤنٹ بیٹن نے تسلیم کرتے ہوئے برصغیر کا سرجیکل آپریشن کر دیا لیکن اس کے نتیجہ میں پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں پر جو گزری اس کا حال بھی سن لیجیے۔ اگست 1946ء میں جناح صاحب نے برصغیر کے مسلمانوں کو ڈائریکٹ ایکشن کی ہدایت کی۔ اس ایجی ٹیشن کے سلسلہ میں 16 اگست 1946ء کو عام ہڑتال تھی جس کے نتیجہ میں صرف ایک مقام کلکتہ میں جو ہوا اس کو بیان کرتے ہوئے ایک صاحب لکھتے ہیں:

"That night small gangs set out with knives and short swords,and the next morning hundred of corpses were found lying in gutters. Troops were called out, but the killers seemed to melt away where-ever they appeared, only for the violence to recommence the moment they had left." (42)

ترجمہ: ''اس رات چھریوں اور چھوٹی تلواروں سے مسلح چھوٹے چھوٹے گروہ نمودار

ہوئے اور اگلی صبح سیکڑوں لاشیں گڑھوں میں پڑی ملیں۔فوج کو طلب کیا گیا، مگر فوج جہاں جاتی، یہ قاتل غائب ہوجاتے اور فوج کے جاتے ہی تشدد کا دوبارہ آغاز ہوجاتا۔"

گورنر بنگال نے اپنی خفیہ رپورٹ میں لکھا:

"I actully saw a crowd clubbing these unfortunate individuals to death ... many corpses were stripped and mutilated."(43)

ترجمہ:"میں نے خود ایک گروہ کو دیکھا کہ انھوں نے ان بدنصیب افراد کو ڈنڈوں سے مار مار کر قتل کر دیا۔ بہت سی لاشیں برہنہ اور مسخ شدہ تھیں۔"

اگست 1947ء میں پنجاب میں کیا ہوا اس کے متعلق ایک اور صاحب صرف ایک جگہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

"In Amritsar while the city's authorities dutifully performed their indipendence rituals at the city's Moghal fortress, an enraged horde of Sikhs was ravaging a Moslem neighbour-hood less than a mile away. They slaughtered its male inhabitants without mercy or exception. The women were stripped ,repeatedly raped,then paraded shaking and terrifield through the city to Golden Temple where most had their throat cut." (44)

ترجمہ:"امرتسر میں جب شہر کی انتظامیہ، شہر کے مغلیہ قلعے میں آزادی کی رسومات منانے کی تیاری کر رہی تھی، ایک میل سے بھی کم فاصلے پر واقع ایک مسلم محلے میں غضب ناک سکھوں کا جتھا دندناتا پھر رہا تھا۔ انھوں نے بلا استثنا تمام مردوں کو بے دردی سے قتل کر دیا، خواتین کو برہنہ کر دیا گیا، ان کی عصمتیں تار تار کر دی گئیں۔ بعد میں خوفزدہ اور کانپتے قدموں سے یہ خواتین جلوس کی صورت میں گولڈن ٹیمپل

پہنچائی گئیں جہاں ان میں سے زیادہ تر کو ذبح کر دیا گیا۔"

یہ تھا انعام جو برصغیر کے مسلمانوں کو جناح صاحب کی قیادت کے طفیل حاصل ہوا۔ قتل عام اور مسلمان خواتین کی بے آبروئی کے علاوہ مسلمانوں کو تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت کرنا پڑی۔ تقریباً ایک کروڑ پچاس لاکھ افراد بے گھر ہوئے۔ جن حالات میں ان کو یہ سفر کرنا پڑا، اُسے بھی ایک صاحب کی زبانی سن لیجیے:

"Eyes and throats raw with dust, feet bruised by stones or searing asphalt,tortured by hunger and thirst, enrobed in a stench of urine, sweat and defecation, the refugees plodded dumbly forword. They flowed on in filthy cloths, saris, baggy trousers,frayed sandals,sometimes only one shoe, often none at all. Elderly women clung to their sons, pregnant women to their husbands. Men carried invalid wives and mothers on their shoulders,women their infants they had to endure their burden not for a mile or two but for a hundered, two hundered miles, for days on end with nothing to nourish their strength but a chapati and a few sips of water ... Worst of all were those who could not make it, those who were too young or too old, too weakened by illness,exhaustion or hunger to go on.There was the pitiful sight of children whose parents no longer had the strength to carry them, left behind

to die in the wake of a caravan.There were elderly, resingned to death, tottering off into the fields in search of the shade of a tree under whose comforting branches they might await their end. Engraved in the memory of Margaret Bourke White would be the image of a child left by the side of the road tugging the arms of his dead mother, failing to comprehand why those arms would never pick it up again."(45)

ترجمہ: ''آنکھیں اور حلق گرد سے آلودہ، پاؤں زخم زخم، بھوک پیاس سے ہلکان، بول و براز اور پسینے کی بدبو سے بھرے یہ مہاجر بوجھل قدموں سے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ان کے گروہ میلے کچیلے کپڑوں، ساڑھیوں، شلواروں، پھٹی جوتیوں، جو بعض کے صرف ایک پیر میں جوتی اور بعض کے پاس وہ بھی نہیں، چلے آ رہے تھے۔ بوڑھی عورتیں اپنے بیٹوں سے چمٹی ہوئی، حاملہ عورتیں اپنے شوہروں سے، مرد اپنی معذور بیویوں اور ماؤں کو کاندھوں پر اُٹھائے ہوئے، عورتیں اپنے شیر خوار بچوں کو گود میں اٹھائے۔ انھیں یہ بوجھ ایک دو میل تک نہیں بلکہ سوسو، دو دو سو میل تک اٹھانا پڑا، مسلسل کئی کئی روز تک۔ اور جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کو پانی کے ساتھ ایک سوکھی چپاتی...... سب سے بدتر صورتِ حال ان کی تھی جو یہ سفر مکمل نہ کر پائے۔ جو بہت کم عمر یا بہت عمر رسیدہ تھے۔ بیماری، کمزوری یا بھوک کے مارے ہوئے۔ وہ بچے جن کے والدین اب مزید انھیں اٹھائے نہیں چل سکتے تھے انھیں کسی کارواں کے آنے کی امید میں مرنے کے لیے پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ وہ بوڑھے جو کھیتوں میں ڈگمگاتے قدموں سے کوئی سایہ دار جگہ تلاش کر رہے تھے تاکہ وہاں بیٹھ کر شامِ زندگی کا انتظار کر سکیں۔ اس بچے کی تصویر Margaret Bourke White کی یادداشت پر کندہ ہوگئی تھی جسے سڑک کے کنارے اپنی ماں کی لاش کے ساتھ ہی چھوڑ دیا گیا تھا اور جو اپنی ماں

کے بازوؤں کو چھو چھو کر حیران تھا کہ یہ بازو اسے اٹھانے کو آگے کیوں نہیں بڑھتے۔''

مسلمانوں کا جو قتلِ عام ہوا، مسلمان خواتین کو جس طرح بے آبرو کیا گیا اور جن مشکل حالات میں بغیر کسی تیاری کے اور بغیر کسی منصوبہ بندی کے مسلمانوں نے پاکستان کی طرف سفر کیا، تاریخ میں اس سے قبل اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ جناح صاحب خود تو ہوائی جہاز میں دو گھنٹے کا سفر کر کے دہلی سے کراچی گورنر جنرل ہاؤس میں پہنچ گئے اور آتے ہی دو قومی نظریہ کو بحیرۂ عرب میں غرق کر دیا۔ ہر صاحبِ بصیرت شخص کو نظر آ رہا تھا کہ تقسیم کے نتیجے میں زبردست قتلِ عام ہوگا لیکن اگر کسی کو نظر نہیں آ رہا تھا تو وہ جناح صاحب تھے جن کا خیال تھا کہ جیسے ہی تقسیم کا اعلان ہوگا، ہر چیز نارمل ہو جائے گی۔ ہندو، مسلمان، سکھ سب بھائیوں کی طرح رہنا شروع کر دیں گے۔ کیونکہ دو بھائیوں کے جائیداد کے مقدمہ میں (جس میں وہ وکیل تھے) عدالت کے فیصلے کے بعد انھوں نے پیار اور محبت سے رہنا شروع کر دیا تھا۔ انسانی تاریخ میں شاید ہی کسی لیڈر نے اپنے متبعین کے ساتھ یہ سلوک کروایا ہو جو جناح نے کروایا تھا۔ اس کے باوجود جیالے دانش وروں کا بس چلے تو اسے پیغمبر بنا دیں۔

جناح صاحب کو تو اس سے غرض تھی ہی نہیں کہ تقسیم سے برِصغیر کے مسلمانوں کا کوئی مسئلہ حل ہوتا ہے یا نہیں۔ ان کا مقصد تو یہ تھا کہ تقسیم ہو جائے تاکہ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی عددی طاقت تین حصوں میں تقسیم ہو کر بے اثر ہو جائے اور یہود و نصاریٰ کو ایک آلۂ کار ملک میسر آ جائے۔ مسٹر جناح ایک نوزائیدہ ریاست کے پہلے گورنر جنرل بن جائیں جہاں شہر شہر بہت سی جائیدادیں ان کی ملکیت ہوں۔ اس کے ساتھ ہی جناح صاحب نے پوری کوشش کی کہ برِصغیر کے غیر مسلم متحد رہیں۔ کیونکہ دو قومی نظریہ کا مطلب ہی یہ تھا کہ برِصغیر کے مسلمانوں کے مقابلے میں تمام غیر مسلم (ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی وغیرہ) متحد ہو جائیں اور وہ متحد ہو گئے۔



حوالہ جات

(1) تفہیمات الٰہیہ/ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی/ ص203

(2) قائداعظم کے رفقا سے ملاقاتیں/ ص:40

(3) پاکستان کی سیاست کا پہلا عوامی و ہنگامی دور (69ء تا 72ء کے سیاسی تجزیے)/ ڈاکٹر اسرار احمد/ انجمن خدام القرآن، لاہور/1996ء/ ص115-117

(4) یاد ایام (آپ بیتی)[جلد دوم]/ مولانا محمد زکریا کاندھلوی/ مکتبہ خلیل، لاہور/ س، ن/ ص:559

(5) روزنامہ پاکستان لاہور/8 ستمبر2009ء

(6) روزنامہ جنگ لاہور/دسمبر2010ء

(7) روزنامہ نوائے وقت لاہور/26 جنوری2011ء

(8) روزنامہ ایکسپریس لاہور/22 اگست2006ء

(9)Roses in December: page 80 by M.C. Chagla

(10) شاہراہِ پاکستان/چودھری خلیق الزماں/ ص:1106

(11)Jinnah of Pakistan : Page 340 by Stanly Wolpert

(12)روزنامہ پاکستان (سنڈے میگزین)لاہور/12 اکتوبر2008ء

(13)گونج (چند یادیں، چند باتیں)/ایم اقبال/ ص:133

(14)ہم آغا خانی مسلمان کیسے ؟/اکبر علی غلام حسین، ص346

(15)Jinnah of Pakistan Page 56 by Satnley Wolpert)

(16)Rose in December Page 120-121 by M.C.Chagla

(17)تحریکِ خلافت/ ص:29

(18)ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور/جون1948ء

(19)Jinnah of Pakistan by volpert, Page 339)

(20) Facts are Facts, page 146 by A. Wali Khan

(21)The American Role in Pakistan page 2, 3 by M.S Venkat Ramani.

(22)ibid, page 17.

(23)ibid, page 19.

(24)ibid, page 26.

(25)ibid, page 28.

(26)ibid, page 29-30.

(27)ibid, page 30-31.

(28)ibid, page 31.

(29)ibid, page 70-71.

(30)روزنامہ نوائے وقت لاہور/ یکم جنوری2007ء

(31)روزنامہ پاکستان لاہور/5 جنوری2007ء

(32)روزنامہ نوائے وقت لاہور/29 دسمبر2006ء

(33)ایضاً/ یکم جنوری2007ء

(34)The Sole Spokesman page 284 by Ayesha Jalal and Facts are Facts page 148 by A. Wali Khan)

(35) تحریکِ پاکستان اور انتقالِ اقتدار (ماؤنٹ بیٹن پیپرز)،ص89

(36) ایضاً،ص159

(37) ایضاً،ص236۔

(38) ایضاً،ص288۔

(39) Freedom at Midnight by Lorry collins and MomingueLapiare page 129.

(40) Freedom at Midnight page 129-130

(41) Freedom at Midnight page 149

(42) Liberty or Death, India's Journey to Indipendenc and Division page 251 by Patrice French

(43) Liberty or Death, India's Journey to Indipendenc and Division page 251 by Patrice French

(44)Freedom at Midnight by Lorry collins and Dominique Lapiare, page 341

(45)Freedom at Midnight by Lorry Collins and Dominique Lapierre page 403,405

6

پروفیسر مظفر مرزا کا مضمون بعنوان ''حضرت قائداعظم اور ظہور پاکستان، مطبوعہ نوائے وقت لاہور، 6دسمبر 2005ء ایک قصیدہ ہے۔ اگر قصائد کہنے سے اقوام کا سر بلند ہونا ممکن ہوتا تو برصغیر میں مغلوں کو کبھی زوال نہ آتا کیونکہ مغل دربار میں ایک سے بڑھ کر ایک قصیدہ گو شاعر موجود تھا۔ ہاں قصیدہ کہنے سے قصیدہ گو کا رزق ضرور بڑھتا ہے۔ پروفیسر صاحب مسٹر جناح پر بُری طرح فدا ہیں۔ دن میں اُن کی باتیں کرتے ہیں اور شب کو خواب میں اُن سے باتیں کرتے ہیں۔ انھوں نے انھی خواب پریشاں کو کاغذ پر منتقل کر کے حال ہی میں حضرت قائداعظمؒ کے حضور کے نام سے کتابی صورت میں شایع بھی کر دیا ہے تاکہ پڑھنے والے پریشان رہیں۔ اگر پریشان نہ ہو سکیں تو حیرت زدہ رہیں۔ موصوف نے اس کتاب میں ایک گروپ فوٹو بغیر کیپشن کے شامل کیا ہے، جس میں جناح صاحب اور فاطمہ جناح کے ساتھ مرزا صاحب بھی کھڑے ہیں۔ اب ایسے قلم کار اور ایسے عقیدت زدہ کی باتوں کو سنجیدگی سے لیا جائے تو یہ زیادتی ہوگی۔

موصوف سے چند بار مختصری گفتگو کا موقع ملا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے نوائے وقت میں مطبوعہ مضامین سے بھی استفادہ کیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرے اور موصوف کے درمیان کوئی مشترک اساس نہیں جس پر ہم تبادلہ خیالات کر سکیں، لہٰذا ہمارے درمیان اتفاق رائے بعید از امکان ہے کیونکہ: میرے نزدیک اسلام اللہ تعالیٰ کا طے کردہ دین ہے، جو اس نے نسل انسانی کے لیے پسند فرمایا۔ اسلام اور صرف اسلام ہی حق ہے اس سے ہٹ کر جو کچھ ہے باطل ہے جبکہ: مرزا صاحب موصوف کے نزدیک ''اسلام'' بھی اسی طرح کا ایک دھرم ہے جس طرح

"ہندو دھرم، بدھ مت یا جین مت" دھرم ہیں۔

میرے نزدیک کوئی بھی شخص کلمہ شہادت ادا کر کے اور اپنے سابقہ غلط عقائد سے برأت کا اظہار کر کے اسلام قبول کر سکتا ہے۔ اسی طرح کوئی بھی پیدائشی مسلمان اگر اسلام کے بنیادی عقائد میں سے کسی کے بارے میں تشکیک کا شکار ہو جائے خواہ وہ زبان سے اسلام، اسلام کی گردان ہی کیوں نہ کرتا رہے اسلام سے خارج ہو سکتا ہے۔ جبکہ موصوف کے نزدیک ہر وہ شخص مسلمان ہے جس کا نام مسلمانوں کا سا ہے اور وہ اس بات کا مدعی ہے کہ وہ مسلمان ہے، خواہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہ بھی رکھتا ہو۔ خواہ حشر کا قائل نہ ہو۔ خواہ قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کا کلام تسلیم نہ کرتا ہو نیز کوئی غیر مسلم کلمۂ توحید پڑھ کے مسلمانوں میں شامل نہیں ہو سکتا۔ جس طرح کوئی شخص مذہب تبدیل کر کے ہندو نہیں ہو سکتا۔

میرا ایمان ہے کہ رسول اکرم واقدس حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں اور ان کی بعثت پوری نسل انسانی کے لیے ہے۔ پوری نسل انسانی نبی اکرمؐ کی امت دعوت ہے۔ نسل انسانی کے جس حصہ نے ان کی دعوت کو قبول کر لیا، وہ امت اجابت ہو گئی۔ اس امت کے ہر فرد پر یہ فرض عائد ہو گیا کہ وہ امت دعوت تک اسلام کے اس پیغام کو پہنچا دے جس تک یہ پیغام نہیں پہنچا۔ اس لیے جو شخص نبی اکرم کو آخری نبی تسلیم نہیں کرتا (مثلاً قادیانی، بہائی، ذکری، اسمٰعیلی) وہ مسلمان نہیں ہے۔ اسی طرح یہ قرآن، جو مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے اور "الحمد" سے شروع ہو کر "والناس" پر ختم ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور یہ اسی حالت میں بغیر کسی تبدیلی کے ہے جس حالت میں جبریلؑ نے اللہ تعالیٰ سے وصول کر کے نبی اکرم کو دیا اور نبی اکرمؐ سے امت نے وصول کیا۔ اب جو شخص اس قرآن کو اللہ تعالیٰ کا کلام تسلیم نہ کرے (روافض تسلیم نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ وہ نہ قرآن حفظ کرتے ہیں اور نہ ہی رمضان میں تراویح پڑھتے ہیں) وہ مسلمان نہیں ہے خواہ زبان سے ہر وقت اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا رہے۔ جبکہ مرزا صاحب موصوف کے نزدیک یہ سب کچھ اساطیر الاولین میں شامل ہے۔ موصوف کے نزدیک ہر وہ شخص مسلمان ہے جو اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو، خواہ ختم نبوت پر ایمان نہ رکھتا ہو خواہ قرآن کو اللہ تعالیٰ کا کلام تسلیم نہ کرتا ہو۔

میرے نزدیک پوری روئے زمین ایک مسلمان کا وطن ہے۔ وہ عرب میں ہو یا عجم میں، وہ

روس میں ہو یا سری لنکا میں، وہ مشرق میں ہو یا مغرب میں۔ وہ جہاں بھی ہو گا وہی اس کا وطن ہے۔ قلت تعداد اور کثرت تعداد ایک مسلمان کا مسئلہ ہی نہیں۔ ایک مسلمان کے لیے:

ہر ملک ملک ما است۔ کہ ملک خدائے ما است

مسلمان جہاں بھی ہو گا وہی اس کا وطن ہے اور وہ غیر مسلموں تک اس پیغام کو پہنچانے کا فرض ادا کرتا رہے گا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے جبکہ پروفیسر صاحب موصوف کے نزدیک یہ سب ڈھونگ ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ کسی مسلمان پر نہ تبلیغ فرض ہے، نہ کسی غیر مسلم نے مسلمان ہونا ہے۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں وہ ہمیشہ اقلیت میں رہیں گے۔ ضروری ہے کہ جہاں اتفاق سے ان کی اکثریت بن گئی ہے ان کو علیحدہ کر کے الگ ملک بنا دیا جائے جہاں وہ عشرت کدے آباد کر سکیں اور جن علاقوں میں ان کی اقلیت ہے وہاں ان کو اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ مرزا صاحب موصوف فرماتے ہیں:

"پاکستان کا معرض ظہور میں آنا کسی معجزے سے کم نہیں۔ پاکستان کا وجود دنیائے انسانیت کے نقشے پر قائم رہنا دوسرے محیر العقول معجزے سے کم نہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ قیام پاکستان کس طرح معجزہ تصور کیا جاتا ہے"؟

موصوف نے اس سوال کا جواب نہیں دیا جبکہ سوال بھی خود ہی پیش کیا ہے۔ بات کو سمجھنے کے لیے ہم پیچھے چلے جاتے ہیں۔ اب ہم 1945ء میں ہیں۔ صوبہ سرحد مسلمان اکثریت کا صوبہ ہے اور مسلمان ہی وزیر اعلیٰ ہے۔ صوبہ بلوچستان مسلم اکثریت کا صوبہ ہے اگرچہ اسے صوبائی درجہ حاصل نہیں ہے لیکن سب سے بااثر شخصیت خان آف قلات کی ہے جو مسلمان ہے۔ سندھ مسلم اکثریت کا صوبہ ہے اور مسلمان ہی وزیر اعلیٰ ہے۔ پنجاب جو اٹک سے شروع ہو کر دہلی تک ہے، مسلم اکثریت کا صوبہ ہے اور مسلمان ہی وزیر اعلیٰ ہے۔ بنگال (پورا بنگال) مسلم اکثریت کا صوبہ ہے اور مسلمان ہی وزیر اعلیٰ ہے۔ ساٹھ سال بعد سرحد بلوچستان، سندھ تو اسی طرح ہیں لیکن پنجاب سکڑ کر آدھا رہ گیا۔ اب دنیا کا کوئی ماہر ریاضی دان مجھے سمجھائے کہ اس معجزے کی بدولت ساٹھ سال بعد ہم فائدے میں رہے یا نقصان میں۔ یہی معاملہ بنگال کا ہے۔ 1947ء سے قبل پورے بنگال پر مسلمانوں کی حکومت تھی تو آج آدھے بنگال پر ہے۔ مرکز میں اس وقت اگر بکنگھم پیلس کا نمائندہ حکومت کرتا تھا تو آج وائٹ ہاؤس کا ایجنٹ حکومت کرتا ہے۔ (یہ 2008ء تک کی

صورت حال ہے اگرچہ اس کے بعد بھی کوئی جوہری تبدیلی نہیں ہوئی اور نہ ہونے کی توقع ہے)۔ موصوف نے یہ بیان نہیں کیا کہ اس معجزے سے برصغیر کے مسلمانوں بالخصوص بھارت کے مسلمانوں کو کیا فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ معجزے کا وظیفہ پڑھنے سے تو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ معجزے کے لفظ کی گردان تو اس طرح کی گئی ہے کہ گویا اس علاقے میں (جسے اب پاکستان کہا جاتا ہے) پہلے سمندر تھا۔ جناح صاحب نے اس سمندر میں عصا مارا تو یکدم پانی خشک ہو گیا اور نیچے سے خشک زمین برآمد ہو گئی اور جناح صاحب نے اسے ہمارے حوالے کر دیا کہ لو بچو! عیش کرو۔ موصوف فرماتے ہیں:

''حضرت قائداعظم نے تین باتوں کے ضمن میں واضح ارشادات فرما دیے تھے کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد اس میں کون سا قانون نافذ فرمائیں گے تو ان کا جواب تھا کہ وہ قانون جو آج سے چودہ سو سال پہلے نوع انسانی کے لیے نافذ کر دیا گیا ہے یعنی اسلام اور قرآن''۔

موصوف نے درست فرمایا۔ پاکستان میں اسلام کے مطابق قانون سازی کے لیے جناح صاحب نے جس شخص کی تربیت کی تھی، اس کا نام تھا جوگندر ناتھ منڈل۔ پاکستان میں مسٹر منڈل کو پہلا وزیر قانون بنایا گیا تھا۔ جناح صاحب نے اس کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ اسلام کے مطابق قانون سازی کریں، لیکن مسٹر منڈل اس کام کو مکمل کیے بغیر ہی بھارت بھاگ گیا اور اس کی تربیت پر جناح صاحب کی محنت اور سرمایہ کاری ضائع ہو گئی۔ اگر مسٹر منڈل بھاگ کر بھارت نہ جاتا تو اب تک اسلام کے مطابق قانون سازی کا کام مکمل ہو جاتا۔ اگر وہ کام جو مسٹر منڈل کے سپرد تھا، نہیں ہو سکا تو جناح صاحب کیا کریں۔ کوئی یہ تو بتائے کہ منافقت کی تعریف کیا ہے؟ موصوف فرماتے ہیں:

''جب ان سے استفسار کیا گیا کہ آپ سنی ہیں یا شیعہ تو ان کا فرمان تھا رسول اللہؐ کیا تھے؟ سنی یا شیعہ''۔

جناح صاحب کا یہ جواب ایسا ہی تھا جیسا کہ آپ کسی شخص سے سوال کریں کہ ''آپ جاٹ ہیں یا راجپوت؟'' اور جواب میں وہ شخص الٹا یہ سوال کر دے کہ ''حضرت آدم علیہ السّلام کیا تھے، جاٹ تھے یا راجپوت؟'' حیرت ہے کہ جناح کو احساس ہی نہیں تھا (اور نا اب اُن کی ذریّت کو

ہے) کہ یہ جواب Evasive (جان چھڑانے والا) ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو نہ سنی ہو سکتے تھے نہ شیعہ کہ وہ اللہ کے رسول تھے۔ وہ تو خود ماڈل تھے ان کا قول و فعل ہی اسلام تھا۔ کیا کوئی دوسرا شخص بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ماڈل ہے اور اس کا قول و فعل اسلام ہے۔ لیکن جب مسلمانوں میں شیعہ اور سنی کی تقسیم ہو گئی تو اس کے بعد ایک مسلمان لازماً یا سنی ہو گا یا شیعہ۔ اب یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک شخص مسلمان ہونے کے بعد نہ سنی ہو نہ شیعہ۔ کسی عیسائی یا کسی ہندو سے کبھی کسی نے سوال نہیں کیا کہ وہ سنی ہے یا شیعہ، لیکن جو شخص مسلمان ہونے کا مدعی ہے اس سے یہ سوال ضرور پوچھا جائے گا۔ نماز اسلام کا ستون ہے۔ ایک شخص جو مسلمان ہے وہ کبھی نہ کبھی نماز ضرور پڑھے گا۔ جب وہ نماز پڑھے گا تو یا ہاتھ باندھ کر پڑھے گا یا ہاتھ کھول کر۔ دراصل یہ ایک لغو سیاسی جواب تھا، یہ جناح صاحب نے محض سائل کا منہ بند کرنے کے لیے دیا تھا۔ موصوف فرماتے ہیں:

''ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت قائداعظم اور حضرت علامہ اقبال دونوں اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے تھے۔ ان میں ولیانہ اوصاف موجود تھے''۔

میں چونکہ دانش ور نہیں ہوں۔ اس لیے میں احمقانہ طور پر یہ سمجھتا رہا ہوں کہ عقیدے کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، رسالت، اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتب، ملائکہ اور حشر سے ہے۔ موصوف کے مضمون سے میرے علم میں یہ اضافہ ہوا ہے کہ جناح صاحب اور علامہ اقبال کو ولی اللہ سمجھنا بھی عقائد اور ایمانیات کا حصہ ہے۔ یہ سوال ایک عرصہ سے میرے ذہن میں جواب طلب تھا کہ علامہ اقبال کی وہ کون سی خدمات تھیں جن کے صلہ میں ان کو انگریزوں نے ''سر'' کا خطاب عطا فرمایا۔ اس مضمون سے اب معلوم ہوا ہے کہ انگریزوں پر یہ منکشف ہو گیا تھا کہ علامہ اقبال ولی اللہ تھے۔ اس لیے انگریزوں نے بھی ان کو ''سر'' کا خطاب عطا کر دیا۔

موصوف کے نزدیک علامہ اقبال کے علاوہ جناح صاحب بھی ولی اللہ تھے۔ ان کے خیال میں سؤر کا گوشت کھانے، شراب پینے اور مہمانوں کو (جن میں غیر مسلم بھی شامل ہوں) شراب پیش کرنے سے ولایت میں کمی نہیں آتی بلکہ اضافہ ہوتا ہے۔ ایسا شخص جو مسلمان ہونے کا مدعی ہو، مہمانوں کو شراب پیش کرے میرے نزدیک تو دینی حمیت سے بھی عاری ہوتا ہے خاص طور پر ایسا شخص جو ایک اسلامی مملکت کا سربراہ ہو وہ ایسا کرے تو اسے ولی اللہ تسلیم کرنا ایک جیالے کا حوصلہ ہی ہو سکتا ہے۔ ویسے حقیقت یہ ہے کہ جناح صاحب ایک اسلامی ملک کے سربراہ نہیں تھے۔

انھوں نے گورنر جنرل کے عہدے کا جو حلف اٹھایا تھا اس کے الفاظ یہ تھے:

''میں محمد علی جناح قانون کے مطابق قائم ہونے والے پاکستان اور دستور حکومت سے سچی عقیدت اور وفاداری کا عہد مصمم کرتا ہوں اور میں پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے شہنشاہ جارج ششم اور ان کے ولی عہدوں اور ان کے جانشینوں کا وفادار رہوں گا''۔

اب اگر جناح صاحب نے مہمانوں کی شراب سے تواضع کی تھی تو وہ شہنشاہ جارج ششم سے وفاداری کے تسلسل میں کی تھی۔ اس سے موصوف کے نزدیک ان کی ولایت میں کمی نہیں ہو سکتی تھی۔ مرزا صاحب موصوف فرماتے ہیں:

''چین، کوریا، تائیوان، انڈونیشیا اور افریقہ کے مسلم ممالک جو پاکستان کے قیام کے بعد معرض وجود میں آئے۔ ان میں اکثر آج ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہیں اور پاکستان کی پچاس فیصد آبادی فقط ایک وقت کی روٹی پر اکتفا کیے ہوئے ہے''۔

موصوف نے بجا ارشاد فرمایا، لیکن جن ممالک کا موصوف نے ذکر کیا ہے ان میں عوام کی قیادت کسی جناح صاحب کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ چین جیسا ہے اور جہاں ہے، اس کی نیک نامی یا بدنامی اس کے قائد ماؤزے تنگ کو جاتی ہے۔ بھارت اس وقت جیسا ہے، جہاں ہے، اس کی بھی نیک نامی یا بدنامی اس کے قائد گاندھی کو جاتی ہے۔ پاکستان جیسا ہے جہاں ہے تو اس کی بھی نیک نامی یا بدنامی جناح صاحب کو جائے گی۔ اس لیے اگر پاکستان کی (بقول مرزا صاحب موصوف) پچاس فیصد آبادی کو ایک وقت کی روٹی بھی مشکل سے ملتی ہے تو وہ جناح صاحب کو دعائیں دیں۔

موصوف فرماتے ہیں:

''کرشنا مینن اور دوسرے ہندو لیڈروں نے یہ سکیم بنائی تھی کہ پاکستان کو کرم خوردہ بنا دیا جائے۔ چنانچہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قائد اعظم کو ایسا ہی پاکستان دیا''۔

کیا جناح صاحب یہ توقع رکھتے تھے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور دوسرے ہندو لیڈران کے حسب منشا پاکستان طشتری میں رکھ کر انھیں پیش کر دیں گے کہ لیجیے جناب اسے قبول فرما کر ہم پر احسان فرما دیں۔ کیا جناح صاحب کو معلوم نہیں تھا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہود و نصاریٰ مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ کیا جناح صاحب یہود و نصاریٰ سے بھلائی کی توقع رکھتے تھے؟

اگر ایسا ہے تو اس پر یہی کہا جا سکتا ہے:

میر کیا سادہ ہیں کہ بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

اگر جناح صاحب ہندو لیڈروں کو اور ماؤنٹ بیٹن کو مسلمانوں کا خیرخواہ نہیں سمجھتے تھے تو ان کے شر سے بچنے کے لیے انھوں نے کیا تیاری کی تھی؟ اگر نہیں تو کیوں؟ ان کا ذہنی رویہ تو تھا کہ وہ صرف اپیل اور درخواست کر سکتے تھے۔

جناح صاحب کا تمام تر انحصار انگریز کے جذبۂ ترحم پر تھا۔ جناح صاحب نے اس کے لیے کسی قسم کی تیاری نہیں کی تھی کہ اگر انگریز نے ان کا تقسیم ہند کا مطالبہ ان کی حسب منشا تسلیم نہ کیا تو وہ حصولِ مقصد کے لیے کیا طریق کار اختیار کریں گے۔ جب آخر کار انگریز تقسیم کے لیے تیار ہو گئے اور کانگریس بھی تقسیم پر رضامند ہو گئی، بشرطیکہ پنجاب اور بنگال کو بھی تقسیم کیا جائے تو جناح صاحب کو سوجھ نہیں رہا تھا کہ وہ کیا کریں سوائے انگریز کے جذبہ ترحم کو اپیل کرنے کے۔ ملاحظہ کیجیے:

"If he(Mountbatten)accepted the arguments for partition as apllying to all India, logic compelled him (Mountbatten)to apply them equally to the Punjab and Bangal. Mr.Jinnah admitted the apparent logic of this but begged Lord Mountbatten not to give him a moth-eaten Pakistan."(1)

ترجمہ: ''اگر وہ (ماؤنٹ بیٹن) پورے ہندوستان کی تقسیم کے حق میں دلائل کو تسلیم کرتا تو منطق کا تقاضا تھا کہ اس کا اطلاق پنجاب اور بنگال پر بھی کیا جاتا۔ مسٹر جناح نے اس واضح منطق کو قبول کیا، لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے درخواست کی کہ انھیں یوں کرم خوردہ پاکستان نہ دیا جائے''۔

ایک اور موقع پر اس موضوع پر گفتگو کے دوران بھی جناح صاحب ماؤنٹ بیٹن کی منت

سماجت ہی کر سکے:

"Mr.Jinnah again appealed to the Viceroy not to give him a moth-eaten Pakistan and again was most distressed by the Viceroy`s insistance that the logic of partition, if applied to India,must be applied also to the provinces , that is to say, the Punjab and Bengal."(2)

ترجمہ: ''مسٹر جناح نے دوبارہ وائسرائے سے درخواست کی کہ انھیں لولا لنگڑا پاکستان نہ دیا جائے اور دوبارہ انتہائی پریشان ہوئے جب وائسرائے نے اس بات پر اصرار کیا کہ تقسیم کی منطق کا اطلاق اگر پورے ہندستان پر ہوتا ہے تو پھر صوبوں پر بھی ہونا چاہیے یعنی بنگال اور پنجاب پر۔''

جناح صاحب اور ماؤنٹ بیٹن کے درمیان تقسیم ہند کے مسئلہ پر جب بھی گفتگو ہوئی اس میں ماؤنٹ بیٹن نے واضح کر دیا تھا کہ اگر جناح صاحب کا تقسیم ہند کا مطالبہ تسلیم کیا گیا تو اس صورت میں اس کے پاس کانگریس کے اس مطالبہ کو رد کرنے کا کوئی جواز نہیں ہوگا کہ پنجاب اور بنگال کو بھی تقسیم کیا جائے۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا:

''آپ ایک بڑی اقلیت کے لیے تقسیم کے وسیع پیمانے پر مدعی ہیں۔ اگر میں آپ کی یہ بات مان لیتا ہوں تو کانگریس کے اس مطالبہ کو کیسے رد کر سکتا ہوں جو بڑی ہندو اقلیت کے لیے پنجاب اور بنگال کی تقسیم پر زور دے گی''۔

مسٹر جناح کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ میں ان کو لازمی طور پر'' زندہ رہنے والا، پاکستان دوں''(3)

مسلمان جب برصغیر میں آئے تو انھیں حکومت طشتری میں رکھ کر پیش نہیں کی گئی تھی۔ اسی طرح جب انگریز ہندستان میں آئے تو ان کا استقبال بھی سرخ قالین بچھا کر نہیں کیا گیا تھا، لیکن جناح صاحب کا خیال تھا کہ وہ صرف وکالت کے جوہر دکھا کر ہی اپنی مرضی کا پاکستان حاصل کر لیں گے، جبکہ وقت آنے پر جناح صاحب کے پاس ماؤنٹ بیٹن کے جذبہ ترحم کو اپیل کرنے

کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، مگر وہ کیوں رحم کھاتا۔ مرزا صاحب موصوف اپنے زیر تبصرہ مضمون میں فرماتے ہیں:

''حضرت قائد اعظم ہر صورت میں پاکستان چاہتے تھے خواہ اس کا مکمل جغرافیہ ایک رومال جتنا ہی ہو۔ وہ تو بار بار یہ فرما رہے تھے کہ پاکستان یا موت۔''

واقعی انھوں نے رومال جتنا ہی پاکستان قبول کر لیا کیونکہ ان کو اس سے غرض ہی نہیں تھی کہ اس سے مسلمانوں کا کوئی مسئلہ حل ہوتا ہے یا نہیں۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر کیا قیامت گزرے گی۔ بھارت میں رہ جانے والے، جو تقسیم کی وجہ سے وہاں ایک حقیر اقلیت بن کر رہ گئے، مسلمانوں کا تحفظ کیسے ہوگا۔ پاکستان کے دونوں بازو کیسے متحد رہیں گے۔ انھوں نے جن لوگوں کے مفاد میں برصغیر تقسیم کروایا ان کے مفادات کو پاکستان بہ احسن طریق پورا کر رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ کوئی یہ بتائے کہ جناح صاحب کے جانشین جارج ششم کے جانشینوں کے وفادار ہیں یا نہیں؟ یہ جو جناح صاحب نے فرمایا تھا کہ: ''پاکستان یا موت'' تو دراصل وہ کہنا چاہتے تھے: اس کا مطلب تھا ''پاکستان اور موت''۔ دیکھ لیجیے کہ جیسے ہی تقسیم کا اعلان ہوا تو مشرقی پنجاب میں تقریباً پندرہ لاکھ مسلمان قتل ہو گئے۔ کم و بیش نوے ہزار مسلمان عورتیں بے آبرو ہوگئیں۔ بہار میں مسلمانوں کا اس قدر قتل عام ہوا کہ تاریخ میں اس کی مثال سوائے چنگیز خاں کی غارت گری کے کہیں نہیں ملتی۔ 1948ء میں سقوط حیدر آباد دکن کے موقع پر پانچ لاکھ مسلمان قتل ہوئے۔ 1971ء میں مشرقی پاکستان میں تقریباً پینتالیس لاکھ بنگالی اور غیر بنگالی مسلمان قتل ہوئے۔ تقسیم کے بعد سے بھارت کے کسی نہ کسی حصہ میں مسلمانوں کا قتل عام ہوتا ہی رہتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ ابھی زیادہ پرانی بات نہیں کہ گجرات (بھارت) میں مسلمانوں کو زندہ جلایا گیا اور ان کا قتل عام کیا گیا جبکہ 1947ء سے اب تک کشمیر میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان تہ تیغ کیے جا چکے ہیں یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ اور جناح صاحب نے اپنا وعدہ ''پاکستان اور موت'' پورا کر دکھایا۔ مرزا صاحب موصوف اپنے مضمون میں فرماتے ہیں:

''لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم ہند میں جو کردار ادا کیا وہ تاریخ برصغیر میں انتہائی گھناؤنے اور عبرتناک کردار کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گا اور پھر جو حشر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا ہوا وہ بھی تاریخ کا تاریک ترین واقعہ ہے۔ انھیں زمین بھی میسر نہ آ

سکی۔ مگر مچھوں، مچھلیوں اور آبی جانوروں کی خوراک کا قدرتی سبب بن گئے۔ جو ناانصافیاں ہندوؤں نے کیں اور جو سلوک انگریزوں نے روا رکھا وہ سب پر عیاں ہے"۔

موصوف کو ماؤنٹ بیٹن سے شکایت ہے، لیکن کیوں؟ آخر ہم نے ان کے ساتھ کیا نیکی کی تھی کہ وہ ہم سے ہمدردی کرتا۔ اگر ہم نے سب کچھ اسی سے لینا تھا تو ہم نے اس کی حمایت حاصل کرنے کے لیے کیا کوشش کی تھی۔ اگر ہم نے اس کے جذبہ ترحم کو اپیل کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا تھا تو وہ ہمارے ساتھ نیکی کیوں کرتا۔ کیا ہم یہ نہیں کر سکتے تھے کہ جیسے ہی ماؤنٹ بیٹن نے برصغیر میں قدم رکھا تھا، ہم اس کے کان میں کہہ دیتے کہ ہم تمھیں دس سال کے لیے پاکستان کا گورنر جنرل بنا دیں گے۔ اگر ہم نے ایسا کیا ہوتا اور پھر بھی وہ ہم سے ناانصافی کرتا تو موصوف کی شکایت بجا ہوتی۔ حیرت ہے کہ موصوف کو ہندو لیڈر شپ سے بھی شکایت ہے۔ یہاں پھر یہی سوال ہے کہ ہم نے برصغیر کی ہندو آبادی کے ساتھ کیا نیکی کی تھی؟ ہم نے ان پر ہزار سال حکومت تو کی لیکن ان کو اسلام قبول کرنے کی دعوت کبھی ڈھنگ سے نہ دی اور ان کو اسلام کی نعمت سے محروم رکھا۔ پھر بھی ان سے شکایت ہے۔ ماؤنٹ بیٹن کی لاش کے مچھلیوں کی خوراک بن جانے کی موصوف کو بہت خوشی ہے۔ اگر اسے تپ دق سے بستر پر موت آتی اور زمین میں دفن ہو جاتا تو کیا وہ سیدھا جنت میں چلا جاتا۔ ڈوب کر مرنے کی وجہ سے وہ سیدھا دوزخ میں گیا ہوگا۔ اس کے ڈوب کر مرنے سے ہمارا کون سا مسئلہ حل ہو گیا۔ اگر اسے بستر پر موت آتی تو ہمیں کیا نقصان ہوتا؟ واقعی دنیا شیخ چلی، نہیں نہیں مرزا صاحب جیسے حضرات سے کبھی خالی نہیں رہی۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ تقسیم برصغیر میں ماؤنٹ بیٹن کا کردار فیصلہ کن تھا۔ اس کی خوشنودی یا برہمی کسی ایک فریق کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا سکتی تھی اور دوسرے فریق کو بے پناہ فائدہ پہنچا سکتی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے بلاشبہ مسلمانوں کو بے پناہ نقصان پہنچایا۔

برصغیر کے مسلمانوں کے قائداعظم کا پیشہ وکالت تھا۔ اس پیشہ سے موصوف نے نام بھی کمایا اور مال بھی بہت بنایا۔ اگرچہ ابتدا میں ان کا وقت مالی پریشانیوں میں گزرا، لیکن جلد ہی ان کے حالات اس حد تک بہتر ہو گئے کہ وہ برصغیر کے امرا اور رؤسا کی صف میں شامل ہو گئے جس کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ بمبئی کے پوش علاقے مالا بار ہل میں ان کا مکان گورنر ہاؤس کے

بعد شہر کی بہترین عمارت تھی۔ پیشہ وکالت میں جب بھی کوئی شخص داخل ہوتا ہے تو اس کو اپنے استاد کی طرف سے جو پہلا سبق ملتا ہے وہ یہ ہے کہ "کسی جج کو (Annoy) برہم کر کے کوئی قابل سے قابل وکیل بھی دادرسی حاصل نہیں کر سکتا"۔ میں نے اس اصول کی طرف اشارہ اس لیے کیا ہے کہ جناح صاحب بھی وکیل تھے اور اس پیشہ میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے موصوف نے اس اصول کو ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھا ہوگا۔ لیکن برصغیر کی تقسیم کے مسئلہ پر بھی کیا جناح صاحب نے اس اصول کو پیش نظر رکھا؟ آیئے دیکھتے ہیں۔

برصغیر کی تقسیم کا مطالبہ برصغیر کے مسلمانوں کی طرف سے کیا جا رہا تھا اور اس کے لیے جملہ اختیار (Mandate) مسلمانوں نے جناح صاحب کو دیا ہوا تھا۔ یہ مطالبہ انگریز حکمرانوں سے کیا جا رہا تھا کہ وہ یہاں سے جب بھی رخصت ہوں تو برصغیر کو تقسیم کر کے اسے دو ممالک کی صورت میں چھوڑ کر کے جائیں۔ اس مطالبہ کو تسلیم کرنا یا نہ کرنا اور اگر تسلیم کرنا انگریزوں کی صوابدید پر تھا بلکہ متعین طور پر دیکھا جائے تو یہ انگریزوں کے آخری وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کی صوابدید پر تھا۔ میں صوابدید کا لفظ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ اگر برصغیر کی تقسیم کا مطالبہ انگریز رد کر دیتے اور بضد ہوتے کہ ہم تو برصغیر کو ایک متحد ملک ہی کی صورت میں آزاد کر کے جائیں گے تو مسلمانوں کے امام معصوم نے تقسیم کے لیے ہتھیار نہیں اٹھانے تھے، نہ ہی برصغیر کو تقسیم کروانے کے لیے کوئی متبادل پروگرام ان کے پاس موجود تھا۔

اگر برصغیر کے مسلمانوں نے سب کچھ آخری وائسرائے ماؤنٹ بیٹن سے ہی لینا تھا اور واقعتاً اسی سے لینا تھا تو یہ لازم تھا کہ اس کی خوشنودی کے حصول کے لیے ہر ممکن کوشش کی جاتی اور کوئی ایسی بات نہ کی جاتی جس سے وہ برہم (Annoy) ہو جاتا۔ لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس۔ بہر حال فیصلہ ہو گیا کہ برصغیر نے آزاد ہو کر دو ممالک میں تقسیم ہونا ہے اور اس سارے عمل کو صرف چند ماہ میں مکمل ہونا ہے۔ تقسیم کا اعلان تو ہو گیا لیکن اصل اور مشکل کام تو دونوں ممالک کے درمیان حد بندی اور برصغیر کے اثاثوں کی دو حصوں میں تقسیم تھا۔ اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ماؤنٹ بیٹن نے تجویز دی کہ وہ دونوں ممالک (بھارت، پاکستان) کا گورنر جنرل بننا چاہتا ہے تاکہ اثاثوں کی تقسیم کا عمل زیادہ آسانی سے (Smoothly) ہو سکے۔ بھارت کی قیادت نے اس تجویز کو قبول کر لیا، لیکن جناح صاحب نے اس تجویز کو رد کر دیا اور مطالبہ کیا کہ پاکستان کے

پہلے گورنر جنرل وہ خود بنیں گے۔اس کے بارے میں سٹینلے والپرٹ(Stanley Wolpert) اپنی تالیفShameful Flightمیں لکھتا ہے:

"Mountbatten tried to convince Jinnah of the value of accepting him i.e Mountbatten as Pakistan's first Governor General, but Jinnah refused to be moved from his determination to take the Job himself.

"Mr. Jinnah came to see me last night", Mountbatten wired Attlee in early July, "and told me that he wanted to be Governor General of Pakistan". Mountbatten argued with him for four hours, "Trying to make him realise the advantages that Pakistan would gain from having the same Governor General as India ... until partition is complete. He is so adamant that he openly says that he would prefer to lose crore's (Tens of Millions of Rupees) worthy of assets ... than share a Governor General". ... Mountbatten's ego was jolted by Jinnah's rejection" of what he considerd his "generous" offer to help Pakistan gain advantages in its early months of life".

"Mountbatten was so upset by Jinnah's refusal to allow him to govern the dominion of

Pakistan that he had Ismay fly to London the day after he met with Jinnah, carrying his Top Secret report to the cabinet and king. "He is suffering from megalomania in its worst form". Mountbatten reported of Pakistan's first Governor General and "Great Leader". So angered by Jinnah's stubborn refusal to do what he wanted, he finally got up and left the room". after warning Jinnah some-what acidly" It may cost you the whole of your assets and future of Pakistan". Sheer vanity or prophetic warning?"(4)

ترجمہ:''ماؤنٹ بیٹن نے جناح کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کے (یعنی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے) پاکستان کا پہلا گورنر جنرل بننے کی کیا اہمیت ہے،لیکن مسٹر جناح نے اپنے اس عزم سے پیچھے ہٹنے سے انکار کر دیا کہ وہ یہ عہدہ خود ہی رکھیں گے۔

ماؤنٹ بیٹن نے جولائی کے آغاز میں ایٹلی کو ایک ٹیلی گرام بھیجا جس میں کہا گیا کہ ''کل رات جناح مجھ سے ملنے آئے اور مجھے بتایا کہ وہ خود پاکستان کے گورنر جنرل بننا چاہتے ہیں۔'' ماؤنٹ بیٹن چار گھنٹے تک جناح سے بحث کرتا رہا اور یہ کوشش کرتا رہا کہ جناح کو اس بات کا ادراک ہو سکے کہ جب تک تقسیم کا عمل مکمل نہیں ہوتا اس وقت تک ہندستان اور پاکستان کا ایک ہی گورنر جنرل ہونا پاکستان کے فائدے میں ہے۔جناح اس حوالے سے اس قدر بے لچک ہیں کہ وہ سرعام کہتا ہے کہ وہ (پاکستان کے حصہ کے) کروڑوں کے اثاثوں کا نقصان برداشت کر لے گا لیکن ایک مشترکہ گورنر جنرل نہیں......ماؤنٹ بیٹن کی انا کو جناح کے انکار سے شدید دھچکا پہنچا کیونکہ اس کے خیال میں یہ اس کی جانب سے پاکستان کو اپنے قیام کے ابتدائی دنوں میں

فائدہ پہنچانے کی ایک فراخ دلانہ پیش کش تھی۔

ماؤنٹ بیٹن جناح کے انکار سے اس قدر پریشان ہوا کہ اس نے ملاقات کے اگلے ہی دن Ismay کو ایک ٹاپ سیکرٹ رپورٹ دے کر شاہ اور کابینہ تک پہنچانے کے لیے لندن روانہ کر دیا۔ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل اور عظیم رہنما کے بارے میں ماؤنٹ بیٹن نے لکھا کہ وہ "بدترین قسم کے خبط عظمت" کا شکار ہے۔ جناح کی ہٹ دھرمی پر اسے اس قدر غصہ آیا کہ بالآخر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور جناح کو یہ دھمکی دے کر چلا گیا کہ اس کی قیمت تمھیں اپنے تمام اثاثوں اور پاکستان کے مستقبل کی صورت میں ادا کرنا پڑے گی۔"

یہ تھا برصغیر کے مسلمانوں کے قائداعظم کا طرزِ عمل۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس کی پیش کش کو نہ صرف قبول کر لیا جاتا، بلکہ اسے یہ پیش کش کی جاتی کہ وہ صرف پاکستان کا گورنر جنرل بن جائے، بلکہ دس سال کے لیے بن جائے۔ ویسے اس سے بھی بہتر پیش کش بھی کی جا سکتی تھی تاکہ وہ اس نازک موقع پر اپنی منفرد پوزیشن کی بنا پر پاکستان کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکے۔ لیکن جس طرح آغا خان نے مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب حاصل کر کے تمام غیر مسلم اقلیتوں (از قسم سکھ، پارسی وغیرہ) کو دھکیل کر ہندوؤں میں شامل کر کے ان کو مزید مضبوط کر دیا، اسی طرح ان کے معنوی فرزند مسٹر جناح نے اس نازک موقع پر ماؤنٹ بیٹن کو دھکیل کر ہندوؤں کے کیمپ میں پہنچا کر دیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ انھوں نے جو کچھ بھی لینا ہے ماؤنٹ بیٹن سے ہی لینا ہے، یہاں تک کہ جناح صاحب کو پاکستان کے حصے کے تمام اثاثوں سے محرومی تو گوارا تھی لیکن یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل نہ بنیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟

جب تقسیم کا اعلان ہوا تو دریائے ستلج پر فیروز پور ہیڈ ورکس پاکستان میں شامل تھا۔ اس ہیڈ ورکس سے جو نہر نکلتی تھی وہ ضلع ساہیوال (اب ضلع اوکاڑہ) کی تحصیل دیپالپور اور تحصیل (اب ضلع) پاک پتن کو سیراب کرتی تھی۔ دریا کے بائیں کنارے سے جو نہر نکلتی تھی وہ ریاست بیکانیر کی زمینوں کو سیراب کرتی تھی۔ بیکانیر کی ریاست پاکستان کی ریاست بہاولپور سے ملحق تھی۔ (بیکانیر کا راجہ سکھ تھا اور تقسیم کے بعد اس نے اپنی ریاست کا الحاق بھارت سے کر دیا تھا) جب بیکانیر کے راجہ کو علم ہوا کہ فیروز پور ہیڈ ورکس پاکستان میں شامل ہو رہا ہے تو اس نے ماؤنٹ بیٹن کو پیغام بھجوایا

کہ اگر فیروز پور ہیڈ ورکس پاکستان میں شامل ہوا تو وہ اپنی ریاست کا الحاق پاکستان سے کر دے گا۔ پھر کیا ہوا؟ اس کے بارے میں سٹینلے والپرٹ (Stanley Wolpert) لکھتے ہیں:

"The Maharaja of Bikaner wired Mountbatten the next day to "express every confidence that your Excellency in finally arriving at decision on the award of Boundry Commission will be good enough to safeguard interests of Bikaner State" The Maharaja sent that message with his prime minister K.M. Panikkar, Nehru's close friend, who warned Mountbatten that "Bikaner would have no option but to join Pakistan", unless the Ferozepur Headworks were protected by India. That strategic risk was judged by Mountbatten to be too high a price, and though he never admitted, he told Redcliffe to change his initial Punjab award, the maps were altered accordingly and the award itself kept under Mountbatten's personal embargo until after his August 15 celebrations ended. On August 10, Maharaja Sadul Singh of Bikaner sent a confidential private letter to Mountbatten to "convey my most grateful thanks" for "the action which you so kindly and promptly took after your talk with Mr. Panikkar in regard to the protection of interests ... of my

state". Pakistan was thus, strategically, obliged to "pay" a very high price, as Mountbatten warned Jinnah it would, for refusing to grant him the pleasure of becoming Governor General of Pakistan as well as India." (5)

ترجمہ: ''بیکانیر کے مہاراجا نے اگلے دن ماؤنٹ بیٹن کو ایک تار بھیجا جس میں کہا کہ'' اسے پورا اعتماد ہے کہ حضور والا باؤنڈری کمیشن ایوارڈ کے حوالے سے بیکانیر ریاست کے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے والے ہوں گے۔'' مہاراجا نے یہ پیغام اپنے وزیر کے.ایم. پانیکر (K.M.Panikkar) کے ہاتھ وائسرائے کو بھجوایا جو نہرو کے قریبی دوستوں میں سے تھا۔ اس نے ماؤنٹ بیٹن کو خبردار کیا کہ اگر فیروز پور ہیڈ ورکس بھارت کو نہ ملا تو بیکانیر کے پاس سوائے پاکستان سے الحاق کے کوئی راستہ نہیں بچے گا۔ ماؤنٹ بیٹن کے خیال میں یہ سٹریٹجک خطرہ بہت بڑی قیمت تھا، لہٰذا اس نے ریڈکلف کو ابتدائی پنجاب ایوارڈ میں تبدیلی کا حکم دے دیا۔ اگرچہ اس نے کبھی اس بات کا اعتراف نہیں کیا۔ بہرحال نقشوں میں تبدیلی کردی گئی اور 15 اگست کی تقریب کے خاتمے تک ایوارڈ کی اصل دستاویز ماؤنٹ بیٹن کی ذاتی حفاظت میں رہی۔ 10 راگست کو بیکانیر کے مہاراجہ نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ایک ذاتی خط بصیغہ راز بھیجا جس میں کہا گیا: ''میں نہایت ممنونیت کے ساتھ آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مسٹر پانیکر کے ساتھ ملاقات کے بعد میری ریاست کے مفادات کے تحفظ کے لیے فوری اور ہمدردانہ اقدام کیا۔'' یوں پاکستان کو تزویراتی لحاظ سے ماؤنٹ بیٹن کو بھارت اور پاکستان دونوں کا گورنر جنرل بنانے سے انکار کی واقعی بہت بڑی قیمت ادا کرنا پڑی جیسا کہ ماؤنٹ بیٹن نے جناح کو خبردار بھی کیا تھا۔''

جناح صاحب پاکستان کے گورنر جنرل تو بن گئے، لیکن اس کے نتیجے میں پاکستان فیروز پور ہیڈ ورکس سے محروم ہو گیا، بلکہ اس کے ساتھ ریاست بیکانیر کے الحاق سے بھی محروم ہو گیا۔ یہی معاملہ ضلع گورداسپور کے سلسلے میں ہوا۔ تقسیم پنجاب کے ابتدائی اعلان کے مطابق ضلع گورداسپور کو

پاکستان میں شامل کر دیا گیا تھا۔ گورداسپور کے پاکستان میں شامل ہونے کی وجہ سے بھارت کا ریاست کشمیر سے زمینی رابطہ منقطع ہو گیا تھا اور اس صورت میں کشمیر کے راجہ کے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ بھارت کے ساتھ ریاست کا الحاق کر سکے۔ ماؤنٹ بیٹن نے باؤنڈری کمیشن کے ایوارڈ پر اثر انداز ہو کر ضلع گورداسپور کو بھارت میں شامل کر دیا اور اس طرح بھارت کو کشمیر میں داخل ہونے کا زمینی راستہ مل گیا اور بھارت نے کشمیر میں اپنی افواج داخل کر کے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔

سوال یہ ہے کہ اگر جناح صاحب نے پاکستان کا خود گورنر جنرل بننے کی بجائے ماؤنٹ بیٹن کی تجویز قبول کر لی ہوتی تو کیا پھر بھی ماؤنٹ بیٹن کا طرز عمل وہی ہوتا جو کہ اس نے فی الواقع اختیار کیا۔ ہر معقول شخص اس کا جواب نفی میں دے گا۔ ممکن ہے کوئی صاحب یہ کہیں اگر وہ بھارت کے علاوہ پاکستان کا گورنر جنرل بھی ہوتا تو بھی وہ یہی کچھ کرتا۔ یہ دعویٰ کسی منطق پر اُستوار نہیں۔ بات سیدھی سی ہے کہ وہ ایک ملک کا گورنر جنرل بن گیا تو اُس نے اُسی ملک کے مفادات کا خیال رکھا۔ اگر دونوں ممالک کا گورنر جنرل ہوتا تو وہ یقیناً دونوں ممالک کے مفادات کا خیال رکھتا یا کم از کم پاکستان کے خلاف اس قدر تعصب اور جانب داری کا مظاہرہ نہ کر سکتا۔ وہ لارڈ تھا اور اُسے اپنے ملک کی اشرافیائی اقدار کا یقیناً کچھ نہ کچھ پاس تھا۔ اُسے پاکستان کا گورنر جنرل مان لینے میں یقیناً یہ امکان موجود تھا کہ وہ مبنی بر انصاف طرز عمل اختیار کرتا۔ اگر پاکستان کی حمایت نہ کرتا تو بھارت کے حق میں بھی باؤنڈری کمیشن پر اس طرح اثر انداز نہ ہوتا جس طرح کہ وہ ہوا۔ اس صورت میں نہ فیروز پور ہیڈ ورکس بھارت میں شامل ہوتا، نہ ہی ریاست بیکانیر بھارت میں شامل ہوتی اور پاکستان کی سرحدیں کہیں آگے ہوتیں۔ ضلع گورداسپور بھی پاکستان کا حصہ ہوتا اور مقبوضہ کشمیر بھی۔

جناح صاحب کے اس فیصلے سے پاکستان کو اور مسلمانوں کو جو نقصان ہوا، وہ اس قدر غیر معمولی تھا کہ محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں بھی اپنے ایک مضمون میں اس کا ذکر کرنے پر مجبور ہو گئے۔ موصوف اپنے کالم ''سحر ہونے تک'' میں بعنوان ''تقسیم اور کشمیر کا مسئلہ'' رقم طراز ہیں:

''میں اس کالم میں ایک ایسے واقعے کا تذکرہ کروں گا جو پاکستان کے لیے تباہ کن ثابت ہوا اور ہم آج بھی اس فیصلے کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔

میں ہندستان کے آخری وائسرائے ماؤنٹ بیٹن اور قائداعظم کی آخری ملاقات اور اس کے نہایت سنگین اور دوررس نتائج کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ تقسیم ہند کا اصول طے ہو چکا تھا اور صرف طریقۂ کار طے ہو رہا تھا۔ ہندستانی لیڈروں نے وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کو مطلع کر دیا تھا کہ ان کی خواہش ہے کہ وقتی عبوری دور میں وہی گورنر جنرل کے عہدہ کے فرائض انجام دیں۔ ہندستانی لیڈروں کی یہ نہایت عقلمندانہ اور دوررس پالیسی تھی۔ جب قائداعظم اور وائسرائے کی ملاقات ہوئی اور ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم سے رسماً دریافت کیا کہ کیا آپ نے پاکستان کے گورنر جنرل کے بارے میں کچھ سوچا ہے؟ تو قائداعظم نے جواب دیا کہ ہاں انھوں نے خود گورنر جنرل بننے کا فیصلہ کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وائسرائے کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس کو یہ بات ناگوار گزری، مگر وہ خاموش رہا۔ ملاقات کے بعد باہر فیلڈ مارشل لارڈ اسمے چیف آف اسٹاف برائے وائسرائے نے قائداعظم سے ملاقات کی۔ وہ قائداعظم کی بے حد عزت کرتا تھا اور ان کے اخلاق، راست گوئی اور عقل وفہم سے بے حد متاثر تھا۔ اس نے قائداعظم سے کہا: ''مسٹر جناح! آپ کو احساس نہیں کہ آج آپ نے اپنے اس عمل سے اپنے پاکستان کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے۔'' لارڈ ریڈکلف، جو باؤنڈری کمیشن کا سربراہ تھا اور پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا ذمہ دار تھا، اس نے یہ کام مکمل کر کے نقشوں کی کاپیاں وائسرائے ماؤنٹ بیٹن، گورنر پنجاب ایوان جینکنس اور گورنر بنگال کو روانہ کر دی تھی۔ اس رپورٹ کے حساب سے مشرقی پنجاب میں گرداسپور اور ملحقہ علاقہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، پاکستان کو دیا گیا تھا۔ قائداعظم سے ملاقات کے بعد وائسرائے نے ریڈکلف کو بلا بھیجا اور حکم دیا کہ وہ گرداسپور اور ملحقہ علاقہ ہندستان میں شامل کر دے۔ اس کے دوررس نتائج نکلنا تھے اور وہ اس سے پوری طرح آگاہ تھا کہ صرف گورداسپور اور ملحقہ علاقہ کے راستہ سے ہی کشمیر کا رابطہ تھا۔ نتیجہ میں لاکھوں مسلمان سکھوں کے ہاتھوں قتل ہوئے، ہزاروں مسلمان لڑکیاں سکھوں نے اغواء کر کے اپنی بیویاں بنالیں، تمام جنگی ہتھیار اور مالی اثاثے ہندستان نے اپنے قبضے میں لے لیے اور وائسرائے نے ہندستان پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا۔ سب سے بڑا نقصان یہ

ہوا کہ مہاراجہ کشمیر، جو کہ بہت پریشان تھا اور شش وپنج میں تھا، اس کو سنہری موقع مل گیا اور اس نے ہندستان سے الحاق کا اعلان کر دیا۔ جب قبائلی لوگوں نے کشمیر میں فوج کشی کی تو ہندستانی فوج کشمیر میں اتر گئی اور ان کو پسپا کر دیا۔''(6)

جناح صاحب نے بھارت کے ساتھ مشترکہ گورنر جنرل تو قبول نہ کیا، اس لیے کہ وہ خود گورنر جنرل بننا چاہتے تھے کیونکہ اسی بلند منصب کے لیے وہ زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے تھے اور یہ منصب کسی قیمت پر بھی کھونا نہیں چاہتے تھے۔ پاکستان یا اہلِ پاکستان کو اِس کی کیا قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، اس کی انھیں کوئی پروا نہیں تھی۔ جناح صاحب نے سیاست میں حصہ لیا تھا تو اپنی ذاتی عظمت کے حصول کے لیے لیا تھا، نہ کہ مسلمانوں کے مفاد میں ایسا کیا تھا۔

سوال یہ ہے کہ پاکستان کا پہلا گورنر جنرل بن کر جناح صاحب نے پاکستان کے لیے کیا تیر مارا اور کیا توپ چلائی تھی۔ وہ پاکستان میں ایک سال چھبیس دن زندہ رہے اور زیادہ عرصہ بیمار رہے۔ اس عرصہ میں گرمیوں کا موسم زیارت کے مقام پر آرام کرتے ہوئے گزارا۔ ان کے گورنر جنرل بننے کے حق میں جو واحد بات کہی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر ماؤنٹ بیٹن ہی پاکستان کا پہلا گورنر جنرل بن جاتا تو دنیا کو معلوم ہی نہ ہوتا کہ پاکستان ایک الگ اور آزاد ملک ہے۔ ایسا کہنے والے یہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ کیا ماؤنٹ بیٹن کے بھارت کا گورنر جنرل بن جانے سے دنیا کو معلوم نہیں ہوا تھا کہ بھارت ایک آزاد ملک ہے؟ یقیناً کسی کو شبہ نہیں ہوا کہ بھارت ایک آزاد ملک ہے تو پاکستان کے بارے میں یہ شک کیوں کیا جاتا۔ پاکستان نے پنجاب کے انگریز گورنر سر فرانسس موڈی کو قبول کیا۔ جنرل ڈگلس گریسی کو بطور آرمی چیف قبول کیا اگر ان دو اہم عہدوں پر انگریزوں کے فائز ہونے کی وجہ سے پاکستان کی آزادی پر شک نہیں کیا گیا تو ماؤنٹ بیٹن کے گورنر جنرل بن جانے سے کیا غضب ہو جاتا۔ پاکستانی قیادت نے دونوں ممالک کا ایک گورنر جنرل تو قبول نہ کیا، دونوں ممالک کی افواج کا ایک سپریم کمانڈر تسلیم کر لیا جس کا اسمِ گرامی فیلڈ مارشل سر کلارڈ آکنلیک تھا۔ یہی وہ ذات شریف تھی جس نے گریسی کو حکم دیا تھا کہ وہ پاکستانی افواج کو کشمیر میں داخل نہ ہونے دے۔ وہ پاکستانی قیادت کے سامنے اپنے موقف پر ڈٹا رہا، مگر قیادت نے نہ تو آکنلیک کو اُس کے عہدے سے برطرف کیا، نہ کوئی دوسرا قدم اٹھایا۔ آکنلیک کا دونوں ممالک کی افواج کا سربراہ ہونے کے باوجود دنیا کو معلوم تھا کہ پاکستان ایک الگ ملک ہے۔

حال ہی میں اس موضوع پر بریگیڈیر (ر) شمس الحق قاضی کا نوائے وقت، لاہور میں ایک کالم بعنوان "خشتِ اول چوں نہد معمار کج۔ تاثریا می رود دیوار کج" شائع ہوا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

"ابھی حالیہ ٹی وی مذاکرے میں اینکر پرسن نے اردشیر کاؤس جی سے پوچھا کہ پاکستان میں جو خرابیاں پیدا ہوئی ہیں، ان کی ابتدا کہاں سے شروع ہوئی، یعنی پہلی غلطی کب اور کہاں سے شروع ہوئی۔ اس کا جواب کاؤس جی نے تو نہیں دیا، البتہ راقم اب قارئین کی دل چسپی کے لیے پہلی غلطی کی نشان دہی کرتا ہے۔

پاکستان بننے پر پہلا آرمی چیف انگریز جنرل میسروی مقرر کیا گیا تھا اور جنرل گریسی کو آرمی چیف کا چیف آف سٹاف مقرر کیا گیا اور کیپٹن رینک تک کے انگریز افسر ہی ہمارے یونٹ وغیرہ کے کمانڈر تھے۔ اس کے مقابلے میں پنڈت نہرو نے حکم دیا کہ انڈین آرمی میں ہر لیول کی کمانڈ صرف انڈین افسروں کے پاس ہوگی، جہاں انڈین آفیسر سمجھتا ہو کہ اس کو کمانڈ کا پورا تجربہ نہیں تو وہ اپنی مدد کے لیے انگریز افسروں کو ایڈوائزر رکھ سکتا ہے لیکن کمانڈ بہرصورت ہر لیول پر انڈین افسروں کے پاس ہوگی۔

چنانچہ پہلا انڈین آرمی چیف کری آپا کو مقرر کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے انگریز جرنیلوں نے کشمیر پر فوری قبضہ کرنے کے لیے حکومتِ پاکستان کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف اسی دوران انڈین آرمی نے فوج بھیج کر بزورِ شمشیر سری نگر پر قبضہ کر لیا، جس کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔ دشمن کے کشمیر پر قبضہ کر لینے کی وجہ سے پاکستان کی معیشت مستقل خطرے میں مبتلا رہتی ہے۔" (7)

جبکہ انگریز فوجیوں کے لیے جناح صاحب کے جو جذبات و احساسات تھے اس کی گواہی ایئر مارشل (ر) محمد اصغر خاں نے اپنے ایک انٹرویو میں دی ہے، وہ بتاتے ہیں کہ:

"چودہ اگست 1947ء کو کراچی میں قائداعظم نے ایک ریسیپشن دیا تھا۔ سروسز کے چند سینئر لوگ وہاں موجود تھے جن میں مَیں بھی شامل تھا۔ مجھ سے سینئر کرنل اکبر خان تھے جو بعد میں حکومت گرانے کی سازش میں شریک رہے۔ کہنے لگے چلو قائداعظم سے بات کرتے ہیں۔ اُس وقت قائداعظم مہمانوں سے فرداً فرداً مل رہے تھے۔ اکبر

خان نے ہمارا نمائندہ بن کر قائداعظم کو پاکستان بنانے پر مبارک باد دی اور کہا "ہم بہت پُر امید تھے کہ پاکستان بننے کے بعد ہم لوگوں کو صحیح طور پر خدمت کا موقع ملے گا مگر ہم بہت مایوس ہیں۔ ابھی بھی انگریز ہم پر مسلّط ہے۔" اشارہ سروسز کے انگریز چیف جنرل گریسی کی طرف تھا۔ انھوں نے انگریزی میں کہا: "I thought we would be able to show our inherent native genius." قائداعظم نے جواب میں سختی سے کہا: "خبردار! You are servant of people" آپ عوام کے خادم ہیں، ملازم ہیں اُن کے۔ آپ کو کوئی حق نہیں ہے حکومتی معاملات میں دخل دینے کا، آپ کو عوام کے نمائندوں کا حکم ماننے کے علاوہ کسی کام میں دخل نہیں دینا ہے۔" (8)

جناح صاحب نے بحیثیت گورنر جنرل آرمی چیف کو اس حکم عدولی اور غداری پر نہ برطرف کیا اور نہ کوئی سزا دی، حتیٰ کہ باز پرس تک نہ کی۔ جناح صاحب کے پہلے ایئر ایڈی کانگ جناب عطا ربانی نے اپنی کتاب "The Sun Shall Rise" میں جناح صاحب کا پاکستانی آرمی کے سربراہ کو اس نافرمانی پر سزا نہ دینا، اُن کی تین بڑی غلطیوں میں شمار کیا ہے۔ جناب عطا ربانی اپنی مذکورہ کتاب میں لکھتے ہیں:

"پاکستان بنتے ہی پہلے گورنر جنرل کی حیثیت میں قائداعظم کی دوسری غلطی پاکستان آرمی کے پہلے سربراہ کو نافرمانی کی سزا نہ دینا تھی۔ اکتوبر 47ء کے اواخر میں ہمارے قبائلی سری نگر ایئر پورٹ پر قبضہ کرنے کے قریب تھے۔ آس پاس کا علاقہ بھی ان کے زیرِ قبضہ تھا۔ ایسے میں قائداعظم نے لیفٹیننٹ جنرل ڈگلس گریسی، جنھیں عارضی طور پر پاکستان آرمی کی کمان دی گئی تھی، کو حکم دیا کہ کشمیری مجاہدین اور قبائلیوں کی اعانت کے لیے ایک بریگیڈ فوج کشمیر بھیجی جائے لیکن گریسی نے قائد کے حکم کی تعمیل کے برعکس فیلڈ مارشل آکین لیک سے رابطہ کیا جو ان دنوں بھارتی فوجوں کے سربراہ تھے اور انھیں قائداعظم کے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ وقت اور حالات کا تقاضا تھا کہ قائداعظم فوری طور پر گریسی کو سزا دیتے ہوئے عہدے سے الگ کر دیتے اور ان کی جگہ پاکستانی فوج کے کسی سینئر افسر کا تقرر عمل میں آتا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سری نگر

ایئر پورٹ بھی ہمارے قبائلیوں کی گرفت سے نکل گیا اور کشمیر کی مکمل فتح بھی ادھوری رہ گئی۔ اگر جنرل گریسی کو فوری سزا دے دی جاتی تو نہ بعد میں پاکستان اور بھارت کے درمیان تین ہلاکت خیز جنگیں ہوتیں اور نہ ہی سیاچن اور کارگل ایسی لڑائیوں کے سانحات رونما ہوتے۔ نامعلوم وجوہ کی بنا پر نہ صرف جنرل گریسی کو سزا نہ دی جا سکی بلکہ قائداعظم نے اسے لیفٹیننٹ جنرل سے ترقی دے کر کرنل جنرل بنا دیا اور پاکستان آرمی کے پہلے با قاعدہ سربراہ ہونے کا اعزاز بھی اسے بخش دیا۔“(9)

جنرل گریسی نے کشمیر پر قبضے کے لیے مسٹر جناح کا حکم ماننے سے ہی انکار نہیں کیا تھا، بلکہ جونا گڑھ پر بھارت کے قبضے کے خلاف بھی اُس نے حکم عدولی کی تھی اور فوج بھیجنے سے انکار کر دیا تھا۔ نوائے وقت کے چیف ایڈیٹر جناب مجید نظامی نے نظریہ پاکستان ٹرسٹ لاہور کے تحت 15 ستمبر 2010ء کو ٹرسٹ کی لائبریری میں منعقدہ ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے بتایا:

”15 ستمبر 1947ء کو غیر علانیہ فوجی جارحیت کے ذریعے جونا گڑھ پر بھارت نے اسی طرح غاصبانہ قبضہ کر لیا جس طرح اس نے حیدر آباد، مناودر اور ریاست جموں و کشمیر کے بڑے حصے پر قبضہ کیا۔ قائداعظم نے پاکستان کے پہلے کمانڈر ان چیف جنرل گریسی کو جونا گڑھ میں پاکستان کی فوجیں داخل کر کے بھارتی جارحیت کو ناکام بنا دینے کا حکم دیا تو اس نے کمال ریشہ دوانی سے اس حکم کی تعمیل میں بھی اسی طرح لیت و لعل کیا جس طرح کشمیر میں پاکستانی فوجیں داخل کرنے کے حکم پر عمل درآمد سے گریزاں رہا تھا۔“(10)

جناح صاحب کے غلط در غلط فیصلوں کے نتائجِ بد سب کے سامنے ہیں۔ آج 63 سال بعد بھی کشمیر کا مسئلہ وہیں کا وہیں ہے۔ اس کے نتیجے میں دو جنگیں ہو چکی ہیں۔ کشمیر میں لاکھوں لوگ قتل و غارت کا شکار ہو چکے ہیں۔ ہزاروں عورتوں کی عصمتیں لوٹی جا چکی ہیں۔ لیگی قلم کار جناب فضل حسین اعوان 1947ء سے اب تک کی صورتِ حال کو بایں الفاظ بیان کرتے ہیں:

”پاکستان اور بھارت کے درمیان پہلا، بڑا اور دیرینہ تنازع مسئلہ کشمیر کی صورت میں چلا آ رہا ہے۔ پاکستان اور بھارت نفرت کی جن انتہاؤں پر اس تنازع کے جنم لینے کے پہلے روز تھے، آج بھی انھی انتہاؤں پر ہیں۔ تقسیم ہند کے 63 سال بعد بھی دونوں

ممالک کے درمیان نفرت میں کمی آئی ہے، نہ عدم برداشت کی برف پگھلی ہے، اور نہ مسئلۂ کشمیر کی موجودگی میں نفرت کی دیواریں گرنے کا امکان ہے، نہ تعلقات معمول پر آنے کی کوئی امید۔“(11)

مستقبل قریب تو کیا، مستقبل بعید میں بھی اس مسئلہ کے حل کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اب معلوم ہوا کہ مسئلہ کشمیر جناح صاحب کے غلط فیصلوں کے نتیجے میں اگر پیدا ہوا تو انھوں نے اس کا ”بہت آسان اور عمدہ حل“ بھی تو بتایا تھا۔ جناحی جیالے جناب پروفیسر محمد مظفر مرزا اپنے ایک حالیہ کالم میں رقم طراز ہیں:

”کشمیر کا حل جیسا کہ حضرت قائداعظمؒ فرما گئے ہیں کہ کشمیر کا مسئلہ صرف آپ اپنے زورِ بازو سے حل کریں گے، وہ زورِ بازو آپ کو ایٹم بم کی شکل میں مل چکا ہے۔ جناب مجید نظامی بار بار اور برملا فرما چکے ہیں کہ سوائے ایٹم بم کے بھارت کے ساتھ کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ کوئی حرج نہیں اگر 4، 5 کروڑ پاکستانی اور 30، 40 کروڑ بھارتی لقمۂ اجل بن جائیں، پھر پاکستان میں جو بچے گا وہی پاکستان تعمیر کرے گا جو حضرت قائداعظمؒ اور حضرت علامہ اقبالؒ چاہتے تھے۔“(12)

دیکھیے یہ لوگ مسٹر جناح کے غلط فیصلوں کو درست ثابت کرنے کے لیے کیا سوچ اور فکر رکھتے ہیں۔ 1947ء میں تقسیم ہند کے موقع پر 15 لاکھ مسلمانوں کا قتل، 1948ء میں سقوط حیدر آباد دکن کے موقع پر 5 لاکھ مسلمانوں کا قتل اور 1971ء میں سقوط مشرقی پاکستان کے موقع پر 45 لاکھ مسلمانوں کا جو قتلِ عام ہوا اور ان تمام مواقع پر مسلمان عورتوں کی جو بے حرمتی کی گئی اور 1947ء سے اب تک کشمیر میں لاکھوں مسلمان قتل ہو چکے ہیں اور ہزاروں مسلمان عورتوں کی عصمتیں پامال ہو چکی ہیں، کیا جناح صاحب کی روح کو ”ایصال ثواب“ کے لیے کافی نہیں؟ جو اَب جناحی جیالے مجید نظامی اور مظفر مرزا مزید ایک بڑے خونی معرکہ کے خواب دیکھ رہے ہیں؟

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!

جناح صاحب نے بطور گورنر جنرل ایک ”نیکی“ ضرور کی۔ شاید ایک سے زیادہ ”نیکیاں“ کرنے کی ان کو مہلت نہ مل سکی۔ جناح صاحب نے دہلی سے کراچی پہنچ کر زیادہ وقت گورنر جنرل ہاؤس میں ہی گزارا۔ مارچ 1948ء میں ان کو مشرقی پاکستان کا دورہ کرنے کا شوق ہوا اور آپ

ڈھاکہ تشریف لے گئے۔ ڈھاکہ میں جناح صاحب نے 21 مارچ 1948ء کو پلٹن میدان میں ایک جلسہ عام سے بھی خطاب فرمایا اور اس جلسہ میں تقریر کے دوران آنجناب نے ارشاد فرمایا:

''میں آپ کو صاف طور پر بتا دوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہوگی اور صرف اُردو۔ جو کوئی آپ کو غلط راستہ پر ڈالے وہ پاکستان کا دشمن ہے۔ ایک مشترک قومی زبان کے بغیر کوئی قوم باہم متحد نہیں ہوسکتی اور نہ کام کرسکتی ہے''۔(13)

ستم ظریفی دیکھیے کہ جناح صاحب خود نہ بنگالی بول سکتے تھے اور نہ اُردو۔ جہلا کے جلسہ عام میں بھی ہمیشہ انھوں نے انگریزی میں ہی تقریر کی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ پاکستان جن علاقوں پر مشتمل تھا اور ہے ان میں سے وہ کسی کی زبان بھی نہیں بول سکتے تھے۔ جناح صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ بنگال کی آبادی اپنی زبان کے معاملہ میں کس قدر حساس ہے، لیکن اعلان کر دیا کہ پاکستان کی قومی زبان ''اُردو'' ہوگی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ باسٹھ سال گزر جانے کے باوجود ''اُردو'' پاکستان کی قومی زبان نہیں بن سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگلے ہی روز اس اعلان کے خلاف طلبا نے احتجاجی جلوس نکالا۔ پولیس سے تصادم ہوا اور ایک طالب علم جاں بحق ہو گیا۔ اس اعلان کے خلاف احتجاج اس لیے ہوا:

"Mr. Jinnah`s remarks, therefore,caused as a slap on the face of Bengalis.It was duobly galling to the students in the vanguard of the language movement.Apart from language and culture,it was economic proposition which would put the young Bengali at a serious disadvantage with his counter part in west Pakistan who would automatically have command over Urdu since it was widely spoken there.The Bengali students could have to learn an additional language Urdu alongwith the burden of his regular studies in

order to qualify for a decent job in the Government or outside."(14)

ترجمہ: ''یوں مسٹر جناح کا بیان بنگالیوں کے منہ پر تھپٹر تو تھا ہی، ان کے طلبہ کے لیے تو یہ دُہرا اذیت ناک تھا جو بنگالی زبان کی تحریک کا ہراول دستہ تھے۔ معاملہ زبان اور ثقافت سے بڑھ کر معاشی تھا کیونکہ اس طرح مغربی پاکستان کے نوجوان کو مشرقی پاکستان والے کے مقابلے میں فوقیت حاصل ہو جاتی تھی جسے فطری طور پر اُردو پر عبور ہوتا تھا، کیونکہ وہاں اُردو عام بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ بنگالی طالب علم کو مناسب سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لیے ایک اضافی زبان سیکھنے کا بوجھ بھی اٹھانا پڑتا۔''

بالآخر مشرقی پاکستان میں اُردو بولنے والوں کے ساتھ کیا گزری کہ لاکھوں اُردو بولنے والے 1971ء سے بنگلہ دیش میں خیمہ بستیوں میں پڑے جانوروں جیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ لوگ بہر حال زندہ تو ہیں لیکن جو اُردو بولنے والے 1971ء کے ہنگامے کے دوران کسی محفوظ جگہ تک نہ جا سکے ان کے ساتھ کیا ہوا وہ بھی سن لیجیے۔ 3 مارچ 1971ء کو قومی اسمبلی کا بلایا ہوا اجلاس جب جنرل یحییٰ نے ملتوی کر دیا تو مشرقی پاکستان میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ مشرقی پاکستان میں پاکستانی فوج کی تعداد بہت محدود تھی۔ جہاں پاکستانی فوج کی دسترس نہیں تھی وہاں پاک فوج سے علیحدگی اختیار کرنے والی بنگالی نفری یا مکتی باہنی کا کنٹرول ہو گیا۔ مثال کے طور پر چٹاگانگ شہر تو پاک فوج کے قبضہ میں تھا، لیکن گرد و پیش جس میں چٹاگانگ کا ریڈیو سٹیشن بھی شامل تھا بنگالی باغیوں کے کنٹرول میں تھا۔ ان حالات میں مصیبت کے مارے اُردو بولنے والے کچھ مرد خواتین چٹاگانگ شہر میں پناہ لینے کے لیے آ رہے تھے کہ بنگالی باغیوں کے ہاتھ لگ گئے۔ اس اندوہناک واقعے کا حال ملاحظہ کیجیے:

"It happened on the evening of the 28th March1971 when Pakistan army was battling to control Chittagong against stiff resistance from the East Pakistan Rifles under Major Rafiq and

others.Zia was at Kalurghat providing military cover for the Shadin Bangla Bitor Kendra broadcast. At about sunset, my informant said,a group of Biharis,some 18 men and 12 women,were caught on the road trying to slip into city under the safety of Pakistan army. These Urdu speaking people were brought to Zia at the radio station since he was the senior Bangali military person in the area.'Take the men out and shoot them.'Zia ordered.Then pointing to the women he told his troops:'You can do what you like with them.' "

ترجمہ: 28 مارچ 1971 کی شام کو جب افواجِ پاکستان چٹا گانگ کا کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور انھیں میجر رفیق اور دیگر کی قیادت میں ایسٹ پاکستان رائفلز کی جانب سے شدید مزاحمت کا سامنا تھا، ضیاء کلور گھاٹ میں تھا اور بنگالی ریڈیو سٹیشن کی حفاظت کر رہا تھا۔ شام کے وقت مخبر نے مجھے اطلاع دی کہ بہاریوں کا ایک ایسا گروہ جس میں 18 مرد اور 12 عورتیں تھیں، پکڑ لیا گیا ہے جو شہر میں داخل ہو کر پاکستانی فوج کی پناہ میں آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان اُردو بولنے والے لوگوں کو پکڑ کر ضیاء کے پاس لایا گیا کیونکہ اس علاقے میں وہی سب سے سینئر بنگالی فوجی افسر تھا۔ ضیاء نے حکم دیا: ''مردوں کو باہر لے جا کر گولی مار دو اور عورتوں کے ساتھ جو چاہو کرو۔''

یہ جاننے کے لیے بقراط ہونا ضروری نہیں کہ مردوں کو قتل کرنے کے بعد عورتوں کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ جناح صاحب کی بابرکت قیادت کے طفیل دو دفعہ (ایک دفعہ 1947ء میں دوسری دفعہ 1971ء میں) برصغیر کے مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمان عورتیں بے آبرو ہوئیں۔ مسٹر جناح ایسا ''صاحبِ بصیرت'' لیڈر نہ پہلے کسی قوم کو ملا ہوگا اور نہ آئندہ ملے گا۔

یہ تھی بانیِ پاکستان کی بصیرت اور بصارت کہ 21 مارچ 1948ء کو ڈھاکہ میں یہ اعلان کر کے کہ ''پاکستان کی قومی زبان اُردو ہوگی'' مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ اس کے بعد واقعتاً جو کچھ ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ یہ واحد ''نیکی'' تھی جو جناح صاحب نے اپنی مختصر سی زندگی میں پاکستان اور اہلِ پاکستان کے ساتھ کی (سبحان اللہ)۔ دنیا میں ایسا لیڈر کا ہے کو گزرا ہوگا۔ جناح صاحب کے پہلے ایئر ایڈی کانگ جناب عطا ربانی نے اپنی کتاب "The Sun Shall Rise" میں جناح صاحب کی اس ''نیکی'' کو ان کی تین بڑی غلطیوں میں شمار کیا ہے۔ جبکہ ممتاز دانش ور، ادیب اور ناول نگار جناب عبداللہ حسین اس ''نیکی'' کو بے وقوفی قرار دیتے ہیں۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور کے صحافی جناب وقار اشرف کے اس سوال: ''کیا اُردو کو قومی زبان قرار دینے کا فیصلہ درست تھا؟'' جواب میں عبداللہ حسین نے فرمایا:

> ''میرے خیال میں بے وقوفی تھی۔ اگر ہم اُردو اور بنگلہ کو دو قومی زبانیں تسلیم کر لیتے تو کیا حرج تھا۔ بنگالیوں کی اپنی زبان سے گہری وابستگی تھی اور وہ اُردو کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ ہم نے اصل میں ان گنت بے وقوفیاں کی ہیں۔''(15)

سچی بات یہ ہے کہ میں جب بھی مسٹر جناح کی سیاست کا جائزہ لیتا ہوں، جب بھی ان کے غلط در غلط فیصلوں پر غور و فکر کرتا ہوں تو بے اختیار میری زبان پر یہ شعر جاری ہو جاتا ہے:

کم ہوں گے اس بساط پہ تم جیسے بدقمار
جو چال تم چلے، سو نہایت بُری چلے

مرزا صاحب موصوف کم از کم ڈگریوں کی حد تک تعلیم یافتہ ہیں۔ کسی بھی بات کا فیصلہ نتائج دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ لیکن موصوف فرماتے ہیں کہ تقسیم برصغیر کے نتائج سے آنکھیں بند رکھو اور یہ ایمان رکھو کہ جناح صاحب نے جو کیا درست کیا تھا۔ لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ پاکستان اس لیے بنایا گیا تھا کہ جارج ششم اور اس کے جانشینوں کے آلۂ کار کا کردار ادا کرتا رہے۔ دوسرا مقصد اس سے یہ تھا کہ برصغیر میں مسلمانوں کی عددی قوت تین حصوں میں تقسیم ہو کر بے حیثیت و بے اثر ہو جائے۔ حمید اختر صاحب پاکستان کے ممتاز دانش ور اور کالم نگار ہیں۔ انھوں نے بھارت کا دورہ کیا اور اس دورہ کے مشاہدات و تاثرات روزنامہ ایکسپریس، لاہور میں اپنے کالم ''پُرسش احوال'' میں لکھے تھے۔ انھوں نے اس کالم میں لکھنؤ کے ایک ہندو کی گفتگو بھی نقل کی ہے جو اس

طرح ہے:

''لکھنؤ میں تو ایک صاحب نے ہم سے یہ تک کہا کہ محمد علی جناح نے پاکستان بنا کر بھارتی مسلمانوں پر نہیں بلکہ برصغیر کے ہندوؤں پر احسان کیا ہے۔ ہم نے جب وضاحت چاہی تو ان کا کہنا تھا کہ پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد اس وقت پچاس کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ اگر پاکستان نہ بنتا اور ملک کا بٹوارہ نہ ہوا ہوتا تو یہ تعداد متحدہ بھارت کی حکومتوں کے لیے سخت پریشانی کا سبب بن سکتی تھی اور یہ ممکن تھا کہ کسی وقت ان کی تعداد اتنی ہو جاتی کہ وہ پھر سے اس دیش کے حاکم بن جاتے''۔(16)

صاحب بصیرت وفراست راہنما مجاہد آزادی مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری نے تو تقسیم ہند سے ایک سال قبل 2 ستمبر 1946ء کو بیرون دہلی دروازہ لاہور میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے پیش گوئی فرما دی تھی:

''مسلم لیگ والو! تم ہندستان کے مسلمانوں کا حل پاکستان بتاتے ہو، میرا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کا مسئلہ تمھاری مجوزہ تقسیم سے کبھی حل نہیں ہوگا۔ ہاں! اس سے دس کروڑ مسلمان تین حصوں میں بٹ جائیں گے۔ جواہر لال نہرو کو تم ''اشوک'' کا تخت بچھا کر دے رہے ہو۔ ہندو کو اتنی بڑی سلطنت اشوک کے بعد کبھی نہیں ملی۔''(17)

مرزا صاحب تسلیم کریں یا نہ کریں حقیقت کسی کی تصدیق اور توثیق کی محتاج نہیں ہوتی۔ روافض نے جناح صاحب کی سربراہی میں برصغیر تقسیم کروا کر مسلمانوں کو تین حصوں میں تقسیم کر کے کمزور کر دیا اور ہندوؤں کو بھارت میں اکٹھا کر دیا۔ جناح صاحب نے مسلمانوں پر نہیں ہندوؤں پر احسان کیا تھا اور ہندو کم از کم جناح صاحب کے احسان کا اعتراف تو کرتے ہیں، لیکن جارج ششم کے جانشین پاکستان کو حسب منشا استعمال بھی کرتے ہیں اور اعتراف بھی نہیں کرتے۔ مرزا صاحب موصوف کے نزدیک تو جناح صاحب سے معجزہ سرزد ہوا تھا اور معجزہ انبیاء کے بعد اللہ تعالیٰ نے کسی کو عطا کیا ہے تو وہ جناح صاحب ہیں۔



حوالہ جات

(1) The Great Divide page 227 by H.V.Hudson

(2) The Great Divide page 226-227 by H.V.Hudson

(3) تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار (ماؤنٹ بیٹن پیپرز ڈاکومنٹ نمبر116)/ص:159۔

(4) Shameful Flight Page 163- 164.

(5) The Shameful Flight by Stanley Wolpert Page 167-168.

(6) روزنامہ جنگ لاہور/2 ستمبر 2009ء

(7) روزنامہ نوائے وقت لاہور/22 فروری 2010ء

(8) ماہنامہ چہار سو راولپنڈی/اگست 2005ء/ص:97

(9) "The Sun Shall Rise"/Atta Rabani

(10) روزنامہ نوائے وقت لاہور/17 ستمبر 2010ء

(11) ایضاً/3 مئی 2010ء

(12) ایضاً/20 جولائی 2010ء

(13) خطبات قائداعظم/ رئیس احمد جعفری/ص 601

(14) Bangladesh-A Legacy of Bloodshed by Anthony Mascarenhas page 13

(15) ہفت روزہ فیملی میگزین (نوائے وقت)، لاہور/2 مئی 2010ء

(16) روزنامہ ایکسپریس لاہور/23 نومبر 2005ء

(17) روزنامہ انقلاب لاہور/6 ستمبر 1946ء

7

پروفیسر مظفر مرزا کا تحریر کردہ مرثیہ بعنوان ''روح قائداعظم کی فریاد'' مطبوعہ: نوائے وقت لاہور 19 اپریل 2006ء نظر سے گزرا۔ موصوف فرماتے ہیں:

''پاکستان کے وجود کے لیے کروڑوں مسلمانوں کو اپنے گھر بار اور کھیت کھلیان کو خیر باد کہنا پڑا۔ لاکھوں جانوں کا نذرانہ پیش کرنا پڑا۔ معصوم بچوں کو ان کے والدین کے سامنے نیزوں پر اچھالا گیا۔ بہنوں کو ان کے بھائیوں کے سامنے بے آبرو کیا گیا وغیرہ وغیرہ۔''

پاکستان کے لیے یہ قیمت ادا کرنے کے بعد پاکستان کی موجودہ حالت کا جو نقشہ موصوف نے اس ''مرثیہ'' میں بیان کیا ہے۔ اس کے پیش نظر موصوف کے اس مرثیہ کا عنوان ''روح قائداعظم کی فریاد'' کی بجائے ''میں ہوں اپنی شکست کی آواز'' ہونا چاہیے تھا۔ بہر حال موصوف فکر مند نہ ہوں۔ جناح صاحب کی روح بہت پرسکون ہوگی۔ جب جناح صاحب کو اپنی زندگی میں اس بات کی پروا نہیں تھی کہ ان کی قیادت کے فیض سے برصغیر کے مسلمانوں پر کیا گزر رہی ہے تو اب ان کی روح کو کیا بے چینی ہوگی۔ ستمبر 1947 میں جب لاکھوں مسلمان ابھی کیمپوں میں پڑے تھے اور لاکھوں ہی قافلہ در قافلہ آگ اور خون کا دریا عبور کرتے ہوئے پاکستان کی سرحدوں کی طرف رواں دواں تھے، جناح صاحب اپنی کامیابی پر اس قدر مسرور اور مطمئن تھے کہ ان کی طرف سے گورنر جنرل ہاؤس کراچی میں ایک دعوت میں مہمانوں کو اعلیٰ اقسام کی شرابیں پیش کی جارہی ہیں۔ اب ان کی روح کو کیا بے چینی ہوسکتی ہے۔ یہ جناح صاحب کا مسئلہ ہی نہیں تھا کہ ان

کی حسن قیادت کے طفیل مسلمانوں پر کیا گزرتی ہے یا تقسیم کے بعد پاکستان میں کیا ہوگا۔ جناح صاحب برصغیر کے مسلمانوں کی جان و مال کے تحفظ کے بارے میں کس قدر بے حس تھے، اس کا اندازہ اس واقعے سے ہوجاتا ہے کہ قدرت اللہ شہاب مرحوم نے جو تقسیم ہند کے وقت اڑیسہ کے ہوم سیکرٹری تھے، جناح صاحب کو وہ سرکلر لا کر دیا تھا کہ جس میں مسلمانوں کو بے دست و پا کرنے کا منصوبہ تھا تا کہ جب ان کا قتل عام شروع کیا جائے تو ان کے پاس اپنے دفاع کے لیے چاقو تک نہ ہو۔ شہاب صاحب کو اس کاوش پر جو شاباش جناح صاحب کی طرف سے ملی تھی اس کا ذکر میں آئندہ صفحات میں کروں گا۔ اس سرکلر کے مطالعہ کے بعد جناح صاحب نے مسلمانوں کے تحفظ کے لیے ایک تنکا تک نہیں ہلایا تھا۔ تقسیم برصغیر سے قبل متحدہ بنگال کا وزیر اعلیٰ حسین شہید سہروردی تھا۔ اسے جب حکومتی ذرائع سے اطلاع ملی کہ بنگال میں ہندو مسلم فساد کی تیاریاں کی جارہی ہیں تو اس نے اس کا یہ حل سوچا کہ کانگریس کے ساتھ مخلوط حکومت بنالی جائے اور اس کے لیے سہروردی نے جناح صاحب سے اجازت طلب کی تو معلوم ہے کیا ہوا تھا؟ ملاحظہ فرمائیے:

"When on 6 September Suharavardy asked Jinnah to allow him to re-open negotitations with the Bengal Congress with a view of forming a coalition, Jinnah rejected this point blank, arguing that there was no question of any provincial coalition with Congress without a coalition at the centre. So Suharvardy found himself warning the Viceroy that unless Jinnah's demands at the centre were met there was no hope of averting a catastrophic outbreak of communal violence in Bengal" (1)

ترجمہ: ''جب 6 ستمبر کو سہروردی نے جناح سے درخواست کی کہ اسے اتحاد سازی کے

لیے بنگال کانگریس کے ساتھ مذاکرات کا دوبارہ آغاز کرنے کی اجازت دی جائے تو جناح نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے کہا اگر مرکز میں اتحاد نہیں ہوتا تو صوبائی سطح پر اتحاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے سہروردی کو وائسرائے کو خبردار کرنا پڑا کہ اگر مرکز میں جناح کے مطالبات تسلیم نہیں کیے جاتے تو بنگال میں تباہ کن فرقہ وارانہ فسادات کا خطرہ کسی صورت میں نہیں ٹالا جاسکے گا۔''

جناح صاحب کو اس بات کی ہرگز پروا نہیں تھی کہ بنگال میں فسادات کی صورت میں مسلمانوں کا قتل عام ہوگا، ورنہ وہ سہروردی کو کانگریس کے ساتھ مخلوط حکومت بنانے سے کبھی نہ روکتے۔ نتیجتاً بنگال میں مسلمانوں کا ایسا قتل عام ہوا کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

مرزا صاحب موصوف نے اپنے مذکورہ بالا مرثیہ میں جناح صاحب کی ناکامیوں کا تذکرہ تو کیا ہے، لیکن جیالے ہونے کی وجہ سے اس میں بھی ڈنڈی مار گئے ہیں اور چند ایک بڑی بڑی ناکامیوں کا ذکر کرنے سے انھوں نے ارادۃً گریز کیا ہے مثلاً:

1) جناح صاحب کا مطالبہ تھا کہ پاکستان کو پورا بنگال، پورا آسام اور پورا پنجاب ملے۔ اس میں جناح صاحب ناکام ہوئے اور ان کو بدوضع، کٹا پھٹا اور دیمک زدہ پاکستان قبول کرنا پڑا۔ جسے وہ 1944ء میں گاندھی کی پیشکش کے جواب میں رد کر چکے تھے اور چند ماہ قبل ہی کیبنٹ مشن کو بھی انکار کر چکے تھے۔

2) جناح صاحب کا مطالبہ تھا کہ متحدہ ہندستان کی آخری عبوری مخلوط حکومت میں تمام مسلمان وزرا مسلم لیگ نامزد کرے اور کانگریس کوئی مسلمان وزیر نامزد نہ کرے، لیکن اس میں بھی جناح صاحب ناکام ہوئے۔

3) جناح صاحب اپنے اس مطالبہ میں بھی ناکام ہوگئے کہ مرکزی مخلوط حکومت میں دفاع اور امور خارجہ کے محکمے ان کے سپرد کیے جائیں۔

4) جناح صاحب یہ بھی نہ منوا سکے کہ تقسیم برصغیر کی بنیاد دو قومی نظریہ ہو۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ متحدہ برصغیر کا کل رقبہ 39,54159 مربع کلومیٹر ہے اور اس وقت متحدہ ہندستان میں مسلم آبادی کا تناسب چالیس فی صد تھا۔ اس حساب سے مسلمانوں کے حصہ میں چالیس فیصد 15,81,663 مربع کلومیٹر بنتا تھا لیکن جناح صاحب مشرقی پاکستان (1,44,000 مربع

کلومیٹر) اور مغربی پاکستان (7,96,096 مربع کلومیٹر) کو ملا کر صرف 9,40,096 مربع کلومیٹر حاصل کر سکے۔ جو کل رقبہ کا صرف 23.77 فیصد بنتا ہے۔ جناح صاحب نے چالیس فیصد آبادی کے لیے 23.77 فیصد رقبہ حاصل کیا تو کیا تیر مارا۔ یہ تو وہ علاقے تھے جن میں مسلمانوں کو متحدہ برصغیر میں بھی حکومت بنانے سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی تو پھر جناح صاحب نے پندرہ لاکھ مسلمان کس خوشی میں قتل کرا دیے اور نوے ہزار مسلمان عورتیں کیوں بے آبرو کروا دیں؟ اگر جناح صاحب مسلمانوں کی چالیس فیصد آبادی کے لیے پینتالیس یا پچاس فیصد رقبہ حاصل کر لیتے تو واقعی یہ کارنامہ ہوتا۔

5) جناح صاحب نے مطالبہ کیا تھا کہ مغربی اور مشرقی پاکستان میں رابطہ کے لیے بھارت Corridor مہیا کرے لیکن جناح صاحب اس میں بھی ناکام رہے۔

6) جناح صاحب نے مطالبہ کیا کہ کلکتہ پاکستان کو دیا جائے لیکن اس مطالبہ کو منوانے میں بھی وہ ناکام رہے۔

7) جناح صاحب نے مطالبہ کیا کہ خلیج بنگال میں (مشرقی پاکستان کے بالکل نیچے) جزائر انڈیمان اور نکوبار پاکستان کو دیے جائیں۔ اس میں بھی وہ ناکام رہے۔

8) جناح صاحب نے مطالبہ کیا کہ برصغیر کی ریاستوں کو اس طرح آزاد کیا جائے کہ وہ پاکستان یا بھارت کے ساتھ الحاق کی پابند نہ ہوں۔ جناح صاحب اس میں بھی ناکام رہے۔

9) جناح صاحب ریڈکلف ایوارڈ بھی اپنی حسب خواہش اور مبنی بر انصاف حاصل کرنے میں ناکام رہے، حالانکہ صاحب موصوف انھی کا تجویز کردہ تھا۔

10) جناح صاحب انتقال اقتدار میں تاخیر بھی نہ کروا سکے۔ وہ بھی کانگریس کی خواہش کے مطابق ہوا۔ اس میں بھی وہ ناکام ہوئے۔

11) جناح صاحب نے مطالبہ کیا کہ پاکستان کی قومی اسمبلی کا پہلا اجلاس دہلی میں کرنے دیا جائے۔ ماؤنٹ بیٹن نے تسلیم بھی کر لیا۔ کانگریس کی لیڈرشپ نے کہا کہ ہم جناح صاحب کو دلی کے قریب سے بھی نہیں گزرنے دیں گے۔ (2)

مرزا صاحب موصوف نے اپنے زیر تبصرہ مضمون ''روح قائد اعظم کی فریاد'' میں فرمایا:

''حضرت قائد اعظم ہر صورت میں پاکستان چاہتے تھے خواہ اس کا مکمل جغرافیہ ایک

رومال جتنا ہی ہو''۔

سوال یہ ہے کہ ایک رومال جتنا پاکستان برصغیر کی چالیس فیصد مسلم آبادی کا کونسا مسئلہ حل کر سکتا تھا اور اس نے کون سا مسئلہ حل کیا ہے؟ اس کے برعکس جناح صاحب نے برصغیر کے مسلمانوں کو مسائل کے ایک جنگل میں لا کر چھوڑ دیا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ جب بھارت نے چناب اور نیلم پر مجوزہ ڈیم بنا لیے تو ہمارا کیا حشر ہوگا؟ اس کا تصور کرتے ہوئے روح کانپ جاتی ہے۔ پاکستان میں بعض دانش ور حضرات کی طرف سے مسلسل پراپیگنڈا کیا جا رہا ہے کہ جناح صاحب نے ہندو اور انگریز کی زبردست مخالفت کے باوجود پاکستان حاصل کر لیا۔ اس کی کوئی بنیاد نہیں، بلکہ صورت حال اس کے برعکس ہے۔ دو ممالک میں تقسیم برصغیر سے برطانیہ کی صحت پر تو کوئی اثر نہیں ہونا تھا اور جب دو سے تین ملک بن گئے تو بھی انگریزوں کی بلا سے۔ بلکہ میں عرض کر چکا ہوں کہ دو قومی نظریہ کی تجویز انگریز نے اپنے خاص آدمی سر سلطان محمد شاہ آغا خاں سوم، جو نہ مسلمان تھا اور نہ مسلمان ہونے کا مدعی تھا اور نہ اسلام کا یا مسلمانوں کا خیر خواہ ہو سکتا تھا، کے ذریعے برصغیر کے مسلمانوں کو دی جسے اس کے معنوی فرزند جناح صاحب نے اپنی انتہا (تقسیم برصغیر) تک پہنچایا اور اس طرح مسلمانوں کی عددی طاقت کو تین حصوں میں تقسیم کر کے بے اثر کر دیا۔ یہ پورا پروگرام برصغیر کی ہندو کمیونٹی کے مفاد میں تھا۔ چنانچہ 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں مسلم لیگ نے تقسیم برصغیر کی تجویز پاس کی تو اس پر جواہر لعل نہرو کا ردعمل ان الفاظ میں تھا:

" Nehru for example, was reported to have remarked that instead of feeling sorry at the Muslim League's new demand, he was pleased, not because he liked it ... on the contrary, he considered it to be the most insane suggestion but because it very much simplified the problem. They (Congress) were now able to get rid of the demands about proportionate representation in legislation, services, cabinets,

etc. etc. He asserted that if people (muslim) wanted such things, as suggested by the Muslim League at Lahore, then one thing was clear, they and people like him (Jinnah) could not live together in India. He would be prepared to face all consequences of it but he would not be prepared to live with such people".(3)

ترجمہ: ''مثال کے طور پر نہرو کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اس نے یہ کہا تھا کہ مسلم لیگ کے نئے مطالبے پر انھیں افسوس کے بجائے خوشی ہے اس لیے نہیں کہ اسے یہ تجویز پسند ہے...... اس کے برعکس وہ اسے انتہائی غلط تجویز سمجھتا ہے،...... بلکہ اس لیے کہ اس طرح مسئلہ بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اب ان کے (یعنی کانگریس کے) لیے قانون سازی، ملازمتوں اور کابینہ وغیرہ میں متناسب نمائندگی کے مطالبات سے جان چھڑانا ممکن ہو گیا تھا۔ اس نے اس بات پر بھی زور دیا کہ اگر (مسلمان) لوگ وہی کچھ چاہتے ہیں جس کی تجویز مسلم لیگ لاہور میں پیش کر رہی ہے تو پھر یہ واضح ہے کہ وہ اور جناح جیسے لوگ ایک ملک میں رہ ہی نہیں سکتے پھر وہ ہر طرح کے نتائج برداشت کر لیں گے، لیکن ان لوگوں کے ساتھ رہنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔''

جناح صاحب کی قیادت میں مسلم لیگ نے تقسیم ہند کی تجویز دے کر برصغیر کے غیر مسلموں کا کام آسان کر دیا جس کے نتیجہ میں ان کے لیے مستحکم بھارت کی تعمیر ممکن ہو گئی ورنہ ان کے لیے تو مسائل ہی ختم نہیں ہو رہے تھے۔ متحدہ ہند میں چالیس فیصد مسلمان تقسیم ہو کر بے اثر ہو گئے جبکہ ہندو اکٹھے ہو گئے۔ یہی وجہ ہے:

"Raj Gopal Acharia urged his High Command to give Muslim provinces the option to go their own way. This would enable the Indian union to have a strong government at the centre. In his

opinion, partition was by far the lesser evil than forcing Muslim provinces to stay in".(4)

ترجمہ: ''راج گوپال اچاریہ نے اپنی ہائی کمانڈ پر زور دیا کہ مسلمان صوبوں کو اپنی مرضی کے راستہ پر جانے دیا جائے۔ کیونکہ اس طرح انڈین یونین میں ایک مضبوط مرکزی حکومت کا قیام ممکن ہو سکے گا۔ اس کے خیال میں مسلمان صوبوں کا ہندستان میں شامل رہنا تقسیم کے مقابلے میں زیادہ بڑی برائی تھی۔''

متحدہ ہند میں تو بہت ممکن تھا کہ جلد ہی مسلمانوں کی چالیس فیصد آبادی دوسری غیر مسلم اقلیتوں (سکھ پارسی وغیرہ) کو ساتھ ملا کر اکثریت حاصل کر لیتی لیکن مسلمانوں کو تقسیم کر کے بھارت کی مشرک اکثریت کے لیے یہ خطرہ جناح صاحب نے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ اگر ہم نے دو قومی نظریہ پیش کر کے برصغیر کی ہندو اکثریت کو اپنا دشمن نہ بنایا ہوتا تو بالکل ممکن تھا کہ گزشتہ نصف صدی میں مسلمانوں کی تعداد ہی اکاون (51) فیصد سے زیادہ ہو چکی ہوتی۔ مرزا صاحب موصوف اپنے مرثیہ کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:

''پاکستانی قوم اس وقت جن جان لیوا، دل شکن اور حوصلہ شکن سیاسی اور قومی حالات وکیفیات سے دوچار ہے۔''

سوال یہ ہے کہ یہ ''پاکستانی قوم'' کہاں سے برآمد ہو گئی۔ ہم تو ''مسلم قومیت'' کے علم بردار تھے۔ ہمارا تو مقدمہ ہی یہ تھا کہ قوم وطن سے بنتی ہی نہیں، بلکہ مذہب سے بنتی ہے تو پھر ''پاکستانی قوم'' کیا چیز ہے۔ ہم تو کہتے تھے:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن ہے اس کا وہ مذہب کا کفن ہے

سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبرز مقام محمد ﷺ عربی است

ہمارے نزدیک تو ''وطنی قومیت'' کفر سے بھی بدتر تھی۔ بات بڑی واضح ہے کہ پاکستانی قوم اس وطن سے منسوب ہے جو دنیا کے نقشے پر پاکستان کے نام سے موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم بھی بالآخر اسی مؤقف پر آ گئے جو تقسیم برصغیر سے قبل دینی جماعتوں کا تھا کہ قوم صرف مذہب

سے نہیں بنتی۔ ہم نے بھی 15 اگست 1947ء سے وطنی قومیت کے نظریے کو اپنا کر اور مسلم قومیت کے نظریہ کو دفن کر کے پاکستانی قوم کی تشکیل شروع کر دی۔ اگر ہم نے ''مسلم قومیت'' کے نظریہ کو دفن نہیں کیا تو لاکھوں غیر بنگالی مسلمان جو 1972ء سے بنگلہ دیش کے کیمپوں میں پڑے ہیں ان کو ہم قبول کیوں نہیں کرتے۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ اس ''وطن'' میں پیدا نہیں ہوئے جو اب پاکستان کے نام سے دنیا کے نقشہ پر موجود ہے۔ جس کے لیے پندرہ لاکھ مسلمان قتل کروائے گئے اور نوے ہزار مسلمان خواتین بے آبرو کروائی گئیں، یہ قیمت اس ملک کے لیے ادا کی گئی جس میں چھ کروڑ انسان غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ خاندان کے خاندان گردے فروخت کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں، معاشی حالات سے مجبور ہو کر۔ دنیا میں، سب سے زیادہ لوگ پاکستان میں خودکشیاں کر رہے ہیں۔ حکمران کروڑوں روپے کی گاڑیاں درآمد کر رہے ہیں۔(5)

اگر بالآخر ہم نے ''وطنی قومیت'' کے نظریے کو ہی اختیار کرنا تھا تو تقسیم سے قبل ''وطنی قومیت'' کس اصول کی بنا پر کفر تھا۔ جناح صاحب نے برصغیر کے مسلمانوں کو تقسیم کر کے ان کی عددی طاقت کو بے حیثیت اور بے اثر کیا تو کس کے مفاد میں؟ اس سوال کا جواب اہل دانش کے ذمے ہے۔



حوالہ جات

(1) The Sole Spokesman page 220 by Ayesha Jalal.

(2) Towards India's Freedom & Partitioin By S.R. Meehotra. Page 320-321

(3) Daily Leader 15th April 1940 - Towards India's Freedom and Partition page 265 by S.R. Meehotra.

(4) Civil and Military Gazette 25th April 1942. The Sole Spokesman Page 82. By Ayesha Jalal

(5) روزنامہ پاکستان لاہور/13 اپریل 2006ء

8

پروفیسر مظفر مرزا اپنے ایک مضمون مطبوعہ نوائے وقت، لاہور، 14 جون 2007ء میں جناح صاحب کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں:۔

> ''محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں لامتناہی انسانی اوصاف سے مزین فرمایا تھا۔ تمام زندگی کمپیوٹرائزڈ تھی۔ ایک ایک لمحہ، ایک ایک سانس، خون کا ایک ایک قطرہ اسلامیان ہند کی آزادی و خود مختاری کے لیے صرف فرما رہے تھے۔ اتنی عظیم اسلامی مملکت (جو مستقل طور پر امریکا کی آلۂ کار بنی ہوئی ہے۔ ناقل) کو تخلیق کیا جس کی مثال دنیائے انسانیت میں کہیں بھی دستیاب نہیں''۔

کیا عمدہ قصیدہ ہے، لیکن اس میں موصوف نے ایک خوف ناک ڈنڈی ماری ہے جو صرف انھیں زیب دیتی ہے۔ یہ تمام دعویٰ بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے کہ جناح صاحب اپنا ''ایک ایک لمحہ، ایک ایک سانس، خون کا ایک ایک قطرہ اسلامیان ہند کی آزادی و خود مختاری کے لیے صرف فرما رہے تھے۔'' جناح صاحب تو برصغیر کے مشرق اور مغرب کے مسلم اکثریت کے علاقوں کو علیحدہ کروانے کی کوشش کرتے رہے۔ برصغیر کی آزادی سے تو ان کو دلچسپی ہی نہیں تھی۔ ان کی کاوش تو انگریز سے اس مطالبہ تک محدود تھی کہ ''اگر آپ جائیں تو تقسیم کر کے جائیں''۔ جس میں یہ بات مضمر تھی کہ ''اگر آپ نہ جائیں تو ہم آپ کے زیر سایہ بہت خوش ہیں''۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے زندگی میں کبھی اپنی قمیص کا کالر بھی میلا نہ ہونے دیا اور نہ کبھی اپنے جوتے کی چمک ماند پڑنے دی۔ آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والوں کی آدھی آدھی زندگی جیل میں گزری تھی۔ برصغیر کے

ان مسلمانوں کی فلاح سے جناح صاحب کو کوئی غرض ہی نہیں تھی جو برصغیر کے ان صوبوں میں رہتے تھے جہاں وہ اقلیت میں تھے۔ یہ علاقے جو مشرق اور مغرب میں پاکستان کا حصہ بنے یہاں تو مسلمان اکثریت میں تھے۔ یہاں تو ان کی حکومتیں تھیں۔ اصل مسئلہ تو ان مسلمانوں کا تحفظ تھا جو غیر مسلم اکثریت کے علاقوں میں رہتے تھے۔ ان کی جناح صاحب کو کوئی فکر ہی نہیں تھی۔

یہ خلافِ واقعہ ہے کہ جناح صاحب تمام اسلامیانِ ہند کی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ تقریباً ایک تہائی مسلمانوں کو انھوں نے مستقل طور پر مشرکین بھارت کی غلامی میں دے دیا۔ جن علاقوں کو انھوں نے علیحدہ کروایا، اس سے بھی ان کی غرض یہ تھی کہ برطانیہ اور امریکا کو ایک ایسی ریاست میسر آجائے جو ہمیشہ ان کے آلۂ کار بنی رہے۔ پاکستان کا اب تک یہی کردار رہا ہے۔ اگر یہ غلط ہے تو کوئی صاحب اس کی نشان دہی کر دیں۔ اسی مضمون میں مرزا صاحب فرماتے ہیں:

> سیرت و کردار میں بے مثال ہونے کے ناطے سر آغا خاں نے اپنی مشہور سرگزشت میں تحریر کیا تھا کہ: ''میرے دوستوں میں مسولینی، ہٹلر، چرچل، سٹالن، گاندھی اور نہرو تھے لیکن سیرت و کردار میں قائداعظم سب سے اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔''

کیا لاجواب خراجِ تحسین ہے۔ آغا خاں نے یہ خراجِ تحسین پیش کیا ہے تو اس کی وجہ یقیناً یہ ہے کہ جناح صاحب آغا خاں کے معنوی فرزند تھے اور جناح صاحب نے اس ایجنڈے کی تکمیل کی جو برطانوی انڈیا آفس نے مسلمانوں کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ان کی عددی طاقت کو بے اثر کرنے کے لیے آغا خاں کے سپرد کیا تھا۔ اسی مضمون میں مرزا صاحب یہ بھی فرماتے ہیں:

> ''اللہ تعالیٰ کی ذات واحد اور احد ہے، لہٰذا قائداعظم کو بھی خالصتاً واحد ہی پیدا فرمایا۔ کوئی دوسرا قائداعظم نہ پیدا ہوا۔''

مرزا صاحب کے یہ جملے شرک فی التوحید کے ذیل میں آئیں گے یا شرک فی النبوہ کی ذیل میں۔ اللہ کی توحید سے جناح صاحب کو تشبیہ دینا کسی طرح بھی شرک سے کم نہیں۔ مرزا صاحب جناح کی مدح سرائی میں شرک تک بلاوجہ نہیں پہنچے۔ وہ نوائے وقت، نظریہ پاکستان ٹرسٹ اور بزمِ اقبال سے جو بے شمار فوائد اٹھا رہے ہیں، اسی مدح سرائی کا عوض و معاوضہ ہے۔ اسی مدح سرائی کے طفیل آپ علم کے بغیر ہی علامہ کہلاتے ہیں۔

مرزا صاحب موصوف کے نزدیک جناح صاحب کو اللہ تعالیٰ نے واحد پیدا فرمایا تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ جناح صاحب کی تین ٹانگیں تھیں۔ ایک آنکھ تھی اور چھ ہاتھ تھے۔ موصوف کے نزدیک جناح صاحب بزرگی کی بنا پر تمام انسانوں میں واحد تھے۔ تمام امتِ مسلمہ سوائے موصوف کے یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو بزرگ ترین واحد شخصیت تخلیق کی وہ پیغمبرِ اعظم و آخر حضرت محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ہے۔ وہی سید ولدِ آدمؑ ہیں۔ ان کے اس مقام و مرتبہ کو بعض غیر مسلم اہلِ علم نے بھی تسلیم کیا ہے۔ معروف امریکی دانش ور مائیکل ہارٹ نے دنیا کی نامور ترین سو شخصیات پر جو کتاب لکھی ہے اس میں اس نے نبی اکرمؐ کی شخصیت کو سب سے اوپر رکھا ہے، لہٰذا کوئی مسلمان بسلامتیِ ایمان و بقائمیِ ہوش و حواس موصوف سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ اگر موصوف یہ فرما دیں کہ جناح صاحب تاریخ انسانی کی اس لحاظ سے واحد شخصیت ہیں کہ ان کی قیادت کے طفیل 1947 میں مشرقی پنجاب میں پندرہ لاکھ مسلمان قتل ہوئے اور تقریباً نوے ہزار مسلمان عورتیں بے آبرو ہوئیں۔ 1948ء میں حیدرآباد (دکن) میں پانچ لاکھ مسلمان قتل ہوئے۔ 1971ء میں مشرقی پاکستان میں پہلے بیس پچیس لاکھ غیر بنگالی مسلمان قتل ہوئے اور اس کے بعد تقریباً اتنی ہی تعداد میں پاکستان کی فوج نے بنگالی مسلمان قتل کر دیے اور مقبوضہ کشمیر میں 1947ء سے آج تک کم و بیش ایک لاکھ کشمیری قتل ہو چکے ہیں اور ان کی بے شمار عورتوں کی آبروریزی کی جا چکی ہے، تو یہ بالکل درست ہے۔ انسانی تاریخ میں کوئی ایک بھی ایسا لیڈر نہیں جس نے اپنے پیروکاروں کو اتنی تعداد میں قتل کروایا ہو یا اتنی تعداد میں عورتوں کو بے آبرو کروایا ہو اور ایک ایسا ملک حاصل کیا ہو جو مستقل طور پر یہود و نصاریٰ کا آلۂ کار بنا ہوا ہے۔ لہٰذا اس پہلو سے ان کے واحد ہونے پر مرزا صاحب موصوف سے اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں:

> ''یہ اسلامیانِ پاکستان کا گمان اور دعا تھی (اس میں موصوف نے بھارت کے مسلمانوں کو شامل نہیں کیا حالانکہ 15 اگست 1947ء کی شام تک جناح صاحب ان کے بھی لیڈر تھے۔ ناقل) اور اب بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دوسرے قائداعظم سے نوازتے جو ہمیں کشمیر لے دیتے۔''

موصوف کے مضمون کا یہ حصہ تجاہلِ عارفانہ یا عرفانِ جاہلانہ کا شاہکار ہے۔ سوال یہ ہے کہ جناح صاحب نے 1947ء میں ہی کیوں کشمیر لے کر نہ دیا۔ کس نے ان کو روک دیا تھا۔ ہر

پاکستانی جانتا ہے کہ کشمیر کا بھارت میں شامل ہونا جناح صاحب کی قیادت کا ہی کمال ہے، کیونکہ یہ فیصلہ جناح صاحب کے اصرار پر ہی ہوا تھا کہ ریاستوں کے الحاق کا فیصلہ ریاستوں کے عوام نہیں بلکہ وہاں کے حکمران نواب یا راجہ کریں گے۔ جناح صاحب کو معلوم تھا کہ کشمیر کا ہندو راجہ کبھی کشمیر کا الحاق پاکستان سے نہیں کرے گا۔ سوال یہ ہے کہ جناح صاحب نے کس کے مفاد میں یہ فیصلہ کروایا تھا کہ کسی ریاست کے الحاق کا فیصلہ وہاں کے عوام نہیں، بلکہ حکمران (فرد واحد) کرے گا؟ اگر جناح صاحب یہ سمجھتے تھے کہ کشمیر کا راجہ ہندو ہونے کے باوجود کشمیر کا الحاق پاکستان سے کردے گا تو ہم جناح صاحب کی فہم وفراست کے بارے میں کیا رائے قائم کریں؟ مظفر مرزا موصوف اللہ تعالیٰ سے ایک اور ایسا ہی قائد مانگ رہے ہیں تو کیا آپ ایک بار پھر ستر لاکھ مسلمان قتل کروانا چاہتے ہیں اور ہزاروں مسلمان عورتوں کو بے آبرو کروانا چاہتے ہیں؟

تجھ کو کتنوں کا لہو چاہیے اے ارضِ وطن
کتنی آہوں سے کلیجہ تیرا ٹھنڈا ہو گا



9

جناب رانا فضل الرحمن نعیم نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ روزنامہ پاکستان، لاہور 29،30 اگست 2007ء میں اس سوال کے جواب میں کہ جناح صاحب نے ایک نئی مملکت کو چلانے کے لیے کوئی ٹیم تیار کی تھی یا نہیں، اعتراف کرتے ہیں:

"قائداعظم کے سوانح حیات کو بار بار پڑھنے کے باوجود یہ معلوم نہیں کر سکا کہ انھوں نے کون سی ٹیم تیار کی تھی۔ وہ فٹ بال، ہاکی یا کرکٹ کے کپتان یا کوچ ہرگز نہ تھے۔ پھر ٹیم کہاں سے آ گئی؟"

اس تحریر میں موصوف نے اعتراف کر لیا ہے کہ جناح صاحب نے سیاسی کارکنوں کی کوئی ٹیم تیار نہیں کی تھی جو اس نوزائیدہ ملک میں سیاسی استحکام پیدا کرتی۔ اسے مسلم امہ کی اُمنگوں کے مطابق دنیا میں ایک باوقار ملک کا مقام حاصل کر کے دیتی جس طرح کہ گاندھی نے مخلص سیاسی کارکنوں کی ٹیم تیار کی تھی جو اب تک بھارت کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اسے دنیا میں ایک باوقار مقام حاصل کر کے دیا ہے۔ اس کے رقبے میں اضافہ بھی کیا ہے، ادارے بھی مضبوط کیے ہیں جبکہ پاکستان کی حالت یہ ہے کہ امریکا کی پاپوش بوسی کے لیے ہر وقت تیار ہے اور ملک کو بھی آدھا کر دیا گیا ہے۔ موصوف فرماتے ہیں:

"قائداعظم نے جان نثاروں کا ایک گروہ تیار کیا تھا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں مگر اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ان کے بااعتماد ساتھی قیام پاکستان سے قبل یا اس کے فوراً بعد وفات پا گئے۔"

اس گروہ میں کتنے جانثار تھے جو پاکستان سے قبل ہی وفات پا گئے یا اس کے فوراً بعد، دو ہزار، چار ہزار؟ اگر موصوف ان میں سے چند ایک کے نام بھی لکھ دیتے تو لوگوں کے علم میں اضافہ ہو جاتا۔ اگر کرکٹ اور ہاکی کی ٹیم کے لیے گیارہ ارکان تیار کیے جاتے ہیں تو ملک کو چلانے کے لیے ہزاروں نہیں تو سیکڑوں کارکن ضرور تیار کیے جاتے ہیں اور قائد کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ کارکن تیار کرے تاکہ جب ملک کی زمام اقتدار اُن کے ہاتھ میں آئے اور وہ اس کو کامیابی سے چلا سکیں۔ وہ سیکڑوں کارکن بھی بے لوث اور مخلص ہونے چاہییں، ورنہ حکومت ہاتھ میں آتے ہی لوٹ مار کا بازار گرم ہو جاتا ہے جیسا کہ پاکستان میں ہوا۔ مخلص اور بے لوث سیاسی کارکن، وہ بھی سیکڑوں کی تعداد میں، تو وہی قائد تیار کر سکتا ہے جو خود مخلص اور بے لوث ہو۔ جناح صاحب تو قیادت کر ہی نہیں رہے تھے وہ تو وکالت کر رہے تھے۔ انھیں اس سے غرض ہی نہیں تھی کہ برصغیر کی تقسیم کے بعد بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں پر کیا گزرے گی اور پاکستان میں نظم مملکت کیسے چلے گا۔ چنانچہ انھوں نے تقسیم کروا دی اور جو کچھ مل گیا صبر شکر کے ساتھ قبول کر لیا۔ اگر برطانوی حکومت دریائے راوی یا دریائے چناب کو سرحد بنا دیتی تو وہ اسے بھی قبول کر لیتے۔ اصل مقصد تو تقسیم تھا جو کروالی اور گورنر جنرل بن کر اپنی وکالت کی فیس وصول کر لی۔ انگریز اگر تقسیم سے بالکل ہی انکار کر دیتے تو جناح صاحب نے اس پر بھی صبر شکر ہی کرنا تھا، اس نے ہتھیار تو نہیں اٹھانے تھے اور نہ ہی اس طرح کی اس نے کوئی تیاری کی تھی۔ موصوف فرماتے ہیں:

> ”قیام پاکستان کے بعد ہمارے ہاں یکے بعد دیگرے مارشل لا نافذ کیے گئے تو ان کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ملک قائم رہا اور جمہوریت کے نام پر جب انتخابات کروائے گئے اور جمہوریت کا صرف نام ہی لیا گیا کہ ملک دولخت ہو گیا۔“

یہ بھی ایک طرح سے موصوف کا اعتراف ہی ہے کہ جناح صاحب نے جن لوگوں کو اپنی سیاسی ٹیم میں شامل کیا تھا وہ اس قدر نااہل تھے، یا وہ سب کے سب پانچ سال کے اندر ہی فوت ہو گئے، کہ ملک نہ چلا سکے اور بالآخر فوج نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ دنیا کے دیگر ممالک تو جمہوریت سے مضبوط ہوتے ہیں اور پاکستان ہی ایسا منفرد ملک ہے جسے جمہوریت کمزور کرتی ہے اور فوجی اقتدار اِسے مضبوط کرتا ہے جس نے اسے امریکا کا طفیلی ملک بنا دیا ہے۔ لیکن کیا یہ ملک اب بھی وہی ہے۔ اس کا رقبہ بھی اتنا ہی ہے۔ اس کی سرحدیں بھی وہی ہیں جو 15 اگست 1947ء کی صبح کو

تھیں؟ یہ جیالے دانش وروں ہی کا حوصلہ ہے جو کہہ رہے ہیں کہ ”مارشل لا کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ملک قائم رہا“ وہ بھی کوئی ملک ہوتا ہے جسے صرف فوجی اقتدار ہی قائم رکھ سکے۔ موصوف نے فرمایا:

> ”نور محمد قریشی صاحب بھارت کے سیاسی نظام سے مرعوب دکھائی دیتے ہیں۔ شاید وہ نہیں جانتے کہ بھارت میں مارشل لا نہیں آیا اور وہاں جمہوریت کا تسلسل ہے مگر بھارت میں انسانی حقوق کی پاسداری نہیں کی جاتی۔“

موصوف کے کہنے کا مطلب کیا یہ ہے کہ پاکستان میں تو انسانی حقوق کے دریا رواں ہیں؟ جبکہ ورلڈ جسٹس پراجیکٹ کی ایک رپورٹ نوائے وقت میں شائع ہوئی ہے، جس میں پاکستان کو انسانی حقوق، کرپشن اور انصاف تک رسائی کے حوالے سے بدترین ملک قرار دیا گیا ہے۔

رپورٹ کا متن حسب ذیل ہے۔ پڑھیے:

> ”واشنگٹن (اے ایف پی) ورلڈ جسٹس پراجیکٹ کی طرف سے جاری رپورٹ کے مطابق پاکستان بنیادی انسانی حقوق، کرپشن اور عام آدمی کی انصاف تک رسائی کے حوالے سے بدترین ملک ہے۔ ورلڈ جسٹس پراجیکٹ کی 35 ممالک میں رول آف لا کے حوالے سے کی گئی 3 سالہ سٹڈی رپورٹ میں نو کیٹیگریز کو بنیاد بنایا گیا تھا جن میں کرپشن، واضح اور مضبوط قوانین، اوپن گورنمنٹ، انصاف تک رسائی و دیگر شامل ہیں۔ رپورٹ کے مطابق رول آف لا کے حوالے سے پاکستان کی ہر انڈیکس میں پوزیشن نچلی ترین سطح کے قریب پائی گئی جبکہ تین کیٹیگریز جن میں بنیادی انسانی حقوق، کرپشن اور انصاف تک رسائی شامل ہیں کے حوالے سے پاکستان بدترین ملک ہے۔ رپورٹ کے مطابق موثر حکومت سازی کے حوالے سے رینکنگ میں سویڈن اور ہالینڈ سرفہرست ہیں۔ بنیادی حقوق اور موثر کریمنل جسٹس سسٹم کی رینکنگ میں آسٹریا پہلے نمبر پر ہے۔ امریکا کسی کیٹیگری میں ٹاپ پوزیشن حاصل نہیں کر سکا، تاہم شہری آزادیوں کے حوالے سے وہ تیسرے نمبر پر ہے۔ ورلڈ جسٹس پراجیکٹ سابق امریکی وزیر خارجہ میڈیلین البرائیٹ اور سابق آئرش صدر میری رابنسن و دیگر نے تشکیل دیا تھا۔“(1)

کیا موصوف واقعی اس قدر بے خبر ہیں کہ ان کو معلوم ہی نہیں کتنے ہی لوگوں کو ان کے گھروں سے اٹھا کر بغیر کسی عدالتی کارروائی کے امریکا کے حوالے کر دیا گیا؟ 1996ء میں ایک بلوچی نوجوان ایمل کانسی کی امریکا حوالگی پر ایک امریکی اٹارنی جنرل نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستانیوں کا کیا ہے، وہ تو ڈالروں کے بدلے اپنی ماں کو بھی بیچ دیتے ہیں۔(2) بعد میں ایک بے گناہ عفت مآب ماں ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو ڈالروں کے عوض امریکا کے حوالے کر کے ثابت کر دیا کہ پاکستانی واقعی اتنے ہی بے غیرت و بے حمیت ہیں۔

لیگی قلم کار پروفیسر سید محمد اسرار بخاری روزنامہ نوائے وقت لاہور کے معروف کالم ''سرراہے'' میں اعتراف کرتے ہیں:

''امریکا میں غیر قانونی طور پر قید ڈاکٹر عافیہ صدیقی کی بہن فوزیہ صدیقی نے کہا ہے کہ ''ہم منتظر ہیں کوئی محمد بن قاسم اٹھے اور عافیہ کو رہا کرائے۔''

یہاں تو سارے میر جعفر و میر صادق ہیں، جو بہنوں کو دشمن کے حوالے تو کر سکتے ہیں، دشمن سے رہا نہیں کروا سکتے۔ محمد بن قاسم ''ہتاں تے نئیں وکدے، توں لبھدی پھریں وچ پاکستان کڑے''۔ یہاں کوئی محمد بن قاسم نہیں ہے، یہاں سارے شیطان بن اوباما پھرتے ہیں اس لیے بہن کو نہ چھڑا کر ان کے دن پھرتے ہیں۔

پاکستان کی تو یہ حالت ہے کہ وہ اپنے فائدے کے لیے پاکستان ایران گیس پائپ لائن کا منصوبہ شروع نہیں کر سکتا، اس لیے کہ جن کے پاس عافیہ قید ہے، ان کا آرڈر نہیں ہے۔ تو وہ بھلا محمد بن قاسم کیسے بن سکتا ہے؟ یہاں کوئی محمد بن قاسم نہیں ہے، یہاں تو سب ظالم بن ظالم ہیں، جو صرف اپنے اوپر ترس کھاتے ہیں، اپنا مفاد سوچتے ہیں اور امریکا کی بات اس لیے مانتے ہیں کہ ان کی کرسی بحال رہے چاہے قوم ساری نڈھال رہے۔''(3)

ہم نے تو بہت سی تنظیموں پر بھارت کو خوش کرنے کے لیے پابندی لگائی ہوئی ہے۔ موصوف اس پر خوش ہو رہے ہیں کہ بھارت میں انسانی حقوق کی پاسداری نہیں کی جاتی۔ موصوف کو اپنی آنکھ کا شہتیر نظر ہی نہیں آتا اور بھارت کے تنکے نظر آ رہے ہیں۔ رانا صاحب موصوف فرماتے ہیں:

''تقسیم ملک کی کسی شق میں تبادلہ آبادی کا درج نہیں تھا۔ تحریری یا زبانی کسی بھی طور پر مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کی پاکستان کی طرف ہجرت کا معاملہ زیر غور نہ آیا تھا۔ قتل و غارت کا یہ سلسلہ آناً فاناً شروع ہوا اور بے قابو ہوتا چلا گیا۔''

فرقہ وارانہ فسادات، جس کے نتیجہ میں تبادلہ آبادی ہوا، اس لیے نہیں ہوا کرتے کہ ایسا ہونا کسی شق میں درج ہوتا ہے۔ لیکن موصوف تو بالکل ہی جیالے نکلے۔ فرقہ وارانہ فسادات اور ان کی شدت کا انحصار مختلف فرقوں کے باہمی تعلقات پر ہوتا ہے نہ کہ زبانی یا تحریری شقوں پر۔ جناح صاحب اور ان کی جماعت گزشتہ نصف صدی سے جس فرقہ وارانہ منافرت کی سیاست کر رہی تھی یہ فسادات تو اس کا منطقی نتیجہ تھے۔ جناح صاحب نے برصغیر کے احمق مسلمانوں کو یہ باور کروا دیا تھا کہ برصغیر کے غیر مسلم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ دعوت نہیں ہیں، بلکہ ان کے دشمن ہیں اور مسلمان بھی صرف پیدائشی مسلمان ہوتا ہے کوئی شخص مذہب تبدیل کر کے مسلمان نہیں ہو سکتا، لہٰذا تمھاری نجات اسی میں ہے کہ جہاں اتفاق سے تمھاری اکثریت ہے ان علاقوں کو علیحدہ کروا لو اور جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کو بھول جاؤ۔ اس طرز سیاست کا یہی نتیجہ ہو سکتا تھا جو ہوا۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ جناح صاحب کے پاس نہ تو بصیرت تھی نہ ہی بصارت کہ وہ اندازہ کر لیتے کہ ان کے اختیار کردہ طرز سیاست کا یہ نتیجہ نکلے گا جو نکلا۔ لیکن وہ بھی کوئی قائد ہوتا ہے جو دس بیس سال آگے نہ دیکھ سکے؟ موصوف کا یہ فرمانا کہ ''قتل و غارت کا یہ سلسلہ آناً فاناً شروع ہوا'' واقعتاً بھی غلط ہے۔ جناب قدرت اللہ شہاب نے اپنی خودنوشت آپ بیتی شہاب نامہ کے صفحہ 265 تا 268 پر بیان کیا ہے کہ انھوں نے اس سرکلر کی نقل جناح صاحب کو اڑیسہ سے دہلی لا کر دی تھی جس میں مسلمانوں کو غیر مسلح کرنے کا منصوبہ تھا لیکن یہ علم میں آنے کے باوجود جناح صاحب نے مسلمانوں کے تحفظ کے لیے ایک تنکا تک نہیں توڑا تھا کیوں کہ مسلمانوں کی جان و مال و آبرو کا تحفظ جناح صاحب کی وکالت میں شامل ہی نہیں تھا۔

کوئی صاحب تسلیم کریں یا نہ کریں حقیقت بہر حال یہی ہے کہ جناح صاحب بصیرت و بصارت سے کلیتاً محروم تھے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے بصیرت و بصارت عطا کی تھی ان کو بہت پہلے اندازہ ہو گیا تھا کہ جناح صاحب کی طرز سیاست کا نتیجہ کیا ہوگا۔ میں اس مقصد کے لیے مفکر احرار چودھری افضل حق کی کتاب ''پاکستان اور اچھوت'' کا حوالہ دوں گا جو 1941ء میں

شائع ہوئی تھی۔ 23 مارچ 1940ء کی قرارداد کے حوالے سے وہ تحریر فرماتے ہیں:

"جناح ایک ہوشیار سیاست دان ہے اور اس نے ہندستان کی دو بڑی قوموں کی چپقلش سے پورا فائدہ اٹھایا ہے اور زخم پر پھاہا رکھنے کی بجائے خنجر سے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا مناسب سمجھا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ مسلم لیگی رہنما قرارداد لاہور کے منطقی نتائج اخذ نہ کریں مگر تحریک شروع ہو چکی ہے۔ موجودہ حالات کو دیکھ کر یہ نتیجہ بہ آسانی نکالا جاسکتا ہے کہ آئندہ اختلافات اتنے بڑھ جائیں گے کہ گزشتہ فرقہ وارانہ فسادات مستقبل کے فسادات کے سامنے ماند پڑ جائیں گے۔"(4)

یہ ہوتی ہے بصیرت اور بصارت جس سے جناح صاحب بالکل محروم تھے۔ جناح صاحب اگر وکالت کی بجائے قیادت کر رہے ہوتے تو ان کو بھی معلوم ہو جاتا کہ ان کی طرز سیاست کے نتیجے میں تقریباً پندرہ لاکھ مسلمان قتل ہو جائیں گے اور کم وبیش نوے ہزار مسلمان عورتیں بے آبرو ہو جائیں گی۔ رانا صاحب موصوف درست فرماتے ہیں کہ اس میں جناح صاحب کیا کر سکتے تھے۔ قتل کے ملزم کے وکیل کو صفائی کی بحث کے دوران میں اگر کوئی یہ بتادے کہ ملزم اگر بری ہو گیا تو مقتول کے ورثا اسے جیل سے باہر نکلتے ہی قتل کر دیں گے تو وہ عدالت سے یہ تو نہیں کہتا کہ ملزم کو بری نہ کیا جائے بلکہ اسے عمر قید کی سزا دے دی جائے۔ وہ ملزم کو بری کروانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا کیوں کہ اس کو بری کروانا اس کی ذاتی کامیابی ہوتی ہے۔ یہ اس کا مسئلہ ہی نہیں ہوتا کہ جیل سے رہائی کے بعد اس ملزم پر کیا گزرتی ہے۔ برصغیر کی تقسیم جناح صاحب کی ذاتی کامیابی تھی۔ یہ اس کا مسئلہ ہی نہیں تھا کہ اس کے نتیجہ میں برصغیر کے مسلمانوں پر کیا گزرتی ہے۔ رانا صاحب فرماتے ہیں:

"اہل پاکستان کو چاہیے کہ وہ تاریخ کا مطالعہ کریں اور بتائیں کہ سقوط بغداد کی کیا وجوہات تھیں اور لاکھوں مسلمانوں کی جو چنگیز خان اور ہلاکو خان کے ہاتھوں قتل ہوئے ان کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔"

حیرت ہے کہ سقوط بغداد اور ہلاکو اور چنگیز کے حملوں کا حوالہ موصوف نے کس طرح دے دیا؟ سقوط بغداد میں جو مسلمان قتل ہوئے اس کی ذمہ داری یقیناً اس وقت کے حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے اور مسلمانوں نے کبھی ان کا نام احترام سے نہیں لیا۔ لیکن کوئی بتائے کہ مشرقی پنجاب میں

کس ہلاکو نے حملہ کر دیا تھا۔ ہلاکو نے قتل کرنے سے قبل کسی سے دریافت نہیں کیا تھا کہ وہ مسلمان ہے یا غیر مسلم۔ نادر شاہ نے بھی دہلی میں قتل عام کا اپنے سپاہیوں کو حکم دیتے ہوئے یہ نہیں کہا تھا کہ کسی شخص کو قتل کرنے سے قبل اس کا مذہب معلوم کر لینا۔ لیکن مشرقی پنجاب میں صرف اور صرف مسلمانوں کو قتل کیا گیا اور مسلم خواتین کو بے آبرو کیا گیا تو اس کی ذمہ داری جناح صاحب اور ان کے رفقا پر کیوں نہ ڈالی جائے جو مسلمانوں کی قیادت کر رہے تھے۔ مشرقی پنجاب میں کسی ہلاکو خاں نے حملہ نہیں کیا تھا، بلکہ پندرہ لاکھ مسلمانوں کو قتل کرنے والے اور نوے ہزار مسلمان عورتوں کو بے آبرو کرنے والے وہ لوگ تھے جو صدیوں سے ہمارے ساتھ مل کر رہ رہے تھے۔ جن کے ساتھ ہمارے دوستانہ معاشرتی تعلقات تھے۔ ہم ایک دوسرے کی شادی غمی میں شریک ہوتے تھے۔ ہمارا دین، ہماری تہذیب و معاشرت اور ہماری زبان وادب غرض ہر چیز ہندوؤں پر ہر طرح سے حاوی تھی، ہمیشہ ہندو ہی مسلمان ہوتے تھے، 14 سو سال کی تاریخ میں ایک مسلمان بھی ہندو نہیں ہوا، حتیٰ کہ 1947ء کے بعد بھی کوئی ایک مسلمان بھی ہندو نہیں ہوا۔ 47ء کے بعد بھی ہندستان میں ہندو ہی بہ کثرت اسلام قبول کر رہے ہیں۔ ان لوگوں نے کم وبیش ایک ہزار سال تک ہماری غلامی کو بخوشی قبول کیے رکھا اور اگر موصوف نے بھی تاریخ کا مطالعہ کر رکھا ہے (جس کا مشورہ موصوف نے دیا ہے) تو ان کو معلوم ہو گا کہ مغل بادشاہ اکبر کا آرمی چیف راجہ مان سنگھ ایک ہندو راجپوت تھا۔ وہ لوگ جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ دعوت تھے ہم نے انھیں اپنا دشمن تصور کر لیا۔ یہ لوگ ہمارے ساتھ اس وقت بھی شامل تھے جب ہم نے 1857ء میں مغل بادشاہ کا اقتدار بحال کرنے کی جدوجہد کی تھی۔ یہ جناح صاحب اور ان کے ہم نواؤں کی طرز سیاست کا ہی نتیجہ تھا کہ مشرقی پنجاب میں پندرہ لاکھ مسلمان قتل ہوئے اور نوے ہزار مسلمان عورتیں بے آبرو ہوئیں۔ اگر 1941ء میں چودھری افضل حق کو یہ نظر آ جاتا ہے کہ اس طرز سیاست کے نتیجہ میں ایسے فرقہ وارانہ فسادات ہوں گے کہ ماضی میں اس کی مثال نہیں ملے گی تو جناح صاحب کو بھی اگر وہ صاحب بصیرت اور صاحب بصارت ہوتے تو یقیناً نظر آ جاتا۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ 1947ء میں جو فسادات مشرقی پنجاب میں ہوئے اور مسلمانوں کا جو حشر ہوا، کیا ماضی میں اس کی کوئی مثال ملتی ہے؟ اگر نہیں تو جناح صاحب کو بے بصیرت اور بے بصارت تسلیم کرنے میں کسی کو تردد کیوں ہے؟

حوالہ جات

(1) روزنامہ نوائے وقت لاہور/15 اکتوبر 2010ء

(2) پاکستانیوں کے بارے میں امریکی اٹارنی جنرل کے اشتعال انگیز ریمارکس پر معروف ادیب اور صحافی جناب عنایت اللہ نے ''ڈالروں کی خاطر'' کے عنوان سے اپنے جریدہ ماہنامہ حکایت لاہور کا جو اداریہ لکھا، ہم اُسے ذیل میں من وعن نقل کر رہے ہیں:

''سنا آپ نے بھی، امریکہ کے ایک اٹارنی جنرل نے بھری عدالت میں کہا ہے کہ ایمل کانسی کی گرفتاری کے لیے پاکستان کو 30 لاکھ ڈالر کیوں ادا کیے گئے، پاکستانی تو ڈالر کی خاطر اپنی ماں بیچ دیا کرتے ہیں۔

پاکستان سراپا احتجاج بن گیا۔ جلوس نکلے، مظاہرے ہوئے، ٹائر اور امریکی پرچم جلائے گئے، سیاسی اور دینی لیڈروں کو بیان بازی کا موقع مل گیا۔ ہماری سرکار نے اسلام آباد میں امریکی سفیر کو طلب کر کے سرکاری احتجاج اس مطالبے کے ساتھ پیش کیا کہ اٹارنی جنرل پاکستان سے معافی مانگے اور اپنے الفاظ واپس لے۔

آج امریکی وزیر خارجہ نے ہماری سرکار سے کہہ دیا ہے کہ اس امریکی اٹارنی جنرل کو معافی مانگنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جائے گی لیکن امریکی حکومت پاکستان سے معذرت نہیں کرے گی۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ توہین آمیز الفاظ واپس لے بھی لیے گئے تو کیا ہو جائے گا؟ کسی کو ماں، بہن کی انتہائی فحش گالی دے کر کہہ دو کہ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں تو کیا یہ اس کی عزت افزائی ہوگی؟ یہ ایسے ہی ہے کہ تیر چلا کر کسی کو گھائل کر دو پھر اُس کے جسم سے تیر نکال کر کہہ دو کہ میں نے اپنا تیر واپس لے لیا ہے۔

ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو، میرے عزیز پاکستانیو! حقائق سے نظریں نہ چراؤ۔ احتجاج اور مظاہروں کا رُخ امریکہ سے موڑ کر اپنے ان سابق اور حاضر حکمرانوں کی طرف کر دو جنھوں نے ڈالروں کی خاطر اپنی مائیں بیچی ہیں، پاک سرزمین کی عزت و آبرو یہودی ساہوکاروں کے ہاں گروی رکھ دی ہے۔

قرآن کی سرزمین کی آبرو ماں، بہن کی عصمت سے زیادہ مقدس ہوتی ہے۔

امریکہ کی نظروں میں ہم بھک منگے ہیں۔ ہمیں وہ وقت یاد ہے جب امریکہ نے پہلی بار پاکستان کو

گندم کی خیرات دی تھی۔ کراچی سے یہ گندم جن مال گاڑیوں سے ملک کے دوسرے حصوں تک پہنچائی جاتی تھی ان کی ہر بوگی کے دونوں طرف رنگین پوسٹر چسپاں ہوتے تھے: ''Thank You America'' اور اُردو میں ''امریکہ تیرا شکریہ'' لکھا ہوتا تھا۔ گاڑیوں کے علاوہ یہ پوسٹر شہروں کی دیواروں پر اور سرکاری دفتروں میں بھی لگے نظر آنے لگے تھے۔ ان پر ایک ہاتھ امریکہ کا اور ایک ہاتھ پاکستان کا مصافحہ کی پوزیشن میں دکھائے گئے تھے۔ امریکہ کی آستین پر امریکی پرچم اور پاکستان کی آستین پر پاکستانی پرچم تھا۔ پاکستانی پرچم کی اس سے زیادہ توہین اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس پوسٹر کا مطلب یہ تھا کہ امریکہ گندم نہ دیتا تو پاکستانی فاقوں مر جاتے۔

اس کے بعد ہمارے لیڈرانِ کرام امریکہ کو اَن داتا بناتے چلے گئے، ڈالروں کی خاطر دھرتی ماں کی آبرو امریکہ کے قدموں میں رکھتے چلے گئے اور نوبت یہاں تک پہنچا دی کہ ہماری ملکی پالیسیاں امریکہ کی منشا اور بجٹ امریکہ کے مفادات کے مطابق بنتے ہیں۔

رمزی یوسف کی نشاندہی پاکستانی مخبروں نے ڈالروں کی خاطر کی تھی اور بے نظیر کی حکومت نے ڈالروں کی خاطر اسے امریکہ کے حوالے کیا تھا۔ ایمل کانسی کو بھی ڈالروں کی خاطر پاکستانیوں نے پکڑوایا اور نواز شریف کی حکومت نے اسے امریکہ کی ایف بی آئی کے حوالے کیا ہے۔

یہ دو واقعات اس لیے سب کی نظروں میں آگئے کہ ان کے چرچے اخباروں میں ہو گئے۔ ڈالروں کی خاطر پاکستانیوں کی غداری اور ایمان فروشی کے واقعات کی فہرست خاصی لمبی ہے۔ امریکہ کے رسوائے زمانہ جاسوس اور تخریب کار ادارے سی آئی اے کے ایجنٹوں اور مخبروں کی خفیہ فہرست تک اگر آپ رسائی حاصل کر سکیں تو آپ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آئے گا۔ اس میں ایڈیٹر بھی ہیں، سینئر صحافی بھی، پروفیسر اور سیاسی لیڈر بھی، ہر شعبے کے افراد کے علاوہ دو چار علمائے دین کے نام بھی ملیں گے۔ ہمارے ایک دو زندہ، ایک دو مردہ صدر اور وزیر اعظم سی آئی اے کے باقاعدہ ایجنٹ تھے۔

کسی واقف کار سے پوچھیں کہ گزرے ہوئے پچاس برسوں میں ہمارے سربراہانِ مملکت نے ڈالروں کی خاطر امریکہ کو اپنے ملک میں کیسی کیسی توہین آمیز اور شرمناک مراعات دی ہیں۔ اہلِ پاکستان احتجاج اور مظاہروں کی بجائے اپنی قومی غیرت کو بیدار کریں، اگر مر ہی نہ گئی ہو تو!''

ماہنامہ حکایت لاہور/اگست 1997ء/ص 11-12

(3) روزنامہ نوائے وقت لاہور/25 جون 2010ء

(4) پاکستان اور اچھوت/ص 7

10

ہندستان پاکستان کے معاشی حالات پر جب بھی گفت گو ہوتی ہے، ہمارے حضرات اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ ہندستان میں غربت، بھوک، افلاس زیادہ ہے۔ ہندستان کی نسبت پاکستان میں خوشحالی ہے۔ یہاں لوگ اچھا پہنتے ہیں، اچھا کھاتے پیتے اور اچھی زندگی گزارتے ہیں۔ یہ باتیں وہی لوگ کرتے ہیں جو اصل حقائق سے بے خبر ہیں۔ ذیل میں ہم اس موضوع پر کچھ عرض کرتے ہیں اور چند حوالے پیش کرتے ہیں۔

جناب ایم. اقبال لیگی ذہن رکھتے ہیں اور جناح صاحب کے بے حد شیدائی ہیں۔ تقسیم ہند سے قبل ان کے والد دہلی میں مقیم تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت بھی وہیں ہوئی۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ دہلی میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے گئے اور وہاں مقیم رہے۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی گونج کے نام سے لکھی تھی جو 1985ء میں ماڈل ٹاؤن، لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں وہ ہندستان پاکستان کے معیارِ زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آزادی سے پہلے کے مقابلے میں ایک عام ہندستانی کا معیارِ زندگی بس ذرا سا بلند ہوا ہوگا۔ ورنہ وہ لوگ اسی حال میں ہیں جس حال میں آزادی سے پہلے تھے۔ ہندستان کے سیاسی رہنماؤں اور ماہرین اقتصادیات نے سوچا کہ ملک میں پہلے بھاری صنعتیں لگائی جائیں، چھوٹی اور عام ضروریات کی صنعتیں بعد میں۔ اس طرح پہلے چند سالوں میں تکلیف تو ہوگی لیکن پہلی نسل کی قربانیوں کا ثمر آنے والی نسلوں کو ملے گا۔ پر ہندستان میں غربت کا وہی حال ہے۔ لوگ اب بھی فٹ پاتھوں پر سوتے

ہیں۔اَن گنت لوگ نیم برہنہ ہیں۔ان کی خوراک غذائیت سے خالی۔تین چار نسلیں گزرنے کے باوجود ایک عام ہندستانی کی حالت خصوصاً غریبوں کی حالت بہتر نہیں ہوئی۔جب ہم نے بیشتر ہندستانیوں کے مرجھائے ہوئے چہروں کو دیکھا تو اللہ کا شکر بجالائے کہ اپنے یہاں کا غریب ترین مزدور بھی پیٹ بھر کر روٹی تو کھاتا ہے۔لباس بھی مناسب پہنتا ہے۔معلوم نہیں یہ اللہ کی نعمت اور احسان ہے یا امریکا کے قرضوں کی فراوانی۔ہم قرضدار ہونے کا خیال تک دل میں نہیں لاتے۔آنے والی نسلیں جو نصیب میں ہوگا بھگتیں گی۔ہم تو دنیا کے مزے لوٹ لیں۔مغربی سیاسی غلبہ،اقتصادی استعمار کی صورت اختیار کر چکا ہے۔اقوام مشرق پہلے کی طرح اب بھی مجبور اور بے بس ہیں۔فرنگ کی رگ جان پنجۂ یہود میں ہے۔لیکن ہماری رگ رگ کو فرنگیوں نے دبوچ رکھا ہے۔"(1)

ایم.اقبال کی مذکورہ کتاب کے آخری پیراگراف کی عبارت یہ ہے:

"بھارت ٹیکنالوجی کے میدان میں ہم سے کہیں آگے ہے۔ہتھیاروں کی دوڑ میں وہ ہمیں کبھی کا پچھاڑ چکا۔تحصیل علم میں بھی وہ ہم سے آگے ہے۔زراعت کے شعبے میں بھی بہت ترقی ہوئی ہے۔جمہوریت کا جس کے متعلق قائداعظم نے کہا تھا کہ مسلمانوں کے رگ و ریشہ میں ہے اور ہندو ذہنیت سے کوسوں دور۔وہی جمہوری نظام وہاں آزادی کے وقت سے چل رہا ہے۔بھارتی کفایت شعار ہیں۔نمود و نمائش سے اجتناب کرتے ہیں۔بیوروکریسی سیاسی راہنماؤں کے تابع ہے۔ہندستان میں یہ سب کچھ ہے لیکن اس کے باوجود وہاں کی نصف آبادی ایک وقت کی روٹی کو ترستی ہے۔نیم برہنہ لوگ اپنے مدقوق چہرے لیے گلیوں اور بازاروں میں بھیک مانگتے دکھائی دیتے ہیں۔ملک لامتناہی مسائل کا شکار ہیں۔صوبہ پرستی بھی ہے۔اقلیتوں کے ساتھ ناروا سلوک بھی ہے۔زبان کے مسائل بھی ہیں اور نظریاتی اختلافات بھی۔لیکن اس کے باوجود نظم و نسق کی گاڑی استوار ہے اور سرکار کے روزمرہ کے کاموں میں خلل نہیں پڑا۔وہاں ہر سرکاری ملازم چھوٹا ہو یا بڑا جب ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچتا ہے تو بلاتخصیص ریٹائر کر دیا جاتا ہے چاہے وہ پاکستان کو دولخت کرنے والا جنرل مانک شا

اور جنرل اروڑہ ہی کیوں نہ ہو۔ستر کروڑ کی آبادی اور بے شمار مسائل کا یہ ملک ایک نظام کے تحت چلے جا رہا ہے۔بھارتی مسلمانوں کی ایک حقیر سی اقلیت کے ایک نمائندہ نے جو اونچے عہدے پر فائز ہے،ایک مرتبہ طنزاً کہا تھا کہ تمھاری خوشحالی قرضوں کی مرہونِ منت ہے۔تم آج کے آرام کے لیے اپنا کل داؤ پر لگا رہے ہو اور اپنے آرام کی خاطر آنے والی نسلوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رہے ہو۔مجھے ان فلسفیانہ موشگافیوں سے کوئی علاقہ نہیں۔میں تو یہ جانتا ہوں کہ میرا اہم وطن صحت مند ہے۔نسبتاً خوشحال ہے۔اسے صحیح راہبر میسر آ جائے،کوئی عظیم مقصد سامنے ہو،تو اسے حاصل کرنے کی ہمت اور حوصلہ بھی رکھتا ہے۔انھی خیالات مین غلطاں و پیچاں تھا کہ لاہور کا ہوائی اڈہ آ گیا۔"(2)

ہندستان پاکستان کے حالات اور معیارِ زندگی کے بارے میں ایک پاکستانی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ ہمارے لیے بصیرت افروز بھی ہیں اور باعث عبرت و تشویش بھی۔ ہندستانی قیادت نے اپنے ملک کے لیے جو منصوبہ بندی کی، جس کا ذکر ایم.اقبال نے اپنی کتاب میں کیا، اس سے ہندستان کا ابتدائی کٹھن دور تو جیسے تیسے کٹ گیا، لیکن حال بہتر ہو رہا ہے اور ہو گیا ہے۔ان کا مستقبل تابناک معلوم ہوتا ہے۔ہمارے قائدین (مسٹر جناح اور مسٹر لیاقت علی خاں) نے پاکستان کو پہلے دن سے ہی امریکا کی گود میں ڈال دیا تھا۔گویا "انھوں نے اپنے آرام کے لیے قوم کا کل داؤ پر لگا دیا تھا اور اپنے آرام کی خاطر آنے والی نسلوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا تھا۔" جس کے نتیجے میں آج پاکستان بڑی طاقتوں اور ان کے مالی اداروں کے پاس گروی رکھا ہوا ہے۔ پاکستان کی ساڑھے اٹھارہ کروڑ کی آبادی کا ہر فرد تقریباً ساٹھ ہزار روپے کا مقروض ہے۔ پاکستان نے ماضی میں تو غیر ملکی سودی قرضوں سے عیاشی کی، اچھا کھایا پیا اور پہنا، لیکن آج پاکستان مکمل تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے۔امریکا نے پاکستان کی ناک میں نکیل ڈال رکھی ہے اور اسے تگنی کا ناچ نچا اور اپنے اشاروں پر چلا رہا ہے۔اپنے من پسند فیصلے کروا رہا ہے۔معروف عالمی میگزین دی اکانومسٹ کے ایک حالیہ مضمون میں بتایا گیا ہے کہ پاکستانی فوج کے سربراہ جنرل اشفاق پرویز کیانی کی مدت ملازمت میں تین سال کی توسیع امریکا کی سفارش پر کی گئی ہے۔ ایک جمہوری دور حکومت میں ہوا ہے، ڈکٹیٹر شپ کے دور میں نہیں۔ پاکستان میں 5 رمضان

المبارک مطابق 8 اکتوبر 2008ء کو جو تباہ کن زلزلہ آیا تھا، اس مصیبت کی گھڑی میں بھارت نے امداد کی پیش کش کی تھی جسے پاکستان نے ٹھکرا دیا تھا۔ حالیہ تباہ کن سیلاب کے متاثرین کے لیے بھی انڈیا نے پاکستان کو پچاس لاکھ ڈالر امداد دینے کا اعلان کیا۔ اس پر نوائے وقت نے بہت شور وغوغا کیا اور حکومت کو مشورہ دیا کہ وہ حسب سابق یہ امداد کسی صورت قبول نہ کرے۔ حکومت کی طرف سے انکار کی خبریں آ رہی تھیں، لیکن بعد میں پاکستان نے امریکا کے دباؤ میں آ کر بھارتی امداد قبول کر لی۔ 10 رمضان المبارک 1431ھ مطابق 21 اگست 2010ء کے نوائے وقت لاہور میں یہ خبر بہت نمایاں شائع ہوئی کہ ''دفتر خارجہ کے تحفظات کے باوجود امریکی دباؤ پر پاکستان نے سیلاب زدگان کے لیے 50 لاکھ ڈالر کی بھارتی امداد قبول کر لی۔ بھارتی امداد قبول کرنے کا انکشاف وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی نے بھارتی ٹی وی چینل سے انٹرویو میں کیا۔ انھوں نے انٹرویو میں بھارت کے اس اقدام کو خوش آیند قرار دیا۔'' واضح ہو کہ اس خبر کے ساتھ ہی محترمہ ڈاکٹر شیریں مزاری کا تجزیہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے: ''50 لاکھ ڈالر کی امداد پر کشمیریوں کا خون لگا ہوا ہے۔ جان کیری ڈکٹیشن دینے آئے، حقیر سی امداد قبول کرنا پاکستان کے لیے باعث شرم ہے۔''

مستقبل کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔ آج پاکستان میں ہر روز درجنوں افراد معاشی حالات سے مجبور ہو کر خودکشیاں کر رہے ہیں۔ روزنامہ دن لاہور، 17 ستمبر 2010ء میں پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کی رپورٹ شائع ہوئی ہے جس کا عنوان ہے: ''پاکستان میں ایک ماہ کے دوران 73 خواتین سمیت 225 افراد نے خودکشی کی۔'' رپورٹ کا متن حسب ذیل ہے:

''کراچی (نیوز ایجنسی) گزشتہ ایک ماہ کے دوران ملک بھر میں دو سو پچیس افراد نے خودکشی کی۔ اپنی زندگیوں کا خاتمہ کرنے والوں میں تہتر (73) خواتین بھی شامل ہیں۔ پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے مطابق بیشتر افراد نے تنگدستی اور نامساعد حالات سے تنگ آ کر اپنی زندگی کا خاتمہ کیا۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ گزشتہ ایک ماہ کے دوران ملک بھر میں خودکشی اور اقدام خودکشی کے 351 واقعات رپورٹ ہوئے، تاہم صرف انتالیس واقعات کی ایف آئی آر درج ہوئیں۔ رپورٹ کے مطابق صرف سندھ میں غیرت کے نام پر اٹھارہ افراد قتل ہوئے جن میں گھوٹکی کا 8 سالہ بچہ دادن بھی شامل ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ملک بھر میں اکیس خواتین

سمیت ستائیس افراد کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اس تشدد کا شکار ہونے والوں میں ماتلی کا چار سالہ بچہ اور ٹنڈو محمد خان کی پانچ سالہ بچی بھی شامل ہے۔ ماہرین کے مطابق ہر ماہ خودکشی کے واقعات میں اضافہ تشویشناک ہے۔ جس کی ایک بڑی وجہ معاشرے میں عدم برداشت بتائی جاتی ہے۔''(3)

روزنامہ نوائے وقت لاہور میں ایک سپیشل رپورٹ شائع ہوئی ہے، جس کا عنوان ہے: ''سال بھر میں 18 سو غریب سرکاری ملازمین نے خودکشیاں کیں۔ 9 ہزار دہشت گردی کا شکار ہوئے۔ سرکاری ملازمین کے گھروں میں فاقوں کی نوبت آ گئی، جہیز نہ ہونے کی وجہ سے بچیوں کی شادیاں نہیں ہو رہیں۔'' رپورٹ کا متن ملاحظہ فرمائیے:

''لاہور (سپیشل رپورٹر) سرکاری ملازمین کو جتنی تنخواہ ملتی ہے اس میں ایک ہفتہ تک گزارہ ہو سکتا ہے اور ملازمین ادھار لے کر اور فاقہ کشی میں اپنی اور اپنے خاندانوں کی زندگی گزار رہے ہیں اس وجہ سے گزشتہ ایک سال میں ملک بھر میں 1800 غریب سرکاری ملازمین نے مہنگائی سے تنگ آ کر خودکشیاں کی ہیں۔ جبکہ 9 ہزار ملازمین بم دھماکوں میں دہشت گردی کا شکار ہو گئے ہیں۔ سرکاری ملازمین کی بچیوں کی شادیاں نہیں ہو رہی ہیں کہ ان کے پاس جہیز کے پیسے نہیں ہیں جبکہ حکمران آئی ایم ایف اور امریکا کی مرضی کے فیصلے کر کے ملک میں مہنگائی کا سیلاب برپا کر رہے ہیں۔''(4)

مسلم لیگ کی رکن پنجاب اسمبلی محترمہ ثمینہ خاور حیات ملک کی معاشی ابتری کس طرح محسوس کرتی ہیں، ان کا ایک اخباری بیان ملاحظہ ہو:

''لاہور (پ ر) مسلم لیگ (ق) کی رکن پنجاب اسمبلی ثمینہ خاور حیات نے کہا ہے کہ حکمرانوں کی غفلت کی وجہ سے اب تو غریب پیاز سے بھی روٹی نہیں کھا سکتا۔ ایک بیان میں انھوں نے کہا کہ جس ملک میں پیاز 90 روپے کلو ہو جائے وہاں عام آدمی کیا کھائے گا۔ عام آدمی سبزی نہیں خرید سکتا، وہ پھل کیا خریدے گا۔ عوام کے لیے دو وقت کی روٹی کھانا مشکل ہو گیا ہے۔ مسلم لیگ (ن) دعوے کرتی رہی کہ وہ اقتدار میں آ کر 1999ء والی قیمتیں واپس لائے گی، یہاں تو 2008ء کی قیمتوں میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔''(5)

پاکستان میں معاشی بدحالی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ جس کی وجہ سے ملک کی 97 فیصد آبادی فرسٹریشن کا شکار ہوگئی ہے۔ روزنامہ جنگ لاہور کی ایک رپورٹ پڑھیے:

"کراچی (رپورٹ: اعظم علی) ماہرین نفسیات نے کہا ہے کہ گزشتہ دو برسوں کے دوران ملک میں 97 فیصد آبادی میں خطرناک حد تک فوبیک انزائٹی، فرسٹریشن اور ڈپریشن یعنی ذہنی تناؤ، قوت برداشت میں کمی اور خوف میں مبتلا ہوئی ہے جس کی بنیادی وجوہات میں معاشی بدحالی، مسلسل مایوسی، بیروزگاری اور مستقبل کی غیر یقینی صورتِ حال شامل ہیں۔"(6)

پاکستان میں عوام کو دو وقت کی روٹی کے لیے جن حالات و مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے، اس کا بیان بھی تکلیف دہ ہے۔ جسٹس (ر) کے ایم اے صمدانی اپنی آپ بیتی جائزہ میں لکھتے ہیں:

"لاہور میں قیام کے دوران مجھے ایک بزرگ سے ملنے کا شرف حاصل ہوا جو پنجاب کے دانش وروں میں واصف علی واصف کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔ واصف صاحب اپنی شاعری اور صحافت کی وجہ سے بھی مشہور ہیں لیکن میں انھیں ایک بزرگ (یعنی ولی اللہ) کے طور پر جانتا تھا۔ اب وہ اس دارِفانی سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ان کی ایک محفل میں کسی نے ذکر کیا کہ پاکستان میں ہندستان کے مقابلہ میں افلاس کم ہے، پاکستان میں ہر شخص کو کم از کم ایک وقت کی روٹی تو مل ہی جاتی ہے۔ اس بات پر واصف صاحب کے چہرے پر کچھ تکدر کے آثار نمایاں ہوئے اور فرمایا کہ آپ لوگوں نے کبھی سوچا کہ وہ ایک وقت کی روٹی کس قیمت پر ملتی ہے۔ پھر خود ہی تشریح فرمائی کہ عزتِ نفس کی قیمت پر یعنی At the cost of self-respect۔ بزرگوں کی کوئی بات تصدیق کی محتاج تو نہیں ہوتی لیکن اس ضمن میں مَیں اپنے پنجاب کے مشاہدات کی بنا پر تصدیق کرنا چاہوں گا کہ قبلہ واصف صاحب نے کس قدر درست فرمایا۔ میں اس بات کا گواہ ہوں کہ یہاں اکثر افسر یا آجر (Employer) اسی میں اپنی برتری سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے ماتحت کی عزتِ نفس کو مجروح کریں اور ماتحت بھی اس بات کو بوجہ معاشی مجبوری یا بوجہ عادت برداشت کر لیتے ہیں۔ یہ نہایت ہی افسوسناک بات ہے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جب ہم کسی کی عزتِ نفس کو

مجروح کرتے ہیں تو وہ شخص کبھی ہمارا دوست نہیں بن سکتا۔ اگر وہ اپنی شرافت میں ہمیں نقصان نہ بھی پہنچائے تو کبھی فائدہ بھی نہیں پہنچائے گا۔ کسی کی عزتِ نفس کا خیال نہ کرنے اور بے عزتی برداشت کرنے کی عادت نے ہمیں بہت اچھا Subordinate اور بہت برا Boss بنا دیا ہے۔ مزید برآں یہ کہ ماتحتی کو ہم نے غلامی کی حدود میں پہنچا دیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ ہم اب تک اپنی غلامانہ ذہنیت سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے اور خوشامد کو ایک فن کا درجہ دے دیا ہے بلکہ خوشامد میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ ہمیں غلامی سے محفوظ رکھے لیکن آثار کچھ اچھے دکھائی نہیں دے رہے۔ جس فرد میں غیرت نہ ہو، اس میں اور مویشی میں کوئی فرق نہیں اور جس قوم میں غیرت نہ ہو وہ قوم مشکل ہی سے پنپ سکتی ہے۔"(7)

پاکستان کے مجموعی حالات و سانحات پر نوائے وقت کے دو سینئر صحافیوں کی دو تحریریں ذیل میں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جناب سرور منیر راؤ اپنے کالم "سانحات کا سونامی" میں لکھتے ہیں:

"پاکستان دنیا کا واحد خطہ ہے جو آج کل بدترین خبروں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ پاکستانی میڈیا ہو یا دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ، ہر طرف پاکستان کے حوالے سے خیر کی کوئی خبر نہیں۔ دہشت گردی، خودکش حملے، کرپشن، سیلاب سے تباہی، امدادی رقوم میں خرد برد، قومی دولت کی لوٹ مار، میچ فکسنگ، معصوم بچوں کا دن دیہاڑے بربریت سے قتل، پولیس کی سرعام پٹائی، جلاؤ گھیراؤ، حکمرانوں کی کردار کشی، مہنگائی، خوف و ہراس، بیرون ملک پاکستانیوں کی تذلیل غرضیکہ کوئی پہلو ایسا نہیں جہاں ہمارے لیے خیر کی خبر ہو۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ یہ ہے وہ سوال جس کا جواب کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اس کا جواب ہم سب کے پاس ہے۔ آج ہمیں یہ دن کسی ایک فرد یا گروہ کی وجہ سے نہیں دیکھنا پڑا، بلکہ اس کے پس منظر میں تواتر سے ہماری اجتماعی غلطیاں، خودغرضی اور ہوس شامل رہی ہیں۔ ہم نے نہ تو بطور حکمران اور نہ ہی بطور قوم ایسا لائحہ عمل اختیار کیا ہے کہ ہم اقوام عالم میں سرخرو ہو سکیں۔ 63 سالہ قومی تاریخ میں نہ تو سیاسی استحکام حاصل ہو سکا اور نہ معاشی۔ نہ تو عوام کی زندگی میں مثبت تبدیلیاں

آئیں اور نہ ہی حکمرانوں نے اپنے وطیرے تبدیل کیے۔ بدقسمتی سے ہمیں یہ احساس بھی نہیں کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور مزید کیا ہوگا۔"(8)

14 اگست 2010ء کو یوم قیام پاکستان کے موقع پر سعید آسی نے "پیارے پاکستان کی پیاری باتیں" کے عنوان سے جو کالم لکھا، اُس کا پہلا اور آخری پیرا ملاحظہ کیجیے:

"آج پیارے پاکستان کی تخلیق کا 63واں سال ہے۔ اس پیارے پاکستان کے جنم دن سے اب تک بے شمار ایسے سوالات ذہنوں میں جنم لے چکے ہیں جو جواب کی تسلی سے ابھی تک آشنا نہیں ہو پائے۔ ایک آفاقی سوال جو ہر وقت اور ہر لمحے اٹھتا رہتا ہے وہ یہ ہے کہ اس ملک کا کیا بنے گا۔ شروع دن سے اب تک اس سوال کا یہی جواب ملتا ہے کہ اللہ خیر کرے گا۔ اگر یہ سوال آج 63 سال بعد بھی ذہنوں میں کلبلا رہا ہے تو اس سے سادا سی مراد تو یہی ہے کہ ذات باری تعالیٰ کی اس پیارے پاکستان پر اب تک خیر کی نظر نہیں پڑی۔"

"بے شک اس دھرتی کے وسائل اس پر آباد خلقِ خدا کی پہنچ سے دور کر دیے گئے ہیں اور بے شک اس خلقِ خدا کے اقتصادی حالات انگریز اور ہندو کی غلامی والے دور کے ہمارے اقتصادی حالات سے بھی بدتر ہیں۔ بے شک ہم غلامی در غلامی کے شکنجے میں کسے جا رہے ہیں۔ اپنی حمیت، آبرو، آزادی بھی دشمن کے پاس گروی رکھنے کے عادی ہو گئے ہیں اور بے شک غربت، افلاس، مہنگائی، بے روزگاری اور بجلی پانی سے محرومی ہمارے مقدر کا حصہ بنا دی گئی ہے۔ بے شک یہاں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی گزارنے والے مجبور و مقہور انسان اپنی بے چارگی سے عاجز آ کر خودکشیاں، خودسوزیاں کر رہے ہیں اور تنگ آمد بجنگ آمد کی ٹھانے بیٹھے ہیں اور بے شک ڈرون حملوں سے گھائل ہونے والی ہماری خودداری کو آخری سانس تک پہنچانے کی ملی بھگت چل رہی ہے، ہمیں مالِ غنیمت سمجھ کر لوٹنے والوں کو ہی بالآخر کھاتے، ہلکان ہوتے اپنے اگلے عزائم سے تائب ہونا پڑے گا کیونکہ ہم تو اُجڑ کر بھی آباد رہنے کے عادی ہو چکے ہیں، آج ہمیں اپنے پیارے وطن کے جنم دن پر اچھی اچھی پیاری پیاری باتیں کرنی چاہئیں۔ وہ باتیں جو ہماری معاشرت کی عکاسی کرتی ہیں اور مسائل میں گھر کر بھی گزرتی جانے

والی ہماری زندگیوں کی زندہ دلی کی گواہی دے رہی ہیں۔ آج کے دن کے لیے پیاری باتوں کی خوشبو لیے ایک ایس ایم ایس ملاحظہ فرمائیے اور اپنی آزادی کا جشن منائیے:

آؤ باتیں کریں

لائٹ چلی گئی ہے لائٹ آ گئی ہے
لائٹ جانے والی ہے لائٹ آنے والی ہے
لائٹ نہیں آئی لائٹ نہیں گئی
لائٹ جا بھی سکتی ہے لائٹ آ بھی سکتی ہے
لائٹ ڈم آ رہی ہے لائٹ تیز آ رہی ہے
لائٹ آ کیوں نہیں رہی لائٹ جا کیوں نہیں رہی
"آ گئی جے" آؤ باتیں کریں
پیارے پاکستان کی پیاری باتیں" (9)

پاکستان کئی سالوں سے شدید ترین معاشی بحران کا شکار ہے۔ آٹا، چینی ناپید ہے۔ سبزیاں، آلو، پیاز، ٹماٹر کی قلت ہے۔ پیٹرول اور سی این جی کی کمی ہے۔ ادویات نہیں ملتیں۔ پانی کا مسئلہ روز بہ روز پیچیدہ سے پیچیدہ ہو رہا ہے۔ ضروریات زندگی کی اور بے شمار چیزیں ہیں جو دستیاب نہیں۔ ان میں سے بیش تر چیزیں ہم ہندستان سے درآمد کر کے اپنی ضرورت پوری کر رہے ہیں۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور میں ایک خبر بعنوان: "واہگہ کے راستے بھارت سے سبزیوں کی درآمد میں پھر اضافہ۔ آلو، پیاز، ٹماٹر کے روزانہ 60 سے 80 ٹرک پاکستان پہنچ رہے ہیں" شائع ہوئی، جس کا متن یہ ہے:

"لاہور (خبرنگار) بھارت سے سبزیوں کی درآمد میں ایک بار پھر اضافہ ہو گیا ہے۔ بھارت سے واہگہ بارڈر کے راستے روزانہ 60 سے 80 ٹرک آلو، پیاز اور ٹماٹر لے کر پاکستان پہنچ رہے ہیں۔ گزشتہ روز بھی 60 ٹرک ٹماٹر اور 7 اور 8 آلو اور اتنے ہی ٹرک پیاز لے کر پاکستان داخل ہوئے۔"(10)

اسی روز کے نوائے وقت میں ایک اور خبر شائع ہوئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ بھارت اور تھائی لینڈ سے درآمد ہزاروں ٹن مضرِ صحت چینی برآمد، سرکاری گودام سیل کر دیا گیا۔ پورٹ قاسم پر

لائی گئی چینی ٹی سی پی کے گوداموں میں بھارتی تھیلوں سے منتقل کی جارہی تھی۔خبر کا متن یہ ہے:

''ایف آئی اے نے بھارت اور تھائی لینڈ سے درآمد کی گئی ہزاروں ٹن مضر صحت چینی برآمد کر کے ٹی سی پی کے گودام سیل کر دیے ہیں۔ریڈیو نیوز نے نجی ٹی وی کے حوالے سے کہا ہے کہ بھارت سے درآمد زائد المیعاد چینی پورٹ قاسم پر چار جہازوں کے ذریعے لائی گئی تھی اور وہاں گوداموں میں بھارتی چینی تھائی لینڈ کے تھیلوں میں بھری جارہی تھی۔ایف آئی اے نے تھیلے اور مہریں برآمد کر کے چینی لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے بھیج دی ہے کیونکہ چینی کی میعاد 2009ء میں ختم ہو چکی ہے۔جی این آئی کے مطابق ایف آئی اے حکام کا کہنا ہے کہ چینی انسانی صحت کے لیے مضر ہے جبکہ دوسری جانب چیئرمین ٹی سی پی نے میڈیا سے گفتگو میں کہا ہے کہ چینی بین الاقوامی معیار کے مطابق اور پاکستان سٹینڈرڈ کوالٹی کنٹرول کے ادارے سے تصدیق شدہ ہے۔''(11)

بھارت سے سبزیوں کی درآمد میں ڈیڑھ ماہ بعد مزید اضافہ ہوا، اس حوالہ سے نوائے وقت میں ہی شائع ہونے والی خبر کا متن ملاحظہ فرمایئے:

''لاہور (خبرنگار) بھارت سے سبزیوں کی درآمد میں اچانک بے حد اضافہ ہو گیا ہے اور بھارت سے ٹماٹروں کے بعد ادرک، لہسن، سبز مرچ اور شملہ مرچ بھی درآمد ہونے لگی ہیں۔گزشتہ روز واہگہ بارڈر پر 200 ٹرک ادرک، لہسن، ٹماٹر اور دیگر سبزیوں کی پیٹیاں لے کر سرحد عبور کر کے پاکستان پہنچے۔درآمد کنندگان نے نوائے وقت کو بتایا ہے کہ درآمد بڑھنے کے بعد کسٹم حکام کا ''حصہ'' کم ہونے کی بجائے بڑھ گیا ہے۔درآمد کنندگان کا دعویٰ تھا کہ وہ 7 سے 10 روپے فی پیٹی کسٹم حکام کو ادا کر رہے ہیں جبکہ صرف ٹماٹر کی ایک لاکھ پیٹیاں روزانہ پاکستان پہنچتی ہیں۔''(12)

جبکہ نوائے وقت کے چیف ایڈیٹر، نظریہ پاکستان ٹرسٹ کے چیئرمین اور تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن ہونے کے دعوے دار جناب مجید نظامی کہتے ہیں کہ پاکستان میں سب اچھا ہے۔مثال وہ اپنی دیتے ہیں کہ وہ بہت خوش حال ہیں۔اگر پاکستان نہ بنتا تو وہ اس حال میں نہ ہوتے۔نظامی صاحب کا کہنا ہے کہ جو لوگ ملکی حالات کا رونا روتے ہیں وہ ناشکرے ہیں۔انھوں نے

ایوان کارکنان تحریک پاکستان لاہور میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''ہماری کوشش یہ ہے کہ نئی نسل کو بتایا جائے کہ نظریۂ پاکستان کیا ہے اور پاکستان کیوں بنا؟ ایک دو روز قبل ایک کالمسٹ [جناب نذیر ناجی] نے ایک نام نہاد بڑے اخبار [روزنامہ جنگ] میں کالم لکھا تھا کہ نظریۂ پاکستان کیا ہے اور یہ کیا نظریۂ پاکستان، نظریۂ پاکستان لگے ہوئے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں ایسے عناصر موجود ہیں کہ جنھیں یہ نہیں پتا کہ نظریۂ پاکستان کیا تھا، کیا ہے، پاکستان کیوں بنا، کس لیے بنا، اس کا مقصد کیا تھا اور اگر خدانخواستہ نہ بنتا تو آج جو ہم لوگ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، میرے خیال میں یہاں بیٹھنے کی بجائے کوئی ریڑھی چلا رہے ہوتے یا کوئی پانڈی بنے ہوتے۔ہمیں اس وقت جو کچھ سماجی مرتبہ حاصل ہے پاکستان کی بدولت ہے۔میں اپنے بارے میں جانتا ہوں کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو میں کچھ بھی نہ ہوتا۔میں جو کچھ بھی ہوں، صرف پاکستان کے طفیل ہوں اور اس کا کریڈٹ انھیں جاتا ہے جنھوں نے نظریہ دیا، جنھوں نے پاکستان بنایا۔''(13)

جناب نظامی نے مذکورہ ٹرسٹ کی ایک دوسری تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''پاکستان اپنی نوعیت کے اعتبار سے دنیا کا واحد ملک ہے جو دوقومی نظریہ کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آیا۔پاکستان نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے، اگر پاکستان نہ بنتا تو ہم اعلیٰ عہدے حاصل نہ کر سکتے۔ایوان کارکنان تحریک پاکستان جس زمین پر قائم ہے یہ پہلے ایک ہندو کی کوٹھی کا صحن تھا لیکن آج یہاں پر نظریۂ پاکستان کی ترویج و اشاعت جاری ہے۔ایسا پاکستان کی بدولت ہی ممکن ہوا ہے۔پاکستان کے طفیل ہمیں اتنا کچھ ملا ہے کہ ہم اندازہ نہیں کر سکتے۔آج اگر ہم اچھے لباس زیب تن کیے اس ہال میں بیٹھے ہیں تو یہ بھی پاکستان ہی کی بدولت ہے ورنہ اس شاہراہ قائداعظم (مال روڈ) اور انارکلی میں محض ایک دو دکانیں مسلمانوں کی تھیں، باقی سب ہندوؤں کی تھیں۔''(14)

نظامی صاحب کا یہ فرمانا کہ: ''اگر خدانخواستہ پاکستان نہ بنتا تو آج جو ہم لوگ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، میرے خیال میں یہاں بیٹھنے کی بجائے کوئی ریڑھی چلا رہے ہوتے یا کوئی پانڈی بنے ہوتے۔ہمیں اس وقت جو کچھ سماجی مرتبہ حاصل ہے پاکستان کی بدولت ہے۔میں اپنے بارے

میں جانتا ہوں کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو میں کچھ بھی نہ ہوتا۔ میں جو کچھ بھی ہوں، صرف پاکستان کے طفیل ہوں۔'' اور دوسری تقریر میں فرمانا کہ: ''آج اگر ہم اچھے لباس زیب تن کیے اس ہال میں بیٹھے ہیں تو یہ بھی پاکستان ہی کی بدولت ہے۔''

میرے خیال میں نظامی صاحب کے یہ فرامین حقیقت پر مبنی ہیں۔ واقعتاً وہ قصبہ سانگلہ ہل کے ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک ایسے گھرانے سے جس کی کوئی سماجی یا معاشی حیثیت نہیں تھی، ان کے ہاں جو دولت وثروت کی ریل پیل ہوئی ہے وہ پاکستان ہی کی بدولت ہوئی ہے۔ جناب مجید نظامی کے بڑے بھائی جناب حمید نظامی کے بارے میں تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن اور نوائے وقت کے کالم نگار کرنل (ر) حامد محمود اپنی کتاب میں نے پاکستان بنتے دیکھا میں بعنوان'' جناب حمید نظامی اور نوائے وقت'' لکھتے ہیں کہ'' آپ کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ اس لیے آپ نے اپنے تمام تعلیمی اخراجات ٹیوشن پڑھا کر اور جزوقتی کام کر کے پورا کیے۔''(15) معروف صحافی جناب صلاح الدین ندیم ان کے بارے میں درست لکھتے ہیں کہ: ''پہلے مارشل لاء کا'' شہید صحافی'' جو مقروض مرا، مگر اس کی اولاد اور بھائی اب ارب پتی ہیں۔''(16) ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور میں ایک رپورٹ بعنوان'' یہ ہیں پاکستان کی چالیس طاقت ور ترین بزنس امپائرز'' شائع ہوئی ہے، جس میں نوائے وقت گروپ ساتویں نمبر پر ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ'' اس گروپ کے اثاثے کبھی اناؤنس نہیں ہوئے مگر یہ ارب پتی گروپس میں شامل ہے۔''(17)

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے قیام سے اتنی ہی تبدیلی آئی ہے کہ ہندو اور سکھ جو مال اسباب اور جائیدادیں، زمینیں چھوڑ کر گئے تھے، ان پر مقامی مسلمانوں نے ناجائز قبضہ کر لیا تھا، جو بچیں ان پر ہندستان سے آنے والے مسلمان قابض ہو گئے۔ یا کچھ خاندان دو نمبری کر کے ارب پتی بن گئے۔ عام آدمی اور غریب جیسا پہلے تھا، اس سے بھی بدتر حالات میں مبتلا ہو گیا ہے۔ حالات دن بہ دن دگرگوں ہو رہے ہیں۔ نظامی صاحب کا ایک چینل انٹرویو ان کے اپنے ہی اخبار نوائے وقت میں شائع ہوا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

''قیام پاکستان کے بعد ہندوؤں اور سکھوں کے بھارت چلے جانے کے باعث ان کے گھروں اور زمینوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ بعد میں الاٹمنٹ کروانے کے عمل

میں بھی خاصے گھپلے ہوئے، جس کا داؤ چلا اُس نے بڑی سے بڑی کوٹھی پر قبضہ کر لیا۔''(18)

نظامی صاحب کا اس طرح کے خیالات کا اظہار کثرت سے کرنا کہ جن سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ پاکستان میں سب اچھا ہے، مثال ہمیشہ اپنی یا امیر گھرانوں کی یا ماڈل ٹاؤن اور ڈیفنس میں رہنے والوں کی دینا بڑے افسوس اور دُکھ کی بات ہے۔ جبکہ ان کے اپنے اخبار میں آئے روز بھوک، افلاس اور فاقہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر خودکشی کرنے والوں کی خبریں کثرت سے شائع ہوتی رہتی ہیں۔ تجزیوں میں معاشی حالات کا رونا رویا جاتا ہے، کیا وہ اپنا اخبار بھی نہیں پڑھتے؟ کیا وہ اپنے سامنے ہونے والی باتوں کو بھی نہیں سنتے۔ علامہ محمد اقبال کے پوتے بیرسٹر ولید اقبال نے نظامی صاحب کی موجودگی میں ہی نظریۂ پاکستان ٹرسٹ کے زیر اہتمام منعقدہ یومِ اقبال کی تقریب سے خطاب میں پاکستان کے ناگفتہ بہ حالات پر جو تبصرہ کیا وہ بعد میں نوائے وقت لاہور میں رپورٹ بھی ہوا جس میں انھوں نے کہا:

''ہمارے ملک میں اقوامِ متحدہ کی رپورٹ کے مطابق 6 کروڑ 20 لاکھ افراد خطِ غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں اور 75 فیصد لوگ غربت کا شکار ہیں۔''(19)

پاکستان کے مقابلے میں اس کا سب سے بڑا دشمن ہندستان کن حالات میں ہے، آیئے جانتے ہیں۔ سابق امریکی خارجہ سیکرٹری ہنری کسنجر کے رفیق کار، ورییل یونیورسٹی کے پروفیسر والٹر رسل میڈ نے پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے پاکستان اسٹڈی سنٹر میں لیکچر دیتے ہوئے کہا کہ 2025ء تک بھارت چین کے مقابلے میں آ جائے گا۔ پاکستان کے خراب حالات کی وجہ سے امریکا بھارت کے مساوی تعلقات استوار نہیں کر سکتا۔ لیکچر کی نوائے وقت میں شائع ہونے والی رپورٹ پڑھیے:

''لاہور (اپنے نمائندے سے) پنجاب یونیورسٹی پاکستان سٹڈی سنٹر کے زیر اہتمام سابق امریکی خارجہ سیکرٹری ہنری کسنجر کے رفیق کار، اور ییل یونیورسٹی کے پروفیسر والٹر رسل میڈ نے پاک امریکی تعلقات پر منعقدہ سیمینار میں خطاب کرتے ہوئے امریکا کی خارجہ پالیسی کے حوالے سے اوباما انتظامیہ کی پالیسی کے بنیادی پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ امریکا چاہتا ہے کہ جنوبی ایشیا دہشت گردی اور

ایٹمی خطرہ سے پاک جمہوریت پسند اور خوشحال خطہ بنے۔ انھوں نے کہا کہ امریکا بھارت اور پاکستان کے ساتھ آزادانہ سطح پر دوطرفہ تعلقات کا خواہاں ہے۔ بھارت 2025ء تک معاشی طور پر ایک بڑی معاشی طاقت بن کر ابھرتے ہوئے چین کا مقابلہ کرنے کی بھرپور صلاحیت حاصل کر لے گا۔ اسی لیے امریکا و دیگر یورپی ممالک بھارت کے ساتھ مستحکم حکومتی تعلقات و سرمایہ کاری میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں۔ دوسری طرف پاکستان کی خراب معاشی صورت حال کے پیش نظر امریکا کے لیے پاکستانی معیشت میں مساویانہ بنیادوں پر دلچسپی لینا محال ہے۔ تاہم پاکستان کو غربت وجہالت کے خاتمے اور پسماندگی جیسے مسائل سے خودنمٹنا ہوگا۔ یہ کس قدر افسوسناک امر ہے کہ اس وقت مجموعی جی ڈی پی کا ازحد قلیل حصہ پرائمری تعلیم کے فروغ کے لیے مختص کیا جارہا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر قلب عابد نے کہا کہ پاکستان کم وسائل کے استعمال کے ساتھ بہت سے مسائل رکھنے کے باوجود نہ تو ناکام ریاست ہے اور نہ ہی بدمعاش ریاست ہے۔ امریکی پالیسی سازوں کو مسئلہ فلسطین کے حل کو اولین ترجیح دینی چاہیے۔'' (20)

نوائے وقت لاہور میں ہی حکومت امریکا کی ایک رپورٹ بعنوان ''بھارت دنیا کی تیسری اُبھرتی ہوئی طاقتور قوم ہے۔ امریکی رپورٹ کا دعویٰ'' شایع ہوئی ہے جس میں لکھا ہے:

واشنگٹن (آن لائن) امریکا نے کہا ہے کہ بھارت دنیا کی تیسری طاقتور قوم ہے۔ امریکی حکومت کی جانب سے جاری گلوبل گورننس 2025 کی رپورٹ کے مطابق بھارت امریکا اور چین کے بعد تیسرا بڑا طاقتور ملک ہے۔'' (21)

جبکہ غیرملکی جریدے اکانومسٹ نے اپنی حالیہ اشاعت میں ایک رپورٹ بعنوان: ''بھارت کے حیران کن معاشی معجزے'' شایع کی ہے، جس میں بتایا گیا کہ بھارت جلد چین کی معاشی ترقی کی رفتار کم کر دے گا۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور جمہوریت سے آئندہ 25 برس میں بھارت کسی بھی بڑے ملک کی نسبت زیادہ ترقی کر لے گا۔ رپورٹ کی خبر روزنامہ آواز لاہور میں شایع ہوئی ہے، جو حسب ذیل ہے:

''لاہور (فارن ڈیسک) غیر ملکی جریدے اکانومسٹ نے اپنی حالیہ اشاعت میں

بھارت کی معاشی ترقی کو موضوع بحث بناتے ہوئے بتایا ہے کہ کیسے بھارت کی ترقی چین کی معیشت میں اضافے کی رفتار کو کم کر دے گی۔ جریدہ ''بھارت کے حیران کن معاشی معجزے'' کے عنوان سے اپنی رپورٹ میں لکھتا ہے کہ دولت مشترکہ گیمز کی تیاریوں کے سلسلے میں بھارت پر ہونے والی عالمی میڈیا کی تنقید کے باوجود انڈیا نے بہت بہتر کام کیا ہے۔ جریدہ لکھتا ہے کہ رواں سال بھارت کی اقتصادی ترقی کی شرح میں 8.5 فیصد اضافہ متوقع ہے۔ اگرچہ اسے چین جیسا امیر ملک بننے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا ہوگا کیونکہ چین کی معیشت بھارت کے مقابلے میں چار گنا زیادہ ہے لیکن بھارت کی آبادی کی شرح 2013ء تک چین سے بڑھ جائے گی۔ بعض معاشی ماہرین کا خیال ہے کہ آئندہ 25 برس میں بھارت کسی بھی بڑے ملک کی نسبت زیادہ تیزی سے ترقی کرے گا۔ جریدہ بتاتا ہے کہ دو وجوہات ہیں جن کی بنا پر بھارت جلد چین کی معاشی ترقی کی رفتار کو کم کرنا شروع کر دے گا۔ ان میں پہلا عنصر آبادی کا ہے۔ جریدہ کہتا ہے کہ عنقریب چین کی افرادی قوت عمر رسیدہ ہونا شروع ہوجائے گی اور کچھ سالوں میں اس میں کمی شروع ہو جائے گی۔ رپورٹ کے مطابق چین کی افرادی قوت میں کمی کی وجہ اس کی ون چائلڈ پالیسی ہے۔ بھارت میں نوجوان افرادی قوت پر انحصار کی شرح کا تناسب بچوں اور عمر رسیدہ افراد کے مقابلے میں دنیا میں سب سے زیادہ ہے اور یہ ایک نسل تک برقرار رہے گا اور اس آبادیاتی تقسیم سے بھارت کی معیشت کو فائدہ پہنچے گا۔'' (22)

نوائے وقت میں ہی صوبائی اسمبلی پنجاب کی رُکن محترمہ زوبیہ رباب ملک کا ایک بیان بعنوان: ''بھارت کہاں پہنچ گیا، ہم آٹے چینی جیسے بحرانوں سے دوچار ہیں'' شایع ہوا ہے، پڑھیے:

''لاہور (پ ر) رکن صوبائی اسمبلی پنجاب زوبیہ رباب ملک نے کہا کہ بھارت کہاں پہنچ چکا ہے، وہ سلامتی کونسل کی مستقل رکنیت حاصل کرنے اور عالمی طاقت بننے کے لیے پر پرزے نکال رہا ہے جب کہ پاکستان جو بھارت سے ایک دن پہلے آزاد ہوا آٹے چینی دالوں سبزیوں جیسے بحرانوں سے دوچار ہے۔ عوام کا مورال گر چکا ہے،

مہنگائی کنٹرول نہ کر سکنے والے حکمران پاکستان کو درپیش سنگین چیلنجز کا مقابلہ کیسے کر سکیں گے۔"(23)

پنجاب کے وزیر اعلیٰ جناب میاں محمد شہباز شریف نے لاہور پریس کلب کے نومنتخب عہدیداروں کی تقریب حلف برداری کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"پاکستان کو ڈکٹیشن دی جا رہی ہے، بھارت کو کوئی ڈکٹیشن نہیں دیتا، نہ کوئی دے سکتا ہے۔ بھکاری کے پاس کوئی چوائس نہیں ہوتی۔ کشمیر کی آزادی سے پہلے معاشی آزادی اور سماجی انصاف ضروری ہے، جہاں پر آئین اور قانون کی حکمرانی ہو، تھانوں میں ظلم نہ ہو رہا ہو، عدالتوں میں انصاف مل رہا ہو، سفارش کے بغیر لوگوں کے بنیادی مسائل حل ہو رہے ہوں تو پھر کسی کی طرف دیکھنے یا کسی سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہو گی۔"(24)

"اپنے ازلی و ابدی دشمن بھارت" کے مقابلے میں پاکستان آج 63 سال بعد جن حالات و سانحات سے دوچار ہے، جس بدحالی میں مبتلا ہے اور جس پستی میں گرا ہوا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ ہم پاکستانیوں کو، اگر ہمارے اندر غیرت و حمیت نام کی کوئی چیز ہے تو ڈوب مرنا چاہیے۔ چونکہ ہم ایک سخت جان قوم ہیں یعنی بے غیرت قوم ہیں، لہٰذا ہم ایسا نہیں کریں گے۔ بے شک پاکستان کی غریب عوام بھوک، افلاس، تنگ دستی اور بے روزگاری کے ہاتھوں مجبور ہو کر خودکشیاں کرتی رہے۔

ہم نے اوپر ہند-پاک معاشی صورت حال پر جو کچھ لکھا ہے، جو حوالے پیش کیے ہیں انھیں ذہن میں رکھ کر جناب ایم اقبال کی 1983ء کی تحریر کے ان جملوں کو ایک مرتبہ پھر پڑھیے:

"ہم قرض دار ہونے کا خیال تک دل میں نہیں لاتے۔ آنے والی نسلیں جو نصیب میں ہو گا بھگتیں گی۔ ہم تو دنیا کے مزے لوٹ لیں۔ مغربی سیاسی غلبہ، اقتصادی استعمار کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اقوامِ مشرق پہلے کی طرح اب بھی مجبور اور بے بس ہیں۔ فرنگ کی رگِ جان پنجہ یہود میں ہے۔ لیکن ہماری رگ رگ کو فرنگیوں نے دبوچ رکھا ہے۔"

"بھارتی مسلمانوں کی ایک حقیری اقلیت کے ایک نمائندہ نے جو اونچے عہدے پر

فائز ہے، ایک مرتبہ طنزاً کہا تھا کہ تمھاری خوشحالی قرضوں کی مرہونِ منت ہے۔ تم آج کے آرام کے لیے اپنا کل داؤ پر لگا رہے ہو اور اپنے آرام کی خاطر آنے والی نسلوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رہے ہو۔"



حوالہ جات

(1) گونج (چندیادیں، چند باتیں)/ایم اقبال/لاہور/1985ء/ص45
(2) ایضاً/ص:161
(3) روزنامہ دن لاہور/17 ستمبر 2010ء
(4) روزنامہ نوائے وقت لاہور/13 اپریل 2010ء
(5) ایضاً/20 ستمبر 2010ء
(6) روزنامہ جنگ لاہور/5 اکتوبر 2010ء
(7) جائزہ (خودنوشت)/جسٹس (ر) کے ایم اے صمدانی/سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور/2004ء/ص:98
(8) روزنامہ نوائے وقت لاہور/5 ستمبر 2010ء
(9) ایضاً/14 اگست 2010ء
(10) ایضاً/4 اکتوبر 2010ء
(11) ایضاً/4 اکتوبر 2010ء
(12) ایضاً/16 نومبر 2010ء
(13) ایضاً/17 جون 2007ء
(14) ایضاً/13 اکتوبر 2010ء
(15) میں نے پاکستان بنتے دیکھا/ کرنل حامد محمود/ص:345
(16) یادوں کے دریچے (آپ بیتی)/صلاح الدین ندیم/ص:70
(17) ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور/ مئی 2005ء/ص:184
(18) روزنامہ نوائے وقت لاہور (سنڈے میگزین)/12 ستمبر 2010ء
(19) ایضاً/13 نومبر 2010ء
(20) ایضاً/27 جولائی 2010ء
(21) ایضاً/22 ستمبر 2010ء
(22) روزنامہ آواز لاہور/5 اکتوبر 2010ء
(23) روزنامہ نوائے وقت لاہور/15 نومبر 2010ء
(24) روزنامہ جنگ لاہور/7 مئی 2010ء

11

معروف کالم نگار جناب عطاء الرحمٰن نوائے وقت لاہور میں ''تجزیہ'' کے عنوان سے مستقل کالم لکھتے ہیں۔ ان کے 10 اگست 2004ء کے ''تجزیہ'' بعنوان ''کیا پاکستان کسی ہوم ورک کے بغیر قائم ہوا؟'' کے مطالعے سے مجھے یہ سطور لکھنے کی تحریک ہوئی۔ میں نے اسے بہت شوق سے پڑھا، لیکن پورے کالم میں ''ہوم ورک'' نام کی کوئی چیز تلاش کرنے کے باوجود نہ مل سکی۔ ''ہوم ورک'' تو وہ ہوتا ہے جو کلاس روم میں پہنچنے کے بعد کام آئے نہ کہ کلاس روم میں داخل ہونے سے قبل ہی غائب ہو جائے۔ پاکستان کے لیے تو ہوم ورک وہ ہوتا جو 14 اگست 1947ء کے بعد پاکستان کے کام آتا لیکن پورے مضمون میں موصوف نے ہماری قیادت کے کسی ایسے اقدام کا ذکر نہیں کیا جو 14 اگست 1947ء کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کے کام آیا ہوتا۔ بہت سی کوہ کنی کے بعد جو کاہ موصوف نے برآمد کیا وہ 1916ء کا میثاق لکھنو ہے جس میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا حق کانگریس نے تسلیم کر لیا حالانکہ چند سطور قبل موصوف یہ لکھ چکے تھے:

''آل انڈیا مسلم لیگ نے قائداعظم کی قیادت میں 1937ء کے انتخابات میں بھرپور حصہ لیا۔ اس کے منشور میں مسلمانان برصغیر کے سیاسی تحفظ کا وعدہ کیا گیا تھا۔ علیحدہ مملکت کے قیام کا نہیں۔ نہ پوری انتخابی مہم کے دوران یہ نعرہ سننے میں آیا۔ پاکستان کے لیے جو بھی ہوم ورک ہونا تھا وہ 1940ء سے 1947ء کے دوران یا فوراً ہونا تھا''۔

جب 1937ء تک حصول پاکستان مسلم لیگ کے مقاصد میں شامل ہی نہیں تھا کیونکہ ابھی

انگریز کے رخصت ہونے کے آثار نہیں تھے اور موصوف تسلیم کرتے ہیں کہ اس کے لیے ہوم ورک 1940ء سے 1947ء کے دوران میں ہونا تھا تو 1916ء کے میثاق لکھنؤ کو پاکستان کے لیے ہوم ورک کیسے کہا جاسکتا ہے۔ حصول پاکستان کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کو جو مسائل پیش آئے ان کے لیے ہماری قیادت نے کیا ہوم ورک کیا تھا؟ کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔ اس لیے موصوف میثاق لکھنؤ کے علاوہ کسی اقدام کی طرف اشارہ بھی نہیں کرسکے۔ موصوف فرماتے ہیں:

''1947ء میں قیام پاکستان عمل میں آیا۔ غیر متوقع طور پر مہاجرین کا زبردست ریلا آیا اور اس پر مستزاد یہ کہ بھارت کی حکومت نے ہمارے حصے کے فنڈز دینے سے انکار کردیا۔''

موصوف نے بہت ہلکا کر کے اس آفت کو بیان کیا ہے جو مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر ٹوٹی۔ مہاجرین کا ریلا تو تھا ہی لیکن وہ ریلا اپنے پیچھے پندرہ لاکھ مسلمانوں کا قتل اور تقریباً نوے ہزار مسلمان خواتین بے آبرو کروا کر پاکستان پہنچا تھا۔ سوال یہ ہے کہ یہ غیر متوقع کیوں تھا۔ کیا واقعی ہماری قیادت اس قدر بے بصیرت تھی کہ اسے یہ سب کچھ نظر نہیں آرہا تھا؟ جواب ہاں میں ہی ہوسکتا ہے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ ہوم ورک کیا ہوتا ہے۔ اسرائیل 1948ء میں قائم ہوا۔ 1919ء میں سلطنت عثمانیہ کی شکست کے بعد یہودیوں کو فلسطین میں آکر آباد ہونے کی اجازت ملی اور 1939ء تک یعنی دوسری عالمی جنگ شروع ہونے تک وہ فلسطین میں آکر آباد ہوتے رہے۔ میرے مطالعہ کے مطابق سو مختلف زبانیں بولنے والے یہودی فلسطین میں آکر اس عرصہ میں آباد ہوئے۔ ممکن ہے یہ مبالغہ ہو۔ آپ پچاس فرض کرلیں۔ انھوں نے ہوم ورک اس طرح کیا ہوا تھا کہ اسرائیل کے قیام کا اعلان ہوتے ہی اردگرد کی عرب ریاستوں نے اس پر حملہ کردیا۔ اسرائیل نے نہ صرف تمام حملے پسپا کیے، بلکہ مزید علاقہ بھی حاصل کرلیا۔ یہ ہوتا ہے ہوم ورک۔ ہماری قیادت نے مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو قتل عام سے اور مسلمان خواتین کو بے آبرو ہونے سے بچانے کے لیے کیا ہوم ورک کیا تھا؟ موصوف فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ غیر متوقع تھا۔ کیوں؟ وہ بھی کوئی قیادت ہوتی ہے جو دس بیس سال آگے نہ دیکھ سکے۔ موصوف اپنی قیادت پر یہ الزام لگا رہے ہیں کہ اس نے پاکستان کے لیے کوئی ہوم ورک کیا تھا حالانکہ وہ اس گناہ میں ملوث ہی نہیں ہوئی۔ موصوف فرماتے ہیں:

''بھارت نے اپنا آئین پانچ سال میں بنایا تو ہم نے پاکستان کا آئین سات سال میں بنالیا۔ صرف دو سال ہی لیٹ ہوئے لیکن ہماری حسن کارکردگی کو نظر لگ گئی اور دستور ساز اسمبلی کو ہی توڑ دیا گیا۔''

سوال یہ ہے کہ کیوں؟ بھارت میں کسی ملک غلام محمد نے اسمبلی کو کیوں نہ توڑ دیا۔ یہ سارے کے سارے غلام محمد آخر ہمارے حصہ میں ہی کیوں آگئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہماری قیادت نے ایک آزاد ملک چلانے کے لیے کوئی ہوم ورک کیا ہی نہیں تھا۔ ہماری قیادت کی تمام جدوجہد تو انگریزوں سے اس مطالبہ تک محدود تھی کہ ''اگر آپ جا رہے ہیں تو تقسیم کر کے جائیں'' دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب واضح تھا کہ ''اگر آپ نہ جائیں تو ہم آپ کے زیر سایہ بہت خوش ہیں۔'' اگر ہمارے نیلسن منڈیلا نے بھی 28 سال نہیں تو 28 ماہ ہی جیل کاٹی ہوتی یا ہمارے ماؤزے تنگ نے بھی ہزار دو ہزار کلومیٹر لانگ مارچ کیا ہوتا تو ہمارے حالات بھی مختلف ہوتے۔ ہمارے نیلسن منڈیلا نے تو کبھی جیل کا پھاٹک بھی نہیں دیکھا تھا۔ ہمارے ماؤزے تنگ نے تو نہ کبھی اپنی قمیص کا کالر میلا ہونے دیا تھا اور نہ کبھی اپنے جوتے کی چمک ماند پڑنے دی تھی تو پھر ہمارے حصہ میں ملک غلام محمد اور سکندر مرزا جیسے لوگ ہی آنے تھے۔

پاکستان میں اسلام کے مطابق قانون سازی کے لیے جناح صاحب نے جس شخص کو تیار کیا تھا اس کا نام تھا جوگندر ناتھ منڈل، جو پاکستان کا پہلا وزیر قانون بنا اور اس نے وزارت سے استعفاء دیے بغیر ہی بھارت جا کر وہاں کی شہریت حاصل کرلی۔ یہ تھا ہماری قیادت کا حسن انتخاب۔ قتل کے مقدمہ میں وکیل صفائی کی بحث سنتے ہوئے ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ دنیا میں قتل کے ملزم کا اگر کوئی حقیقی خیر خواہ ہے تو یہ وکیل ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہوتی ہے کہ اسے اس سے قطعاً کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ملزم کے ساتھ جیل میں کیا سلوک ہو رہا ہے اور نہ ہی یہ اس کا مسئلہ ہوتا ہے کہ ملزم کے پسماندگان پر کیا گزر رہی ہے۔ اس کی تمام کوشش یہ ہوتی ہے کہ اگر ملزم بری نہ ہوسکے تو اسے پھانسی بھی نہ ہو۔ ہماری قیادت نے بھی یہی وکالت ہی کی کہ تقسیم ہوجائے چاہے جیسی بھی ہوجائے۔ دینے والوں نے واہگہ کو سرحد بنادیا تو ہم نے اسے قبول کرلیا۔ اگر وہ راوی کے پل کو بنادیتے تو ہم اسے بھی قبول کرلیتے۔ تقسیم کے نتیجہ میں مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر کیا گزرتی ہے؟ بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں سے کیا سلوک ہوگا؟ پاکستان میں نظم ونسق کیسے چلے

گا؟ ہماری قیادت کو اس سے غرض ہی نہیں تھی۔ مسائل تو اور بھی تھے جو پچاس یا سو سال بعد پیش آنے تھے جن کے بیج تقسیم میں ہی مضمر تھے۔ اتنی دور کی کون سوچتا۔ ہمارا قائد تو وکالت کر رہا تھا قیادت نہیں۔ برصغیر کے جن علاقوں پر مشتمل پاکستان بنا ہے ان میں تو مسلمان پہلے ہی عددی اکثریت میں تھے اور ہندو غلبے سے محفوظ تھے۔ اصل مسئلہ تو ان مسلمانوں کا تحفظ تھا جو ان علاقوں میں آباد تھے جہاں وہ عددی لحاظ سے اقلیت میں تھے۔ ہماری قیادت نے تقسیم کروا کر محفوظ مسلمانوں کو مزید محفوظ کر دیا اور جو غیر محفوظ تھے ان کو مزید غیر محفوظ کر دیا۔ یہ تھا ہوم ورک جو ہماری قیادت نے کیا تھا۔

11 اگست کے ''تجزیہ'' کا عنوان ہے: ''بحث پاکستان کے جواز اور عدم جواز کی''۔ آخر کیا وجہ ہے کہ پاکستان ہی میں یہ بحث کیوں اب تک جاری ہے؟ کیا اسرائیل میں بھی کبھی یہ بحث ہوئی کہ اس ملک کا قیام جائز تھا یا ناجائز۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا قیام کسی بھی لحاظ سے جائز نہیں تھا۔ آخر کوئی وجہ تو ہے کہ یہ بحث اب تک جاری ہے۔ پاکستان کے لیے جو تحریک چلائی گئی وہ میرے ہوش سے قبل کی بات ہے۔ میں نے تو اسے کتابوں میں پڑھا ہے، میری رائے میں اس بحث کی وجوہ یہ ہیں:

1) کوئی مسلمان بقائمی ہوش و حواس اور بہ سلامتی ایمان یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ اسلام اپنی تاثیر کھو چکا ہے، لیکن عملاً اجتماعی طور پر ہم نے تقسیم برصغیر کا مطالبہ کر کے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ اسلام اپنی دعوتی قوتِ تاثیر کھو چکا ہے اس لیے اب کوئی غیر مسلم برصغیر میں اسلام قبول نہیں کرے گا۔ اس وجہ سے قیامت تک مسلمان برصغیر میں اقلیت میں رہیں گے، لہٰذا جمہوری اصولوں کے مطابق نہ کہ اسلامی اصولوں کے مطابق جہاں اتفاق سے نہ کہ اسلام کی قوت تاثیر کی وجہ سے مسلمان اکثریت میں ہیں وہ علاقے علیحدہ کر کے ان کا ایک آزاد ملک بنا دیا جائے۔

2) ہم نے تسلیم کر لیا تھا کہ اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری دین حق نہیں ہے نہ اس کی دعوت آفاقی ہے اور نہ یہ دین جملہ نوع انسانی کے لیے ہے، بلکہ یہ بھی ہندو دھرم کی طرح ایک دھرم ہے جس طرح ہندو صرف پیدائشی ہندو ہوتا ہے کوئی شخص تبدیل (Convert) ہو کر ہندو نہیں ہو سکتا، اسی طرح مسلمان بھی صرف پیدائشی مسلمان ہو سکتا، کوئی شخص Convert ہو کر مسلمان نہیں ہو سکتا۔ ہم نے ہندو مذہب کو اور اسلام کو ایک ہی سطح پر رکھا۔ مسلمانوں میں سے جس نے بھی اس تصور کو

قبول کرنے سے انکار کیا ہم نے اس کی خوب تذلیل کی تھی۔

3) ہم نے تسلیم کر لیا تھا کہ برصغیر میں جو مسلمان ہیں وہ سب کے سب باہر سے آئے ہوئے ہیں اور جن علاقوں میں ان کی اکثریت نہیں تھی وہاں اگر کبھی وہ حکومت کرتے رہے تھے تو ظلم کرتے رہے تھے کیونکہ جناح صاحب اور ان کی ہم نوا قیادت نے جو فلسفہ پیش کیا تھا اس کی رو سے کسی اقلیت کا اکثریت پر حکومت کرنا ظلم تھا۔

کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے، لیکن برصغیر کی تقسیم کا مطالبہ کر کے ہم نے مذکورہ بالا تینوں باتیں جو بسلامتی ایمان ناقابلِ تسلیم تھیں عملاً تسلیم کر لیں۔ موصوف فرماتے ہیں:

''مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا سانحہ ناقابل فراموش المیہ ہے لیکن مذہب اس کا ذمہ دار نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ملک جس نے اپنی فوجی قوت کے بل بوتے پر اس عمل میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا کب کا بنگلہ دیش کو اپنے اندر ضم کر چکا ہوتا۔ زبردست خواہش کے باوجود بھارت ایسا نہیں کر سکا''۔

اسے موصوف کی خوش فہمی کہہ لیں یا غلط فہمی کہ بھارت زبردست خواہش کے باوجود بنگلہ دیش کو اپنے اندر ضم نہیں کر سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ برطانوی ہند کی حکومت نے تقسیم برصغیر کی تجویز کو اس وقت پذیرائی بخشی جب کانگریس اس کے لیے تیار ہو گئی۔ اگر کانگریس تقسیم کو قبول نہ کرتی تو برصغیر کبھی تقسیم نہ ہوتا، نہ ہمارے قائدین کے پاس کوئی ایسی طاقت تھی کہ وہ اس کے زور پر ان علاقوں پر قبضہ کر لیتے جہاں مسلم اکثریت تھی۔

اب قابل غور بات یا تصفیہ طلب امر صرف یہ ہے کہ کانگریس نے تقسیم کو کیوں قبول کر لیا۔ اس کے لیے میں ہندستان کے صاحب بصیرت و فراست رہنما مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی کتاب انڈیا ونز فریڈم کا حوالہ دیتا ہوں۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

''تجربے نے دکھا دیا کہ مسلم لیگ کے ساتھ کام کرنا ناممکن تھا۔ ایک اور مصلحت غالباً سردار پٹیل کے حق میں جاتی تھی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے یہ دلیل دی تھی کہ کانگریس ایک کمزور مرکز پر صرف اس لیے رضامند ہو گئی تھی تاکہ لیگ کے اعتراضات کا جواب دے سکے۔ صوبوں کو اسی لیے مکمل صوبائی خودمختاری دے دی لیکن ایک ایسے ملک میں جو زبان، فرقے اور ثقافت کی بنیاد پر اتنا بڑا ہو، کمزور مرکز لازمی طور پر علیحدگی پسند

میلانات کو تقویت پہنچائے گا۔ اگر مسلم لیگ نہ ہوتی تو ہم ایک مضبوط مرکزی حکومت کا منصوبہ بنا سکتے تھے اور ایک ایسا آئین وضع کر سکتے تھے جو ہندستانی اتحاد کے نقطۂ نظر سے پسندیدہ ہوتا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے یہ صلاح دی کہ بہتر ہوگا کہ شمال مغرب اور شمال مشرق میں چند چھوٹے ٹکڑے دے دیے جائیں اور پھر ایک مضبوط اور مستحکم ہندستان کی تعمیر کی جائے۔ سردار پٹیل اس دلیل سے متاثر ہوئے تھے کہ مسلم لیگ کے ساتھ تعاون ہندستانی اتحاد اور طاقت کو خطرے میں ڈال دے گا۔" (1)

جب کانگریس نے تقسیم کو قبول ہی اس لیے کیا تھا کہ مسلم اکثریتی علاقے علیحدہ کر کے ایک مضبوط اور مستحکم بھارت کی تعمیر کریں تو وہ مشرقی پاکستان کو، جو بہت بڑی مسلم آبادی اپنے اندر رکھتا تھا، کیوں کر بھارت میں شامل کر کے مسلم آبادی کے تناسب کو اپنے ملک میں زیادہ کر لیتے۔ وہ تو ان مسلمانوں کو بھی ختم کرنا چاہتے تھے اور چاہتے ہیں جو وہاں سے کسی طرح بھی نکل نہیں سکتے، چہ جائیکہ وہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد کو اپنے اندر شامل کر لیتے۔ اگر بھارت نے مشرقی پاکستان کو فتح کرنے کے بعد بھارت میں ضم نہیں کیا تو اس کی وجہ بھارت کا داخلی مسئلہ ہے نہ کہ مذہب۔ نامور مسلم لیگی رہنما جناب مولانا محمد اسماعیل ذبیح نے ایک مضمون بعنوان: "ہم کارکنان تحریک پاکستان اب شرمندہ ہیں!" لکھا تھا۔ یہ مضمون بہ ایں الفاظ شروع ہوتا ہے:

"یہ مضمون ایک قدیم مسلم لیگی کارکن کے دکھے دل اور شرمندہ ضمیر کی آواز ہے کہ یہ پاکستان ایسا نہیں ہے، جس کے لیے مسلمانان ہند نے ووٹ دیا تھا۔"

اس مضمون میں مولانا ذبیح لکھتے ہیں:

"ہندستان کے ایک سابق دفاعی اور خارجی امور کے ماہر مسٹروی لانگر نے اپنی کتاب ڈیفنس اینڈ فارن پالیسی آف انڈیا میں واضح طور پر یہ تفصیل بیان کر دی ہے کہ پاکستان کا مشرقی حصہ یعنی موجودہ "بنگلہ دیش" خود پاکستان کی قیادت کے ہاتھوں الگ ملک بنا اور اس کے توڑنے میں کس طرح پاکستان کے مختلف صوبوں کے "نامور قائدین" نے نمایاں حصہ لیا اور پھر اسی کتاب میں یہ تفصیلات بھی درج تھیں کہ کس طرح سرحد، سندھ اور بلوچستان کے بعض مشہور سیاسی رہنماؤں نے بار بار اندرا گاندھی کو یہ ترغیب دی کہ وہ باقی ماندہ پاکستان پر بھی حملہ کر کے اس کو ختم کر دے

تا کہ پاکستان کا نام ونشان ہی مٹ جائے۔ اس کتاب میں ان دشمنانِ پاکستان، پاکستانی جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور سیاست دانوں کے نام بھی تحریر کر دیے گئے جو مسلسل پاکستان کو ختم کرنے کے لیے ہندستانی حکومت سے درخواستیں کرتے رہتے ہیں، جو نام اس ہندستانی افسر مسٹروی لانگر نے اپنی کتاب میں گنوائے ہیں ان سب سے پاکستانی عوام آشنا ہیں اور وہ جس آزادی کے ساتھ پاکستان میں تخریب کاری کے کارنامے انجام دے رہے ہیں اور جس تباہ کن عصبیت کو پاکستان میں زہریلے ناگوں کی طرح پھیلایا ہے وہ بغیر کسی رکاوٹ کے پورے پاکستانی معاشرے کو زہریلا بنا رہی ہے۔ جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ معمولی قسم کی صوبائی قومیتوں اور نسلی گروہ بندی کی حامل جماعتیں پاکستان کی بقا کے درپے ہیں۔ قائداعظم کی تعلیمات اور اصل اسلامی تقاضوں کے مطابق پاکستان کی تعمیر کا تصور کچھ جماعتوں یا برسراقتدار گروہ کا نعرہ تو ہو سکتا ہے لیکن عملاً اب پاکستان میں پاکستانی قومیت اور اسلامی عدل کا وجود نہیں ہے۔ ڈیفنس اینڈ فارن پالیسی آف انڈیا کا مصنف مسٹروی لانگر لکھتا ہے کہ جب پاکستان کے سرحد، سندھ اور بلوچستان کے قائدین نے اندرا گاندھی سے بار بار کہا کہ "پاکستانی قوم مایوس اور پریشان ہے اس لیے یہ موقع پاکستان پر حملہ کرنے اور اس کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کا سب سے بہتر ہے" تو اندرا گاندھی نے پاکستانی لیڈروں کی اس "پاکستان توڑ" فرمائش کا سیاسی اور فوجی جائزہ لینے کے لیے اپنے پالیسی ساز اداروں کے مشیروں کو کئی بار اکٹھا کیا کہ وہ پاکستان کے ان لیڈروں کی اس بات کا جائزہ لیں، لیکن پاکستانی لیڈروں کی یہ بدقسمتی تھی کہ اندرا گاندھی کے خارجی حکمت عملی کے ماہرین نے یہ قطعی رائے ظاہر کی کہ موجودہ پاکستان پر کوئی بڑا حملہ کرنا یا اس کو توڑنا خود ہندستان کی بقا کے لیے خطرناک بن جائے گا۔ اس لیے کہ چین، ہندستان کو یہ اجازت نہیں دے گا کہ وہ پاکستان کو ختم کر کے بڑی طاقت بن جائے اور چین سے لڑنا جس طرح نہرو کے لیے موت ثابت ہوا تھا شاید ایسا ہی ہندستانی حکومت کے قائدین کے لیے پیام مرگ ثابت ہوگا۔ ان کی دوسری دلیل یہ تھی کہ ہندستانی مسلمانوں کو جس طرح دبا کر رکھا گیا ہے اور اس میں یونس خان جیسے لوگ

موجود ہیں پاکستان کو فتح کر کے ہندستان میں ملانا مسلمانانِ ہند کی طاقت اور ان کی تعداد میں بے انتہا اضافے کا باعث بن جائے گا اور اگر ایک بار بنگلہ دیش اور پاکستان کے مسلمانوں کو زیر کر کے بھارت میں شامل کر لیا گیا تو یہ ایک ایسا خطرناک کھیل ہوگا جو خود اس صدی کے خاتمے پر مسلمانوں کو ہندستان میں ہندو قوم کی برابری کی تعداد پر لے آئے گا۔ اس ہندستانی مصنف کا یہ بھی کہنا تھا کہ ہمارے نزدیک یہ ''گپ بازی'' کا بہت بڑا موضوع تھا کہ یہ کون سے بہادر پاکستانی ہیں جو پاکستان کے وسائل سے مالا مال ہوتے ہوئے اور اس ملک کے درجہ اوّل کے بارسوخ شہری ہو کر بھی پاکستان توڑنے کی بات کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ پاکستان کا اپنا مسئلہ ہے کہ اس کے یہ لیڈر کہاں رہتے ہیں لیکن دنیا کی نگاہوں میں یہ لوگ انتہائی محسن کش، غدار اور قابلِ نفرت شمار ہوں گے جنھوں نے اپنے ملک کی خدمت کرنے کی بجائے اس کی دشمنی کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ ہندستان کے خارجی اور دفاعی امور کا یہ ماہر صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ ہندو اکثریت پاکستان بننے سے ناخوش ہے اس کا خیال ہے کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو جس طرح ہندستانی مسلمانوں کو دبا کر رکھا گیا ہے اسی طرح غیر منقسم ہندستان کے سارے مسلمانوں کو ہندو اکثریت دبا کر رکھتی۔ ان ہندوؤں کا کہنا یہ ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد پاکستان ایک فوجی قوت نہ بن سکتا جو آج وہ ہندستان کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہے۔ ہندستانی حکمرانوں کی خفیہ نفسیات کا یہ ماہر پوری ہندو قوم کے خوف کو یہ کہ کر ظاہر کر دیتا ہے کہ: پاکستان کے دس کروڑ بنگلہ دیش کے چودہ کروڑ اور ہندستان کے سولہ کروڑ مسلمان اگر متحدہ ہندستان میں رہتے تو ان کی آبادی چالیس کروڑ تو اب ہوتی اور جس رفتار سے ان کی آبادی بڑھتی ہے 2000ء میں پچاس اور ساٹھ کروڑ کے درمیان مسلمانوں کی آبادی ہو جاتی۔ ہندو اقلیت میں رہ جاتے اور مسلمان اکثریت میں ہو جاتے اس لیے پاکستان کا بن جانا ہی بہتر ثابت ہوا ہے۔''(2)

جناب عطاء الرحمٰن پر یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ بھارت بنگلہ دیش کو اپنے اندر ضم کرنے کی قطعاً کوئی خواہش نہیں رکھتا۔ پاک بھارت جنگوں کے حوالہ سے سابق سیکرٹری خارجہ جناب شمشاد احمد

خاں کے ایک انٹرویو کا کچھ حصہ پیشِ خدمت ہے جو بہت بصیرت افروز ہے۔ اس انٹرویو میں خاں صاحب بتاتے ہیں کہ ہندستان پاکستان سے جنگی محاذ آرائی نہیں چاہتا۔ پاک بھارت جو جنگیں ہوئی ہیں وہ بھی پاکستان کی شروع کردہ ہیں۔ واضح ہو کہ یہ انٹرویو جناب سہیل وڑائچ نے روزنامہ جنگ کے لیے کیا تھا:

''س: آپ کے خیال میں سیٹو اور سینٹو میں شمولیت کا فیصلہ صحیح تھا یا نہیں؟

ج: یہ فیصلہ میرے خیال میں بہت غلط تھا۔ سیٹو اور سینٹو کی وجہ سے ہمیں نفسیاتی مدد مل گئی لیکن ہمیں سکیورٹی کی بھی ضرورت تھی۔ اس وقت پاکستان ایک ایسا گھر تھا، جو اندر سے تقسیم تھا۔ دوسری طرف، ہر وقت یہی خطرہ رہتا تھا کہ بھارت ہمیں ہڑپ کر جائے گا اور اس نے بھی ہمیں بلیک میل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی تو یہ دونوں معاہدے ہم نے اسی نیت سے کیے تھے کہ برے وقت میں ہمارے کام آئیں۔

س: آپ کے خیال میں سیٹو اور سینٹو کے جو معاہدے ہم نے اپنی حفاظت کے لیے کیے تھے، کیا یہ بعد میں ہمارے کام آئے؟

ج: ان معاہدوں کا تجربہ توقعات سے بالکل الٹ رہا۔ ہمیں اپنی بقاء کے لیے جنگیں خود ہی لڑنا پڑیں۔ 1965ء کی جنگ کے دوران میں فارن سروس میں نیا نیا آیا تھا، ابھی اکیڈمی ہی میں تھا، مگر دبلا پتلا ہونے کے باوجود ہر روز اپنے سپاہیوں کو خون دینے جاتا تھا، اس وقت لوگوں کے جذبۂ حب الوطنی کی کوئی حد ہی نہیں تھی۔

س: اگر ہم سیٹو یا سینٹو میں نہ جاتے تو اور کون سا راستہ اختیار کرتے؟

ج: میرے خیال میں 1965ء میں اگر آپریشن جبرالٹر نہ کیا جاتا تو بھارت سے جنگ نہ ہوتی۔

س: کہا جاتا ہے کہ آپریشن جبرالٹر کی منصوبہ بندی میں ذوالفقار علی بھٹو بھی شامل تھے؟

ج: میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح سویلین لیڈرز کے کہنے پر فوجیں آپریشن نہیں کرتیں، سویلین لیڈر صرف مشورہ دیتا ہے یعنی وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو صرف اپنی رائے دے سکتے تھے، فیصلہ تو صدر ایوب کا تھا۔

س: تو آپ کے خیال میں صدر ایوب نے آپریشن جبرالٹر کروایا؟

ج: بالکل، اس کی ذمے داری صدر ایوب پر ہی عائد ہوتی ہے۔

س: یعنی آپ کہنا چاہ رہے ہیں کہ 1965ء کی جنگ پاکستان نے شروع کی تھی۔ پاکستانی تاریخ دان تو یہی بتاتے ہیں کہ 6 ستمبر کو اچانک بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا تھا؟

ج: یہ جنگ پاکستان نے شروع کی تھی۔ اگر آپ کسی کے دانتوں پر جا کر مکا مار دیں تو کیسے یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ آپ کو جواب نہ دے، آپ نے کشمیر میں ایکشن کیا تو وہ انٹرنیشنل بارڈر پر آ گئے۔

س: بتایا تو یہی جاتا ہے کہ 1965ء کی جنگ دفاعی تھی۔

ج: مجھے بھی یہی بتایا گیا تھا لیکن حقیقت یہ نہیں۔ کارگل بھی اسی قسم کی مثال تھی۔ 1971ء کی جنگ کسی اور قسم کی تھی، وہ ہمارا بنیادی طور پر اندرونی مسئلہ تھا، جو جنگ کی صورت اختیار کر گیا۔

س: تو آپ سمجھتے ہیں کہ 1971ء کی پاک بھارت جنگ میں بھی ہماری غلطی تھی؟

ج: بھارت کو میں اس وجہ سے الزام نہیں دوں گا کہ وہ جو کچھ کر رہا تھا اپنے مفاد میں کر رہا تھا۔ اس کی تو شروع سے یہی نیت تھی کہ پاکستان کو توڑنا ہے، تو جب شروع سے ہم یہ جانتے تھے تو ہم نے کیوں اس کو موقع دیا۔ ہم نے اپنے آدھے گھر کو خود ہی دبا کر اور پھر فوجی کارروائی کر کے عوام کو اپنے خلاف کیا۔ وہ مسئلہ اگر ہم سیاسی طریقے سے حل کر لیتے تو میں سمجھتا ہوں کہ 71ء کی جنگ کبھی نہ ہوتی۔" (3)

یہاں رک کر ایک منٹ کے لیے ہم یہ تصور کر لیں کہ ہم گزشتہ چھ عشروں سے پاکستان کی بجائے بھارت یا 1972ء سے بنگلہ دیش کے کسی کیمپ میں پڑے ہوتے تو کیا پھر بھی ہماری رائے یہی ہوتی جو موصوف نے 10 اور 11 اگست کے "تجزیہ" میں پیش کی ہے؟ اگر نہیں تو پھر کیا فائدہ ایسے دلائل کا جو حقیقی نہیں اضافی ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا بھارت کے مسلمان اور بنگلہ دیش میں 1972ء سے پڑے ہوئے پاکستانی آج بھی یہ رائے رکھتے ہیں کہ انھوں نے مسلم لیگ کو تقسیم برصغیر کا منڈیٹ دے کر درست فیصلہ کیا تھا۔ جواب نفی میں ہے۔ اس کے لیے بھی میں مولانا آزاد مرحوم کی کتاب کا حوالہ دوں گا۔ مولانا فرماتے ہیں:

"تقسیم کے بعد سب سے مضحک پوزیشن ان مسلم لیگی لیڈروں کی تھی جو ہندستان میں ہی رہے۔ جناح اپنے مقلدوں کے نام اس پیغام کے ساتھ کراچی کے لیے روانہ ہو گئے کہ اب ملک تقسیم ہو چکا ہے اور انھیں ہندستان کا وفادار شہری ہونا چاہیے۔ اس رخصتی پیغام نے ان میں کمزوری اور ہزیمت کا ایک عجیب احساس پیدا کر دیا۔ ان میں بہت سے لیڈر 14 اگست 1947ء کے بعد مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ ان کی حالت قابلِ رحم تھی۔ ان میں سے ہر ایک نے گہرے ملال اور غصے کے ساتھ کہا کہ جناح نے انھیں دھوکا دیا ہے اور بے سہارا چھوڑ دیا ہے۔ میں پہلے پہل سمجھ نہیں سکا کہ یہ کہنے سے ان کی مراد کیا تھی کہ جناح نے انھیں دھوکا دیا تھا۔ انھوں نے مسلم اکثریتی صوبوں کی بنیاد پر کھلے عام ملک کی تقسیم کا مطالبہ کیا تھا۔ اب تقسیم ایک حقیقت تھی اور مغرب و مشرق دونوں میں مسلم اکثریتی علاقے پاکستان کا حصہ بن چکے تھے۔ پھر مسلم لیگ کے ان ترجمانوں نے یہ کیوں کہا کہ انھیں دھوکا دیا گیا تھا"؟

"ان سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے سمجھ لیا کہ ان لوگوں نے تقسیم کی ایک ایسی تصویر بنائی تھی جس کا حقیقی صورت حال سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ پاکستان کے اصل مضمرات کو سمجھنے میں ناکام رہے تھے۔ اگر اکثریتی صوبوں نے ایک الگ ریاست بنالی تو یہ صاف تھا کہ وہ صوبے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ہندستان کا حصہ بنیں گے اور اس طرح بھارت میں رہ جانے والے مسلمان ایک بے اثر اور بے ضرر اقلیت ہوں گے۔" (4)

جب برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی شعور کا یہ عالم تھا کہ 15 اگست 1947ء سے قبل انھیں اس کا اندازہ ہی نہیں تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے یا وہ اپنے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ تو پھر ان کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔

ہماری سادہ لوحی کا یہ عالم تھا کہ ہم نے برصغیر میں وطنی قومیت کی نفی کی بنیاد پر ایک بھرپور تحریک چلائی اور توقع یہ رکھی کہ جب یہ تحریک بارآور ہو گی تو یہ ایک وطنی قومیت میں تبدیل ہو جائے گی۔ 14 اگست 1947ء تک وطنی قومیت کفر تھی جو 15 اگست 1947ء کی صبح کو پاکستانی قومیت میں تبدیل ہو کر برحق ہو گئی۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ ہم حنظل کاشت کریں اور توقع یہ رکھیں کہ

اس سے فصل ہم سیب یا انار کی اٹھائیں گے۔ ایسا نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اگر قوم مذہب سے بنتی ہے تو کیا افغانی مسلمان ہمارے ہم قوم ہیں۔ اگر نہیں تو کیا ثابت ہوا؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ صرف برصغیر میں ہی قوم مذہب سے بنتی تھی اور وہ بھی 14 اگست 1947ء تک اس کے بعد یہاں بھی قوم وطن سے ہی بنے گی، تو کیا وہ بن سکی؟ ہم تو ایک ڈیم پر متفق نہیں ہو سکے ہم نے قوم کیا بننا تھا۔

کچھ دانش ور تقسیم برصغیر کے حق میں یہ دلیل دیتے ہیں (پروفیسر مرزا منور مرحوم بھی ان میں شامل تھے) کہ نبی اکرم ﷺ کی تیرہ سالہ مکی زندگی میں صرف تین صد کے قریب لوگ مسلمان ہوئے لیکن مدنی زندگی میں جب اسلام کو ریاست کی طاقت میسر آ گئی تو دس سال کے اندر پورا عرب اسلام لے آیا۔ اس دلیل کا کھوکھلا پن تو اس سے ظاہر ہے کہ وہاں تو دس سال میں پورا عرب مسلمان ہو گیا تھا لیکن ہم اہل پاکستان نے 1947ء سے لے کر اب تک کتنے لوگوں کو مسلمان کیا ہے؟ اس دور میں تو نبی کریم ﷺ کی ہجرت کے بعد ہر مکی مسلمان پر ہجرت فرض ہو گئی تھی۔ کیا ہم نے بھی برصغیر کے جملہ مسلمانوں کے لیے پاکستان کی طرف ہجرت لازم کر دی تھی۔ اگر نہیں تو نبی اکرم ﷺ کے مدنی دور سے دلیل پکڑنے سے کیا حاصل۔ ہم تو گزشتہ کئی عشروں میں بنگلہ دیش میں پڑے ہوئے پاکستانیوں کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں لیکن جرأت کا یہ عالم ہے کہ پاکستان کے لیے ریاست مدینہ کی مثال دیتے ہیں۔

جناب عطاء الرحمٰن نے یورپی یونین کی مثال دی ہے کہ پورا یورپ عیسائی ہونے کی وجہ سے ایک یونین بنا چکا ہے اور ترکی کو مسلمان ملک ہونے کی وجہ سے اس میں شامل نہیں کر رہے۔ کیا اہل یورپ پر بیسویں صدی کے آخری عشرہ میں یہ منکشف ہوا ہے کہ وہ عیسائی ہیں اس لیے ایک یونین بنا کر اکھٹے ہو جائیں۔ وہ تو صدیوں سے عیسائی ہیں اور عیسائی ہونے کے باوجود گزشتہ صدی میں دو عظیم جنگیں لڑ چکے ہیں۔ یورپین یونین کی تشکیل میں مذہب ایک وجہ تو ہو سکتا ہے لیکن واحد وجہ ہرگز نہیں ہے اس لیے اس سے زیادہ عرض نہیں کر سکتا کہ کسی قوم کی تشکیل میں مذہب ایک وجہ تو ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے لیکن تنہا مذہب آج تک کسی قوم کی تشکیل نہیں کر سکا اور نہ کبھی کر سکے گا۔

ایک سوال گزشتہ کئی سالوں سے میرے ذہن میں کلبلا رہا ہے اور اس کا ایک جواب بھی میرے پاس ہے جو میں پیش کر رہا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ برصغیر میں بیسویں صدی میں ان گنت ہندو مسلم فساد ہوئے اور ان میں زیادہ تر نقصان مسلمانوں کا ہی ہوا، لیکن انیسویں صدی میں کوئی

ہندو مسلم فساد نہیں ہوا، بلکہ 1857ء میں تو انگریزوں سے نجات کے لیے جو کوشش کی گئی تھی اس میں مسلمانوں کو ہندوؤں کا تعاون حاصل تھا۔ یہ بیسویں صدی ایسی بد بخت کیوں بن گئی کہ اس میں تعاون تو بہت دور کی بات ہے، فساد ہی فساد برپا رہا۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ انیسویں صدی تک مسلمانوں کی قیادت علماء کے پاس تھی اور وہ اسلام کے دین حق ہونے کے Status سے آگاہ تھے۔ ممکن ہے وہ اسلام کی دعوت پہنچانے میں اضمحلال کا شکار ہوئے ہوں، لیکن اس سے دستبردار بھی کبھی نہیں ہوئے تھے اور جملہ غیر مسلموں کو دعوت کا میدان سمجھتے تھے۔ انھوں نے ہندو دھرم کو کبھی اسلام کا حریف اور رقیب نہیں خیال کیا تھا، بلکہ اس قابل بھی نہیں سمجھا تھا کہ اس کی تکذیب کو ایک مہم کے طور پر اختیار کرتے۔ بیسویں صدی میں مسلمانوں کی قیادت ''لنکن ان'' سے فارغ التحصیل بیرسٹر صاحبان کے پاس آ گئی جن کی اسلام کے بارے میں آگاہی کا اکلوتا ذریعہ ایک غیر مسلم ''ڈی ایف ملاّ'' کی تالیف محمڈن لاء تھا۔ انھوں نے ہندو دھرم کو اسلام کا حریف بنا دیا۔ حریفوں میں تصادم تو معمول کی بات ہے۔ یہ ہے ہماری قیادت کی کارکردگی کا حسن! یہ ایسی قیادت تھی جس کے نزدیک تہذیب کا معیار یہ تھا کہ بائیں ہاتھ سے کھایا جائے، کھڑے ہو کر پیشاب کیا جائے اور طہارت کے لیے پانی استعمال نہ کیا جائے۔ کیا ایسی قیادت سے اس سے بہتر فیض بھی مل سکتا تھا؟ میں کوئی بڑا دانش ور یا مفکر تو نہیں ہوں، لیکن میرا احساس یہ ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں نے اسلام کو ایک دھرم بنا کر اور اس کو ہندو دھرم کا حریف بنا کر جرم عظیم کیا ہے۔ اس کی کچھ سزا تو ان کو فوراً مشرقی پنجاب میں قتل عام اور مسلمان خواتین کی آبروریزی کی شکل میں مل گئی، لیکن اس کے بعد بھی انھیں یعنی بھارت کے مسلمان کو کسی ایک شکل میں اور پاکستان کے مسلمان کو کسی دوسری شکل میں مسلسل سزا مل رہی ہے اور ملتی رہے گی۔ واللہ اعلم بالصواب!



حوالہ جات

(1) انڈیا ونز فریڈم/مولانا ابوالکلام آزاد/ص:273

(2) روزنامہ نوائے وقت (سنڈے میگزین) لاہور/21 اگست 1992ء

(3) روزنامہ جنگ (سنڈے میگزین) لاہور/22 فروری 2009ء

(4) انڈیا ونز فریڈم/ص:227-226

12

بانیِ پاکستان مسٹر محمد علی جناح، جنھیں اہل پاکستان نے امام معصوم کا درجہ دیا ہوا ہے، انھیں برصغیر کے مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کا کس قدر احساس تھا، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہو جاتا ہے جسے جناب قدرت اللہ شہاب مرحوم نے اپنی خودنوشت آپ بیتی شہاب نامہ میں بیان کیا ہے۔ واقعہ اس طرح ہے کہ تقسیم سے قبل جب شہاب صاحب اڑیسہ میں ڈپٹی ہوم سیکرٹری تھے تو چیف منسٹر کی ڈاک میں انھیں ایک خفیہ سرکلر دیکھنے کا موقع ملا جو کانگریسی چیف منسٹر صاحبان کے نام ہدایت نامہ تھا کہ وہ اپنے صوبے میں مسلمانوں سے ہر قسم کا اسلحہ تھانوں میں جمع کروالیں۔ ہر جگہ ڈی سی، آئی جی اور ایس پی ہندو لگائیں۔ محکمہ پولیس اور ضلعی انتظامیہ میں مسلمانوں کو فیلڈ ورک سے ہٹا کر بے ضرر قسم کے دفتری کاموں پر لگادیں۔ پولیس میں مسلمان سپاہیوں کو غیر مسلح کر کے پولیس لائن میں لگادیں۔ مسلمان آتش بازوں کے لائسنس معطل کر دیے جائیں اور ان کے پاس سے آتش گیر مادہ کا سٹاک فوری طور پر اٹھالیا جائے۔ یہ سب کارروائی اس لیے کی جارہی تھی کہ جب مسلمانوں کا قتل عام شروع کیا جائے تو ان کے پاس مدافعت کے لیے لاٹھی کے سوا کچھ نہ ہو۔ اس سرکلر کے مندرجات سے آگاہ ہونے کے بعد شہاب صاحب کا پریشان ہونا قدرتی امر تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس سرکلر کو جناح صاحب تک پہنچانے کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کے لیے اسی رات بغیر چھٹی لیے دہلی روانہ ہوگئے اور کئی روز کی تگ و دو کے بعد بمشکل جناح صاحب تک رسائی حاصل کر کے وہ تحریر ان کے حوالے کر دی۔ وہاں سے جو شاباش ان کو ملی اس کی تفصیل انھی کے قلم سے پڑھیے، وہ لکھتے ہیں:

''اِس بار جو مَیں نے چیف منسٹر کے کاغذات کا جائزہ لیا تو ان میں ایک عجیب دستاویز ہاتھ آئی۔ یہ چھ سات صفحات کا سائیکلو سٹائلڈ انتہائی خفیہ (Top Secret) حکم نامہ تھا، جو کانگریسی چیف منسٹروں کے نام اس ہدایت کے ساتھ جاری کیا گیا تھا کہ ہر چیف منسٹر اسے اپنی ذاتی تحویل میں رکھے۔ اس میں لکھا تھا کہ تقسیمِ ہند کا معاملہ تقریباً طے پا چکا ہے۔ اس لیے جن صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں قائم ہیں، وہاں پر مسلمان افسروں کو کلیدی عہدوں سے تبدیل کر دیا جائے۔ خاص طور پر ہوم ڈیپارٹمنٹ، فنانس ڈیپارٹمنٹ اور پریس ڈیپارٹمنٹ میں بااعتماد ہندو افسروں کو تعینات کیا جائے۔ ڈی سی، آئی جی اور ایس پی عموماً ہندو ہوں۔ تھانوں کے انچارج بھی زیادہ سے زیادہ ہندو ہوں۔ محکمہ پولیس اور ضلعی انتظامیہ میں مسلمانوں کو فیلڈ ورک سے ہٹا کر بے ضرر قسم کے دفتری کام کاج پر لگا دیا جائے۔ پولیس کی نفری میں مسلمان سپاہیوں کو بتدریج غیر مسلح کر کے پولیس لائن اور تھانوں کے اندر معمولی فرائض پر مامور کیا جائے۔ جن صوبوں میں سرحدی مسلمانوں سے بھرتی شدہ ماونٹڈ ملٹری پولیس ہے، اسے فوراً توڑ دیا جائے اور افسروں اور نفری کو اختتامِ ملازمت کی مناسب رقم یکمشت ادا کر کے رخصت کر دیا جائے۔ سرکاری خزانوں، اسلحہ خانوں اور محکمہ مال کے ریکارڈ آفسوں کی حفاظت کے لیے ہندو گارڈ تعینات کیے جائیں۔ اسلحہ رکھنے والے مسلمان لائسنس ہولڈرز کی نقل و حرکت کی نگرانی کی جائے۔ ایسے ہنگامی منصوبے تیار رکھے جائیں جن کے تحت ان لائسنس داروں سے قلیل ترین نوٹس پر ہر قسم کا اسلحہ قریبی تھانے میں جمع کروایا جا سکے۔ کاروں، بسوں، ٹیکسیوں اور ٹرکوں کے مسلمان مالکوں کی فہرستیں بنا کر ان پر کڑی نظر رکھی جائے۔ مسلمان آتش بازوں کے لائسنس معطل کر دیے جائیں، اور ان کا آتش گیر سٹاک فوری طور پر پولیس کی حفاظت میں لے لیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ ہر چیف منسٹر کو نہایت سخت تاکید کی گئی تھی کہ وہ ان ہدایات پر ایسی خوش اُسلوبی سے عمل درآمد کرے کہ اس سے آبادی کے کسی فرقے کے خلاف کسی قسم کے امتیازی سلوک کا پہلو مترشح نہ ہو! بغل میں چھری اور منہ میں رام رام کا اس سے بہتر ظہور چشمِ تصور میں لانا محال ہے۔

یہ دستاویز پڑھ کر تھوڑی دیر میرے دل میں ایک عجب سی کشمکش ہوتی رہی۔ ڈپٹی ہوم سیکرٹری کا پیشہ ورانہ ضمیر میرے اندر چھپے ہوئے بے عمل، ناقص اور خوابیدہ سے مسلمان کے ضمیر کے ساتھ ٹکرا گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ تھوڑی سی لڑائی کے بعد جیت ٹوٹے پھوٹے مسلمان ہی کی ہوئی۔ چنانچہ میں نے یہ دستاویز اُٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لی اور اُسی رات قائداعظم سے ملاقات کرنے کی نیت سے دہلی روانہ ہو گیا۔

ان دنوں مسٹر کے ایچ خورشید قائداعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ اگر وہ دہلی میں موجود ہوتے تو غالباً مجھے قائداعظم سے ملنے میں کوئی دِقت پیش نہ آتی لیکن وہ موجود نہ تھے۔ ایک دو روز کی تگ و دو، منت سماجت اور حیلے بہانوں کے بعد آخر بڑی مشکل سے مجھے قائداعظم تک رسائی حاصل ہوئی۔ جب میں ان کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ فارغ ہو کر ایک نظر مجھ پر ڈالی اور گرجدار آواز میں بولے، ''کیا بات ہے؟''

''سر! میں آپ کے لیے ایک مفید دستاویز لے کر آیا ہوں۔ میرا نام قدرت اللہ شہاب ہے۔ میں اڑیسہ میں ڈپٹی ہوم سیکرٹری ہوں۔'' میں نے ایک ہی سانس میں زیادہ سے زیادہ باتیں کہنے کی کوشش کی۔

''کیسی دستاویز؟''

میں نے آگے بڑھ کر کانگریس کا سرکلر اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ وہ بڑے سکون سے اسے پڑھتے رہے۔ میں کھڑا ہوا اُن کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ ان کے جذبات میں ہلکا سا ارتعاش بھی پیدا نہ ہوا۔ ایک بار پڑھ چکے تو مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور فرمایا، ''ہاں، یہ ہمارے لیے مفید ہو سکتی ہے۔''

یہ کہہ کر وہ دوبارہ اس کے مطالعے میں مصروف ہو گئے۔ اس کے بعد مجھ سے دریافت کیا، ''یہ تم نے کہاں سے حاصل کی ہے؟''

میں نے فر فر ساری بات کہہ سنائی۔

''ویل، ویل...... تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، "This is breach of trust"۔ (یہ بددیانتی ہے)''

میں نے اپنا قومی فرض پورا کرنے کے موضوع پر تقریر کرنے کی کوشش کی تو قائداعظم نے مجھے کسی قدر سختی سے ٹوک دیا، اور فرمایا:

"Don't you see each copy is numbered? Its disappearance would be easily tracked down to you. Are you prepared to face the consequences?"

(تم دیکھتے نہیں کہ اس پر کاپی نمبر لگا ہوا ہے۔ اس کے غائب ہونے کے ذمہ دار کے طور پر بہ آسانی تمھارا سراغ لگ جائے گا۔ کیا تم اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو؟)

میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا:

"Yes Sir! I am fully prepared."

(ہاں جناب! میں ہر طرح سے تیار ہوں۔)

''کیا میں اسے اپنے پاس رکھ سکتا ہوں؟'' قائداعظم نے دستاویز کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''جی ہاں، سر۔ یہ میں آپ ہی کے لیے لایا ہوں۔''

''آل رائٹ۔ تم جا سکتے ہو۔'' قائداعظم نے حکم دیا۔

میں دروازے سے باہر نکلنے لگا تو قائداعظم نے بلند آواز سے پکار کر پوچھا: ''تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟''

''قدرت اللہ شہاب''

''بوائے، دوبارہ ایسی حرکت نہ کرنا۔'' قائداعظم نے کہا۔

مجھے نہیں معلوم کہ اُس وقت ان کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ تھی یا نہیں تھی، لیکن ان کے لہجے میں مجھے شفقت کا ہلکا سا گداز ضرور محسوس ہوا۔

یہ اپریل 1947ء کی بات ہے۔ اُس وقت ہندستان کی بساطِ سیاست پر مسلمانوں کے خلاف جو خطرناک چالیں چلی جا رہی تھیں، ان کا پس منظر بڑا سبق آموز

ہے۔''(1)

اس تحریر سے آگاہ ہونے کے بعد جناح صاحب نے مسلمانوں کی جان و مال کے تحفظ کے لیے کیا ہوم ورک کیا؟ مجھے کسی ذریعے سے بھی آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ ممکن ہے انھوں نے وائسرائے سے بات کر لی ہو کیونکہ وہ تو وکیل تھے اور وکیل تو یہی کچھ کیا کرتے ہیں۔ اگرچہ کسی جگہ بھی یہ ریکارڈ پر نہیں کہ انھوں نے وائسرائے کو وہ تحریر دکھا کر مسلمانوں کے جان و مال کے تحفظ کی اپیل کی ہو کیونکہ مسلمانوں کی جان و مال کا تحفظ ان کا مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اسی لیے برصغیر میں وہ قتل و غارت اور تباہی و بربادی ہوئی کہ جس کی مثال پوری دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ہندوؤں کی خفیہ دستاویز شہاب صاحب کے ہاتھ سے جیسے ہی جناح صاحب کے ہاتھوں میں گئی، جناح صاحب نے اُسے دیکھا پڑھا۔ ان کے اندر مسلمانوں کا یا انسانوں کا درد ہوتا تو وہ لازماً پریشان ہو جاتے۔ شہاب صاحب بھی کچھ اسی طرح کی توقع ان سے وابستہ کیے ہوئے تھے، جبکہ وہ ذرا بھی پریشان نہ ہوئے بلکہ مسکراتے رہے۔ انھوں نے تو اُلٹا شہاب صاحب کو ہی ڈانٹا۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ دل میں پیشگی خوش ہو رہے تھے کہ ان کی ہندو مسلم منافرت اپنی انتہا کی طرف بڑھ رہی ہے۔ قتل مسلم سے ان کا من گھڑت دو قومی نظریہ سچ ثابت ہونے چلا ہے۔ ان کی یہ خواہش نہ ہوتی تو لازماً وہ اس خفیہ دستاویز کے ملنے کے بعد کچھ تو کرتے۔ کم از کم وائسرائے کے علم میں لاتے یا ایک بیان ہی اخبارات کو جاری کر دیتے۔ لیکن انھوں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا، جبکہ ان کی تو تمام سیاست ہی ہندو مسلم منافرت کو فروغ دینے پر مبنی تھی۔ ان کی تو گویا زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہی یہ تھا۔ تقسیم ہند کے موقع پر مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا اور خواتین کی جس قدر عصمت دری ہوئی اس کی پوری انسانی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ اس قتل و غارت اور خواتین کی عصمت دری کی تمام ذمہ داری مسٹر جناح اور مسلم لیگ پر عائد ہوتی ہے۔ انھوں نے اس قتل و غارت سے بچاؤ کے لیے قطعاً کوئی کوشش نہیں کی۔ جبکہ ہندستان کے دوسرے رہنما، جناح صاحب اور مسلم لیگ کی ہندو مسلم منافرت کے فروغ کی سیاست کے نتیجے میں تقسیم ہند کے موقع پر ہونے والی متوقع قتل و غارت سے پیشگی تشویش میں مبتلا تھے، اور وہ پکار پکار کر اس خطرے سے خبردار کر رہے تھے۔

انگریز مصنف لوری کولنز اور ڈانیک لیپئیر اپنی کتاب فریڈم ایٹ مڈنائٹ میں مسٹر گانڈھی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"Gandhi did not oppose partition simply out of some mystical devotion to Indian unity. His years in the villages of India had given him an intuitive feeling for the soul of his country. Partition, that intiution told him , was not going to be the surgical operation.Jinnah has promised Mountbatten, it would be a sickening slaughter that would turn friend on friend, neighbour on neighbour,stranger on stranger,in thousands of these villages he knew so well.Their blood would be shed to achieve an abhorrent,useless end ,the division of the sub-continent into two antagonistic parts condemned to gnaw at each other`s entrails.Genrations of Indians for the decades to come, Gandhi believe, would pay the price of the error they were preparing to commit."(2)

"گاندھی کے تقسیم کی مخالفت کرنے کا سبب ہندستان کی وحدت سے کوئی روحانی لگاؤ نہیں تھا۔ ہندستان کے دیہات میں گزارے ہوئے برسوں کے تجربے کے نتیجے میں انھیں ہندستان کی روح سے ایک وجدانی آگاہی حاصل ہو چکی تھی اور اس وجدان کی وجہ سے انھیں اندازہ تھا کہ تقسیم اس قسم کا سرجیکل آپریشن نہیں ہوگا جس کا وعدہ جناح وائسرائے سے کر رہے ہیں بلکہ یہ ایک مکروہ قسم کی قتل و غارت ہوگی اور ان ہزاروں دیہات میں، جنھیں وہ بخوبی جانتے تھے، دوست دوست کا، پڑوسی اپنے پڑوسی کا اور اجنبی اجنبی کا گلا کاٹے گا۔ یہ خون ایک لایعنی مقصد کے حصول کی خاطر بہایا جائے گا۔ برصغیر کی دو ایسے دشمن حصوں میں تقسیم ہوگی، جو ہمیشہ ایک دوسرے کو کچا چبا جانے کے لیے تیار ہوں گے۔ گاندھی کا خیال تھا کہ جو غلطی وہ (یعنی جناح صاحب اور اُن کے

ساتھی) کرنے جا رہے ہیں اس کا خمیازہ آنے والی نسلیں کئی دہائیوں تک بھگتیں گی۔"

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو اس تمام صورت حال کا ادراک تھا۔ انھوں نے مارچ 1947ء میں لاہور میں ایک اجلاس میں نہایت کرب انگیز لہجے اور بہت واشگاف الفاظ میں کہا تھا:

"مجھے صاف نظر آ رہا ہے، میں دیکھ رہا ہوں کہ دور دور تک آگ لگی ہوئی ہے۔ مکان جل رہے ہیں، دکانیں لوٹی جا رہی ہیں اور قزاق عصمتیں اڑائے سرپٹ دوڑ رہے ہیں۔ ماں بیٹے کو چھوڑ چکی، باپ بیٹی کو ہار چکا ہے۔ بھائی بہن کو بھول گیا ہے اور خاوند بیوی سے الگ ہو گیا ہے۔ سب رشتے ٹوٹ گئے ہیں، چاروں طرف قیامت کا صور پھنک گیا ہے، دریاؤں میں خون ہے، ہواؤں میں دھواں، دھرتی طوطا چشم ہو گئی ہے۔ سیاست دانوں نے جغرافیائی نقشہ اٹھا کر اس پر ضرب و تقسیم کی ہے، لیکن اس کی بدولت بڑی مدت کے لیے انسان مر گیا ہے۔ برصغیر میں تبلیغ کا دروازہ بند اور جذبۂ جہاد ختم کرنے کی سازش ہو رہی ہے۔ ہم نے سیاسی حقوق کے حصول کی خاطر دینی فرائض سے بغاوت کر دی ہے۔ مسلمانوں کو تیاری کے بغیر ایک ایسی آگ میں جھونک دیا گیا ہے جس کا واحد نتیجہ ہمہ گیر تباہی ہے۔ اگر مسلمانوں کے ساتھ بدعہدی کی گئی تو پاکستان سیاسی مفاد پرستوں اور قومی غداروں کی آماجگاہ بن جائے گا: لعنت بر پدرِ فرنگ!

میاں! آج ہنستے ہو کل روؤ گے۔ تم نہیں دیکھ سکتے، میں دیکھ رہا ہوں۔ جو کچھ بیت رہا اور جو کچھ بیتنے والا ہے۔ ایک وبا پھوٹ چکی اور ایک وبا آ رہی ہے۔ بند ٹوٹ چکا اور سیلاب کا رُکنا محال ہے۔

ہاں بھائی! انگریز کا مفاد اسی میں ہے کہ بستیاں کوئلہ ہو جائیں اور لوگ قتل ہوں۔ آخر جانے سے پہلے فرنگی بابا آزادی کی قیمت لے کر ہی جائے گا۔ تم نے آزادی مانگی تھی، یہ لو آزادی۔ یہ اس کی پہلی قسط ہے۔

قدرت کبھی معاف نہیں کرتی۔ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ میری آنکھیں بہت کچھ دیکھ چکی ہیں اور بہت کچھ دیکھ رہی ہیں۔ میں نے ہوا کا رُخ جس طرف دیکھا ہے

تم اس کے برعکس دیکھو گے۔ برہنہ گفتگو کا موقع نہیں ورنہ جو کچھ جہد آزادی کے دور میں ہوتا رہا اور برطانوی سرکار نے خود کاشتہ خاندانوں کے لیے جو کچھ کیا یا ان خاندانوں نے برطانوی سرکار کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ روداد اتنی تلخ ہے کہ عرش وفرش کانپ اٹھتے ہیں۔''(3)

جبکہ انگریز مصنف لوری کولنز اور ڈانیک لیپئیر (Larry Collins & Dominique Lapierre) اپنی مشترکہ تصنیف فریڈم ایٹ مڈنائٹ میں مسٹر جناح کی سوچ، فکر اور رویے کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"When Mountbatten expressed concern lest partition might produce bloodshed and violence, Jinnah reassured him. Once his` surgical operation had taken place,all troubles would cease and India`s two halves would live in harmony and hapiness. It was, Jinnah told Mountbatten, like a court case he had handled between two brothers, embittered by the shares assigned to them under their father`s will.Yet, two years after the court had adjudicated their dispute, they were the greatest friends. That, he promised the viceroy, would be the case in Inidia." (4)

''جب ماؤنٹ بیٹن نے ان خدشات کا اظہار کیا کہ تقسیم کے نتیجے میں تشدد اور خون خرابا ہو سکتا ہے تو جناح نے انھیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا کہ جب ایک مرتبہ ان کا سرجیکل آپریشن مکمل ہو جائے گا تو تمام مسائل ختم ہو جائیں گے اور ہندستان کے دونوں حصے اتفاق اور خوش اُسلوبی سے رہنے لگیں گے۔ جناح نے کہا کہ اس کی مثال

ان کے ایک مقدمے کی سی ہے جو دو بھائیوں کے اپنے والد کی جائداد کی تقسیم کے تنازعے کی بنا پر تھا، جس کا اس نے فیصلہ کروایا۔ جب عدالت نے مقدمے کا فیصلہ کر دیا تو دو سال بعد دونوں آپس میں بہترین دوست بن گئے۔ انھوں نے وائسرائے کو یقین دلایا کہ ہندستان میں بھی یہی صورتِ حال ہوگی۔''

سوال یہ ہے کہ گاندھی جی اور شاہ جی نے اپنی بصیرت وفراست سے تقسیم ہند کے موقع پر قتل و غارت کے حوالے سے جو کچھ فرمایا تھا وہ درست ثابت ہوا یا جناح صاحب جو کچھ کہہ رہے تھے وہ صحیح ثابت ہوا۔ حقیقت یہ ہے تقسیم ہند کے موقع پر ہونے والی قتل وغارت نے ثابت کر دیا ہے کہ جناح صاحب ایک انتہائی بے بصیرت انسان تھے۔ بصیرت وبصارت اور فراست سے ان کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔

مسلم لیگ کی انتہائی ہندو مسلم منافرت پر مبنی اشتعال انگیز سیاست کے نتیجہ میں فسادات اور قتل وغارت کے آثار تو اہل بصیرت وفراست بہت پہلے سے ہی محسوس کر رہے تھے، لیکن جیسے جیسے آزادی کی منزل قریب آ رہی تھی، فضا میں شدید تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ بعض بعض مقامات پر فسادات کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ ایسے وقت میں ضرورت تھی کہ صبر و تحمل سے کام لیا جاتا، لیکن راولپنڈی اور اس کے مضافات میں مسلم لیگ کے جیالوں نے 15 اگست سے سوا دو مہینے پہلے ہی ہندوؤں اور سکھوں کا قتل عام کر کے گویا ہندستان کے دوسرے علاقوں میں ہندوؤں اور سکھوں کو مسلمانوں کے قتل عام کی دعوت دے دی تھی۔ معروف ادیب جناب ڈاکٹر رشید نثار نے ''میں نے پاکستان بنتے دیکھا'' کے زیر عنوان ایک انٹرویو میں بتایا:

''اس وقت پورے برصغیر کے مسلمانوں میں ایک جوش اور ولولہ تھا۔ میں بھی ایک نوجوان کی حیثیت سے تحریک پاکستان کے آخری مرحلے میں پُرجوش رہا۔ لیکن راولپنڈی چھاؤنی کے بعض مسلم لیگیوں کا کردار مجھے پسند نہ آیا، جنھوں نے 6 مارچ 1947ء کو ڈھیری حسن آباد، راولپنڈی میں انتظامیہ اور پولیس کے ساتھ مل کر بلوہ کرا دیا، جس کے نتیجے میں بے شمار غیر مسلم (ہندو، سکھ) مارے گئے۔ اس بلوے کا وقوع پذیر ہونا تھا کہ امرتسر اور بعد ازاں پورے ہندستان میں آگ لگ گئی اور سارا خمیازہ امرتسر کے بے گناہ مسلمانوں نے سکھوں کے ہاتھوں مظالم کی صورت میں بھگتا اور

یہی نہیں، یہ فسادات سارے ہندستان میں پھیل گئے۔''(5)

جیسے ہی آزادی کا اعلان ہوا ادھر لاہور میں لیگیوں نے کیا گل کھلائے، نوائے وقت کے چیف ایڈیٹر جناب مجید نظامی نے ایک انٹرویو میں بتایا:

''میں سمجھتا ہوں کہ علی گڑھ یونیورسٹی، اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور اور اسلامیہ کالج پشاور، ان تین اداروں کے طلبہ نے تحریک پاکستان کے دوران قائداعظمؒ کے جیش اول کا رول ادا کیا۔ ان کا پاکستان بنانے میں بڑا ہاتھ ہے۔ قیام پاکستان کے وقت اگر بھارت میں شامل ہونے والے علاقوں میں مسلمانوں کے خلاف فسادات شروع ہو گئے تھے تو مسلمانوں نے بھی اپنے علاقوں میں اس کا جواب دیا تھا۔ لاہور کی شاہ عالم مارکیٹ، جس میں سو فیصد دکانیں ہندوؤں کی تھیں، اسے مکمل طور پر جلا دیا گیا اور تقریباً ہر علاقے میں فسادات ہوئے تھے۔ میں نے خود ریگل چوک میں ایک سکھ کو مرتے ہوئے دیکھا۔''(6)

راولپنڈی میں مسلم لیگیوں نے ہندوؤں اور سکھوں کا جو قتل عام کیا تھا، اس میں سکھوں کے سب سے بڑے لیڈر ماسٹر تارا سنگھ کا نہ صرف خاندان بلکہ ان کی سگی ماں کو بھی بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔ سردار شوکت حیات خاں اپنی خودنوشت سوانح حیات گم گشتہ قوم میں لکھتے ہیں:

''تارا سنگھ نے جب راولپنڈی ڈویژن میں قتل و غارت کی اطلاع سنی تو اس نے سکھوں کو بدلہ لینے کے لیے علانیہ اکسایا۔ وہ اپنی ماں کے قتل کا بدلہ، جو راولپنڈی ڈویژن میں میرے جانے سے قبل ہو چکا تھا، اس نے اسمبلی ہال کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر چیخ چیخ کر کہا، ''پاکستان بن کے رہے گا قبرستان''۔ جس کا مطلب تھا کہ پاکستان کے وجود میں آنے کی بجائے قبرستان وجود میں آئے گا۔ میں اتفاق سے ادھر سے گزر رہا تھا۔ میں نے رک کر خود اس شرانگیز نعرے کو سنا۔ تارا سنگھ اب مسلمانوں کے نرغے میں تھا، وہ اسے قتل کرنا چاہتے تھے۔ میں فوراً اس کے پاس پہنچ گیا اور اسے کہا کہ وہ احمقانہ بہادری نہ دکھائے۔ میں نے اسے اپنی کار میں ڈالا اور بحفاظت ہجوم سے باہر نکال لایا۔ سکھ قوم کا ہر فرد خون کے پیاسے لیڈروں کے زیر کمان قتل عام برپا کیے ہوئے تھا۔ انھوں نے امرتسر میں قتل عام کیا۔ سینکڑوں مسلمان

قتل یا معذور ہوئے۔''(7)

مسٹر جناح نے من گھڑت اور گمراہ کن دو قومی نظریہ کو سچ ثابت کرنے کے لیے ہندو مسلم منافرت کو فروغ دیا اور اس مقصد کے لیے سخت اشتعال انگیزی کی، اس کے نتیجے میں ہندو اور سکھوں نے مسلمانوں کو، اور مسلم لیگیوں نے ہندوؤں اور سکھوں کو جس بے دردی سے قتل کیا اور ایک دوسرے کی عورتوں کی عصمت دری کی اس کی مثال نہیں ملتی۔ طبیعت پر جبر کر کے صرف دو مثالیں پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ سکھ ادیب جسونت سنگھ راز لکھتا ہے:

''ہمیں پریتم سنگھ اروڑہ امرتسری نے بتایا کہ سب سے بڑا ظلم جو گرو کی نگری امرتسر میں سکھ بدمعاشوں نے کیا وہ یہ تھا کہ مغویہ مسلمان عورتوں کو کئی مساجد میں جمع کیا اور قرآن پاک کی جلدوں کو نیچے بچھا کر بے بس عورتوں کو بے آبرو کیا۔ مسجد خیر دین میں ایسا واقعہ پریتم سنگھ نے بچشم خود دیکھا۔''(8)

دوسرے واقعہ کے راوی علامہ محمد اسد (نومسلم) ہیں۔ علامہ صاحب اگست 1947ء میں ہندستان میں تھے اور ڈلہوزی کو انھوں نے اپنا مستقر بنایا ہوا تھا۔ جہاں وہ امام بخاریؒ کے جمع کردہ ذخیرہ احادیث (صحیح بخاری) کا انگریزی ترجمہ کرنے میں مصروف تھے۔ اس کام کے لیے انھیں علامہ اقبال مرحوم نے آمادہ کیا تھا۔ تقسیم ملک کا جو ابتدائی اعلان ہوا تو اس کے مطابق ضلع گرداسپور پاکستان میں شامل تھا۔ چنانچہ علامہ صاحب مطمئن رہے کہ ڈلہوزی پاکستان میں ہے۔ چند دن بعد وہ کسی وجہ سے باہر نکلے تو ایک سرکاری عمارت پر انھیں ترنگا لہراتا ہوا نظر آیا۔ انھوں نے خیال کیا کہ کوئی غلط فہمی ہو گی۔ تاہم جب انھوں نے جا کر دریافت کیا تو ان کو بتایا گیا کہ (ہمارے قائد محترم کے شوق حکمرانی کی وجہ سے) اب گرداسپور بھارت کا حصہ ہے اور ڈلہوزی بھی بھارت میں شامل ہے۔ اگلے روز ہی مسلمانوں کے قتل اور مسلمان عورتوں کی آبروریزی کی خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ چنانچہ ایسی افراتفری میں علامہ صاحب وہاں سے نکل کر لاہور آ گئے کہ اس وقت تک کا کیا ہوا کام بھی ساتھ نہ لا سکے۔ لاہور آنے کے بعد وزیراعلیٰ پنجاب نواب ممدوٹ صاحب کی خواہش پر وہ حکومت پنجاب سے وابستہ ہو گئے۔ وہ اپنی خودنوشت آپ بیتی بندۂ صحرائی میں لکھتے ہیں کہ:

''(حکومت پنجاب کی طرف سے ڈالی گئی) اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے

علاوہ میں ہر روز بیسیوں رضا کاروں کے ساتھ ہندستان سے آنے والے ہزاروں مہاجرین کی بنیادی ضروریات زندگی فراہم کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ ایک روز مشرقی پنجاب (ہندستان) کے شہر فیروز پور کے اسٹیشن ماسٹر کا ٹیلی فون موصول ہوا۔ اس نے اطلاع دی کہ مقررہ پروگرام سے ہٹ کر ابھی ابھی مہاجر عورتوں کی ایک گاڑی روانہ ہوئی ہے اور وہ چند گھنٹوں میں قصور کی سرحد پر پہنچ جائے گی۔ میں نے جلدی جلدی لاریوں کا انتظام کیا اور رضا کاروں کو اُن پر سوار کر کے قصور کی طرف روانہ ہو گیا۔ قصور پہنچا تو وہاں میرے انتہائی مخلص اور پرانے دوست مولانا عبداللہ قصوری اور اُن کے بیٹے محمود علی قصوری سے ملاقات ہوئی۔ ہم سب ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ ایک گھنٹہ بعد وہ گاڑی بھی پہنچ گئی۔ اس میں ہر عمر کی کم از کم دوسو عورتیں تھیں اور یہ دیکھ کر ہم سب کے اوسان خطا ہو گئے کہ یہ سب مادرزاد برہنہ تھیں۔ لیکن انھوں نے شرم وحیا اور ضبطِ نفس کے نسوانی ماحول میں پرورش پائی تھی اور اب انھیں اسی برہنہ حالت میں گاڑی سے نیچے اتارا جا رہا تھا جس میں ان کی ولادت ہوئی تھی۔ ان میں نوجوان، عمر رسیدہ عورتیں اور نابالغ لڑکیوں کی لاشیں تھیں۔''(9)

ان مسلمان عورتوں کو اس حالت میں پہنچانے سے قبل ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہوگا، بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

جناح صاحب کے ''فضائل و مناقب'' میں کئی کتابیں لکھنے والے لیگی قلم کار جناب منشی عبدالرحمٰن خاں نے تقسیم ہند کے موقع پر مسلمانوں کے جانی و مالی نقصانات کا تخمینہ اپنی ایک تحریر میں پیش کیا ہے، جو حسب ذیل ہے:

''1947ء کے پُر آشوب دور میں پندرہ لاکھ مسلمانوں کو قتل کیا گیا، ایک لاکھ مسلمان عورتوں کو جبراً اغوا کیا گیا، اسّی لاکھ مسلمانوں کو اربوں روپے کی جائیداد و مال سے محروم کر دیا گیا، مسلمان عورتوں کی عام شاہراہوں پر بہیمانہ عصمت دری کی گئی، حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے جھنڈے بنائے گئے، بچوں کو ہلاک کر کے ان کے گوشت کے ٹکڑے زبردستی ان کی ماؤں کے منہ میں ٹھونسے گئے، برہنہ عورتوں کے سڑکوں پر جلوس نکالنے کے بعد اُنھیں تہ تیغ کر دیا گیا، سڑکوں پر لاشوں کے انبار لگ

گئے کہ گزرنا مشکل ہو گیا تھا اور معصوم بچوں کو نیزوں اور سنگینوں پر چڑھا کر رقص کیا گیا اور قہقہے لگائے گئے۔ مسلمانوں کے اس سفاکانہ قتل و غارت کے مقابلہ میں چنگیز خاں کی ہلاکت آفرینیاں اور بہ دورانِ غدر انگریزوں کی سفاکیاں ماند پڑ گئیں، بہادر شاہ ظفر اور اس کے شاہی خاندان کی خونچکاں داستان کی کوئی اہمیت نہ رہی، دہلی کی اتنی تاخت و تاراج ہوئی کہ بغداد اور قرطبہ کے کھنڈرات میں زلزلہ آ گیا اور جنگ عظیم کی تباہ کاریاں اس محاربۂ عظیم کے سامنے ہیچ ہو کر رہ گئیں۔''(10)

مسٹر جناح کی سیاستِ بد کے نتیجہ میں جو حالات پیدا ہوئے، جو واقعات رونما ہوئے مَیں سمجھتا ہوں سب ہی شرم ناک ہیں بلکہ دلوں کو دہلا دینے والے ہیں لیکن ہماری جو مائیں، بہنیں بیٹیاں اپنی عصمتیں لٹا کے یا بچا کے جیسے تیسے ''پاک سرزمین'' میں پہنچیں، جناحی جیالوں نے تحفظ کے نام پر اُنھیں کیمپوں سے لے جا کر ان کے ساتھ جو حرام زدگی کی، یعنی ان کی عصمتیں تار تار کیں، وہ بے غیرتی، بے حیائی اور بے شرمی کی انتہا ہے۔ گمراہ کن ''دوقومی نظریہ'' میں جناح صاحب کے حلیف و ہم خیال مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا تھا کہ:

''حد یہ ہے کہ قوم کی جو بیٹیاں ہندستان کے ظالموں سے بچ کر آ گئی تھیں، ان کی عصمتیں یہاں خود اپنے بھائیوں کے ہاتھوں میں محفوظ نہ رہ سکیں، اس قسم کے واقعات شاذ نہیں ہیں بلکہ بکثرت ہمارے عِلم میں آئے ہیں، اور ان شرم ناک جرائم کے مرتکب عرف عام شُہدے ہی نہیں تھے......''(11)

مسلم لیگیوں نے ایسی بے غیرتی اور کمینگی بہ کثرت کی، ثبوت کے لیے جناب قدرت اللہ شہاب کی کتاب یا خدا کا مطالعہ کیا جائے۔

مولانا مودودی نے ہی اپنے ایک دوسرے مضمون جو دراصل مسٹر جناح، ان کے رفقا (کھوٹے سکوں) اور ان کی جماعت کے خلاف چارج شیٹ ہے، میں لکھا تھا کہ:

''اس قیادت کی غلطیاں اس سے بہت زیادہ ہیں کہ چند سطروں میں انھیں شمار کیا جا سکے۔ مگر اس کی چند غلطیاں تو اتنی نمایاں ہیں کہ آج ہر ذی ہوش آدمی ان کو بُری طرح محسوس کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر:

1) اس نے حصولِ پاکستان کی جنگ میں ان علاقوں کے مسلمانوں کو شریک کیا جنھیں

لامحالہ ہندستان ہی میں رہنا تھا۔ آج یہ اسی کا خمیازہ ہے کہ ہندستان کی سرزمین اُن غریبوں کے لیے جہنم بن گئی ہے۔ حالانکہ اگر تقسیم کے بعد ہندستانی اور پاکستانی مسلمانوں کا مستقبل ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو جانے والا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ تقسیم سے پہلے دونوں کی پالیسی ایک ہوتی۔

2) اس نے ہندستانی مسلمانوں کو ایک ہفتہ پہلے بھی خبردار نہ کیا کہ تقسیم کے وقت اُن پر کیا طوفان ٹوٹنے والا ہے۔ اگر فی الواقع اسے ان حالات کا اندازہ ہی نہ تھا تو اس کی غفلت و بےخبری قابلِ ماتم ہے۔ اور اگر اس نے جان بوجھ کر مسلمانوں کو بےخبر رکھا تو اس غداری کے لیے اسے کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔

3) جن لیڈروں پر ہندستان کے مسلمان آخر وقت تک اندھا اعتماد کیے ہوئے تھے وہ عین وقت پر انھیں چھوڑ کر پاکستان اٹھ آئے اور انھیں کچھ بھی نہ بتایا کہ ان کے پیچھے وہ کیا کریں۔

4) جو عجیب و غریب ہدایت ہندستان کے مسلمانوں کو دی گئی وہ یہ تھی کہ ایک رات میں وہ اُن سارے اصولوں کو نگل جائیں جن پر وہ دس برس سے کانگریس کے خلاف لڑ رہے تھے۔ 14 اگست کا سورج دو قومی نظریے کا کلمہ پڑھتے ہوئے غروب ہوا اور 15 اگست کا سورج طلوع ہوتے ہی ہر ہندی مسلمان ہندستانی قومیت کا معتقد بن کر اُٹھے۔

5) پچھلے دس سال کی قومی تحریک میں اسلام کا نام جس قدر لیا گیا اُس کا پچاسواں حصہ بھی مسلمانوں کے اندر اسلامی اخلاق پیدا کرنے کے لیے کام نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کے قومی اخلاق کو پہلے سے کچھ زیادہ ہی پست کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ قومی جنگ میں مسلمان ان تمام اخلاقی جرائم کے مرتکب ہوئے، جن کا ارتکاب ان کے حریفوں نے کیا۔ مظالم کی مقدار میں چاہے کتنا ہی فرق رہا ہو، مگر مظالم کی نوعیت میں دونوں کے کارنامے ایک دوسرے سے کچھ بھی مختلف نہ رہے تھے۔ اگر ہماری قومی قیادت نے ہمارے عوام کی اخلاقی تربیت کے لیے کوئی کوشش کی ہوتی اور اکثریت کے علاقوں کے مسلمان وہ حرکات نہ کرتے جو انھوں نے کیں تو اقلیت کے مسلمان اس بری طرح

نہ پیسے جاتے، اور آج پاکستان کی اخلاقی پوزیشن ہندستان سے اتنی زیادہ اونچی ہوتی کہ ہندستان اس سے آنکھ ملا کر بات نہ کر سکتا۔"(12)

1947ء میں مسلم لیگیوں نے جو قتل و غارت اور جو لوٹ کھسوٹ کی، اس پر نظامی صاحب فخر کرتے ہیں، اس حوالہ سے مودودی صاحب کی رائے آپ اوپر پڑھ چکے ہیں۔ ممتاز دانش ور روزنامہ پاکستان لاہور کے چیف ایڈیٹر جناب مجیب الرحمٰن شامی کی رائے بھی ملاحظہ ہو۔ شامی صاحب نے ایکسپریس نیوز چینل کے پروگرام "کالم کار" میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا:

"قیامِ پاکستان کے وقت لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ لوگ بےگھر ہوئے، ہم خود ان میں شامل تھے۔ اگر ہندوؤں کی جانب سے مسلمانوں کے قتلِ عام کے جواب میں ہمارے ہاں ہندوؤں کو قتل نہ کیا جاتا تو ہم اخلاقی لحاظ سے ہندوؤں سے آگے ہوتے۔"(13)

لیکن مسلم لیگ کے جیالوں نے تو قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ میں پہل کر کے ہندوؤں اور سکھوں کو اُکسایا اور بھڑکایا تھا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری قیادت نے ہوم ورک مسلمانانِ برصغیر کو قتل و غارت سے بچانے کے لیے نہیں بلکہ انھیں ہولناک قتل و غارت اور تباہی و بربادی سے دوچار کرنے کے لیے کیا تھا۔ سنتے ہیں کہ ایک انسان کے قاتل کو اُس کا ضمیر ملامت کرتا رہتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ شخص صحیح طرح سے سو بھی نہیں سکتا۔ مگر مسٹر جناح اور ان کے رفقا (کھوٹے سکے) کتنے بےرحم اور کتنے سنگ دل تھے کہ ان کی بےحمیت سیاست و قیادت کے نتیجہ میں لاکھوں مسلمان قتل ہوئے اور ہزاروں عورتوں کی بےحرمتی ہوئی، لیکن اس پر انھوں نے نہ کبھی ندامت و افسوس کا اظہار کیا اور نہ کبھی پسماندگان سے معافی مانگنے کی ضرورت محسوس کی۔ حالانکہ تقاضا تو یہ تھا کہ وہ فوراً قیادت سے مستعفی ہو جاتے، مگر وہ تو گورنر جنرل بننے کی تیاریوں میں لگے ہوئے تھے۔ یاد رکھیے اللہ تعالیٰ ان سفاک قاتلوں کو کبھی معاف نہیں کرے گا، بلکہ ان سے روزِ حشر اُن لاکھوں مسلمانوں کی جان کا اور ہزاروں مسلمان عورتوں کی آبرو کا قصاص ضرور لے گا اور یقیناً یہ لوگ اپنے اس جرمِ عظیم کی پاداش میں قیامت تک عذابِ قبر میں بھی مبتلا ہوں گے۔

پوری دنیا میں اقلیتیں مخلوط انتخابات اپنے لیے مفید اور جداگانہ انتخابات اپنے لیے نقصان دہ

سمجھتی ہیں، لیکن ایک برصغیر کے مسلمان ہیں کہ انھوں نے متحدہ برصغیر میں مخلوط انتخابات کو اپنے لیے نقصان دہ اور جداگانہ انتخابات کو اپنے لیے مفید خیال کرتے ہوئے ان کا حق اپنے لیے حاصل کیا۔ اگر امریکا میں یہودیوں کے لیے جداگانہ انتخابات ہوتے تو دنیا کا نقشہ ہی مختلف ہوتا اور یہودی امریکا میں ایک بے ضرر سی اقلیت ہوتے۔ مخلوط انتخابات میں تو اقلیت ہمیشہ اکثریت کو بلیک میل کرنے کی پوزیشن میں ہوتی ہے اور اپنی ہر بات منوا لیتی ہے جس طرح کہ امریکا میں یہودی جو چاہتے ہیں ہو جاتا ہے، خواہ اسمبلی میں ان کا ایک نمائندہ بھی نہ ہو جبکہ جداگانہ انتخابات کی صورت میں اقلیت ہمیشہ اقلیت ہی رہتی ہے اور اکثریت کے رحم و کرم پر ہوتی ہے، اگرچہ اسمبلی میں اسے پوری نمائندگی حاصل ہوتی ہے۔ اب میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کرنے والے زیادہ عقل مند تھے یا اس کی مخالفت کرنے والے زیادہ عقل مند اور مسلمانوں کے ہمدرد تھے۔

ہمارے دانش ور 1916ء کے میثاق لکھنؤ کو پاکستان کے لیے ہوم ورک قرار دیتے رہتے ہیں جس میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخابات کا طریقہ منظور کروایا گیا تھا۔ جداگانہ انتخابات کے ذریعے گزشتہ ایک صدی میں مسلمانوں کو جو کچھ حاصل ہوا ہے؛ میں نے اس کی بیلنس شیٹ (BALANCE SHEET) تیار کی ہے۔ بیلنس شیٹ کے دونوں اطراف برابر ہوتے ہیں۔ اس بیلنس شیٹ میں مجھے ایک طرف جو کچھ نظر آ رہا ہے وہ اس طرح ہے:

1) اسلام اور ہندو مذہب ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔

2) مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیاں گزشتہ ایک ہزار سال سے قائم خوشگوار تعلقات ختم ہو گئے اور وہ ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے جس کے نتیجے میں زیادہ نقصان مسلمانوں کا ہی ہوا کیونکہ وہ اقلیت میں تھے۔

3) انیسویں صدی تک ہندو اپنا مذہب ترک کر کے مسلمان ہوتے رہے اگرچہ ان کی تعداد کم ہی تھی۔ لیکن جیسے ہی ہم نے اسلام کو ہندو مذہب کا حریف بنا کر جداگانہ انتخابات کا مطالبہ تسلیم کروایا ہندوؤں کا قبول اسلام کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

4) 1916ء سے 1947ء تک تقریباً پندرہ لاکھ مسلمان فرقہ وارانہ فسادات میں قتل ہوئے۔

5) تقریباً نوے ہزار مسلمان عورتیں 1947ء میں بے آبرو ہوئیں، ان میں سے ہر عورت کے سامنے اس کے بھائیوں، خاوند، باپ اور بیٹوں کو قتل کیا گیا اور اس کے فوراً بعد اس کے ساتھ گینگ ریپ کیا گیا۔

6) 1971ء میں مشرقی پاکستان میں بنگالیوں نے لاکھوں غیر بنگالی مسلمانوں کو قتل کیا۔ اس طرح کی اطلاعات بھی ملی ہیں کہ ہندو بنگالی اور مسلمان بنگالی نے مل کر غیر بنگالی مسلمان عورتوں سے گینگ ریپ کیا اور اس طرح غلط نظریہ گویا درست ثابت کر دیا کہ قوم مذہب سے بنتی ہے نہ کہ وطن سے۔

7) پاکستانی فوج نے ردعمل کے طور پر لاکھوں بنگالیوں کو قتل کر دیا۔

8) مسلمانوں کی فوج کو مشرکوں سے تاریخ کی بدترین شکست ہوئی اور نوے ہزار مسلمان فوجی مشرکین بھارت نے جنگی قیدی بنا لیے۔

9) پاکستان امریکا کا اور بالواسطہ طور پر یہودیوں کا کاسہ لیس بن گیا۔ یہاں تک کہ افغانستان میں مسلمان بھائیوں کو قتل کرنے کے لیے پاکستان نے اپنے تمام وسائل امریکا کے حوالے کر دیے۔

10) دریاؤں کے منابع کا بھارت میں ہونے کی وجہ سے پاکستان مستقل طور پر پانی کی کمی کا شکار ہو گیا۔ زیر زمین پانی کی سطح مسلسل نیچے جا رہی ہے اور اس بات کا خطرہ موجود ہے کہ آئندہ کچھ سالوں بعد پاکستان ایتھوپیا بن جائے۔

11) بھارت میں مسلمان ایک بے ضرر اور غیر مؤثر اقلیت ہو گئے اور وقفے وقفے سے بھارت میں مسلمانوں کا قتل عام ہوتا رہتا ہے۔

12) کراچی میں نام نہاد مسلم قومیت اور نظریۂ پاکستان کی کوکھ سے مہاجر قومیت وجود میں آئی اور اردو سپیکنگ اور غیر اردو سپیکنگ آبادی کے درمیان گاہے بگاہے خون ریز تصادم ہوتے رہتے ہیں۔

13) پاکستان کے بجٹ کا آدھے سے بھی زیادہ حصہ دفاع پر خرچ ہوتا ہے اور اس کے بعد عوامی بہبود کے کسی منصوبہ کے لیے فنڈز ہی نہیں ہوتے۔

14) پاکستان میں نظریۂ ضرورت وجود میں آ گیا اور پاکستان کی اعلیٰ عدلیہ کی طرف سے ہر

آئین شکن کو سند جواز ملنا شروع ہوگئی۔

اب ہم آتے ہیں بیلنس شیٹ کی دوسری طرف اور دیکھتے ہیں کہ اس میں کیا ہے:

1) جناح صاحب کو پاکستان کا پہلا گورنر جنرل، انگریز جنرل کو پہلا چیف آف سٹاف، سر ظفر اللہ خاں قادیانی کو پاکستان کا پہلا وزیر خارجہ اور جوگندر ناتھ منڈل کو پاکستان کا پہلا وزیر قانون بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔

2) پاکستان میں جاگیرداری باقی رہی (اور تا حال باقی ہے)۔

3) جداگانہ انتخابات کے ذریعے قبل از تقسیم ہمارے جاگیردار اسمبلی کے ممبر منتخب ہوتے رہے ہیں اور بعد از تقسیم پاکستان میں 1947ء سے اب تک سول وخاکی بیوروکریسی کے تعاون سے عوام پر مسلط ہیں جبکہ خود ان کو قانون سے بالاتر ہونے کا استحقاق بھی حاصل رہتا ہے۔

4) انارکلی میں جہاں 1947ء سے قبل ایک دکان مسلمانوں کی تھی اب تمام دکاندار مسلمان ہیں۔ (ماشاءاللہ)

5) گلبرگ اور ڈیفنس جیسے پوش علاقے وجود میں آگئے اور ان میں ہمارے جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور جرنیلوں کے عشرت کدے بن گئے ہیں۔ (ماشاءاللہ)

یہ ہے وہ بیلنس شیٹ جو میرے حساب کتاب کے مطابق 1916ء کے ہوم ورک کے نتیجہ میں وجود میں آئی ہے۔ کوئی صاحب اس میں اضافہ کرنا چاہیں تو کرلیں۔ اگرچہ مذکورہ حقائق بھی یہ معلوم کرنے کے لیے کافی ہیں کہ اس ہوم ورک سے اسلام اور مسلمانوں کی اب تک کیا خدمت ہوئی اور آئندہ کے کیا امکانات ہیں۔

یہاں تک حساب کتاب کرنے کے بعد میں اسی سوچ میں غرق تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کے وہ ہمدرد کون سے تھے جن کے ذریعے سے برصغیر کے مسلمانوں کو ایسی بیلنس شیٹ میسر آئی کہ تاریخ میں اس سے قبل اس کی مثال مشکل سے ہی ملے گی۔ اس دوران میں ایک دوست نے مجھے روزنامہ ''انساس'' لاہور کے 17 اگست 2007ء کا ادارتی صفحہ عنایت فرمایا۔ جس میں جناب سید اظہار مہدی بخاری کا مضمون ''قیام پاکستان۔ ماضی حال اور مستقبل'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں بخاری صاحب نے بتایا ہے کہ ہمارے یہ مہربان تھے: جسٹس سید امیر علی، سر سلطان محمد شاہ آغا خاں سوم، راجا صاحب محمود آباد امیر احمد خاں، ایم۔ ایم اصفہانی، بیگم علی امام، سید وزیر

حسن آغا، نواب سر فتح علی خاں قزلباش، میجر سید وزیر حسن بلگرامی، علامہ سید محمد دہلوی، علامہ گلاب علی شاہ نقوی، علامہ سید محمد باقر چکڑالوی، خلیفہ محمد حسین چیف منسٹر پٹیالہ وغیرہم ان کے علاوہ محمد علی جناح اور علامہ اقبال۔ یہ تھے وہ حضرات جن کی جدوجہد سے ہمیں جداگانہ انتخابات کا تحفہ ملا جو پاکستان کے لیے واحد ہوم ورک ثابت ہوا۔ اس مضمون میں جناب سید اظہار مہدی نے ثابت کیا ہے کہ برصغیر کی تقسیم میں سب سے زیادہ حصہ شیعہ حضرات کا ہے اور مسلم لیگ کی قیادت مکمل طور پر ان کے ہاتھ میں رہی تھی۔ میری رائے میں اس قیادت نے برصغیر کے مسلمانوں کو جس حال میں پہنچایا ہے یہ اس کے تاریخی کردار کا تسلسل ہے اور ہرگز باعث تعجب نہیں ہے۔ ایک تو روافض اور پھر ''لنکن ان'' سے فیض یافتہ۔ اس قیادت نے تو مسلمانوں کے ساتھ یہی کچھ کرنا تھا جو کیا۔

کوئی صاحب مجھ سے اتفاق کرے یا نہ کرے لیکن تاریخ کا جو تھوڑا سا مطالعہ میں نے کیا ہے اس کی بنا پر میں پہلے ہی قائل تھا کہ روافض غلطی سے بھی کوئی ایسا کام نہیں کر سکتے جس سے مسلمانوں کا یا اسلام کا بھلا ہو سکتا ہو۔ بخاری صاحب کے مضمون نے میرے اس ایقان میں اضافہ ہی کیا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ پھل اگر شیریں ہے تو کوئی منطق، کوئی فلسفہ اسے کڑوا ثابت نہیں کر سکتا اور اگر پھل کڑوا ہے تو کوئی صحافیانہ انشاء پردازی اور کوئی ادیبانہ سحر بیانی اسے شیریں ثابت نہیں کر سکتی۔ ہمارے مذکورہ بالا قائدین کی جدوجہد کے نتیجے میں ہمیں جو پھل ملا ہے اس کے ایک نمونہ کا ذکر روزنامہ نوائے وقت لاہور کے ادارتی کالموں میں ہوا ہے جسے میں ذیل میں درج کر رہا ہوں کیونکہ اس کے مطالعہ سے ہی قاری کو اندازہ ہو سکے گا کہ دو قومی نظریہ کے پھل کا ذائقہ کیسا ہے:

''ایک اخباری رپورٹ میں کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے پاکستان آنے والے بھارتی شہریوں، صحافیوں اور زندگی کے دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے بھارت جا کر پاکستان کی مہمان نوازی اور سادہ دلی کا مذاق ان الفاظ وخیالات میں اڑایا کہ پوری پاکستانی سوسائٹی دیوان خانہ، طوائفوں کا گڑھ اور شراب کا زیر زمین کاروبار کرنے والوں کی آماجگاہ ہے۔ ایک بھارتی ہفت روزہ آؤٹ لک (out look) کے 5 اپریل 2004ء کے شمارے میں لکھا ہے کہ پاکستان جانے والے ہر

بھارتی کو پاکستانیوں سے سطحی اور جھوٹی دوستی کی تقریریں سننا پڑیں۔ پورے بھارت میں کرکٹ سیریز ختم ہونے کے بعد یہ نعرہ موبائل کے ایس ایم ایس پیغامات کے ذریعے لگایا گیا کہ ''جیت مبارک۔ سپنا سچا ہو گیا کشمیر تو اپنا تھا کراچی اور لاہور بھی اپنا ہو گیا'' یہ نعرہ بھارتی کرکٹ ٹیم کے استقبالی جلوسوں میں بھی لگایا جاتا رہا۔ 5 اپریل کے بھارتی ہفت روزہ آؤٹ لک میں مضمون نگار فریحہ الطاف نے ایک بھارتی کا پاکستان جا کر یہ تاثر پیش کیا کہ: Lahore is like a bitch in heat with no dog in sight. یہ جملہ اس قابل نہیں کہ اس کا ترجمہ کیا جائے، لیکن فریحہ الطاف ایسی گرماؤ کتیا ہی اس کے اصلی معنی بہتر طور پر جانتی ہے جس نے لاہور اور لاہوریوں کو یہ طعنہ دیا ہے۔ ہمارے لبرل حلقوں کو یہ سرٹیفیکیٹ سنبھال کر رکھنا چاہیے۔ سمجھنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ بھارت میں میڈیا اور حکومت نے اپنے عوام کو پاکستان سے کس قسم کی دوستی کے لیے تیار کر رکھا ہے۔ لاہور میں نام نہاد معززین نے بھارتی مہمانوں کے اعزاز میں جس نوع کی ڈانس پارٹیوں کا اہتمام کیا اس کا تفصیلی احوال بھی بھارتی پرنٹ میڈیا کے کالموں کی زینت بنایا گیا ہے جسے پڑھتے ہوئے جہاں ایک غیرت مند پاکستانی کا سر شرم سے جھک جاتا ہے وہاں یہ بھی صاف عیاں ہو جاتا ہے کہ بھارت کا دل و جان سے سواگت بھی کیا اور بھڑوا بھی کہلائے۔ رپورٹ میں بے شمار ناقابل بیان تحریری حوالہ جات پیش کیے گئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بھارتی حکومت اور عوام نے پاکستانی حکومت اور عوام کو نام نہاد دوستانہ تعلقات کے حوالے سے بیوقوف بنا رکھا ہے اور ہم مسلسل ان کی یہ خواہش پوری کر رہے ہیں۔ ہم نے بارہا یہ لکھا کہ حکومت پاکستان بھارت کے ساتھ مسئلہ کشمیر کے قابل قبول حل تک کسی بھی رواداری میں آگے نہ بڑھے اور نہ منافقت کی بنیاد پر قائم دوستی کا سہارا لے لیکن وہی ہوا جس کا خدشہ تھا، آج بھارت میں یہ نعرہ لگ رہا ہے کہ ''کشمیر تو اپنا تھا ہی لاہور کراچی بھی اپنا ہو گیا۔'' بھارتی شائقین کرکٹ نے واپس جا کر یہ تاثر ظاہر کر دیا کہ وہ پاکستان کو اپنے لیے عیاشی کا اڈہ بنانا چاہتے ہیں، ہمارے ہاں جو چند لوگ حکومت اور نام نہاد اشرافیہ میں ناؤ نوش کا مسلک رکھتے ہیں، وہی ذمہ دار ہیں

کہ انھوں نے بھارتیوں کے لیے ناچ گانے اور عیش و نشاط کی محفلیں آراستہ کیں جن میں بھارتی اخبارات و جرائد کے مطابق ہماری کئی معتبر شخصیات نے بھی شمولیت کی۔ حکومت پاکستان اور پاکستان کے غیور عوام کے لیے مذکورہ رپورٹ چشم کشا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ بھارتی میڈیا میں کرکٹ کی جیت کے حوالے سے جو سخت اور رکیک حملے ہماری پوری معاشرت پر کیے گئے ہیں، ان کے بعد بھارت دوستی بلکہ بھارت پرستی کا یہ ناروا اور بے وقعت جنون ترک کر دیا جائے اور حکومت پاکستان بھارتی میڈیا کی پاکستان مخالف مہم چلانے پر بھارت سے احتجاج کرے۔''(14)

میں اپنے قاری سے درخواست کروں گا کہ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بتائے کہ کیا یہی وہ منزل تھی جس کے لیے ہماری قیادت (جناح صاحب اور ان کے رفقا) نے برصغیر کی ایک تہائی مسلم آبادی کو مستقل طور پر مشرکین ہند کی غلامی میں دے دیا۔ مشرقی پنجاب میں پندرہ لاکھ مسلمان قتل کروائے اور کم و بیش نوے ہزار مسلمان عورتوں کو بے آبرو کروایا۔

دو قومی نظریہ کے علم بردار اگر اپنے کاروباری اور سیاسی مفادات سے چند ملی میٹر بلند ہو کر سوچیں اور وہ اپنے اس دعوے پر ذرا غور کریں کہ کیا ان کی خوشحالی قیامِ پاکستان کا ہی شیریں ثمر ہے؟ ان کا یہ دعویٰ ہم بار بار سن چکے ہیں، مگر انھوں نے کبھی غور نہیں کیا کہ اگر ان کی خوشحالی قیامِ پاکستان کا ثمر ہے تو خوشحال طبقے میں پھیلی ہوئی بے غیرتی و بے حیائی اور بے حمیتی بھی تو اسی خوشحالی کا ثمر ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ناجائز دولت کے حصول کے دروازے کھل گئے۔ ان دروازوں سے حرام کی دولت تو آئی، مگر انھی دروازوں سے غیرت اور حمیت باہر چلی گئی۔ دو قومی نظریہ کے وکیل دولت کی آمد کو دیکھ رہے ہیں، غیرت و حمیت کی رخصتی کو نہیں۔ کاش وہ اس نکتے پر غور کریں، ورنہ ہم یہی کہیں گے:

حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے



حوالہ جات

(1) شہاب نامہ/ قدرت اللہ شہاب/ص265تا268

(2) Freedom at Midnight, p. 149

(3) پاکستان میں کیا ہو گا؟ (مجموعہ خطبات وبیانات مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری)/ص63

(4) Freedom at Midnight, p. 129-130

(5) روزنامہ پاکستان اسلام آباد/24اگست2004ء

(6) روزنامہ نوائے وقت (سنڈے میگزین) لاہور/12ستمبر2010ء

(7) گم گشتہ قوم (خودنوشت سوانح حیات)/سردار شوکت حیات خاں/جنگ پبلشرز، لاہور/دسمبر 1995ء/ص:208

(8) ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ لاہور، آزادی نمبر/اگست2001ء

(9) بندۂ صحرائی (خودنوشت آپ بیتی)/علامہ محمد اسد، مترجمہ: محمد اکرام چغتائی/ص:110

(10) یادیں جو فراموش کر دی گئیں / منشی عبدالرحمٰن خاں/عالمی ادارہ اشاعت علوم اسلامیہ، ملتان/ س،ن/ص25

(11) ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور/اگست1948ء

(12) ایضاً/جون1948ء

(13) روزنامہ ایکسپریس لاہور/15اگست2009ء

(14) روزنامہ نوائے وقت لاہور/26اپریل2004ء

13

جناب ہارون الرشید پریس وانفرمیشن سیکرٹری جنیوا کیمپ، محمد پور، ڈھاکا (بنگلہ دیش) کی طرف سے نوائے وقت لاہور میں 16 مارچ 2006ء کو صدر پاکستان کے نام ایک اپیل شائع ہوئی ہے جو گہرے غور وفکر کی متقاضی ہے اس لیے میں اسے ذیل میں درج کر رہا ہوں:

''مکرمی! بنگلہ دیش کی سرزمین پر 66 کیمپوں میں ڈھائی لاکھ سچے اور پکے محبان وطن جاں نثاران وطن محصور پاکستانی قیام بنگلہ دیش سے تاحال پاکستان سے وفاداری اور جاں نثاری کے جرم میں جبر واستبداد اور ظلم وتشدد کا شکار ہیں۔ مالی ومعاشی بحران میں مبتلا ہیں۔ یہ حقیقت روز روشن کی طرح ساری دنیا پر اجاگر ہے کہ ہندستان کے اقلیتی صوبوں سے ہجرت کرنے والوں کے آباواجداد کی تائید وحمایت اور بے نظیر قربانیوں کا ثمرہ پاکستان ہے۔ انھی حقائق کو معماران پاکستان اور اکابر رہنماؤں نے بیانگ دہل تسلیم کیا ہے اور پاکستان کی تاریخ میں نمایاں باب کی حیثیت رکھتا ہے مگر شومئی قسمت کہ 1947ء میں قربانی دینے والے سچے اور پکے محبان وطن جو پاکستان پر آنے والے ہر آزمائشی دور میں بقائے پاکستان اور دفاع پاکستان کے لیے سر پر کفن باندھ کر پاک افواج کے شانہ بشانہ رہے۔ 1971ء کے سانحہ کے بعد پاک فوج اپنے وطن عزیز پہنچ گئی۔ لیکن ہم وطن سے وفاداری کے جرم میں جس بے دردی وسفاکی سے کیڑے مکوڑوں سے بدتر قید وبند کی زندگی گزارنے پر بے بس اور مجبور کر دیے گئے ہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔ محصورین کی نمائندہ جماعت ایس پی جی آر سی 35 سال

کے عرصے میں برسرِ اقتدار آنے والے تمام حکمرانوں سے گزارشات کرتی چلی آرہی ہے کہ خدارا ہمارے مسئلہ کا حل نکالا جائے لیکن یہ اس صدی کا دردناک المیہ ہے کہ تمام حکمران ہمیں جھوٹی تسلیوں اور وعدوں سے بہلاتے رہے۔ اس طویل مدت میں جس قدر ہماری ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی آبروریزی اور جوانوں پر تشدد ہوا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ جب آپ (صدر جنرل پرویز مشرف) 30 جولائی 2002ء کو بنگلہ دیش کے دورے پر تشریف لائے تو ہمارے قائدِ تحریک الحاج ایم نسیم خاں جو اس وقت بقیدِ حیات تھے، نے آپ سے ملاقات کی۔ آپ نے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بڑے رقت آمیز لہجے میں یقین دہانی کرائی تھی کہ ”آپ مجھ پر چھوڑ دیں، میں دیکھوں گا“۔ مختلف ذرائع ابلاغ سے آپ کی خدمت میں قائدِ تحریک کی زندگی میں بھی یاددہانی کے لیے یادداشتیں دی گئیں، لیکن آپ کا سکوت و جمود اب ہم تیرہ بختوں کے لیے ہلاکت خیز ثابت ہو رہا ہے۔ تمام عرضداشتیں، گزارشات، دعائیں، التجائیں بے سود، بے اثر ثابت ہوئیں لہٰذا تمام نامساعد حالات، لازمی ضروریات، سہولیات سے محرومی، اربابِ اقتدار کے تجاہلِ عارفانہ اور چشم پوشی سے مجبور ہو کر ہماری تنظیم ایس پی جی آر سی نے یہ حتمی فیصلہ کیا ہے کہ ”یوم قراردادِ پاکستان“ جس کی منظوری میں ہمارے آبا و اجداد کی اکثریت کا کلیدی کردار رہا ہے۔ ورنہ شاید پاکستان کا وجود میں آنا محال ہوتا اس عظیم الشان یومِ تاسیسِ پاکستان 23 مارچ سے قبل 22 مارچ رات بارہ بجے تک ہمارے دو مطالبوں کی منظوری کا اعلان کر دیا جائے:

1) سہ فریقی مذاکرات کی منظوری۔

2) 22 مارچ 2006ء تاریخی دن کے موقع پر پاکستان کی صفِ اول کے مردِ مجاہد ہمارے قائد مرحوم الحاج ایم نسیم خان کو پاکستان کا سول ایوارڈ ”نشانِ پاکستان“ دیا جائے۔ ورنہ 23 مارچ 2006ء سے محصور پاکستانی اپنے اپنے جسموں کو آگ لگا کر اپنی ہلاکت کا سلسلہ شروع کر دیں گے۔ واضح ہو کہ خودسوزی میں ہمارے مرحوم قائد الحاج محمد نسیم خان کی نحیف و ناتواں، بیمار، سن رسیدہ اہلیہ محترمہ (ہماری والدہ ماجدہ) سرفہرست ہوں گی“۔

ہارون الرشید پریس وانفارمیشن سیکرٹری صدر دفتر ایس پی جی آر سی جنیوا کیمپ، محمد پور،
ڈھاکہ بنگلہ دیش

ہر صاحب دانش مجھ سے اتفاق کرے گا کہ بزرگوں کی غلطیوں کی سزا اگلی نسلوں کو بھگتنا پڑتی ہے۔ یہ روزمرہ مشاہدہ کی بات ہے کہ جو شخص محنت کرتا ہے، وقت کی قدر کرتا ہے، اسراف سے پرہیز کرتا ہے، اس کی اولاد بہت سی پریشانیوں سے بچ جاتی ہے۔ اس کے برعکس جو شخص محنت نہیں کرتا، وقت ضائع کرتا ہے، اپنی کمائی کو فضول خرچی میں ضائع کرتا ہے، نہ صرف اس کی، بلکہ اس کی اولاد کی زندگی بھی پریشانیوں میں گزرتی ہے۔

جو لوگ 1972ء سے بنگلہ دیش میں کیمپوں میں پڑے ہیں۔ وہ اپنے بزرگوں کی اس غلطی کی سزا ہی تو بھگت رہے ہیں کہ انھوں نے ایک گمراہ شخص کو اپنا رہنما تسلیم کر لیا تھا۔ جس کی گمراہی اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی، وہ بھی جلی الفاظ میں اور اُسے امام معصوم کا درجہ دے دیا۔ اب کوئی صاحب علم دانش ور ہی بتائے کہ ایسے لوگ کس طرح منزل پر پہنچ سکتے تھے۔ جو ایک آغا خانی رافضی کے پیچھے چل پڑے۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ اس کی گواہ ہے کہ روافض غلطی سے بھی کوئی ایسا کام نہیں کر سکتے جس سے اسلام کا یا مسلمانوں کا بھلا ہو۔ ان کی سرشت ہی ایسی ہے۔ ہارون الرشید صاحب فرماتے ہیں:

”ہم (یعنی: غیر بنگالی مسلمان) دفاعِ پاکستان کے لیے (1971ء میں) سر پر کفن باندھ کر پاک فوج کے شانہ بشانہ لڑے، لیکن ہمیں وطن سے وفاداری کے جرم میں جس بے دردی اور سفاکی سے کیڑے مکوڑوں سے بدتر قید و بند کی زندگی گزارنے پر بے بس اور مجبور کر دیا گیا ہے۔ اس کی مثال نہیں ملتی“۔

ہارون الرشید صاحب کو معلوم نہیں کہ اس طرح کی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں۔ جب جرمن قوم ہٹلر جیسے ایجی ٹیٹر کے پیچھے چل پڑی تو وہ بھی اسی طرح تباہی سے دوچار ہوئی جس طرح برصغیر کے مسلمان۔ فرق کمیت کا تو ہو سکتا ہے کیفیت کا نہیں۔ ان کو کس احمق نے مشورہ دیا تھا کہ وہ پاک فوج کے شانہ بہ شانہ مکتی باہنی سے لڑتے۔ ان کو تو چاہیے تھا کہ وہ مکتی باہنی کے ساتھ مل کر پاک فوج سے لڑتے۔ ان کو یا ان کے بزرگوں کو کس احمق نے یہ کہا تھا کہ وہ 1947ء میں اپنا وطن چھوڑ کر مشرقی پاکستان آ جائیں۔ ان کو یا ان کے بزرگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ”دو قومی نظریہ“ ایک

ڈھکوسلہ ہے۔ ایک فراڈ ہے اور یہ نظریہ برصغیر کے مسلمانوں کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ان کی عددی طاقت کو بے اثر کرنے کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں مشرک ہندوؤں کا ایک مضبوط ملک وجود میں آ گیا۔ ان کے بزرگ جب فریب کھا گئے تو اگلی کئی نسلوں کو اس کی سزا تو بھگتنا ہی پڑے گی۔

یہ بات بھی نہیں کہ برصغیر کے اس وقت کے مسلمانوں کو کسی نے ان کی حماقت پر متوجہ نہ کیا ہو۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے بصیرت و بصارت عطا کی تھی، انھوں نے 1941ء میں ہی آگاہ کر دیا تھا کہ اگر برصغیر کے مسلمان ایک آغا خانی رافضی کی پیروی کریں گے تو ان کے ساتھ کیا پیش آئے گا۔ بعد میں وہی کچھ پیش آیا، لیکن برصغیر کے مسلمانوں نے ان کی بات پر اس لیے توجہ نہ دی کہ وہ ''لنکن ان'' سے فیض یافتہ نہیں تھے، اور وہ ٹیڑھا منہ کر کے انگریزی نہیں بولتے تھے۔

بنگلہ دیش کے غیر بنگالی مسلمان 1972ء سے کیمپوں میں پڑے جانوروں جیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ مستقبل قریب تو کیا مستقبل بعید میں بھی یہ امکان نظر نہیں آتا کہ ان کو پاکستان میں لا کر آباد کیا جا سکے گا۔ کیا اس سے بڑا ثبوت بھی کوئی ہو سکتا ہے کہ دو قومی نظریہ ایک ڈھکوسلا تھا۔ ایک اضافی نظریہ تھا جو برصغیر کے مسلمان کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کے لیے پیش کیا گیا تھا۔



14

مسلم لیگی قلم کار خاص طور سے ڈاکٹر صفدر محمود مسٹر جناح اور پاکستان کے بارے میں اکثر بے تکی باتوں کو قدرت کے رموز و اشارات کا نام دے کر اُن پر خامہ فرسائی کرتے رہتے ہیں۔ وہ پاکستان کے بارے میں قدرتِ خداوندی کے اس واضح رمز و اشارہ، بلکہ یوں کہیے کہ تعزیر و انتقام کی طرف دھیان کیوں نہیں دیتے کہ 1906ء میں انگریز کے ایما پر ڈھاکہ میں مسلم لیگ قائم ہوئی۔ انگریز کے پروردہ لوگوں کو چُن چُن کر اس میں شامل کرایا گیا۔ بعد میں اس کی قیادت جناح صاحب کے سپرد ہوئی۔ 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں مسلم لیگ کے اجلاس میں تقسیم ہند اور مسلمانوں کے لیے الگ مملکت کے قیام کے لیے قرارداد پاس ہوئی۔ بعد میں دو قومی نظریے کی بنیاد پر ہندو مسلم منافرت کو فروغ دے کر علیحدہ ملک کے قیام کے لیے تحریک چلائی گئی۔ بالآخر 1947ء میں برصغیر آزاد ہوا، تقسیم ہند ہوئی، جس کے نتیجے میں خوں ریز فسادات ہوئے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کو اور مسلم لیگیوں نے ہندوؤں اور سکھوں کو بہت بے دردی سے تہ تیغ کیا۔ اس موقع پر 15 لاکھ مسلمان قتل ہوئے۔ 90 ہزار مسلمان عورتیں اغوا ہوئیں اور اس طرح پاکستان کے نام سے الگ مملکت معرضِ وجود میں آ گئی...... لیکن...... قدرتِ خداوندی کی تعزیر و انتقام دیکھیے کہ قیامِ پاکستان کے سات ماہ بعد اگلے سال ڈھاکہ میں ہی، اور مارچ میں ہی جناح صاحب نے اسمبلی میں خطاب کرتے ہوئے بنگلہ زبان کو یکسر نظر انداز کر کے اُردو کو پاکستان کی واحد قومی زبان قرار دے کر گویا 1940ء کی قرارداد پاکستان کی طرح تقسیم پاکستان اور قیامِ بنگلہ دیش کی بنیاد رکھ دی۔ اس موقع پر جناح صاحب نے بنگالیوں سے اُردو کے حق میں، اُردو میں نہیں، انگریزی میں

خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

''میں آپ کو صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہوگی اور کوئی دوسری زبان نہیں ہوسکتی۔ جو کوئی اس معاملے میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ صریحاً پاکستان کا دُشمن ہے۔''(1)

جبکہ پاکستان میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان بنگلہ تھی اور مشرقی پاکستان میں کوئی ایک خاندان بھی اُردو بولنے والا نہیں تھا۔ مسٹر جناح کے اس فیصلہ کو اُن کے پہلے ائرایڈی کانگ جناب عطاء ربانی نے ان کی تین بڑی غلطیوں میں شمار کیا اور ممتاز دانش ور جناب عبداللہ حسین نے اس فیصلہ کو جناح صاحب کی بے وقوفی قرار دیا۔ اگلے روز ہی مشرقی پاکستان میں پاکستان سے علیحدگی اور بنگلہ دیش کے قیام کی پرتشدد تحریک شروع ہوگئی۔ جو سراسر مغربی پاکستان سے شدید نفرت کی بنیاد پر تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح تحریک پاکستان ہندو سے نفرت کی بنیاد پر چلائی گئی تھی۔ اس تحریک میں بھی نمایاں اور پیش پیش مسٹر جناح کے وہی تربیت یافتہ شیدائی اور جیالے شیخ مجیب الرحمٰن، ابوالمنصور، ظہیر الدین اور کرنل عثمانی وغیرہ تھے، جنھوں نے تحریک پاکستان میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ 1947ء میں ان لوگوں نے دوقومی نظریہ کو مقدس بنا کر پیش کیا تھا جبکہ 1971ء میں انھی لوگوں نے اس نظریہ سے شدید نفرت کا اظہار کیا، بلکہ اسے گالی بنا کر پیش کیا۔ 1971ء کے جس مہینے میں مشرقی پاکستان کے حالات انتہائی خراب ہوئے اور احتجاجی مظاہروں میں شدت پیدا ہوگئی تھی اور حکومت نے ملٹری ایکشن کے ذریعے احتجاج کو دَبانے کی کوشش کی تھی، وہ بھی مارچ کا ہی مہینہ تھا۔ بالآخر وسط دسمبر 1971ء میں ڈھاکہ میں ہی پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈالے۔ پاکستان تقسیم ہوا اور قیام بنگلہ دیش کا اعلان ہوا تھا۔ اس موقع پر بھی بہت خوں ریز فسادات اور قتلِ عام ہوا۔ اس موقع پر ہندوؤں یا سکھوں نے نہیں، بلکہ مسلمانوں نے ہی مسلمانوں کو قتل کیا۔ مسلمان ہی قاتل تھے، مسلمان ہی مقتول! لیکن اس بار 1947ء سے کہیں زیادہ، یعنی 45لاکھ مسلمان قتل ہوئے تھے۔ اس موقع پر ہندستان کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے کہا تھا کہ ہم نے دوقومی نظریہ کو خلیج بنگال میں بہا دیا ہے۔ جب کہ درست یہ ہے کہ دوقومی نظریہ کو ہندستان نے نہیں، بلکہ جناح صاحب کے جیالوں نے ہی خلیج بنگال میں ڈبویا تھا۔ اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ یا جماعتیں پاکستان بنانے کے گناہ میں ملوث نہیں تھیں،

وہ اس کے توڑنے کے گناہ میں بھی شریک نہیں ہوئیں۔ یہ سب کیا دھرا مسٹر جناح کے رفقا یعنی کھوٹے سکوں کا تھا۔

اس سارے معاملے میں حیرت انگیز اور عبرت ناک بات یہ ہے کہ پاکستان نے اگر ہندو اور ہندستان سے نفرت کو اپنی تاریخ بنایا تو بنگالیوں نے پاکستان سے نفرت کو اپنی تاریخ قرار دیا۔ یہ دراصل قدرت خداوندی کی تعزیر و انتقام تھا۔ آپ اسے مکافاتِ عمل بھی کہہ سکتے ہیں، کہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد مشرقی پاکستان کے مسلم لیگیوں کے دلوں میں مغربی پاکستان کے لیگیوں کے بارے میں شدید بدگمانیاں پیدا ہوگئیں، جو جلد ہی نفرت میں بدل گئیں۔ اس کے نتیجہ میں انھوں نے پہلے تو جناح صاحب کی عقیدت اور دوقومی نظریہ کی عظمت کے طوق کو اُتار پھینکا اور پھر پاکستان سے علیحدگی کے لیے شدید نفرت انگیز تحریک چلائی۔ اس تحریک میں بھی انھوں نے وہ تمام حربے استعمال کیے جو وہ تحریک پاکستان میں استعمال کر چکے تھے۔ آخر کار 24 سالہ نفرت انگیز جدوجہد کے بعد انھوں نے پاکستان سے علیحدگی اختیار کر لی اور یوں بنگلہ دیش کا قیامِ عمل میں آ گیا۔ بنگلہ دیشی آج بھی پاکستان اور پاکستانیوں سے خاص طور سے بانی پاکستان مسٹر جناح سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ جناح صاحب سے تو ان کی نفرت کا یہ عالم ہے کہ ان کا نام بنگلہ دیش [سابقہ مشرقی پاکستان] میں گالی بنا دیا گیا ہے۔ وہ نا صرف اس نفرت پر قائم ہیں، بلکہ اس کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ہماری تاریخ ہے، ہماری جدوجہد آزادی کی قابلِ فخر تاریخ! ذیل میں اس معروضہ کی تائید و توضیح میں چند حوالے پیش کیے جاتے ہیں:

1) قائداعظم کے رفقاء سے ملاقاتیں کے مولف مسلم لیگی قلم کار جناب پروفیسر سیّد محمد ذوالقرنین زیدی لکھتے ہیں:

''جونہی انگریزوں نے 1905ء میں اپنی سیاسی اغراض کی تکمیل کے لیے بنگال کو تقسیم کیا تو ہر طرف سے آل انڈیا نیشنل کانگریس نے جلسے، جلوس، ہڑتالیں اور ہنگاموں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ کانگریس اس تقسیم کے خلاف تھی۔ انگریزی مال کا بائیکاٹ اور سودیشی تحریک کا پرچار ایسے سیاسی حربے تھے جس سے انگریز چکرا گئے۔ یہ ہتھیار 1857ء کی تلواروں اور نیزوں سے زیادہ کارگر تھا کیونکہ برطانیہ کی صنعت اور تجارت اس سے متاثر ہوتی تھی۔ لہٰذا انگریزوں نے وقتی طور پر کانگریس کی طاقت کو توڑنے

کے لیے مسلمانوں کی پشت پناہی شروع کی۔ اب حکومتِ ہند خود ایک ایسی جماعت کے ہاتھوں تنگ ہو رہی تھی جس کو اس نے خود ہی جنم دیا تھا۔ لہٰذا اس سیاسی جماعت کا جواب دوسری سیاسی جماعت ہی دے سکتی تھی۔

اس زمانہ میں مسلمان خود بھی چاہتے تھے کہ وہ بھی کسی طرح ہندستان کے سیاسی اُفق پر کانگریس کی طرح ابھریں۔ ان کی رائے میں کانگریس ان کے جذبات، احساسات، اور مفادات کی ترجمانی نہیں کرتی تھی۔ تقسیمِ بنگال سے مسلمانوں کو تھوڑا سا اقتصادی فائدہ پہنچنے کی امید تھی، کچھ ملازمتوں کے ملنے کی توقع تھی، لیکن کانگریس کی شدتِ مخالفت بنگال کے مسلمانوں کو اور زیادہ تقسیمِ بنگال کی حمایت میں سرگرم کر رہی تھی، مسلمانوں کے حلقوں میں سیاسی گہما گہمی ہونے لگی۔ اس وقت سر آغا خاں مسلمانوں میں ایک ایسی شخصیت تھے جو برطانیہ کے شاہی خاندان اور سرکاری حلقوں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ وہ لندن میں سیکرٹری آف اسٹیٹ مسٹر مارلو سے ملے اور ان کے سامنے مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کیا۔ پھر فوراً لندن سے شملہ آکر وائسرائے ہند سے ملاقات کی اور پھر بعد میں مسلمانانِ ہند کا ایک وفد لے کر اکتوبر 1906ء میں وائسرائے ہند سے شملہ میں ملاقات کی۔ مسلمانوں کے اس وفد نے وائسرائے ہند سے یہ درخواست کی کہ ان کی سیاسی اور تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر ان کے مفادات کا خیال رکھا جائے۔

اس کے بعد 31 دسمبر 1906ء مین انڈین محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا آخری اجلاس ڈھاکہ میں منعقد ہوا اور اس اجلاس میں آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔

اس موقع پر جناب وقار الملک نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:

''جس مقصد کے لیے آج ہم مجتمع ہوئے ہیں وہ نیا نہیں، یہ اسی روز پیدا ہو گیا تھا جب انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی گئی تھی...... آج جب کہ برٹش کی سلطنت اپنی رعایا کی محافظ ہے جس قسم کی مشکلات بسا اوقات ہم کو اپنے ہمسایہ دوستوں سے پیش آتی ہیں اس کی نظائر کم و بیش ہر صوبے میں موجود ہیں تو وائے اُس وقت پر جب ہم کو ان لوگوں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے گا جو اورنگ زیب کا بدلہ صدہا برس بعد آج ہم سے لینا چاہتے ہیں۔''

اس طرح مسلمانوں کی پہلی سیاسی جماعت 1906ء میں قائم کی گئی، یہ کلیتاً ایک سیاسی جماعت تھی اور اس کے دعوے سیاسی تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد مندرجہ ذیل قرار پائے:

الف: حکومتِ برطانیہ سے وفاداری

ب: مسلمانانِ ہند کے سیاسی حقوق اور مفادات کی حفاظت کرنا

ج: دوسری جماعتوں کے ساتھ خوش گوار تعلقات قائم کرنا۔'' (2)

جناب مولف حاشیے میں لکھتے ہیں:

''اس موقع پر اگر یہ حقیقت بیان کر دی جائے تو مناسب ہوگا کہ شملہ وفد کی تیاری میں اور اس کے راستے میں حائل سیاسی کانٹوں کو صاف کرنے میں جناب آرچی بالڈ پرنسپل علی گڑھ کالج، کا بڑا ہاتھ تھا۔'' (3)

2) مورخِ اسلام علامہ سیّد سلیمان ندوی، جنھیں علامہ اقبال نے ''ہندستان میں علومِ اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد'' قرار دیا تھا، انھوں نے اپنے استاذ گرامی امام المورخین علامہ شبلی نعمانی کی مسلم لیگ کے بارے میں لکھی گئی نظموں پر جو نوٹ لکھا تھا، وہ حسب ذیل ہے:

''مسلم لیگ جب قائم ہوئی تھی تو اس کا مقصد گورنمنٹ کے بجائے ہم وطنوں سے لڑنا اور حکومت وقت سے اظہارِ وفاداری کرنا تھا، اسی لیے اس وقت اس کے ممتاز ارکان اور عہدیداروں میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو خطاب یافتہ، امراء اور ارباب جاہ تھے، لیکن دفعتہً جنگ طرابلس اور بلقان کے اور معرکۂ مسجد کانپور کے زمانہ میں حکومت برطانیہ کی طرزِ سیاست کو دیکھ کر مسلمانوں میں یکے بعد دیگرے مخالفانہ جذبات اور ہیجانات پیدا ہوتے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرجوش مسلمان جو احرار شمار کیے گئے لیگ سے نفرت کرنے لگے اور کانگریس کی طرف مائل ہونے لگے۔ یہ دیکھ کر عام رجحانات کے ساتھ لیگ نے بھی اپنی روش میں تغیر مناسب سمجھا، اور اپنے مقاصد میں ہندستان کی خود مختار حکومت کا مطالبہ شامل کیا، مگر اسی کے ساتھ لفظ سوٹ ایبل یعنی ہندستان کے حالات کے مناسب خود مختار حکومت کا لفظ اضافہ کیا۔ یہ لفظ ایسا ذو معنین تھا جس

سے بلند تر اور پست تر دونوں مقصدوں کو وقت پر مراد لیا جا سکتا تھا۔ احرار نے اس کی سخت مخالفت کی۔ لیکن ان کی مخالفت کامیاب نہ ہوئی۔ بالآخر یہ نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ لیگ مرگئی اور احرار مسلمان تمام تر کانگریس میں داخل ہو گئے۔ لیگ کے خلاف اس تحریک کے ابھارنے میں اور احرار کی جماعت کی رہنمائی میں مرحوم مصنف (حضرت علامہ شبلی نعمانیؒ) کا بڑا حصہ ہے۔'' (4)

3) سہ روزہ مدینہ بجنور کے ادارتی مضمون کا ایک اقتباس پڑھیے:

''وہ لوگ جو پہلے یونین جیک کے سائے تلے جمع تھے اب مسلم لیگ میں شامل ہیں۔ ان کی خودغرضیوں کے سرچشمے مختلف ہیں مگر ان کا جماعتی نظام ایک ہے۔ غور کیجیے کہ مسلم لیگ نے کتنے طبقوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے:

1) انگریزی حکومت کے تمام پرانے خطاب یافتہ شاہی شہزادے۔

2) 57ء کے اصل غداروں کی اولاد جن کو سرسیّد مرحوم نے یہ سبق دیا تھا کہ انگریزی حکومت لازوال ہے۔

3) انگریزی عہد حکومت کے سرکاری دفاتر کے تنخواہ دار ملازم جنھوں نے پیدائشی طور پر مادر برطانیہ کا دودھ پیا ہے۔

4) 1914ء کی جنگ عظیم اور 1939ء کی عالمگیر جنگ کے فوجی ٹھیکیدار۔

5) وائسرائے اور گورنروں کی کونسل اور اسمبلیوں کے تمام پرانے ممبر جنھوں نے عوام کے ووٹوں کو دیکھ کر قرآن کی تلاوت شروع کر دی ہے اور جو انگریزوں کی امداد سے قرآنی سلطنت قائم کرنے پر مُصر ہیں۔

6) انگریزی درسگاہوں کے طلباء کی فوج۔

7) وہ تمام پیر فقیر، سجادہ نشین درویش حضرات اور عافیت پسند علماء جنھوں نے اسلام کے لیے کبھی کسی مصیبت کے وقت کلمۂ حق زبان سے نہیں نکالا۔

8) مخلص اور بے خبر عوام جنھیں منافقینِ اُمت نے فتح کر لیا ہے۔'' (5)

4) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے شعبۂ سرجری کے سربراہ جناب نسیم انصاری اپنی آپ بیتی جواب دوست میں لکھتے ہیں:

''میں نے سب سے پہلے مشرقی پاکستان 50-1949ء میں دیکھا تھا، جب میں روپوشی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہاں غربت، افلاس اور بیماری کے علاوہ جو چیز متوجہ کرتی تھی، وہ لوگوں کا جوش و خروش تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے آشیاں بندی کا ڈنکا بج رہا ہو۔ ہر شخص روشن مستقبل کے خواب دیکھ رہا تھا۔

اس کے بعد بھی کلکتہ کی طالب علمی کے زمانے میں دو ایک بار جانا ہوا اور یہی رنگ دیکھا۔ لیکن 64ء میں جب انگلستان سے تعلیم ختم کر کے اپنے عزیزوں سے ملنے ڈھاکہ گیا تو وہاں کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔

میں اپنی اہلیہ زینت کے ایک قریبی عزیز سے ملنے گیا۔ وہ کلکتہ میں 47ء سے پہلے مسلم لیگ کے بہت اہم نوجوان لیڈر رہتے۔ اب ڈھاکہ میں آباد ہو گئے تھے اور کئی ملوں اور چائے کے باغات کے مالک تھے۔ مجھ سے ہمیشہ بہت اخلاق سے ملتے تھے۔ میں نے حسب معمول آداب عرض کیا اور مزاج پوچھا۔ مسکرا کر بنگلہ میں فرمایا کہ ''اس گھر میں لوگ بنگلہ بولتے اور انگریزی سمجھتے ہیں۔ آپ دونوں سے واقف ہیں۔ جو زبان آپ بول رہے ہیں وہ شاید اُردو ہے جو یہاں نہ بولی جاتی ہے اور نہ سمجھی جاتی ہے۔''

میں نے بنگلہ میں پوچھا کہ یہ تبدیلی کب سے آئی؟ کہنے لگے کہ ''میں نے 61ء میں انگلستان میں آپ سے کہہ دیا تھا کہ حالات خراب ہو رہے ہیں اور اگر ہمارے رہنما معاملے کو نہ سلجھا پائے تو بہت مشکل ہو جائے گی۔ چناں چہ مشکلات پیدا ہو رہی ہیں۔ بنگالی شرفا یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ساتھ باعزت برتاؤ نہیں ہو رہا ہے۔ صنعتی ترقی میں بھی رکاوٹیں پڑتی ہیں۔ ہمارے مغربی ہم وطنوں کے مقابل ہمیں لائسنس مشکل سے ملتے ہیں۔ زبان کا معاملہ تو اور بھی تکلیف دہ ہے۔ آخر یہ اصرار کیوں، کہ اُردو اسلامی زبان ہے اور بنگلہ غیر اسلامی؟ اگر ایران کے لوگ فارسی بول بول کر اور چین کے مسلمان چینی بول کر اپنا مذہب برقرار رکھ سکتے ہیں تو آخر پاکستان کی اکثریت سے کیوں کہا جا رہا ہے کہ ان کی زبان غیر اسلامی ہے؟'' (6)

5) پاکستان کے ممتاز دانش ور، ادیب، نقاد اور کالم نگار جناب انتظار حسین نے نوجوان ادیب اور صحافی جناب محمود الحسن کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

"ہم سمجھتے تھے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی جو ایک ہزار سال کی تاریخ ہے، پاکستان اس کے اگلے باب کے طور پر لکھا گیا ہے اور یہ ملک اس تاریخ کے حوالے سے وجود میں آیا۔ ہم نے شروع میں اس ملک کو اس لیے آئیڈیلائز کیا کہ ایک ہزار سال کی تاریخ کا جو تہذیبی، تاریخی اور ذہنی سفر ہے اس کا ایک نتیجہ تاریخ کے اس موڑ پر آ کر پاکستان کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ پچیس سال میں جب یہ ملک دولخت ہوا تو پاکستان سے وابستہ خواب منتشر ہو گئے۔ مجھ ایسوں کے لیے جنھوں نے پاکستان کا خواب دیکھا تھا، بڑا ذہنی صدمہ تھا۔ باقی جو کمی تھی، جو رخنے تھے وہ بعد میں سمجھ آئے لیکن اس وقت ہم اس ملک کو آئیڈیلائز کر رہے تھے۔ برصغیر کے مسلمانوں کے خوابوں کی تعبیر یوں برآمد ہوئی اور خواب منتشر ہوئے، اب ہمیں سوچنا پڑا کہ برصغیر کے مسلمانوں نے علیحدہ وطن کے لیے جو فیصلہ کیا تھا، اس کے کیا معنی ہیں۔ وہ آئیڈیلائزیشن ختم ہوئی تو اب ریشنل انداز میں، معروضی انداز میں سوچا کہ ہم سے خطا اور لغزش کہاں سے ہوئی ہے، کیا تصور میں کوئی خامی تھی یا اس کو جس انداز سے عملی جامہ پہنایا گیا ہے اس میں کمی تھی۔ تو یہ سوالات تھے جو اس وقت کھڑے ہوئے مجھے پریشان کرتے تھے۔

1857ء کے بعد مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کا آغاز ڈھاکہ سے ہوا جہاں 1906ء کو مسلم لیگ کا پہلا اجلاس ہوا اور پھر اس تاریخ کا انجام بھی اسی شہر میں ہوا۔ یہ میرے لیے بڑی عبرت کی بات تھی۔ تقسیم کے وقت جو خون خرابہ ہوا اس کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ دو الگ الگ قومیں تھیں۔ اس لیے ایسا تو ہونا ہی تھا۔ اب ذہن میں یہ سوالات اٹھے کہ ہندو اور مسلمان تو الگ قومیں تھیں، وہ جسے ہم ایک قوم سمجھ رہے تھے وہ بھی کوئی دو قومیں ہیں یعنی بنگالی کوئی الگ قوم ہے ہم سے، یہ مسلمان نہیں ہیں یا پاکستانی نہیں۔ اس صورتِ حال سے جو سنتالیس (47ء) کی صورت کے مماثل ہے تو اب اس کے کیا معنی ہیں۔ یہ وہ وقت تھا جب میرے ذہن میں اپنی پچھلی تاریخ کے بارے میں سوالوں نے جنم لیا، جن کا جواب میں نے تخلیقی سطح پر ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ برصغیر کے مسلمانوں کا جو تصورِ پاکستان تھا اس کا جو Betrayal ہوا ہے اس کے ذمہ دار بنگالی کم بلکہ مغربی پاکستان کے مسلمان تھے جن میں مقامی اور مہاجر دونوں ہی شامل

تھے۔ اب یہ اس وقت جو صورتِ حال ہے وہ سوالات دوبارہ ذہن میں اٹھ رہے ہیں اور زیادہ پریشان کر رہے ہیں۔ ان سارے واقعات کے باوجود میں نے ایسا کوئی نتیجہ نہیں نکالا کہ تقسیم غلط تھی کیونکہ میں جلدی فیصلے کرنے کا عادی نہیں لیکن شکوک پیدا ہو رہے ہیں اور بے یقینی کا ایک عالم ہے۔"(7)

6) جناب سید محمد ذوالقرنین زیدی رقم طراز ہیں:

"وہ لوگ جو قائداعظم اور پاکستان کے نام پر مر مٹنے کے لیے تیار تھے ان کو غدار کہا گیا۔ یہی لوگ تھے جو پاکستان کی عزت اور وقار کے محافظ تھے اور قائداعظم کے شیدائی تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جو آئین ساز اسمبلی کے اندر کسی معزز رکن کو اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ بابائے قوم کو صرف مسٹر جناح کہہ کر پکاریں۔ شیخ مجیب الرحمٰن، ابوالمنصور اور ظہیر الدین نے بار بار اسمبلی کی کارروائی میں صرف اس وجہ سے رخنہ اندازی کی کہ ان کی نگاہ میں ایوان میں قائداعظم کا نام عزت اور احترام سے نہیں لیا جا رہا تھا۔

ایک مسلم لیگی نے جب اپنی تقریر کے دوران "مسٹر جناح" کہہ دیا تو شیخ مجیب الرحمٰن نے ان کو ٹوکا اور کہا کہ قائداعظم کا لفظ استعمال کریں۔ جناب ظہیر الدین نے جو کہ عوامی لیگی تھے، بڑے افسوس سے سپیکر سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بابائے قوم کا نام عزت اور احترام سے لیا جائے، ہم اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ ان کی بے عزتی ہو۔"(8)

7) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ، ہندستان میں پاکستان کے سفیر، دانش ور اور روزنامہ نوائے وقت کے کالم نگار جناب سمیع اللہ قریشی اپنی آپ بیتی سفیر اور سفارت کاری میں لکھتے ہیں:

"علی گڑھ میں طلبہ کی اکثریت مسلم لیگ کی ہمدرد، اقبال کی دلدادہ اور قائداعظم محمد علی جناح کی شیدائی تھی جو لیگ یا پاکستان کا حامی نہیں ہوتا تھا اسے "غدار" کہا جاتا تھا۔ 1942ء میں مولانا ابوالکلام آزاد پر طلبہ نے دست درازی کی جب ان کی ریل گاڑی چند منٹوں کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی کے پلیٹ فارم پر رکی۔ تاریخ کی کیا ستم ظریفی

ہے کہ جس طالب علم لیڈر نے مولانا کے ریل کے ڈبے میں زبردستی گھس کر ان پر تھوکا تھا اور ان طلبہ کی رہنمائی کی تھی جنھوں نے ان کی داڑھی کو نوچا تھا، وہ ''مچھل'' ایک آسامی بنگالی طالب علم عثمانی تھا جو پنجابی اور پشتو ایسی روانی سے بولتا تھا جیسے اپنی بنگالی زبان۔ اسے 1971ء میں کرنل عثمانی کہا گیا جس نے 1971ء میں بنگلہ دیش کی بغاوت میں کلیدی کردار ادا کیا۔ میں ریلوے اسٹیشن پر موجود تھا اور متنفر ہو کر ان سے ہٹ گیا جب انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد پر تھوکنا شروع کیا مجھے یہ نہایت مکروہ فعل لگا کہ ایک مشہور عالم دین اور خاصی عمر کے آدمی کے ساتھ یہ برتاؤ کیا جائے۔''(9)

8) مسلم لیگ کے مورخ اور دانش ور جناب ڈاکٹر صفدر محمود اپنے کالم ''صبح بخیر'' میں بعنوان: ''یہ نفرت نہیں، ہماری تاریخ ہے'' لکھتے ہیں:

''یہ 1998ء کا واقعہ ہے کہ میں یونیسکو کے ایک وفد کے سربراہ کی حیثیت سے سرکاری طور پر بنگلہ دیش گیا۔ یہ دس دن کا دورہ تھا اور میرے وفد میں پانچ چھ ماہرین تعلیم شامل تھے۔ ایک روز ہمیں بنگلہ دیش کی اہم اور ممتاز این جی او ''براک'' پر بریفنگ کی دعوت دی گئی۔ ملاقاتوں، باتوں اور چائے کی تواضع کے بعد ہمیں بریفنگ روم میں لے جایا گیا۔ روشنیاں بجھانے کے بعد جب براک کے ایک اعلیٰ افسر نے ویڈیو کا بٹن دبایا تو خوبصورت سکرین پر استقبالیہ خوش آمدید کے فقرے ابھرے اور پھر اچانک یہ فقرے سنائی دیے۔ سنائی دینے والے فقرے سامنے سکرین پر بھی نمودار ہو رہے تھے۔ یہ فقرے کچھ یوں تھے۔ 16 دسمبر 1971ء دشمن کو شکست دینے کے بعد اس کا صفایا کر دیا گیا اور دشمن کی فوج ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئی۔ اس کے بعد پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے جنرل نیازی کو جوتے پڑنے اور دوسرے ایسے مناظر تھے جو میرے لیے قابلِ برداشت نہ تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہوں۔ میں نے اپنے حواس پر قابو پا کر براک کے ایک افسر کو اپنے پاس بلایا اور اس سے کہا کہ آپ جانتے ہیں میں پاکستان سے آیا ہوں۔ یہ الفاظ سن کر وہ اٹھا اور اس نے ویڈیو بند کر دی اور زبانی براک کے قیام اور کارکردگی پر روشنی ڈال کر میٹنگ برخاست کر دی۔ ہم باہر نکلے تو وہ شخص میرے ساتھ اُردو میں باتیں

کرنے لگا۔ اس کا کہنا تھا کہ ''سر فوج نے مارچ 1971ء میں جو مظالم ڈھائے اور جس طرح بنگالیوں کا قتلِ عام کیا اس کا مغربی پاکستان میں رہنے والوں کو پوری طرح علم نہیں۔ آپ کے لیے یہ ویڈیو نا قابلِ برداشت تھی لیکن سر! یہ ہمارا یومِ آزادی ہے آپ اسے نفرت کی داستان سمجھتے ہیں جبکہ یہ ہماری جنگِ آزادی کی کہانی بیان کرتی ہے۔ آپ کے لیے 16 دسمبر 1971ء یومِ سیاہ ہے جبکہ یہ ہماری تاریخ ہے۔ یہ تاریخ خون، آنسوؤں اور آہوں سے لکھی جا چکی اب اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ پھر اس نے مجھ سے چبھتا ہوا سوال کیا۔ کیا 1857ء اور 1947ء کی تاریخ کو بدلا جا سکتا ہے؟ کیا بنیادی حقائق پر پردہ ڈالا جا سکتا ہے؟ میں اس کی باتیں سنتا رہا، جواب بھی دیتا رہا لیکن ساتھ ہی ساتھ میں اپنے باطن کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔ ہم براک کے دفتر سے نکل کر گاڑیوں میں بیٹھ گئے لیکن اس شخص کا ایک فقرہ دن بھر میرا پیچھا کرتا رہا، ''جسے آپ نفرت کی کہانی کہتے ہیں یہ ہماری تاریخ ہے، تاریخ کے حقائق پر نہ پردہ ڈالا جا سکتا ہے نہ ان سے دامن چھڑایا جا سکتا ہے۔''(10)



حوالہ جات

(1) پاکستان میں اُردو کا المیہ/ مولوی عبدالحق/ص:27
(2) قائداعظم کے رفقا سے ملاقاتیں/ص:32-33
(3) ایضاً/ص:33
(4) کلیاتِ شبلی/ ص:72
(5) سہ روزہ مدینہ بجنور/4 مئی 1946ء
(6) جوابِ دوست/ ص:132
(7) روزنامہ ایکسپریس (سنڈے میگزین) لاہور/22 مارچ 2009ء
(8) قائداعظم کے رفقا سے ملاقاتیں/ ص:47
(9) سفیر اور سفارت کاری (ایک دور کی کہانی:1947-1987ء)/ سمیع اللہ قریشی/ پیراماؤنٹ پبلشنگ انٹرپرائزز، کراچی/ نومبر 2006ء/ ص:21
(10) روزنامہ جنگ لاہور/2 مئی 2010ء

15

جناب رانا فضل الرحمٰن نعیم کا مضمون بعنوان ''میں نے کیا دیکھا'' (مطبوعہ روزنامہ الجریدہ لاہور، 3 ستمبر 2007ء) نظر سے گزرا۔ اس میں موصوف نے مسلمان کی جو تعریف بیان کی ہے، وہ اس طرح ہے:

> ''جو شخص بھی خود کو مسلمان کہتا ہے وہ مسلمان ہے اور کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے شخص کے عقائد کی چھان بین کرنے کے بعد یہ اعلان کر دے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔''

مسلمان کی یہ تعریف بیان کرنے کے بعد موصوف فرماتے ہیں:

> ''قائداعظم کی وفات کے تقریباً ساٹھ سال بعد بھی ہم اس محسن قوم سے کسی قسم کی رورعایت برتنے کے لیے تیار نہیں ہیں''۔

یہ موصوف نے کس قوم کی طرف اشارہ کیا ہے جس پر کوئی احسان عظیم کیا گیا ہے۔ اگر اس قوم سے موصوف کی مراد برصغیر کی مسلمان قوم ہے تو کیا موصوف بھارت کے کسی مسلمان سے کہہ سکتے ہیں کہ جناح صاحب آپ کا محسن ہے جبکہ بھارت میں مسلمانوں کی تعداد پاکستان کے مسلمانوں سے زیادہ ہے؟ کیا وہ ان غیر بنگالی مسلمانوں سے، جو دسمبر 1972ء سے بنگلہ دیش میں کیمپوں میں پڑے ہوئے جانوروں کی سی زندگی گزار رہے ہیں، سے کہہ سکتے ہیں کہ جناح صاحب نے برصغیر کو تقسیم کروا کر ان پر احسان عظیم کیا ہے؟ کیا موصوف کسی مسلمان کو، جس کی جوان بیٹی، بہن، بہو مشرقی پنجاب میں 1947ء میں بے آبرو ہوئی ہو، یہ کہہ سکتے ہیں کہ جناح

صاحب نے برصغیر کو تقسیم کروا کر اس پر احسان عظیم کیا تھا؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر وہ کون سی قوم ہے جس پر برصغیر کو تقسیم کروا کر احسان عظیم کیا گیا ہے؟ اگر موصوف کی مراد اس سے پاکستانی قوم ہے تو میں یہ دریافت کروں گا کہ یہ پاکستانی قوم کہاں سے برآمد ہو گئی؟ موصوف تو 14 اگست 1947ء سے قبل وطنی قومیت کو کفر سمجھتے تھے۔ موصوف کے نزدیک قوم وطن سے نہیں مذہب سے بنتی تھی۔ کیا مذہبی قومیت کا نظریہ ایک اضافی نظریہ تھا جو 14 اگست 1947ء کی شام اپنی موت مر گیا۔ اس کے بعد سے وطنی قومیت کا نظریہ برحق ہو گیا؟

موصوف نے ''مسلمان'' کی تعریف کے ضمن میں جو احادیث نقل فرمائی ہیں وہ مشروط ہیں اس بات سے کہ موصوف جسے مسلمان تسلیم کر رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے۔ ''کما ھو باسمائہ و صفاتہ'' اور نبی کریم ﷺ پر ایمان رکھتا ہے جس طرح کہ آپؐ پر ایمان لانے کا حق ہے۔ اب اگر ایک شخص اقرار کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے اور اسے کائنات کا خالق تسلیم کرتا ہے، لیکن وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو تخلیق کر کے ایک مشین کی طرح چلا دیا ہے۔ اب یہ خود کار طریقے سے بغیر اللہ تعالیٰ کے تصرف کے چل رہی ہے۔ ایسا شخص مسلمان نہیں ہے، اگرچہ وہ قبلہ رو ہو کر نماز پڑھتا ہو، مسلمانوں کا ذبیحہ کھاتا ہو، مسلمانوں جیسے نام رکھتا ہو، عقیقہ بھی کرتا ہو۔ نبی اکرمؐ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ ختم نبوت پر بھی ایمان ہو اور یہ کہ اس کا عقیدہ ہو کہ نبی اکرمؐ کے بعد کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہو سکتا جس کا قول و فعل حجت ہو اور آخرت میں نجات کے لیے اس پر ایمان لانا ضروری ہو۔ موصوف نے اس مضمون میں یہ بھی فرمایا ہے:

''مسلمان ہونے کا تعلق صرف بندے اور خدا کا معاملہ ہے اور کسی فرد واحد یا گروہ یا پارلیمنٹ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کے عقیدے یا مذہب کا فیصلہ ڈنڈے کے زور پر کرے''۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ 1974ء میں پاکستان کی قومی اسمبلی نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا جو فیصلہ کیا تھا تو موصوف کے نزدیک اس نے جھک ماری تھی کیونکہ قادیانی ہمارے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور ہمارا ذبیحہ کھاتے ہیں، عقیقہ بھی کرتے ہیں (بس وہ ہم مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں تو کیا ہوا) اس لیے مسلمان ہیں۔ نہ صرف مسلمان ہیں، بلکہ خود کو اصلی مسلمان سمجھتے ہیں۔

جہاں تک آغا خانی اسماعیلی حضرات کا تعلق ہے تو وہ بھی ان کے نزدیک مسلمان ہیں کیونکہ وہ مسلمانوں جیسے نام رکھتے ہیں، عقیقہ بھی کرتے ہیں اگرچہ وہ دعویٰ ہی نہیں کرتے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں، لیکن موصوف بضد ہیں کہ ان کو مسلمان سمجھا جائے کیونکہ جناح صاحب پیدائشی آغا خانی تھے اور رانا صاحب موصوف ثابت نہیں کر سکتے کہ انھوں نے کبھی اسلام قبول کیا تھا۔

یہ ناقابل تسلیم ہے کہ موصوف کو قادیانیوں کے اور آغا خانیوں کے عقائد کا علم نہ ہو اور ان کو یہ علم نہ ہو کہ عقیقے کا عقائد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن ان کی مشکل یہ ہے کہ جس شخص کو چالیس کے عشرے سے موصوف ہیرو باور کر رہے اور کروا رہے ہیں اس کو کس طرح ولن تسلیم کر لیں۔

اقوام عالم میں سے جن اقوام نے عروج حاصل کیا ان میں سے کسی کی بھی تاریخ کا مطالعہ کر لیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ ہر قوم کے لیڈر نے قوم کے سامنے بلند مقاصد رکھے اور اس کے لیے قوم کو متحد کیا۔ جب قوم میں اتحاد پیدا ہو گیا تو اس کے لیڈر نے اپنے مقاصد کے لیے پیش قدمی شروع کر دی اور اپنی قوم کو عروج پر پہنچا دیا۔ جناح صاحب نے برصغیر کے مسلمانوں کو متحد کیا تو اس لیے نہیں کہ اس کے پیش نظر بلند مقاصد تھے، بلکہ صرف اس لیے کہ ان کو تین حصوں میں تقسیم کر دے اور اس طرح تقسیم کر دے کہ وہ پھر کبھی متحد نہ ہو سکیں اور نہ کبھی کسی مشکل میں ایک دوسرے کے کام ہی آ سکیں۔

مجھے جناح صاحب اور ان کے ہم نواؤں کی اس واردات پر ہرگز کوئی حیرت نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ رافضی تھے اور وہ بھی آغا خانی رافضی۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہمارے ہاں کہاوت ہے کہ ایک تو سانپ اور پھر اڑنے والا۔ آغا خانی رافضی تو اڑنے والے سانپ ہیں۔ روافض کا تو پروگرام ہی صحابہ کرامؓ کو گالیاں دینا اور مسلمانوں کو تقسیم کرنا رہا ہے۔ اس پروگرام پر انھوں نے حضرت فاروق اعظمؓ کے وقت سے ہی عمل شروع کر دیا تھا اور قیام قیامت تک وہ اس پروگرام پر عمل جاری رکھیں گے۔

اب برصغیر کے مسلمانوں کی سادہ لوحی دیکھیے کہ وہ راضی خوشی جناح صاحب کے پیچھے چل پڑے جو ان کو تین حصوں میں تقسیم کرنا چاہتا تھا اور اس طرح برصغیر میں مسلمانوں کی عددی طاقت کو بے اثر کرنا چاہتا تھا۔ رانا صاحب موصوف جیسے دانش ور بھی مسلمانوں کی اس تقسیم پر بغلیں بجا رہے ہیں۔ حالانکہ بایں عقل و دانش بباید گریست۔ سوچنے والی بات ہے کہ کیا تقسیم میں بھی کسی

قوم کی فلاح ہوسکتی ہے؟

کیا کوئی اس حقیقت کا انکار کرسکتا ہے کہ جناح صاحب اور ان کے ہم نوا حضرات نے مسلمانوں کو تین حصوں میں تقسیم کر کے برصغیر میں ان کی عددی طاقت کو بے اثر کر دیا۔ اب ان لاکھوں غیر بنگالی مسلمانوں کی، جو 1972ء سے کیمپوں میں پڑے بنگلہ دیش میں جانوروں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں، اہل پاکستان اگر چاہیں بھی تو کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ بھارت کے مسلمانوں پر کوئی افتاد پڑے تو ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ خود پاکستان کا کردار یہ ہے کہ گزشتہ کئی عشروں سے امریکا، برطانیہ (درحقیقت یہود و نصاریٰ) کا آلۂ کار بنا ہوا ہے۔

جناح صاحب نے ایک طرف تو مسلمانوں کو تین حصوں میں تقسیم کروایا جبکہ دوسری طرف تمام غیر مسلموں کو متحد کر دیا۔ دو قومی نظریہ کا مطلب ہی یہ تھا کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں تمام غیر مسلم متحد ہو جائیں۔ اگر قومیت کی بنیاد مذہب تھا تو برصغیر میں دو سے زیادہ مذاہب تھے۔ اس صورت میں جناح صاحب کو کثیر القومی نظریہ پیش کرنا چاہیے تھا۔ جناح صاحب نے اگر کسی پر احسان کیا ہے تو وہ برصغیر کے غیر مسلم ہیں جن کو جناح صاحب نے بلا اختلاف رنگ و نسل اور بلا امتیاز مذہب و ملت متحد کر دیا نہ کہ مسلمان جن کو تین حصوں میں اس طرح تقسیم کر دیا گیا کہ اب نہ تو وہ کبھی متحد ہو سکیں گے اور نہ ہی کسی آفت میں ایک دوسرے کی مدد کر سکیں گے۔



16

جناب ڈاکٹر حسین احمد پراچہ کا خیال افروز مضمون بعنوان ''یہ وہ سحر تو نہیں'' مطبوعہ نوائے وقت لاہور، 17 اگست 2005ء پڑھنے کا اتفاق ہوا، جس میں موصوف نے سپین میں عیسائیوں کے دوبارہ قبضہ کے نتیجہ میں مسلمانوں کو جس اندوہ ناک صورت حال سے گزرنا پڑا، اس حوالے سے لکھا ہے:

> ''بیسویں صدی کے اوائل میں یہی وہ سوال تھا جس نے احساس کی شدت میں جلنے والے مسلمان قائدین کو بے چین کر رکھا تھا کہ کیا ہندستان کے مسلمانوں کا بھی وہ درد ناک انجام ہونے والا تھا جو سپین کے مسلمانوں کا ہوا''۔

اس کے بعد مشرکین ہند کے چھوت چھات اور مسلمانوں کو ملیچھ سمجھنے والے طرز عمل کا حوالہ دینے کے بعد موصوف فرماتے ہیں:

> ''ایسی تنگ نظر اکثریت برسر اقتدار آ کر اقلیتوں کے ساتھ جو سلوک کرنے والی تھی اس کا بروقت اندازہ علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح جیسے قائدین نے لگا لیا۔ انھوں نے اس تجزیے کی روشنی میں جب ہندستان میں مسلم قوم کو علیحدہ وطن کے لیے پکارا تو مسلم امت ایک فرد واحد کی طرح حصول پاکستان کی خاطر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ مسلمان جو اقلیتی صوبوں میں رہتے تھے اور جن کے صوبوں کو کسی طرح بھی پاکستان کا حصہ نہیں بنتا تھا انھوں نے بھی اسی جوش و خروش کے ساتھ پاکستان کے لیے جنگ لڑی جس جوش و خروش کے ساتھ مسلم اکثریت والے صوبوں کے مسلمان لڑ رہے تھے۔''

سوال یہ ہے کہ:

1) ہمارے قائدین کرام کو مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا خیال اسی وقت کیوں آیا جب ہندستان کے انگریز کی غلامی سے نجات کے آثار پیدا ہوئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے برصغیر کی انگریز سے آزادی میں سو سال کی تاخیر ہو جاتی تو ہمارے قائدین کرام کو مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کی ضرورت بھی سو سال بعد ہی محسوس ہوتی۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے قائدین کرام کے نزدیک ہندستان پر برطانوی تسلط مسلمانوں کے لیے باعث خیر و برکت تھا۔ اسی لیے انھوں نے پوری زندگی میں کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے انگریز کے ناراض ہو جانے کا خطرہ ہوتا اور نتیجے کے طور پر ان کے جیل جانے کا امکان پیدا ہو جاتا؟

2) ہمارے قائدین کرام نے مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کی ضرورت صرف اس لیے محسوس کی کہ ان کے خیال میں برصغیر کی مشرک اکثریت بھی مسلم اقلیت کے ساتھ وہی سلوک کرتی جو سپین کی عیسائی اکثریت نے وہاں کی مسلم اقلیت کے ساتھ کیا تھا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہمارے قائدین کرام اس بات کے لیے تیار تھے کہ ان صوبوں کے مسلمانوں کے ساتھ، جہاں وہ اقلیت میں تھے اور جو پاکستان کا حصہ نہیں بن سکتے تھے، بے شک وہ سلوک ہو جائے جو سپین میں مسلم اقلیت کے ساتھ پندرھویں صدی میں ہوا تھا یا ہمارے قائدین کا پروگرام تھا کہ وہ برصغیر کے جملہ مسلمانوں کو پاکستان منتقل کر لیں گے تاکہ ان کے کسی حصہ کے ساتھ وہ سلوک نہ ہو جو سپین میں ہوا تھا یا ان کے پاس کوئی اور منصوبہ تھا؟

3) برصغیر کی آزادی کے بعد بالغ رائے دہی کی بنیاد پر پارلیمانی نظام کے ذریعے انگریز سے مقامی آبادی کو اقتدار منتقل ہوا، اگر اسی بنیاد پر سپین میں مسلمانوں سے عیسائیوں کو اقتدار منتقل ہوا ہوتا تو کیا پھر بھی سپین کے مسلمانوں کے ساتھ وہی سلوک ہوتا جو پندرھویں صدی میں ہوا؟

4) کیا آزادی کے بعد بھارت کی مشرک اکثریت نے وہاں کی مسلم اقلیت کے ساتھ وہی سلوک فی الواقع کیا ہے جو سپین کی عیسائی اکثریت نے مسلمانوں کے ساتھ کیا تھا؟ اگر ایسا نہیں ہوا تو کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ برصغیر کی مشرک اکثریت سپین کی عیسائی اکثریت سے زیادہ رحم دل ہے یا اہل پاکستان کے خوف کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر سکی؟ اگر اب مشرک اکثریت مسلم اقلیت کے ساتھ سپین والا سلوک نہیں کر سکی تو متحدہ برصغیر میں جب مسلم آبادی کا تناسب کہیں زیادہ ہوتا تو

سپین والا سلوک کیسے کر لیتی؟ اور اگر فی الواقع انگریز سے آزادی کے بعد ایسا نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا تھا تو ہمارے قائدین نے مشرقی پنجاب میں کس خوشی میں کم و بیش پندرہ لاکھ مسلمان قتل کروا دیے اور تقریباً نوے ہزار مسلمان خواتین کو بے آبرو کروایا؟

مذکورہ بالا سوالات کے جوابات ہماری قیادت کی طرف سے آج تک نہیں دیے گئے اور نہ ہی یہ سوالات ہماری قیادت کا مسئلہ تھے اور نہ ہی فاضل دانش ور نے ان سوالات کو مذکورہ مضمون میں زیر بحث لانے کی ضرورت محسوس کی ہے۔

اسی مضمون میں موصوف نے شکوہ کیا ہے کہ پاکستان میں قانون کی حکمرانی نہیں ہے اور پاکستان ابھی تک اسلامی فلاحی ریاست نہیں بن سکا۔ کیونکہ پاکستان میں اجتماعی مفاد پر ذاتی مفاد حاوی ہوتا ہے۔ موصوف کا تجزیہ درست ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں نہیں ہو سکا؟ انسان اپنی سرشت کے اعتبار سے خود غرض ہے وہ اپنے ذاتی مفاد کو صرف اسی کے لیے قربان کرتا ہے جس سے اسے محبت ہو۔ ہر شخص اپنا ذاتی مفاد اپنی اولاد کے لیے قربان کرتا ہے۔ اپنے وطن کے لیے بھی کرتا ہے یہاں تک کہ خودکش حملہ تک کر دیتا ہے، لیکن یہ اسی وقت ہوتا ہے جب اسے وطن سے محبت ہوتی ہے۔ ہم نے کم و بیش نصف صدی تک برصغیر میں وطنی قومیت کی نفی کی بنیاد پر ایک تحریک چلائی اور احمقانہ طور پر توقع یہ رکھی کہ جب یہ تحریک بارور ہوگی تو وطنی قومیت میں منقلب ہو جائے گی اور اس کے نتیجے میں لوگوں میں وطن سے محبت پیدا ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ ہمارے قائد مسٹر جناح جن لوگوں کو ساتھ لے کر یہ تحریک چلا رہے تھے ان کا حال جناب عطاء الرحمٰن نے اپنے ایک کالم "تجزیہ" مطبوعہ نوائے وقت لاہور، 17 اگست 2005ء میں اس طرح بیان کیا ہے:

"1953ء کا یہ "تاریخی" واقعہ ابھی تک ہماری قوم کے حافظے میں زندہ ہے کہ ایک دن مرکزی اسمبلی کے اندر اس وقت کے منتخب اور سویلین وزیراعظم کے حق میں کثرت رائے کے ساتھ اعتماد کی تحریک منظور کی جاتی ہے۔ ایک ہفتے کے دوران میں وقت کا گورنر جنرل سول اور ملٹری بیوروکریسی کی پشت پناہی کے ساتھ اسے برطرف کر دیتا ہے۔ اگلے روز اسی اسمبلی کے وہی اراکین کم و بیش اتنی ہی اکثریت کے ساتھ برطرف شدہ وزیراعظم کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کر دیتے ہیں۔ یوں وقت کی طاقت کے

> آگے سر جھکا دیتے ہیں، ''زمینی حقائق'' کو بسر و چشم قبول کر لیتے ہیں اور نئے نامزد وزیراعظم کی راہوں میں پلکیں بچھا دینے کی دوڑ میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ پھر 1957-58ء کا یہ واقعہ تو کسی کو نہیں بھولا کہ کس طرح راتوں رات بڑے بڑے نامی گرامی اور نام نہاد خاندانی جاگیرداروں اور وڈیروں نے پچھلی وفاداری توڑ کر ریپبلکن پارٹی میں شرکت کا اعلان کر دیا تھا اس لیے کہ وقت کے صدر میجر جنرل سکندر مرزا اور کمانڈر انچیف ایوب خان کی یہی مشترکہ خواہش تھی''۔

مذکورہ بالا اقتباس میں جن ممبران اسمبلی کا ذکر ہے، یہ سب آل انڈیا مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر آئے تھے اور جناح صاحب کے تربیت کردہ اور نامزد کردہ تھے۔ ان صفات کے حامل افراد سے جناح صاحب یا کسی اور نے اگر کسی نوع کی خیر کے نتائج کی توقع رکھی تھی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بصیرت و بصارت اور فراست سے بالکل ہی محروم تھے، راقم السطور غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ دراصل جناح صاحب کے پیش نظر ایسا ہی پاکستان تھا جیسا پاکستان کے ایک شہری نے ہوائی اڈے پر مرکزی وزیر قانون کے ہاتھوں جوتے اور گھونسے کھا کر بھگتا اور ہم سب گزشتہ 63 سالوں سے بھگت رہے ہیں۔ یاد رہے کہ وزیر قانون نے قانون ہاتھ میں لے کر ایک مسافر کی خوب دھنائی کی تھی کیونکہ اس نے وزیر قانون کے کسی غیر معقول طرز عمل پر اعتراض کر دیا تھا جبکہ پاکستان میں وزیر قانون تو قانون سے بالاتر ہوتا ہے۔



17

روزنامہ نوائے وقت لاہور کی اشاعت 11 دسمبر 2004ء میں پروفیسر فتح محمد ملک کا مضمون بعنوان ''دو قومی نظریہ اور بھارت کے مسلمان'' نظر سے گزرا۔ میرے نزدیک اس مضمون کے مندرجات تشنہ ہیں کیونکہ اس ضمن میں چند اہم سوالات سے پروفیسر صاحب موصوف نے صرف نظر کیا ہے، جو درج ذیل ہیں:

موصوف نے مذکورہ مضمون میں گیارہ مرتبہ ''دو قومی نظریہ'' کا ذکر کیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہ ہے کیا اور اس کی بنیاد کیا ہے۔ اگر موصوف یہ فرما دیں کہ اس کی بنیاد مذہب ہے تو میں عرض کروں گا کہ برصغیر میں دو مذاہب تو نہیں تھے۔ یہاں متعدد مذاہب تھے اور ہیں پھر ہماری قیادت نے کس اصول کی بناء پر تمام غیر مسلموں کو اختلاف مذہب کے باوجود ہندوؤں میں شامل کر کے ایک قوم بنا دیا۔ اگر برصغیر کے تمام غیر مسلم اختلاف مذاہب کے باوجود محض وطن کی بنیاد پر ایک قوم بن سکتے تھے تو مسلمان ان میں کیوں شامل نہیں ہو سکتے تھے؟ اگر دو قومی نظریہ کی بنیاد مذہب تھا تو ہماری قیادت کو تو کثیر القومی نظریے کا مدعی ہونا چاہیے تھا نہ کہ دو قومی نظریہ کا۔ موصوف فرماتے ہیں:

> ''گویا اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کا مفاد بھی شمال مغربی ہندستان اور بنگال میں جداگانہ مسلمان مملکتوں کے قیام میں مضمر تھا۔ برصغیر میں دو آزاد اور خود مختار مسلمان ممالک بھارت کی مسلمان اقلیت کے تہذیبی، معاشرتی اور سیاسی حقوق کے تحفظ کے ضامن تصور کیے گئے تھے''۔

یہ تصور کس قدر خام بلکہ بچگانہ تھا؟ اس کے لیے مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اب کوئی

صاحب دانش ہی بتائیں کہ ”برصغیر میں دو آزاد اور خود مختار مسلمان ممالک (پاکستان اور بنگلہ دیش) بھارت کی مسلمان اقلیت کے تحفظ کی گزشتہ نصف صدی سے کیا ضمانت دے رہے ہیں؟ اگر وہ ضمانت سلیمانی ٹوپی اوڑھ کر بیٹھی ہوئی ہے تو براہ کرم کوئی صاحب وہ ٹوپی اُتار کر اُسے بے نقاب کر دیں تا کہ برصغیر کے مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ کس قدر صاحب بصیرت قیادت کے پیچھے چلے تھے۔ موصوف فرماتے ہیں:

”تصور پاکستان کو حقیقت کا روپ دینے میں تین طاقتوں نے بے پناہ مشکلات کھڑی کر رکھی تھیں۔ یہ تین طاقتیں تھیں: (۱) برطانوی حکومت (۲) انڈین نیشنل کانگریس (۳) کانگریسی مسلمان۔ ان تینوں طاقتوں کی جانب سے دو قومی نظریہ اور تحریک پاکستان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا“۔

کانگریسی مسلمان تو کانگریس کا حصہ ہی تھے۔ موصوف نے صرف گنتی بڑھانے کے لیے ان کا ایک الگ ”پارٹی“ کے طور پر ذکر کر دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت نے الیکشن میں مسلم لیگ کو تقسیم ملک کا منڈیٹ دے دیا تو مخالف ووٹ اگر انچاس فی صد بھی ہوتے تو اس سے کیا فرق پڑتا اور فی الواقع کیا فرق پڑا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہماری قیادت کو ابتدا ہی سے یہ معلوم نہیں تھا کہ ان کے راستے میں کیا کیا مشکلات پیش آئیں گی اور ان پر کس طرح قابو پایا جائے گا؟ اگر ہماری قیادت کو ابتدا سے ان مشکلات کا علم ہی نہیں تھا تو ہماری قیادت کی بصیرت کا کیا عالم تھا۔ اگر علم تھا تو ان پر قابو پانے کے لیے اس نے کیا تیاریاں کی تھیں؟ موصوف فرماتے ہیں:

”پاکستان کے تصور میں پورا بنگال اور غیر منقسم پنجاب شامل تھا۔ ان تین طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث ہمیں پورے پاکستان کی بجائے کٹا پھٹا پاکستان نصیب ہوا“۔

بہت خوب۔ کیا موصوف چاہتے تھے کہ مسلم لیگ کا کوئی مخالف نہ ہوتا اور تمام مخالف ہاتھ باندھ کر اور صف آرا ہو کر ہماری قیادت کے سامنے کھڑے ہو جاتے اور عرض کرتے کہ لیجیے حضور! یہ پورا پاکستان پیش خدمت ہے، اسے قبول فرما کر ہماری عزت افزائی فرمائیں؟ میرا سوال یہ ہے کہ اگر برطانوی حکومت برصغیر کو تقسیم کرنے سے انکار کر دیتی تو کیا ہماری قیادت اس کے لیے

ہتھیار اٹھا لیتی اور بزور طاقت وہ تمام علاقہ جو موصوف کے بقول تصور پاکستان میں شامل تھا اسے حاصل کر لیتی؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو کٹے پھٹے پاکستان کو قبول کرنے کی بجائے اس نے ایسا کیوں نہ کیا؟ اور اگر جواب نفی میں ہے تو پھر موصوف کا ان تین طاقتوں سے شکوہ بے جا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ہماری قیادت کا ذہنی رویہ تو بھکاری کی صدا کی طرح تھا۔

اس ذہنی رویے کی وجہ سے ہماری قیادت نے جو مل گیا اسے صبر شکر کے ساتھ قبول کر لیا اور اپنے پیروکاروں کو بھی صبر شکر کی تلقین کی۔ وہ اب کیوں شکوہ کناں ہیں: ”شکوۂ بے جا بھی کرے کوئی تو لازم ہے شعور“۔ موصوف فرماتے ہیں:

”عرب ایک قوم ہیں مگر مشرق وسطیٰ کے کئی ممالک میں آباد ہیں۔ عرب قوم کے افراد دوسرے ممالک میں آنے جانے کی خاطر ویزے کے اس طریق کار کے پابند ہیں جسے آج کی عصری ضروریات نے جنم دیا ہے“۔

سوال یہ ہے کہ کیا عرب دو قومی نظریہ کی وجہ سے مختلف ممالک میں آباد ہیں؟ اگر نہیں تو اس کی مثال دینے کا فائدہ۔ اگر دو قومی نظریہ کی وجہ سے ایسا ہے تو انھوں نے کس ملک کو اس طرح تقسیم کروایا جس طرح ہم نے برصغیر کو تقسیم کروایا۔ موصوف فرماتے ہیں:

”بھارت کے مسلمان بھارت ہی کے کسی مسلمان اکثریتی علاقے میں ایک اور پاکستان قائم کر لیں“۔

موصوف کا مشورہ تو سنہری حروف میں لکھا جانا چاہیے، لیکن موصوف نے وہ نسخہ صیغۂ راز میں رکھا ہے جسے اختیار کر کے بھارت کے مسلمان ایک اور پاکستان بنا سکتے ہیں۔ موصوف اگر انھیں وہ نسخہ بھی بتا دیتے تو ان کا بھلا ہو جاتا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتے کہ اگر کسی علاقے میں بھی ان کی اکثریت نہ ہو تو پھر وہ کیا کریں؟ تا قیام قیامت مار کھاتے رہیں اور اپنی قیادت کو دعائیں دیتے رہیں۔ ایک پاکستان کے لیے تو برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے تقریباً پندرہ لاکھ افراد قتل کروائے اور تقریباً نوے ہزار مسلمان عورتوں کو بے آبرو کروایا۔ اس سے موصوف کا جی نہیں بھرا کہ موصوف ایک اور پاکستان قائم کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ کیا امریکا کی کاسہ لیسی کے لیے موصوف کو ایک پاکستان کافی محسوس نہیں ہوتا؟

ملک صاحب موصوف سے آخری سوال یہ ہے کہ:

اگر 1857ء کی جدوجہد کے نتیجے میں مسلمان مغل حکومت کا اقتدار بحال کرنے میں کامیاب ہو جاتے اور 1947ء میں مغل بادشاہ کی حکومت ہی ہوتی تو کیا اس صورت میں بھی ہم دوقومی نظریہ کی بنیاد پر برصغیر تقسیم کرواتے؟ اگر نہیں تو پھر اس نظریے کا کیا حشر ہوتا؟



18

جناب رانا فضل الرحمٰن نعیم روزنامہ الجریدہ لاہور، 14 اگست 2007ء میں اپنے مضمون ''قائداعظم اور ان کے مخلص ساتھی'' کی گیارھویں قسط میں یہ ثابت کرنے کے لیے کہ جناح صاحب مجاہد اسلام اور عاشق قرآن تھے، رقم طراز ہیں:

> ''(بانیِ پاکستان کے والد) جناح کے ہاں سات بچے پیدا ہوئے۔ اگر وہ مسلمان نہیں تھے تو انھوں نے اپنے بچوں کے اسلامی نام کیوں رکھے؟ محمد علی، رحمت، مریم، احمد علی، شیریں، فاطمہ اور بندے علی۔ ان تمام ناموں سے یہ امر عیاں ہوتا ہے کہ جناح کی فیملی مسلمان تھی''۔

حیرت ہے کہ ایک عالم و فاضل اور وسیع المطالعہ شخص ایسی بات بھی کہہ سکتا ہے جس کی توقع ایک پرائمری سکول کے طالب علم سے بھی نہیں کی جا سکتی۔ شاید ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورہ حج کی آیہ مبارکہ نمبر 46 کے آخر میں فرمایا ہے کہ ''آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں، دل جو سینوں میں ہیں اندھے ہو جاتے ہیں''۔ ایسے کور باطن لوگ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ جناح صاحب تو پیغمبر تھا، بلکہ بعض تو جناح صاحب کو افضل البشر کہنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اس کائنات کے اندر پیدا ہوتے ہیں، پلتے ہیں، بڑھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ نعمتوں سے صبح و شام، دن رات فائدہ اٹھاتے ہیں، رائی کے دانے سے اگنے والے پودے کو ایک عظیم تناور درخت کی شکل اختیار کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، پیدائش کو بھی دیکھتے ہیں اور موت کو بھی، لیکن اس کے باوجود اس کائنات کی خالق و مالک ہستی، اللہ تعالیٰ کے وجود کو تسلیم نہیں

کرتے، پاکستان کے پہلے چیف جسٹس منیر بھی ایسے لوگوں میں شامل تھے (تفصیل آگے آ رہی ہے)۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں انسان کو چیلنج کیا ہے:

الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ط مَاتَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ط فَارْجِعِ الْبَصَرَ لا هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ. (سورہ الملک: آیہ مبارکہ نمبر 3)

"(اللہ تعالیٰ وہ ہستی ہے کہ) جس نے سات آسمان اوپر تلے پیدا کیے۔ تو اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں کوئی خلل نہ دیکھے گا سو تو (ایک بار پھر) نگاہ ڈال کر دیکھ لے کہیں تجھ کو کوئی کجی نظر آتی ہے۔"

اللہ تعالیٰ کے اس چیلنج کا جواب نہ دے سکنے کے باوجود ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ کائنات محض اتفاق سے عالم وجود میں آ گئی ہے۔

جناح صاحب اور ان کے خاندان کو مسلمان تسلیم کروانے کے لیے رانا صاحب موصوف کے پاس واحد استدلال یہ ہے کہ "اگر وہ (یعنی مسٹر جناح کے والد) مسلمان نہیں تھے تو انھوں نے اپنے بچوں کے اسلامی نام کیوں رکھے"۔ یہ استدلال معلوم نہیں موصوف نے کسے بیوقوف بنانے کے لیے پیش کیا ہے؟ وہ خود تو اس قدر احمق نہیں ہو سکتے کہ ان کو معلوم ہی نہ ہو کہ کسی کا اسلام اس کے نام سے نہیں، بلکہ اس کے عقائد سے ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے بارے میں بھی یہ بات درست ہے کہ محض نام سے مذہب کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ معروف اداکار دلیپ کمار کو محض اس لیے ہندو مان لیا جائے کہ اس کا نام ہندوؤں جیسا ہے۔ یا موجودہ بھارتی اداکار شاہد کپور کو محض نام کی وجہ سے مسلمان مان لیا جائے۔ جب کہ حقائق یہ ہیں کہ اگر ایک شخص کا نام مسلمانوں جیسا ہے تو اس کے بارے میں صرف ظن ہی ہوتا ہے کہ وہ مسلمان ہوگا، لیکن جب معلوم ہو جائے کہ اس کے عقائد اسلامی نہیں ہیں تو نام کے باوجود ہم مجبور ہوتے ہیں کہ اسے مسلمان تسلیم نہ کریں۔

ایسے ہی دانش ور حضرات سے ایک متعین سوال کا جواب درکار ہے کہ ایک شخص کا نام "غلام احمد" ہے اور یہ نام صرف مسلمان ہی رکھتے ہیں۔ ہندو، سکھ، عیسائی، یہودی یہ نام نہیں رکھتے۔ کیا صرف اس بنا پر کہ اس کا نام "غلام احمد" ہے، اسے ہم مسلمان تسلیم کریں گے؟ ممکن ہے کہ کوئی صاحب اس کا جواب "ہاں" میں دیں۔ اس سے اگلا سوال یہ ہے کہ کیا مرزا "غلام احمد" قادیانی کو

اس بنا پر مسلمان تسلیم کر لیا جائے کہ اس کا نام مسلمانوں جیسا ہے۔ جو شخص بھی اس کا جواب "ہاں" میں دے گا تو میں مجبور ہوں کہ اس کو بھی مسلمان تسلیم نہ کروں اور اگر جواب "نہ" میں ہے تو موصوف کا پورا استدلال ہوا میں تحلیل ہو گیا اور موصوف نے اپنے مضمون کی گیارھوں قسط تحریر کر کے اپنا وقت اور الجریدہ کے صفحات ضائع کیے۔ اب میرا سوال یہ ہے کہ "سلطان محمد"۔ "علی سلمان"۔ "عبدالکریم" جیسے نام بھی مسلمان رکھتے ہیں یا نہیں۔ اگر جواب اثبات میں ہے تو میں یہ عرض کروں گا کہ "سلطان محمد" آغا خاں سوم کا نام تھا۔ "علی سلمان" اس کے بیٹے اور موجودہ آغا خاں کے والد کا نام تھا اور "کریم" موجودہ آغا خاں چہارم کا نام ہے۔ اب کوئی مجھے یہ بتائے کہ کیا ہم ان تینوں کو صرف اس بنا پر مسلمان سمجھتے ہیں کہ ان کے نام مسلمانوں جیسے ہیں یا ان کے عقائد کی بنا پر غیر مسلم تسلیم کرتے ہیں؟ جو شخص بھی ان کو مسلمان تسلیم کرتا ہے تو میں مجبور ہوں کہ اسے خارج از اسلام تسلیم کروں۔ اگر موصوف ان کو مسلمان تسلیم نہیں کرتے تو ان کا استدلال کہاں گیا؟

ہمارے دانش ور بھی کیا کریں، جس شخص کو گزشتہ پون صدی سے وہ مجاہد اسلام تسلیم کرتے اور دوسروں کو بھی باور کراتے چلے آ رہے ہیں ان کو جب یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ تو پیدائشی آغا خانی تھے اور آغا خانی روافض مسلمان نہیں ہیں تو اسے مسلمان ثابت کرنے کے لیے ایسے ہی ہاتھ پاؤں مارتے ہیں، ایسی ہی بے تکی دلیلیں پیش کرتے ہیں جیسی رانا صاحب موصوف نے پیش کی ہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ جناح صاحب کا تو نام بھی اسلامی نہیں تھا، ان کا نام تو "مامدالی جینا بھائی" تھا، جسے انھوں نے پہلے "محمد علی جناح" سے بدلا تھا، بعد میں "ایم۔ اے۔ جناح" میں تبدیل کر لیا۔ قائداعظم کے خاندانی تنازعے کے مصنف جناب خالد احمد اپنی دوسری کتاب لفظوں کی کہانی، لفظوں کی زبانی (مشعل، لاہور/2010ء/ص 171) میں بعنوان "جناح کے بارے میں" لکھتے ہیں:

"والپرٹ نے قائداعظم کے متعلق بیشتر باتیں ٹھیک کہیں لیکن ان کے نام کا درست مطلب بتانے میں ناکام رہا۔ قائداعظم کی داستانِ حیات وہاں سے شروع ہوتی ہے جب انھیں "مامدالی جینا بھائی" کہا جاتا تھا۔ سندھ کے مدرسۃ الاسلام میں، جہاں انھوں نے ابتدائی تعلیم کے لیے داخلہ لیا، ان کا یہی نام درج ہے۔ محترمہ فاطمہ جناح نے بھی اپنے بھائی کو "مامد" لکھا ہے۔ بچپن میں ان کے والدین بھی انھیں اسی نام سے

پکارتے تھے۔

قائداعظم کے والد کا پہلا نام ''جینا'' تھا، خاندانی نام ''پونجا'' تھا۔ جس کا مطلب ہے ''مالدار شخص''۔ یہ گجراتی کاٹھیاواڑی کاروباری برادری کا مخصوص نام ہے۔ سو قائداعظم کا پورا نام ''مامدالی جینا بھائی پونجا'' تھا۔ جب قائداعظم 1893ء کے لگ بھگ لندن گئے تو انھوں نے اپنا نام تبدیل کرلیا۔ پہلے انھوں نے ''مامدالی'' سے محمد اور علی کو علیحدہ علیحدہ کیا اور پھر ''جینا بھائی'' کو مختصر کر کے صرف ''جناح'' کرلیا۔ اس طرح انھوں نے ''ایم۔اے۔جناح'' کے دستخط شروع کر دیے۔ نام تبدیل کرنے کا مشورہ جس کسی نے بھی دیا ہوگا، بہت ذہین آدمی ہوگا۔''



19

پروفیسر محمد مظفر مرزا نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ روزنامہ Nation لاہور، 20 اپریل 2006ء میں محمد علی جناح صاحب کا ایک فرمان نقل کیا ہے:

"Pakistan came into existence, the day the first Hindu embraced Islam".

ترجمہ: ''پاکستان اسی دن وجود میں آ گیا جس دن پہلے ہندو نے اسلام قبول کیا تھا۔''

میں اپنے ناقص فہم کی بناء پر جناح صاحب کے مذکورہ بالا فرمان کو سمجھ نہیں سکا۔ میری نظر سے تو اس سے زیادہ بے معنی بیان (Meaningless Statement) آج تک نہیں گزرا۔ اگر برصغیر کے پہلے ہندو کے مسلمان ہوتے ہی پاکستان بن گیا تھا تو جناح صاحب نے 14 اور 15 اگست 1947ء کی درمیانی شب کو کیا تخلیق کیا تھا اور جس کے بارے میں پاکستان کے جملہ دانش ور خواتین و حضرات کی طرف سے ہمیں مسلسل باور کرایا جا رہا ہے کہ یہ ایسا کارنامہ ہے کہ انسانی تاریخ میں اس سے قبل کوئی انجام نہیں دے سکا۔ پہلے ہندو کے مسلمان ہونے سے ہی اگر پاکستان بن گیا تھا تو اس کی حدود کیا تھیں؟ کیا وہ پاکستان بھی جناح صاحب کے پاکستان کی طرح Maimed-Mutilated-Truncated تھا؟ کیا وہ پاکستان اسی سرزمین پر تھا یا مریخ یا کسی دوسرے سیارے پر واقع تھا؟۔ موصوف مزید فرماتے ہیں:

"Quid-i-Azam knew very well the Hindu psyche. He was an expert on Hindu Mentality".

"قائداعظم ہندو نفسیات کو بخوبی جانتے تھے۔ وہ ہندو ذہنیت کے ماہر تھے۔"

موصوف نے درست فرمایا ہے، اسی لیے مشرقی پنجاب میں صرف پندرہ لاکھ مسلمان قتل ہوئے اور صرف نوے ہزار مسلمان عورتیں بے آبرو ہوئیں۔ اگر جناح صاحب ہندو ذہن کے ایکسپرٹ نہ ہوتے تو موصوف کے خیال میں مسلمان اس سے کہیں زیادہ نقصان اُٹھاتے۔ ہندو ذہن کے ایکسپرٹ ہونے کی وجہ سے ہی جناح صاحب نے برصغیر کے تقریباً نصف مسلمان مستقل طور پر مشرکین بھارت کی غلامی میں دے دیے تھے۔

ایک سوال دریافت طلب ہے کہ کیا تقسیم برصغیر بجائے خود ایک مقصد تھا یا کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ اگر تقسیم برصغیر بجائے خود ایک مقصد تھا تو وہ مقصد حاصل ہو گیا اور تمام لیگی دانش ور حق بجانب ہیں کہ جناح صاحب کی شان میں قصائد کہتے رہیں اور اگر تقسیم برصغیر بجائے خود مقصد نہیں، بلکہ کسی دوسرے مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا تو وہ مقصد کیا تھا؟ اور کیا وہ مقصد حاصل ہو گیا؟ اگر نہیں تو کیوں اور اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ یہ بہت اہم سوال ہے جس کا مجھے کسی طرف سے جواب نہیں ملا۔ میری رائے میں جناح صاحب کے پیش نظر تقسیم برصغیر بجائے خود ایک مقصد تھا اور تقسیم کے ذریعے مسلمانوں کی عددی طاقت کو تین حصوں میں تقسیم کر کے بے اثر کرنا ان کا مقصود تھا۔ مسلمانوں کو تقسیم کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی جناح صاحب کے پروگرام میں شامل تھا کہ برصغیر کے تمام غیر مسلم متحد رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جناح صاحب نے دو قومی نظریہ کا نعرہ لگایا۔ کثیر القومی نظریہ پیش نہیں کیا۔

جو قائد اپنے پیروکاروں (community) سے مخلص ہوتا ہے وہ اسے متحد رکھنے کے لیے کس حد تک جا سکتا ہے اس کا اندازہ درج ذیل واقعہ سے ہو جائے گا:

1932ء میں برٹش گورنمنٹ نے انڈیا میں اچھوتوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دے دیا جس طرح سے کہ اس سے قبل انڈیا کے مسلمانوں کو یہ حق دیا گیا تھا اور اس میں انڈین نیشنل کانگریس کی منظوری بھی شامل تھی لیکن اچھوتوں کو یہ حق ملنے سے ہندو طبقے کی تقسیم ہوتی تھی اور ہندوؤں کی یہ تقسیم مسلمانوں کے مفاد میں تھی اور اس بات کا امکان تھا کہ اس طریق انتخاب سے جب اچھوتوں کے نمائندے اسمبلیوں میں جائیں تو وہ مسلمان نمائندوں کے ساتھ مل کر اونچی ذات کے ہندو نمائندوں کو اقلیت میں تبدیل کر دیں۔ ہندوؤں کا مفاد بہر حال اس میں تھا کہ وہ متحد رہیں۔

چنانچہ اچھوتوں کو جداگانہ انتخاب کے حق سے محروم کروانے کے لیے اور ہندو کمیونٹی کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے ان کی قیادت نے کیا طرز عمل اختیار کیا وہ ملاحظہ فرمائیں:

"... On 17th August 1932 H.M.G`s Award was announced, the untouchables,or the Depressed Clases,as they were formally described,would have a separate electorate.The next day Gandhi wrote to Prime Minister that he would `resist your decision with his life. Unless the decision was reversed, he said, he would cease taking food of any kind save water with or without salt and soda from on 20th September."(1)

ترجمہ: "برطانوی حکومت نے 17 اگست 1932ء کو اچھوتوں اور ہندوؤں کے نچلے طبقے (جیسا کہ انھیں عام طور پر کہا جاتا تھا) کے لیے جداگانہ انتخاب کا حق دینے کا اعلان کر دیا۔ اگلے دن گاندھی نے وزیراعظم کو لکھا کہ وہ اس کی آخری دم تک مزاحمت کرے گا۔ یہاں تک کہ یہ فیصلہ تبدیل ہو جائے۔ اس نے کہا کہ وہ تادم مرگ بھوک ہڑتال کرے گا اور 20 ستمبر دوپہر سے سوائے نمکین یا سوڈا ملے پانی کے کوئی چیز نہیں کھائے گا۔"

اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مسلمانوں کے قائد کی ہمدردیاں اچھوتوں کے ساتھ ہوتیں کیونکہ ہندوؤں کی تقسیم مسلمانوں کے مفاد میں تھی اور مسلمانوں کا قائد اچھوتوں کی حوصلہ افزائی کرتا اور اچھوتوں کی حمایت میں جواباً بھوک ہڑتال کرتا جس سے برٹش گورنمنٹ کو اپنے فیصلہ پر قائم رہنے کے لیے تائید میسر آتی، لیکن مسلمانوں کے قائد کی طرف سے کچھ بھی نہ کیا گیا۔ گاندھی کی بھوک ہڑتال نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ اچھوت خود جداگانہ انتخابات سے دستبردار ہو گئے اور کچھ مخصوص نشستوں پر قناعت کر لی، اس مقصد کے لیے جو معاہدہ تحریر کیا گیا، اسے پونا پیکٹ کا نام دیا گیا۔

"As Gandhi`s condition had entered the danger zone,word of agreement was cabled to London, Where MacDonald and his ministers accepted it,modifying the earlier award.At 5.PM on the 26th,after news of alteration had reached Yeravda,Gandhi broke his fast,sipping orange juice handed to him by a relieved kasturba." (2)

ترجمہ: ''جیسے ہی گاندھی کی حالت خطرے کی حد میں داخل ہوئی معاہدہ کے مندرجات کو بذریعہ تارلندن ارسال کردیا گیا جہاں میکڈانلڈ اور اس کے وزرانے اسے منظور کرلیا۔26 تاریخ کو پانچ بجے شام اس تبدیلی کی اطلاع یراودا موصول ہوئی گاندھی نے بھوک ہڑتال اپنی اہلیہ کستوری بائی سے ملنے کے رس کا گلاس لے کر ختم کردی۔''

اگر جناح صاحب کو بھی مسلمانوں کا مفاد عزیز ہوتا تو وہ بھی اچھوتوں کے مفاد (حقیقت میں مسلمانوں کے مفاد) کے لیے جان کی بازی لگادیتے، لیکن جناح صاحب کے پیش نظر مسلمانوں کا اتحاد کبھی تھا ہی نہیں، بلکہ ان کا پروگرام مسلمانوں کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کا تھا۔

اگر کسی پودے کو حنظل (کوڑتما) لگا ہوا ہو تو کوئی صاحب یہ نہیں کہہ سکتے کہ کاشت کرنے والے نے تو خربوزے کا پودا کاشت کیا تھا بعد میں کسی وجہ سے وہ حنظل میں تبدیل ہوگیا یا جیسے کوئی ببول کا بیج بو کر پیڑ میں آم لگنے کی احمقانہ توقع کرے۔ بقول تلسی داس:

ع بوئے پیڑ ببول کے تو آم کہاں سے آئے

اسی طرح کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جناح صاحب کے پیش نظر تو کوئی دوسری قسم کا پاکستان تھا، لیکن بن گیا کچھ اور۔ ان کے پیش نظر یہی پاکستان تھا جو ہم بھگت رہے ہیں۔ یہ جناح صاحب کا ہی پاکستان ہے۔ یہ نہ تو گاندھی کا ہے نہ نہرو کا نہ ابوالکلام آزاد کا ہے اور نہ ہی حسین احمد مدنی کا۔ جناح صاحب کی حسن قیادت پر فخر کریں کہ 2005ء میں ناکام ریاستوں میں پاکستان چونتیسویں (34) نمبر پر تھا۔ 2006ء میں 9ویں نمبر پر آ گیا ہے۔ ترقی کا یہ سفر جاری رہا تو جلد

ہی ہم پہلے نمبر پر آ جائیں گے۔

☆☆☆

لیجیے ترقی کا یہ سفر جاری ہے۔ 22 جون 2010ء کے تمام اخبارات میں امریکا کے فارن پالیسی میگزین کی رپورٹ نقل ہوئی ہے جس میں پاکستان کو 2010ء کی 10 ناکام ترین ریاستوں میں شمار کیا گیا ہے، جبکہ 177 ممالک میں بھارت کی 87ویں پوزیشن ہے۔(3)

نوائے وقت کے فکاہی کالم ''سر راہے'' میں اس خبر پر بایں الفاظ خامہ فرسائی کی گئی:

''ایک امریکی جریدے کی رپورٹ کے مطابق پاکستان ناکام ریاستوں کی فہرست میں 10ویں نمبر پر آ گیا۔

مبارک ہو گڈ گورننس والوں کو کہ پاکستان ناکام ریاستوں کی فہرست میں دسویں نمبر پر آ گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ ترقی معکوس میں پاکستان نے بہت سے ریکارڈ توڑ دیے۔

مگر ہمیں ان فہرستوں سے کیا، اس لیے کہ ہمارے ہاں حکومت میں وہی ہوتا ہے جو پیچھے کی طرف دوڑتا ہے۔ دسویں پوزیشن بھی کوئی کم نہیں، یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ ہم نمبر وَن پر آ جاتے۔ امیر ملکوں نے غریب ملکوں کی فہرست بنادی ہے، غربت کی غار سے نکلنا اور ناکام ریاستوں کا ٹیگ ہٹانا ہمارے لیے چیلنج ہے، اگر آج آئی ایم ایف ہاتھ کھینچ لے تو ہمارے ہاں باقاعدہ فاقہ کشی شروع ہو جائے گی۔

جو ملک قرضے اٹھا کر دوسروں کی جنگ لڑے، وہ پیٹ کی جنگ ہار جائے گا اور یہ کہتا ہوا سڑکوں پر آ جائے گا کہ:

پیٹ نہ پئیاں روٹیاں
تے سبھے گلاں کھوٹیاں

اگر اس ملک کو اچھی قیادتیں نصیب ہوتی رہتیں تو آج پاکستان کامیاب ریاستوں میں شمار ہوتا۔''(4)

مسٹر جناح کی ''شاہکار تخلیق'' پاکستان میں لوگ غربت، بھوک، افلاس اور بے روزگاری سے تنگ آ کر خودکشیاں کررہے ہیں۔ خودکشی کی خبروں سے اخبارات بھرے ہوتے ہیں۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور، 13 اگست 2009ء میں ایک نوجوان کی خودکشی کی خبر بعنوان: ''بے

روزگاری سے تنگ نوجوان نے قومی پرچم اٹھائے مینارِ پاکستان کے سائے تلے زہر نگل کر جان دے دی۔'' خبر کا متن یہ ہے:

''مینارِ پاکستان گراؤنڈ میں 29 سالہ نامعلوم نوجوان، جس نے ہاتھ میں قومی پرچم اٹھا رکھا تھا، نے پاکستان زندہ باد اور بے روزگاری مردہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیے اور شور مچاتا رہا کہ اسے نوکری نہیں مل سکی۔ یہ کہنے کے بعد اس نے ہاتھ میں پکڑی گندم میں رکھنے والی گولیاں کھالیں، جس سے اس کی حالت غیر ہوگئی۔ وہاں موجود افراد نے ریسکیو 1122 کے ذریعے طبی امداد کے لیے ہسپتال داخل کروایا۔ جہاں اس نے ڈاکٹروں کو اپنا نام شاہد بتایا اور کہا کہ اس نے بے روزگاری سے دلبرداشتہ ہوکر گولیاں کھائی ہیں۔ بعدازاں وہ جانبر نہ ہوسکا۔''(5)

اس خبر پر بھارتی ٹی وی ''سہارا'' نے جو تبصرہ کیا، وہ نوائے وقت، لاہور، 14 اگست 2009ء میں بعنوان ''مینارِ پاکستان پر بے روزگار نوجوان کی خودکشی حکومتِ پاکستان کے لیے لمحۂ فکریہ ہے'' شائع ہوا ہے:

''پاکستان کے یومِ آزادی کے حوالے سے خصوصی رپورٹ میں بھارتی چینل سہارا ٹی وی نے کہا ہے کہ اس مرتبہ پاکستان کو سب سے بڑا تحفہ 29 سالہ نوجوان شاہد نے دیا ہے، جس نے غربت اور بے روزگاری سے تنگ آ کر مینارِ پاکستان پر اس جگہ پر اپنی جان دے دی جہاں 1940ء میں آزاد پاکستان بنانے کی قرارداد پیش کی گئی تھی۔ یہ ایک لمحۂ فکریہ اور موجودہ حکومت کے لیے ایسا سوالیہ نشان ہے جس کا جواب آنے والی حکومت دے گی۔''(6)

سوال یہ ہے کہ پاکستانیوں کو ان بدترین حالات سے دوچار کس نے کیا کہ وہ اپنی جان کے درپے ہوگئے اور خودکشیاں کرنے لگے۔ اس کا جواب لیگی دانش ور جناب ڈاکٹر صفدر محمود اپنے ایک کالم میں دیتے ہیں:

''ہم پر تو قائداعظمؒ کی جیب کے کھوٹے سکوں کے کھوٹے سکے حکمرانی فرماتے ہیں۔ یہاں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ خود قائداعظمؒ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ میری جیب میں کھوٹے سکے ڈال دیے گئے ہیں، لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان کی جیب میں

جاگیرداروں کی شکل میں کھوٹے سکے ہی موجود تھے اور اس تناظر میں موجودہ لیڈران اِن کھوٹے سکوں کے کھوٹے سکے ہیں جنھیں عوام سے زیادہ اپنے مفادات سے غرض ہے، جو اقتدار کو دولت بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں، جن کے غیرملکی بینکوں میں کروڑوں ڈالرز کے اکاؤنٹ ہیں اور جن کی جائدادوں کا سلسلہ دوبئی، سپین اور لندن سے لے کر امریکا تک پھیلا ہوا ہے۔ جو مغل حکمرانوں کی مانند زندگی بسر کرتے اور دن میں لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کرتے ہیں، لیکن غم اُن غریبوں کا کھاتے ہیں جنھیں نانِ جویں اور خشک روٹی بھی میسر نہیں، جو بارہ بارہ افراد پر مشتمل کنبے ایک کمرے میں رہتے اور تین ہزار سے چار ہزار روپوں میں مہینہ گزارتے ہیں، کیا یہ غریبوں کا غم کھانے کا نہایت جعلی طریقہ نہیں؟''(7)

ڈاکٹر صفدر محمود کے اعتراف کے بعد مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں لیکن انھوں نے جناح صاحب کے کھوٹے سکوں کے شاہانہ ٹھاٹ باٹ اور رہن سہن پر جو تبصرہ فرمایا ہے، اس کی مناسبت سے ہم ذیل میں کھوٹے سکوں کے بارے میں ایک واقعہ درج کرنا چاہتے ہیں۔ معروف صحافی جناب پرویز حمید لکھتے ہیں:

''1967ء کی کسی تاریخ کو مولانا عبدالحمید خان بھاشانی لاہور ایئرپورٹ پر پہنچے۔ اتفاق سے میاں ممتاز دولتانہ بھی اس فلائٹ سے آئے تھے۔ مولانا نے میاں عارف افتخار (میاں افتخار الدین کے فرزند) کے گھر جانا تھا۔ میاں دولتانہ نے ازراہِ مروت انھیں اپنی گاڑی پر بٹھالیا۔ میاں عارف افتخار کے گھر پہنچ کر مولانا نے میاں دولتانہ سے کہا: میاں صاحب! حیرت کی بات ہے کہ ہم مشرقی پاکستان میں ایک ایک کمرے میں 26, 26 افراد رہتے ہیں، مگر یہاں (مغربی پاکستان میں) جاگیردار 26, 26 کنال کے بنگلوں میں صرف دو دو افراد رہتے ہیں اور پھر بھی عوام کی سیاست کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مولانا نے یہ بات کہی تو میاں عارف افتخار کے لیے تھی، مگر اتفاق سے میاں دولتانہ پر بھی لاگو ہوگئی کیونکہ وہ اس سے بھی بڑے گھر میں صرف دو تین افراد ہی رہتے تھے۔''(9)



حوالہ جات

(1) Gandhi,The man,His people and the Empire by Rajmohan Gandhi, page 346

(2) Gandhi,The Man,His People and the Empire by Rajmohan Gandhi, page 349

(3) روزنامہ نوائے وقت، لاہور/22جون2010ء

(4) روزنامہ نوائے وقت، لاہور/30جولائی2009ء

(5) روزنامہ نوائے وقت، لاہور/13اگست2009ء

(6) ایضاً/14اگست2009ء

(7) روزنامہ جنگ لاہور/21اگست2009ء

(8) روزنامہ نوائے وقت/ لاہور،4دسمبر2008ء

20

جو کچھ اب تک کے مطالعہ سے میری سمجھ میں آیا ہے وہ یہ ہے کہ مسٹر جناح کا ذاتی زندگی میں کوئی مذہب تھا ہی نہیں۔ پیدائشی آغا خانی ہونے کی وجہ سے انھیں قرآن مجید کی ناظرہ تعلیم کے لیے مسجد میں تو بھیجا ہی نہیں گیا ہوگا۔ آغا خانی قرآن مجید سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتے۔ ان کے پاس حاضر امام کی شکل میں بولتا ہوا قرآن موجود ہے۔ چودہ سال کی عمر میں انھیں کاروبار کے لیے انگلینڈ بھیج دیا گیا تھا جہاں انھوں نے کاروبار میں ناکامی کے بعد تھیٹر کے ڈراموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے، بعد میں لنکن اِن میں داخلہ لے لیا۔ اب لنکن ان میں انھوں نے جو کچھ بھی تعلیم حاصل کی اس میں قرآن مجید اور احادیث مبارکہ یا اسلامی فقہ تو شامل نہیں تھی۔ میری رائے میں اسلام کے بارے میں ان کی معلومات کا واحد ذریعہ ''ڈی۔ ایف ملا'' کی تالیف محمڈن لا تھی جو آج بھی ہر وکیل کی لائبریری میں موجود ہے۔ ملا صاحب مذہباً پارسی تھے۔ ان حقائق کی موجودگی کے باوجود اگر کوئی دانش ور جناح صاحب کو عاشق قرآن اور مجاہد اسلام سمجھتا ہے تو اس کا کیا علاج، اس کی سمجھ پر افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ انگلستان سے واپس آنے کے بعد انھوں نے خود کو آغا خانی کی بجائے اثنا عشری ڈکلیئر کر دیا اس لیے نہیں کہ تقابلی مطالعہ کے بعد جناح صاحب نے آغا خانی مسلک کو غلط اور اثنا عشری مسلک کو برحق پایا بلکہ اس لیے کہ آغا خانی مسلمان ہونے کا دعویٰ ہی نہیں کرتے جبکہ اثنا عشری خود کو مسلمانوں میں شمار کرتے ہیں۔ مسلک میں تبدیلی کا یہ فیصلہ ان کی سیاسی ضرورت تھی کیونکہ انھوں نے مسلمانوں میں سیاست کرنی تھی اور جداگانہ طرز انتخاب کی وجہ سے مسلمانوں سے ووٹ لینے تھے۔ اثنا عشری مسلک سے خود کو منسلک کرنے کے باوجود

انھوں نے نہ کبھی محرم کی مجالس میں شرکت کی اور نہ کبھی ماتم کیا جبکہ کوئی شخص اثنا عشری ہو ہی نہیں سکتا اگر وہ محرم کی مجالس میں شرکت نہ کرے یا ماتم نہ کرے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دل سے اثنا عشری بھی نہیں تھے۔ اس لیے میں یہ تسلیم کرنے میں خود کو حق بجانب سمجھتا ہوں کہ ذاتی زندگی میں جناح صاحب کا کوئی مذہب تھا ہی نہیں۔ مذہب سے ان کا جس حد تک بھی تعلق تھا وہ صرف سیاسی ضرورت کے لیے تھا۔

ہمارے جیالے دانش ور جناح صاحب کو عاشق قرآن اور مجاہد اسلام ثابت کرنے کے لیے اپنا پورا زورِ قلم صَرف کرتے رہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے ایسے دلائل پیش کرتے رہتے ہیں کہ حیرت بھی ہوتی ہے اور اُن کی بے بسی پر افسوس بھی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ دلائل بجائے خود دعاوی ہوتے ہیں جن کے لیے دلیل درکار ہوتی ہے جس کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً ڈاکٹر صفدر محمود صاحب نے جناح صاحب کو مجاہد اسلام ثابت کرنے کے لیے یہ دلیل پیش کی کہ جناح صاحب کی روحانی تربیت مولانا اشرف علی تھانوی نے کی تھی۔ اب یہ تو ایک دعویٰ ہے، نہ کہ دلیل۔ سوال یہ ہے کہ جناح صاحب نے روحانی تربیت حاصل کرنے کے لیے کب کہاں اور کتنا عرصہ مولانا اشرف علی تھانوی کے پاس قیام کیا؟ جواب ندارد۔ پروفیسر مظفر مرزا بھی اپنا زورِ قلم صَرف کر کے جناح صاحب کو عاشق قرآن ثابت کرنے کے لیے یہ دلیل دیتے ہیں کہ جناح صاحب نے مولانا اشرف علی تھانوی اور بہادر یار جنگ سے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی۔ اب یہ بھی ایک دعویٰ ہے، نہ کہ دلیل۔ مظفر مرزا صاحب یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ جناح صاحب نے کب، کہاں اور کتنا عرصہ ان ہر دو حضرات سے قرآن کی تعلیم حاصل کی۔ یہ سوال بھی غور طلب ہے کہ مولانا اشرف علی تھانوی اور بہادر یار جنگ کی تعلیم و تربیت کا کیا نتیجہ نکلا۔ یہ اسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ جناح صاحب نے پاکستان کا پہلا وزیر قانون ایک ہندو جوگندر ناتھ منڈل کو بنا دیا اور وزیر خارجہ ایک قادیانی چودھری ظفر اللہ کو پاکستان کا پہلا وزیر خارجہ بنا دیا۔ یہ بھی اسی تعلیم و تربیت کا ہی اثر تھا کہ ستمبر 1947ء میں جناح صاحب کی طرف سے پاکستان میں متعین سفرا اور اعلیٰ حکام کی جو حکومت پاکستان کی طرف سے دعوت کی گئی تھی اس میں اعلیٰ اقسام کی شراب مہمانوں کو پیش کی گئی تھی، جبکہ اس وقت لاکھوں مسلمان آگ اور خون کا دریا عبور کرتے ہوئے مشرقی پنجاب سے پاکستان کی طرف ہجرت کا جاں گسل سفر کر رہے تھے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ذاتی زندگی میں جناح صاحب کا کوئی

مذہب تھا ہی نہیں۔ راشد علی بیگ، جو 1933ء سے 1940ء تک جناح صاحب کے ساتھ بطور سیکرٹری وابستہ رہے، اپنی تالیف میں جناح صاحب کے عقائد کے بارے میں لکھتے ہیں:

"Religiously he was, whatever anyone in Pakistan may say, basically secular and agnostic. His most devoted biographer will be hard put to quote him preaching or advocating religion. I can recall no speech or writing by him extolling the virtues of Islam. If he entered a mosque, I cannot recall him doing so, it was through political expediency. If he had any dealings with Maulanas, and I cannot recall any, it was as vote catchers. If he liked me, it was because I was, like him, modern, sophisticated and agnostic." (1)

ترجمہ: ''پاکستان میں خواہ کوئی کچھ بھی کہتا رہے بنیادی طور پر وہ (جناح) ایک لامذہب اور لاادری تھے۔ اس کا انتہائی عقیدت مند سوانح نگار بھی مشکل ہی سے نشان دہی کر سکے گا کہ اس نے کبھی مذہب سے لگاؤ رکھنے کا اظہار کیا ہو یا اسلام کی حقانیت بیان کی ہو۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس نے کبھی زبانی یا تحریری طور پر اسلام کی کوئی فضیلت بیان کی ہو۔ اگر کبھی وہ مسجد میں داخل ہوا بھی (اگرچہ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس نے کبھی ایسا کیا ہو) تو صرف سیاسی ضرورت کے لیے ہی اس نے ایسا کیا۔ اگر کبھی اس نے مولانا صاحبان سے ربط ضبط رکھا بھی (اگرچہ میری یادداشت کے مطابق اس نے ایسا کبھی نہ کیا) تو صرف ووٹ کے حصول کی خاطر ایسا کیا۔ اگر وہ مجھے پسند کرتا تھا تو وہ بھی اس لیے کہ میں اس کی طرح ہی ماڈرن، وسیع المشرب اور لاادری تھا۔''

جناح صاحب کے عقیدہ کے بارے میں یہ اس شخص کی گواہی ہے کہ جو جناح صاحب کے ساتھ چھ سال تک بطور سیکرٹری وابستہ رہا۔ میں نے Agnostic کا ترجمہ ''لاادری'' (میں نہیں

جانتا) کیا ہے۔ لاادری کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ''میں نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ ہے یا نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔'' Popular Oxford Dictionary نے اس لفظ کا ترجمہ کیا ہے، ''وہ جس کا قول یہ ہے کہ ہم خدا کے بارے میں نہ کچھ جانتے ہیں نہ جان سکتے ہیں۔''

ان حقائق کے باوجود اگر جیالے دانشور بضد ہوں کہ جناح صاحب ولی اللہ تھے، عاشق قرآن تھے، مجاہدِ اسلام تھے، تو اُن کی مرضی۔ یہ ضرور ہے کہ خود لامذہب ہونے کے باوجود اس نے برصغیر کے مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے اسلام کا نام ضرور استعمال کیا۔ برصغیر کے مسلمان آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے چل پڑے اور ایسے المیہ سے دوچار ہوئے کہ تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

جناب رانا فضل الرحمٰن نعیم نے روزنامہ ''السجریدہ'' لاہور 3 ستمبر 2007ء میں ارشاد فرمایا کہ:

''مسلمان ہونے کا تعلق صرف بندے اور خدا کا معاملہ ہے۔ لہٰذا کسی کے لیے اس بحث میں پڑنا غیر مناسب ہے کہ جناح صاحب پیدائشی مسلمان تھے یا نہیں تھے۔''

یہ صرف جزوی طور پر ہی درست ہے۔ یہ ایک معاشرتی مسئلہ بھی ہے۔ جب ایک غیر مسلم مسلمان ہونا چاہے تو اسے ایک مجلس میں بآواز بلند کلمہ شہادت پڑھ کر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرنا پڑتا ہے جس سے لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اب وہ شخص مسلم معاشرے کا حصہ ہے لیکن اگر ایک غیر مسلم صرف دل میں کلمہ پڑھ لیتا ہے اور کسی مجلس میں اس کا اعلان نہیں کرتا تو وہ مسلمان نہیں ہوتا بلکہ بدستور غیر مسلم ہی رہتا ہے۔

روافض (اثنا عشری) کا معاملہ یہ ہے کہ علمائے کرام ان کو مسلمان تسلیم نہیں کرتے اور میں خود بھی یہی رائے رکھتا ہوں، اگرچہ وہ خود اپنے مسلمان بلکہ مومن ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور (رانا صاحب موصوف کے الفاظ میں) یہ مسلمانوں کو کافر بنانے پر تلے رہنے والی بات نہیں ہے بلکہ ایک ایسا گروہ جو اسلامی عقائد سے فی الواقع منحرف ہو چکا ہے اس کو کافر تسلیم کرنے والی بات ہے۔ روافض کے دیگر گمراہ کن عقائد (از قسم امامت وغیرہ) کے علاوہ ان کا عقیدۂ بداء ایسا عقیدہ ہے جس سے ان کا کفر ثابت ہونے میں کوئی کسر نہیں رہ جاتی۔ عقیدۂ بداء یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی بات کا اس وقت تک علم نہیں ہوتا جب تک کہ وہ بات وقوع میں نہ آ جائے۔ مثلاً 8 اکتوبر 2005ء

کو پاکستان میں جو زلزلہ آیا اس کا علم اللہ تعالیٰ کو اس وقت ہوا جب زلزلہ آ گیا۔ روافض کو اس کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ ان کے عقیدے کے مطابق اگرچہ نبوت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گئی لیکن اس کی جگہ امامت جاری ہو گئی۔ امام بھی نبی کی طرح اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ ہوتا ہے۔ نبی کی طرح ہی اللہ تعالیٰ سے براہِ راست ہدایت وصول کرتا ہے اور ایک نبی کی طرح ہی معصوم ہوتا ہے اور ایک امام کی امامت کو تسلیم کرنا اور امام کی پیروی کرنا اسی طرح لازم ہوتا ہے جس طرح ایک نبی کی نبوت کو تسلیم کرنا اور نبی کی پیروی کرنا لازم ہوتا ہے۔ روافض کے عقیدہ کے مطابق پہلے امام سیدنا حضرت علیؓ تھے۔ ہر امام اپنی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنا جانشین نامزد کرتا ہے۔ اثنا عشری روافض کے عقیدہ کے مطابق امامت سیدنا علیؓ سے شروع ہو کر حضرت امام جعفر صادقؒ تک پہنچی تو امام جعفر صادق نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے بیٹے اسمٰعیل کو اپنا جانشین امام نامزد کیا لیکن ہوا یہ کہ اسمٰعیل اپنے والد کی زندگی میں ہی فوت ہو گئے تو امام جعفر صادق نے اپنے دوسرے بیٹے موسیٰ رضا کو اپنا جانشین امام نامزد کر دیا اور روافض کے ایک گروہ نے عقیدۂ بدا گھڑ کے موسیٰ رضا کی نامزدگی کو قبول کر لیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے امام جعفر صادق کو حکم دیا تھا کہ وہ اسمٰعیل کو اپنے جانشین کے طور پر نامزد کر دیں تو اس وقت اللہ تعالیٰ کو معلوم نہیں تھا کہ اسمٰعیل اپنے والد کی زندگی میں فوت ہو جائے گا۔ روافض کے دوسرے گروہ نے موسیٰ رضا کی نامزدگی کو قبول نہ کیا اور اسمٰعیل کے بیٹے محمد کو امام تسلیم کر لیا اور یہ لوگ اسمٰعیلی روافض کہلائے اور ان کے ہاں امامت امام محمد سے چلتی ہوئی موجودہ امام کریم آغا خاں چہارم تک آ گئی ہے۔ جبکہ موسیٰ رضا کی نامزدگی کو قبول کرنے والے روافض نے اپنے بارھویں امام کو ایک غار میں داخل کر دیا جو قیامت کے قریب غار سے برآمد ہو گا اور اس نسبت سے یہ لوگ اثنا عشری روافض کہلائے۔ اب ان عقائد کی بنا پر اگر علمائے کرام روافض کو مسلمان تسلیم نہ کریں تو کیا کریں۔ (3)

تاریخ گواہ ہے کہ روافض کے دونوں فرقوں نے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان ہی پہنچایا ہے سقوط بغداد ہو، سقوط دہلی ہو یا سقوطِ ڈھاکہ روافض سب جگہ پیش پیش رہے ہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں کی تین حصوں میں تقسیم بھی ان کا ہی کارنامہ ہے جس سے برصغیر میں مسلمانوں کی عددی طاقت بے اثر و بے وقعت ہو گئی۔ لطف یہ ہے کہ اس تقسیم کو بھی مسلمانوں پر احسان عظیم بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔



حوالہ

1. In different saddles, When I was secretary to Jinnah, p. 17 by M. R. A. Baig

21

یہ ایک حقیقت ہے اگرچہ تلخ ہے اور افسوس ناک بھی کہ پاکستان کے دانش وروں کی بہت بڑی اکثریت، جی ہاں! بہت بڑی اکثریت کو روافض کے عقائد سے نہ تو آگاہی حاصل ہے اور نہ ہی ان کو معلوم ہے کہ تاریخ میں ان کا کردار کیسا مسلم دشمن اور اسلام دشمن رہا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ایک شخص رافضی ہو اور اسے اسلام سے یا مسلمانوں سے ہمدردی ہو۔ روافض کے عقائد سے لاعلمی کا ایک سبب تو ہمارے دانش وروں کا دین کے بارے میں غیر سنجیدہ رویہ ہے اور دوسرا یہ کہ یہ مذہب ہی باطنی ہے۔ اس کی دونوں شاخیں اثنا عشری ہوں یا اسمٰعیلی آغا خانی۔ اپنے عقائد نہ صرف چھپاتی ہیں، بلکہ یہ لوگ ضرورت پڑنے پر اپنے عقائد کے برعکس عقائد بیان کرنے کو ثواب خیال کرتے ہیں۔ قرآن مجید جو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے وہ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو اس نے نوع انسانی کی ہدایت کے لیے اپنے مقرب فرشتے کے ذریعے اپنے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی اور تا قیام قیامت اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی اللہ تعالیٰ نے خود اٹھائی۔ اس کے بارے میں روافض کی دونوں شاخوں کا نقطۂ نظر تقریباً ایک سا ہے۔ روافض کی اثنا عشری شاخ کے نزدیک یہ قرآن، جو مسلمانوں کے پاس ہے جو الحمد کے 'الف' سے شروع ہو کر والناس کے 'س' پر ختم ہوتا ہے، وہ قرآن ہے ہی نہیں جو جبریل علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے وصول کر کے نبی اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچاتے رہے۔ ان کے نزدیک یہ ایک تحریف شدہ کتاب ہے۔ اس میں ہمہ قسم کی تحریف ہو چکی ہے۔ اصل قرآن تو ان کے بارھویں امام کے پاس ہے جو امام غائب ہے وہ جب قیامت کے قریب ظاہر ہو گا تو قرآن کو بھی ساتھ لائے گا۔ یہ عقیدہ رکھنا ان کی ضروریات دین میں شامل ہے کیونکہ موجودہ قرآن کو اصل اور غیر محرف تسلیم

کرنے کی صورت میں ان کا عقیدہ ہی باطل ہو جاتا ہے۔

روافض کی اسمٰعیلی آغا خانی شاخ قرآن مجید سے بالکل ہی بے نیاز ہے۔ وہ نہ اس کو پڑھتے ہیں، نہ ہی اس قرآن سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں کیونکہ ان کے پاس آغا خاں کی صورت میں حاضر امام موجود ہے۔ یہ امام معصوم ہے۔ اللہ تعالیٰ سے براہِ راست تعلق رکھتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ اس کے اندر حلول کیے ہوئے ہیں۔ اسمٰعیلی آغا خانی اسی سے ہدایت طلب کرتے ہیں۔ اسی سے دعائیں مانگتے ہیں اور اسی کی تصویر کو سجدہ کرتے ہیں۔ اس لیے ان کو قرآن کی ضرورت نہیں۔ جب صورت یہ ہے جو میں نے بیان کی ہے تو ان کو کس طرح مسلمان تصور کیا جا سکتا ہے اور وہ کس طرح اسلام کے یا مسلمانوں کے خیر خواہ ہو سکتے ہیں۔ اسے برصغیر کے مسلمانوں کی بدقسمتی ہی کہا جا سکتا ہے کہ ووٹروں کی فہرستوں میں روافض کی دونوں شاخوں کو اول روز سے ہی مسلمان قرار دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے روافض حضرات قرآن کا نام کبھی کبھی لیتے رہتے ہیں اور اب بھی ایسا کرتے رہتے ہیں۔ اپنے نام بھی مسلمانوں کے سے رکھتے ہیں جیسا کہ قادیانی کرتے ہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی قیادت پر بھی روافض کا قبضہ تھا بلکہ مسلم لیگ کی تاسیس بھی 1906ء میں آغا خاں سوم نے کروائی تھی اور مسلم لیگ کا پہلا صدر بھی وہی تھا جو انگریزوں کا خصوصی آدمی تھا۔ اس کے ذمے انڈیا آفس کی طرف سے یہ ڈیوٹی لگائی گئی تھی کہ وہ برصغیر میں اتحاد اور امن نہ ہونے دے۔ ہمارے جناح صاحب بھی خیر سے آغا خانی تھے۔ مسلم عوام کی حمایت کے حصول کے لیے کبھی کبھی قرآن کا نام بھی لے لیا کرتے تھے، لیکن قرآن سے ان کی دلچسپی معلوم۔

اب ہمارے دانش وروں کی مشکل یہ ہے کہ اول تو ان کو معلوم نہیں کہ جناح صاحب پیدائشی آغا خانی تھے۔ جن کو معلوم ہے ان میں جرأت اظہار نہیں۔ کاش ہمارے ملک کے دانش ور ہر حال میں حق وصداقت کا ابلاغ کرتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرقان حمید میں اہل ایمان کو حکم دیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ج إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا قف فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا ج وَإِن تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ○

(سورۃ النساء/ آیت:135)

ترجمہ: ''اے ایمان والو انصاف پر خوب قائم رہنے والے، اللہ کے لیے گواہی دینے

والے رہو اگرچہ اپنی ہی ذات پر ہو یا کہ والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابلہ میں ہو۔ وہ شخص اگر امیر ہے تو یا غریب ہے تو دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو زیادہ تعلق ہے۔ سو تم خواہش نفس کا اتباع مت کرنا کہ کبھی تم حق سے ہٹ جاؤ۔ اگر تم کج بیانی کرو گے یا پہلو تہی کرو گے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمھارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں''۔

ایک دانش ور جناب اے۔ آر۔ خالد نے جناح صاحب کو مجاہد اسلام ثابت کرنے کے لیے جناب خالد اختر افغانی کی تالیف ''حالات قائد اعظم'' کا حوالہ دیا کہ اس میں وہ حلف درج ہے جو مسلم لیگی اراکین قومی وصوبائی اسمبلی نے جناح صاحب کے ایما پر اٹھایا تھا جس کی ابتدا سورہ انعام کی ایک آیت مبارکہ سے کی گئی۔ وہ حلف درج ذیل ہے:

''بسم اللہ الرحمن الرحیم

قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین

(کہ دو کہ میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے)

میں .... رکن مسلم لیگ پارٹی صوبائی دستور ساز اسمبلی / کونسل صوبہ .... اپنے اس پختہ عقیدے کا اعلان کرتا ہوں کہ برصغیر ہند میں بسنے والی مسلم قوم کی نجات، اس کی سلامتی، اس کا تحفظ اور اس کا مستقبل حصول پاکستان میں مضمر ہے اور پاکستان ہی اس برصغیر کے پیچیدہ دستوری مسائل کا واحد منصفانہ، باوقار اور معقول حل ہے اور اس کے ذریعے یہاں بسنے والی تمام قوموں اور فرقوں کو امن، آزادی اور خوشحالی حاصل ہو سکتی ہے۔

میں بہ صمیم قلب اقرار کرتا ہوں کہ اس مقصد عزیز یعنی پاکستان کو حاصل کرنے کے لیے کل ہند مسلم لیگ کی طرف سے جو تحریک بھی جاری کی جائے گی اور اس سلسلے میں جو ہدایات و احکامات جاری کیے جائیں گے میں بلا پس و پیش پوری رضا مندی کے ساتھ ان کی تعمیل کروں گا اور اس امر کا یقین کامل رکھتے ہوئے کہ میرا مقصد و مدعا حق و انصاف پر مبنی ہے، میں عہد کرتا ہوں کہ اس راہ میں جو خطرات اور آزمائشیں پیش آئیں گی اور جن قربانیوں کا مطالبہ ہوگا انھیں برداشت کروں گا۔

ربنا افرغ علینا صبر او ثبت اقدا منا و انصرنا علی القوم الکافرین

اے پروردگار ہم کو صبر واستقامت دے ہمیں ثابت قدم رکھ اور قومِ کفار پر ہمیں فتح و نصرت عطا فرما۔ آمین"

میں نے تھوڑی سی تگ ودو کے بعد اس کتاب کو حاصل کرلیا۔ اس کے مطالعہ سے میرے ذہن میں چند سوال پیدا ہوئے، جو میں نے متعدد اہل علم حضرات کی خدمت میں پیش کیے، لیکن کسی نے بھی اطمینان بخش جواب نہیں دیا تھا۔ وہ سوالات درج ذیل ہیں:

1) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عہد آزادی کے حلف کے اوپر بسم اللہ اور سورۃ انعام کی آیہ مبارکہ 162 درج ہے لیکن عہد کی جو عبارت "میں...... رکن مسلم لیگ" سے شروع ہو کر "آمین" پر ختم ہوتی ہے۔ اس میں نہ تو اللہ کا ذکر ہے نہ اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے اور نہ ہی اس دین برحق کا کوئی ذکر ہے جسے لے کر اللہ تعالیٰ کے آخری نبی مبعوث ہوئے تھے۔ البتہ لفظ "پاکستان" کی تکرار تین دفعہ ہے۔ اسی کے لیے یہ حلف لیا گیا تھا۔ کیا اس حلف میں لفظ "پاکستان" کا مطلب "اللہ رب العالمین" ہے؟

2) یقیناً اس حلف کو اٹھانے والوں میں مولوی تمیز الدین مرحوم جیسے کئی بنیاد پرست بھی تھے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی ارکان اسمبلی کو بعد میں کبھی بھی یاد دہانی نہ کروائی کہ ہم نے حلف کیا اٹھایا تھا اور ہم کردار کیا ادا کر رہے ہیں۔ خاص طور پر اس موقع پر جب 1954ء میں غلام محمد گورنر جنرل نے دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا تھا اور مولوی تمیز الدین مرحوم برقعہ پہن کر سندھ چیف کورٹ میں داخل ہوئے تھے تاکہ رٹ دائر کرسکیں۔ اس مجلس عہد کے شرکاء میں سے کسی نے کبھی بھی اس حلف کا حوالہ نہیں دیا۔ مجھے تو یہ افغانی صاحب کے اپنے ہاتھ کی صفائی معلوم ہوتی ہے۔

3) کیا ہمارے جناح صاحب بھی یہ آیہ مبارکہ تلاوت کر کے حلف اٹھانے والوں میں شامل تھے؟ میرے محدود علم کی حد تک جناح صاحب نے اپنی زندگی میں کبھی کسی تقریر میں قرآن مجید کی کوئی آیہ مبارکہ تلاوت نہیں کی کیونکہ آغا خانی ہونے کی وجہ سے وہ اس کے اہل ہی نہیں تھے۔ میری اطلاع کے مطابق وہ تو اُردو بھی ٹھیک طرح سے نہیں بول سکتے تھے۔ ان کی مادری زبان گجراتی تھی اور مادری زبان کے بعد ان کو اگر عبور تھا تو صرف انگریزی زبان پر۔ 1947ء میں والٹن میں مہاجر کیمپ میں انھوں نے جو تقریر کی تھی اس کے سننے والوں میں تو میں شامل نہیں تھا۔ لیکن جو موجود تھے ان میں سے ایک صاحب نے ان کی تقریر کے جو چند الفاظ رپورٹ کیے تھے وہ اس طرح تھے:

"اگر ہم کو پتہ ہوتی کہ اتنا کھون کھرابہ ہوتی تو ہم پاکستان نہ بناتی"

پھر بھی یہ معجزہ ممکن ہے کہ جناح صاحب نے حلف اٹھاتے ہوئے آیہ مبارکہ کی صحیح تلفظ کے ساتھ تلاوت کرلی ہو۔

4) اگر جناح صاحب نے بھی مذکورہ آیہ مبارکہ تلاوت کر کے حلف اٹھایا تھا تو انھوں نے خود اس حلف کی کس حد تک پاسداری کی؟ ستمبر 1947ء کو گورنر جنرل ہاؤس میں انھوں نے سفرا اور اعلیٰ حکام کو کھانے کی جو دعوت دی تھی تو اس دعوت میں اعلیٰ اور مختلف اقسام کی شراب سے مہمانوں کی تواضع کی گئی تھی۔ اس دعوت میں شریک ایک صاحب سری پرکاش (پاکستان میں بھارت کے پہلے ہائی کمشنر) کے بیان کو میں ادارہ "پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز" لاہور کی شائع کردہ کتاب کے حوالہ سے کسی دوسری جگہ پیش کر چکا ہوں۔ کیا ہمارے جناح صاحب نے مہمانوں کی شراب سے تواضع بھی "اللہ رب العالمین" کے لیے کی تھی۔

ایک بڑی صحافتی شخصیت کو ایک دفعہ فون پر میں اس کا حوالہ دے بیٹھا تو انھوں نے فوراً یہ الزامی جواب دیا کہ "اگر ابوالکلام شراب پینے کے باوجود امام الہند ہو سکتے تھے تو جناح شراب پینے کے باوجود قائداعظم کیوں نہیں ہو سکتے تھے"۔ میں ان کو صرف یہی کہہ سکا کہ ہم نے ابوالکلام آزاد کو امام الہند تسلیم کب کیا تھا۔ انھوں نے موقع نہ دیا اور فون بند کر دیا۔ میں کہہ نہ سکا کہ اگر ہم نے ابوالکلام کو امام الہند تسلیم کیا ہوتا تو 1947ء میں نہ کروڑوں مسلمان بے گھر ہوتے، نہ پندرہ لاکھ مسلمان قتل ہوتے، نہ نوے ہزار مسلمان خواتین بے آبرو ہوتیں۔ نہ 1948ء میں حیدر آباد دکن میں پانچ لاکھ مسلمان قتل ہوتے، نہ 1971ء میں مشرقی پاکستان میں بیس لاکھ غیر بنگالی مسلمان قتل ہوتے اور نہ ہی اس کے ردِعمل میں پچیس لاکھ بنگالی مسلمان قتل ہوتے اور نہ مقبوضہ کشمیر میں آج تک مسلمان قتل ہو رہے ہوتے۔ زیادہ سے زیادہ محرومی یہ ہوتی کہ ہماری ایک یا دو فی صد آبادی کو، گلبرگ اور ڈیفنس میں جو عشرت کدے میسر آ گئے ہیں، وہ میسر نہ آتے۔ بہر حال حشر کے روز جب اللہ تعالیٰ کی عدالت میں لاکھوں مسلمان اپنی جانوں کا اور لاکھوں مسلمان عورتیں اپنی آبرو کا قصاص طلب کریں گی تو ہم سب کو معلوم ہو جائے گا کہ محمد علی جناح صاحب اپنی صفائی میں کیا عذر پیش کرتے ہیں۔ آخر ہم سب بھی تو وہیں موجود ہوں گے۔

5) قومی وصوبائی اسمبلیوں کے مسلم لیگی ارکان کے اس کنونشن میں جناح صاحب نے اس

اعتراض کا جواب بھی دیا جو تقسیم برصغیر کی تجویز پر کیا جاتا تھا۔ اعتراض یہ تھا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کے علیحدہ ہو جانے اور پاکستان میں شامل ہو جانے کے بعد ان علاقوں کے مسلمان جہاں وہ اقلیت میں ہیں زیادہ غیر محفوظ ہو جائیں گے تو غیر مسلم اکثریت کی زیادتیوں سے ان کا تحفظ کس طرح ہوگا۔ اس اعتراض کے بارے میں جناح صاحب نے جو فرمایا وہ بحوالہ کتاب مذکورہ اس طرح ہے:

''اگر گلیڈ سٹون کے زمانے میں برطانیہ اقلیتوں کے تحفظ کے نام پر امریکا میں مداخلت کر سکتا تھا تو اگر ہندستان میں ہماری اقلیتوں پر مظالم کیے گئے تو ہمارا مداخلت کرنا کیوں کر حق بجانب نہ ہوگا؟''

کیا مسلم لیگی دانش ور یہ بتانا پسند کریں گے کہ گلیڈ سٹون کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے کتنی بار مسلم اقلیت پر مظالم کی وجہ سے بھارت میں مداخلت کی ہے؟ یا بھارت میں مسلمان اقلیت پر گزشتہ چھ عشروں میں کوئی ظلم ہوا ہی نہیں؟ کیا واقعی برصغیر کی تقسیم برصغیر کے مسلمانوں کے لیے نجات، سلامتی اور ان کے تحفظ کا باعث ہوئی ہے، جیسا کہ حلف کے الفاظ بتا رہے ہیں۔ کیا اس کا مطلب ہے کہ بھارت کے مسلمان تو عیاشیاں کر رہے ہیں، بنگلہ دیش میں لاکھوں غیر بنگالی مسلمان شوق سے 1972ء سے کیمپوں میں پڑے ہوئے جانوروں جیسی زندگی گزار رہے ہیں اور پاکستان میں روزانہ خودکشیاں کرنے والے تفریحاً ایسا کر رہے ہیں۔ کیا قاری نے شیخ چلی کی کوئی کہانی پڑھی ہے، اگر پڑھی ہے تو وہ کہانی جناح صاحب کی کہانی سے کتنی مختلف ہے؟ غور کیجیے۔

ہم اہل پاکستان جس مقام تک پہنچ چکے ہیں اس کے لیے منصوبہ بندی آغا خاں سوم نے کی تھی اور اسی نے ہماری سیاسی گاڑی کو ایسی راہ پر ڈالا تھا جو ہمیں موجودہ مقام تک لے آئی۔ یہ علیحدہ بات ہے جب آغا خاں اپنے اصل مشاغل (شراب۔ شباب اور گھڑ دوڑ) میں مصروفیات کی بنا پر ڈرائیونگ کے لیے وقت نہ دے سکے تو انھوں نے ڈرائیونگ سیٹ اپنے معنوی فرزند جناح صاحب کے حوالے کر دی اور اس کے معنوی فرزند نے ہماری سیاسی گاڑی کو ٹھیک اس مقام پر پہنچا دیا جو آغا خاں نے طے کیا تھا۔ اب ہمارا حال یہ ہے کہ:

امریکا کی چاپلوسی ہے اور ہم ہیں دوستو!
امریکا کی طرفداری ہے اور ہم ہیں دوستو!



22

جناب پروفیسر محمد مظفر مرزا اپنے ایک مضمون ''حضرت قائداعظم اور اسلامی نظریہ جمہوریت'' مطبوعہ ''نوائے وقت'' لاہور 30 دسمبر 2005ء میں ارشاد فرماتے ہیں:

''حضرت قائداعظم اور ان کا پورا خاندان سیدھے سادھے عقائد رکھنے والے مسلمان تھے۔ قائداعظم نے حضرت اشرف علی تھانوی اور بہادر یار جنگ سے قرآن بالتفسیر پڑھا''۔

یہ امر دریافت طلب ہے کہ ''حضرت'' قائداعظم کا خاندان کب مسلمان ہوا۔ ان کا خاندان تو آغا خانی تھا۔ کس تاریخ کو کس مقام پر اور کس کے سامنے جناح صاحب کے خاندان نے اسلام قبول کیا؟ جناح صاحب کے بارے میں اب تک جو کتب شائع ہوئی ہیں ان میں سے کسی میں بھی اس کا تذکرہ نہیں۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ پروفیسر صاحب موصوف اپنی معلومات کا ذریعہ بھی بتا دیتے۔ ممکن ہے کہ موصوف آغا خانی عقائد کو ہی سیدھے سادے اسلامی عقائد خیال فرماتے ہوں؟ جناح صاحب نے مولانا اشرف علی تھانوی اور بہادر یار جنگ سے قرآن کریم کب اور کس مقام پر پڑھا، موصوف نے اپنے مضمون میں یہ نہیں بتایا۔ مرزا صاحب اپنی متعدد تحریروں میں لکھ چکے ہیں کہ جناح صاحب دینی معاملات میں رہنمائی مولانا تھانوی سے لیتے تھے اور انھوں نے قرآن بالتفسیر بھی مولانا سے ہی پڑھا، جبکہ قطعی حقیقت یہ ہے کہ مولانا تھانوی اور مسٹر جناح کی کبھی سرسری سی ملاقات بھی نہیں ہوئی، مولانا تھانوی سے ان کا قرآن بالتفسیر پڑھنا تو بہت دور کی بات ہے۔

موصوف نے جناح صاحب کی تقریر کا ایک اقتباس بھی اپنے مضمون میں درج کیا ہے، الفاظ یہ ہیں:

''میرا خدا یہ کہے کہ بے شک تم مسلمان پیدا ہوئے اور کفر کی طاقتوں کے غلبہ میں اسلام کو سربلند رکھتے ہوئے مسلمان مرے''۔(1)

جناح صاحب نے اسلام کو اتنا سربلند کیا۔ اتنا سربلند کیا کہ تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ جناح صاحب کی قیادت کی برکت سے اسلام اور مسلمانوں کا کیا حال ہوا۔ اس کا اندازہ درج ذیل واقعہ سے ہو جائے گا:

''نومبر 1992ء کی بات ہے کہ ایک قلم کار شکیل احمد نواب کو ڈھاکہ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ان کی ایک راہبہ سے ملاقات ہوئی جو کبھی مسلمان تھی اور اس کی دُور کی عزیزہ تھی۔ اس کے جسم پر سفید راہبانہ لباس اور گلے میں صلیب دیکھ کر وہ حیران و پریشان رہ گیا۔ جب اس مسلمان لڑکی سے پوچھا گیا کہ وہ راہبہ کیسے بنی اور اس کے گلے میں صلیب کس نے ڈالی تو اس کا کہنا تھا ''جن دنوں مکتی باہنی والے پاکستانیوں کے گھر جلا کر ان کا قتل عام کر رہے تھے اور خواتین کی آبرو ریزی ہو رہی تھی ان دنوں جب ہمارے گھر پر حملہ ہوا تو ماں باپ شہید ہو گئے۔ میں گھر سے بھاگی تو ایک گلی میں ریڈ کراس کی گاڑی مل گئی، وہ مجھے ایک کیمپ میں لے گئے جہاں عیسائی پادری اور سفید کپڑوں میں ملبوس راہبائیں مسلمانوں سے ہمدردی جتا کر اپنی کتاب مقدس انجیل کی تعلیمات دے رہے تھے اور عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف تھے۔ میں پریشان تھی۔ انھوں نے میری دلجوئی کی، حوصلہ دیا۔ رہنے کے لیے گرجا گھر میں جگہ دی۔ حالات اتنے خراب تھے کہ میں وہاں سے باہر نکل نہ سکتی تھی اور اگر نکلتی تو قتل کر دی جاتی۔ میں جان کی امان کی خاطر گرجا گھر میں پڑی رہی...... ایک روز بوڑھے پادری نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ پیار بھرے لہجے میں ''بیٹی'' کہا اور میرے گلے میں صلیب ڈالتے ہوئے کہا: ''بیٹا! یہ تیری حفاظت کرے گی''۔ وہ دن گیا اور آج کا دن آیا، میں جان اور عزت کی حفاظت کے لیے گرجا میں پڑی ہوں۔ صلیب میرے گلے میں لٹکتی ہے اور میں راہبہ کہلاتی ہوں۔''(2)

یہ تھی جناح صاحب کی حسن کارکردگی کہ ان کی قیادت کے طفیل کئی دفعہ ان گنت مسلمان خواتین بے آبرو ہوئیں۔ 1947ء میں مشرقی پنجاب میں 1948ء میں حیدرآباد دکن میں، 1971ء میں مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) میں اور 1947ء سے آج تک مقبوضہ کشمیر میں بے آبرو ہو رہی ہیں اور اس طرح جناح صاحب نے اسلام کو سربلند کر دیا اور ایسا سربلند کیا کہ تاریخ میں واقعی اس کی مثال نہیں ملتی۔

اگر جناح صاحب نے مسلمانوں کی عددی طاقت کو تین حصوں میں تقسیم کر کے بے اثر نہ کر دیا ہوتا تو یہ ناممکن تھا کہ ایک مسلمان لڑکی کو جان اور آبرو بچانے کے لیے صلیب کی پناہ لینا پڑتی۔ اسلام اور مسلمانوں کا کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی مسلمانوں کو اس قدر نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا جتنا کہ جناح صاحب نے مسلمانوں کا خیر خواہ بن کر ان کو پہنچایا۔ اس کے باوجود ہمارے دانش وروں کا بس چلے تو اسے پیغمبر بنا دیں، جبکہ امام معصوم تو بنا ہی رکھا ہے۔



حوالہ جات

(1) روزنامہ نوائے وقت، لاہور/30 دسمبر 2005ء

(2) ماہنامہ خطیب لاہور/جنوری 2006ء۔

23

جناب پروفیسر محمد مظفر مرزا کا خیال افروز مضمون بعنوان ''دو قومی نظریہ: پس منظر'' نوائے وقت لاہور میں 21 ستمبر تا 27 ستمبر 2007ء کے دوران پانچ اقساط میں اشاعت پذیر ہوا، ہمیں اس مضمون کے مطالعہ کا موقع ملا۔ ہمارے ملک کے دانش ور اس موضوع پر 1947ء سے تا ایں دم مسلسل طبع آزمائی کرتے آرہے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اقوام مذہب سے تشکیل پاتی ہیں نہ کہ وطن سے۔ چونکہ برصغیر میں دو مذاہب (اسلام اور ہندو دھرم) کے ماننے والے آباد تھے۔ اس لیے یہ انگریز سے آزادی کے بعد دو اقوام مل کر نہیں رہ سکتی تھیں (آزادی سے قبل رہ سکتی تھیں)۔ اس کی تائید میں جو دلیل پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہندو بہت متعصب قوم تھی، وہ مسلمانوں کو ملیچھ (ناپاک) سمجھتی تھی اس حد تک کہ اگر کوئی مسلمان کسی ہندو کے برتن کو ہاتھ لگا دیتا تھا تو وہ برتن پھینک دیا جاتا تھا۔ اس لیے یہ لازم تھا کہ برصغیر کے جن علاقوں میں، مسلمانوں کو اکثریت حاصل تھی، ان علاقوں پر مشتمل برصغیر کو انگریزوں سے تقسیم کروا کر پاکستان کے نام سے ایک الگ ملک بنوا لیا جائے اور جن علاقوں میں مسلمان اقلیت میں تھے، وہاں ان کو مشرک ہندو اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ مطالبہ تو اس وقت کیا گیا جب انگریزوں نے برصغیر کو آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن اس کے لیے پروگرام کا آغاز 1906ء سے کیا گیا جب مسلمانوں کے لیے جداگانہ طریق انتخاب کا اصول انگریزوں سے اور بعد میں انڈین نیشنل کانگریس سے بھی منوا لیا گیا۔

دو قومی نظریہ کا پس منظر بیان کرتے ہوئے ہمارے دانش ور حضرات کی ساری عمر گزر گئی،

لیکن اس نظریہ کے مقاصد کو ان حضرات نے کبھی بیان فرمانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ میری رائے میں اس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ اس نظریے کی بدولت تمام غیر مسلم، مسلمانوں کے مقابلے میں متحد ہو جائیں اور وہ جملہ مذہبی، لسانی، نسلی اختلافات کے باوجود مسلمانوں کے خلاف واقعتاً متحد ہو گئے۔ اس کا دوسرا حاصل یہ تھا کہ جداگانہ انتخاب کی وجہ سے متحدہ ہندستان میں مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہیں اور کسی بھی الیکشن میں اکثریتی فرقہ کے نتائج پر اثر انداز نہ ہو سکیں۔ دوقومی نظریہ کا پس منظر بیان کرتے ہوئے دانش ور حضرات نے یہ ذکر کبھی نہیں کیا کہ یہ نظریہ انگریزوں کے اشارے پر آغا خاں سوم (جو مسلمان بھی نہیں تھا) نے برصغیر میں متعارف کروایا تھا تاکہ یہاں کے لوگ آپس میں ہی دست و گریباں رہیں جس سے انگریزوں کا برصغیر پر غاصبانہ قبضہ طویل ہو سکے اور اسے جواز بھی مل سکے۔

دوقومی نظریہ کا اگر کوئی پس منظر ہے تو اس کا ایک پیش منظر بھی ہے، لیکن ان دانش ور حضرات نے کبھی بھی اسے بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں کوشش کروں گا کہ ان سطور میں اس نظریے کے پیش منظر کی طرف کچھ اشارات کر سکوں، لیکن اس سے قبل مجھے ان دانش ور حضرات سے متعین طور پر ایک سوال کا جواب دریافت کرنا ہے۔

فرض کیجیے ایک خاندان کے تین فرد ہیں۔ ایک شخص ان لوگوں کے پاس آتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ مجھے قائد تسلیم کر لیں اور میری اتباع کریں کیونکہ میرے پاس ان کی فلاح و بہبود کے لیے ایک پروگرام ہے۔ وہ لوگ اس سے دریافت کرتے ہیں کہ وہ پروگرام کیا ہے جس کے جواب میں وہ کہتا ہے کہ وہ ان تینوں کو اس طرح تقسیم کر دے گا کہ اس کے بعد وہ کبھی ایک دوسرے سے نہیں مل سکیں گے، نہ ہی ایک دوسرے کے کام آ سکیں گے اور نہ ہی ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہو سکیں گے، اس تقسیم کے نتیجہ میں ان لوگوں کے صحن میں دودھ اور شہد کی نہریں بہنا شروع ہو جائیں گی، ان کو بہت قوت حاصل ہو جائے گی اور وہ دنیا میں سربلند ہو جائیں گے۔ اس کے پروگرام سے آگاہ ہونے کے بعد ان کا طرزِ عمل کیا ہوگا؟ ایک ممکنہ طرزِ عمل یہ ہو سکتا ہے کہ اگر تو ان کے شانوں پر سر ہے اور اس میں دماغ نام کی کوئی چیز بھی ہے تو وہ اس سے کہیں گے کہ ”تم یا تو کوئی ٹھگ ہو یا ہمارے دشمنوں کے ایجنٹ۔ تم اپنی شکل گم کرو اور دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرنا۔ اگر آج کے بعد تم کبھی نظر آئے تو تمھارے ساتھ عبرتناک سلوک کیا جائے گا۔ کیا تم ہمیں احمق خیال کرتے ہو۔ کیا دنیا میں کسی کو تقسیم ہونے سے بھی قوت اور سربلندی حاصل ہوئی ہے، جو ہمیں حاصل ہو جائے گی“۔ لیکن اگر وہ برصغیر کے مسلمانوں کی طرح عقل و شعور سے بالکل پیدل ہیں تو وہ اس سے کہیں گے کہ ”ما شاء اللّٰہ. سبحان اللّٰہ. قائد تو ہمیں اب ملا ہے۔ کیا شاندار پروگرام پیش کر رہا ہے۔ ہم آپ کو قائد ہی نہیں قائداعظم تسلیم کرتے ہیں“۔ اس کے بعد وہ آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں اور تین حصوں میں اس طرح تقسیم ہو جاتے ہیں کہ نہ تو ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہو سکتے ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے کے کام آ سکتے ہیں۔ ان کے صحن میں دودھ اور شہد کی نہریں تو کیا بہتیں اُلٹا ان کے گھروں میں نصب نلکوں کا پانی بھی سوکھ جاتا ہے۔

بتایئے ان دانش ور حضرات کی رائے میں پہلا طرزِ عمل درست ہے یا دوسرا طرزِ عمل؟

یہ دانش ور حضرات ہمیشہ دوقومی نظریہ کا پس منظر ہی بیان کرتے ہیں جبکہ دوقومی نظریہ کا کوئی پیش منظر بھی ہے جسے یہ حضرات ہمیشہ نظر انداز کر جاتے ہیں۔ کسی نظریے کی افادیت کا اندازہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب اس کے پس منظر کے ساتھ پیش منظر کو بھی سامنے رکھا جائے۔

پیش منظر میں جو سب سے پہلی بات نظر آتی ہے وہ برصغیر میں ہندو مسلم فسادات ہیں۔ انیسویں صدی میں برصغیر میں کوئی ہندو مسلم فساد نہیں ہوا کیونکہ فساد کی جڑ دوقومی نظریہ ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ جیسے ہی بیسویں صدی میں یہ نظریہ پیدا ہوا تو اس کے ساتھ ہی فرقہ وارانہ فساد بھی شروع ہو گئے۔ جیسے جیسے یہ نظریہ فروغ پاتا گیا فسادات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ابتدا میں اگر سال میں دو چار جگہ ہندو مسلم فساد ہوتا تھا تو بعد میں درجنوں فسادات تک بات پہنچ گئی اور بالآخر سال میں سیکڑوں کے حساب سے فسادات ہونا شروع ہو گئے۔ ان فسادات میں نقصان ہمیشہ مسلمانوں کا ہوا کیونکہ وہ اقلیت میں تھے۔

پیش منظر میں دوسری قابل ذکر بات برصغیر کی تقسیم نہیں، بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کی تین حصوں میں تقسیم ہے۔ اس کے نتیجہ میں کم و بیش ایک کروڑ پچاس لاکھ لوگوں کو مہاجرت اختیار کرنا پڑی۔ مسلمانوں کی یہ ہجرت کسی منصوبہ بندی کے تحت نہیں ہوئی تھی اور نہ کسی کو اس کا اندازہ ہی تھا۔ جناح صاحب نے تو مسلمانوں کو بتایا تھا کہ پورا پنجاب اور پورا بنگال پاکستان میں شامل ہو گا، لیکن عملاً یہ ہوا کہ آدھا پنجاب بھی بھارت میں چلا گیا اور آدھا بنگال بھی۔ جناح صاحب سے گویا کہہ دیا گیا تھا کہ ”ایسا ہی پاکستان قبول کرو ورنہ چلتے پھرتے نظر آؤ“۔ چنانچہ جناح صاحب

نے ''ایں ہم غنیمت است'' کہ کر اسے منظور کرلیا کیونکہ اس کے پیش نظر بہرحال مسلمانوں کی تقسیم تھی نہ کہ ان کی فلاح۔ اس کے نتیجہ میں مشرقی پنجاب میں تقریباً پندرہ لاکھ مسلمان قتل ہوئے اور کم وبیش نوے ہزار مسلمان عورتیں بے آبرو ہوئیں اور بے آبرو بھی اس بے دردی کے ساتھ کی گئیں کہ ہر عورت کے سامنے اس کے تمام عزیزوں کو، جن میں معصوم بچے تک شامل تھے، قتل کیا گیا اور اس کے فوراً بعد اس کے ساتھ گینگ ریپ کیا گیا۔

اس مہاجرت میں کچھ مسلمانوں پر جو گزری وہ بھی از حد دردناک ہے۔ قافلہ در قافلہ لوگ چلے آ رہے ہیں جن میں ہر عمر اور ہر صحت کے لوگ شامل ہیں۔ دوران سفر جو لوگ فوت ہو گئے، ان کو نہ تو غسل دیا گیا، نہ جنازہ پڑھا گیا اور نہ ہی قبر کھود کر دفن کیا گیا۔ اپنے مردوں کو سڑک کنارے پھینک کر قافلہ آگے بڑھ گیا۔ یہ بھی ہوا کہ حاملہ عورتیں جن کا وقت دوران سفر پورا ہوا انھوں نے بچہ جنا اور اسی وقت بچے کو اٹھا کر آگے چلنا پڑ گیا۔ اس سفر میں نہ تو لوگوں کے پاس خوراک کا کوئی ذخیرہ تھا، نہ پینے کے لیے پانی۔ اس کے ساتھ ہی ہر وقت قافلے پر حملے کا خطرہ۔ ایسا بھی ہوا کہ قافلے پر حملہ ہوا۔ آدھا قافلہ قتل ہو گیا جو باقی بچ گئے وہ اسی وقت آگے چل پڑے۔

دوقومی نظریہ کے پیش منظر میں یہ بھی شامل ہے کہ 1948ء میں حیدر آباد دکن میں پانچ لاکھ مسلمان مارے گئے۔ دوقومی نظریہ کے پیش منظر کا کچھ حصہ روزنامہ نوائے وقت لاہور، 29 دسمبر 2006ء میں بیان ہوا ہے جب 1971ء میں پہلے کم وبیش بیس لاکھ غیر بنگالی مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ ان کی عورتوں کے ساتھ گینگ ریپ کیے گئے، یہاں تک کہ ہندو بنگالی اور مسلمان بنگالی نے مل کر غیر بنگالی مسلمان عورتوں کے ساتھ گینگ ریپ کر کے دوقومی نظریہ کا حقیقی پس منظر پیش کر دیا۔ جواب میں پاکستانی فوج نے بھی تقریباً بیس لاکھ بنگالی مسلمان قتل کر دیے۔ یہ واقعات اس قدر دردناک ہیں کہ بیان ہی نہیں کیے جا سکتے۔

آج کل (2008ء) وزیرستان اور دیگر قبائلی علاقوں پر ہوائی جہازوں سے بمباری کر کے دوقومی نظریہ کا پیش منظر دیکھنے اور پڑھنے میں آ رہا ہے۔ اس سے قبل افغانی مسلمانوں پر امریکا سے بمباری کروا کر ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ قوم وطن سے نہیں مذہب سے بنتی ہے۔

دوقومی نظریہ کا پیش منظر یہ بھی ہے کہ فیصل مسجد اسلام آباد میں اس روز اذان عصر نہ کہی گئی جس روز برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر مسجد کو دیکھنے آیا ہوا تھا۔ دوقومی نظریہ کا پیش منظر یہ بھی ہے کہ

اس کی بدولت پاکستان آرمی نے اسلام آباد میں لال مسجد اور جامعہ حفصہ کو فتح کیا جس میں اس نے کم وبیش دو ہزار مسلمان بچوں، بچیوں، مردوں اور عورتوں کو گولیوں سے شہید کر دیا یا فاسفورس بم مار کر زندہ جلا دیا۔ دوقومی نظریہ کے پیش منظر میں یہ بھی شامل ہے کہ ہم نے ایک سرکاری ملازم (جنرل پرویز مشرف) کو اپنے ملک کا صدر منتخب کیا ہے جس کی مثال دنیا میں اور کہیں نہیں ملے گی۔ دوقومی نظریہ کے پیش منظر میں یہ بھی شامل ہے کہ ملک کے سیکڑوں شہریوں کو بغیر کسی عدالتی کارروائی کے امریکا کے حوالہ کر دیا گیا، بلکہ فروخت کر دیا گیا۔ دانش ور موصوف اپنے مضمون کی چوتھی قسط میں فرماتے ہیں:

> ''ہندو بھارت میں بندروں، سانپوں، گائیوں، ہاتھیوں، بادلوں، پیپل کے درختوں کی پرستش کرتے تھے (اب بھی کرتے ہیں۔ ناقل) اور انھیں متبرک درجہ دیتے تھے اور ان کے آگے سجدہ ریز ہوتے۔ ہندوؤں نے لکڑی، پتھر، گارے، مٹی، سنگ مرمر کے بت تراشے اور ان کی پرستش کی جن کے کئی کئی ہاتھ، کئی کئی زبانیں، کئی کئی سر اور کئی کئی ٹانگیں ہیں۔ بعض بت آدھے انسان اور آدھے جانور بھی ہوتے ہیں لیکن اس کے باوصف ہندو اپنی تہذیبی اور ہندوانہ ثقافت میں یوں پکے اور غیر متزلزل رہے کہ وہ مسلمانوں میں جذب ہونے کے لیے کبھی تیار نہ ہوئے''۔

یہ بات میرے حیطۂ فہم میں نہیں آئی کہ ہندو ہوتے ہوئے وہ مسلمانوں میں کیسے جذب ہو جاتے؟ برصغیر میں 1947ء میں جتنے بھی مسلمان تھے کیا وہ سب کے سب باہر سے آئے تھے یا مقامی ہندو آبادی میں سے بھی کچھ لوگ مسلمان ہوئے تھے؟ کسی کو اس سے انکار نہ ہوگا کہ برصغیر کی مسلم آبادی میں زیادہ حصہ انھی کا ہے جو مقامی ہندو آبادی میں سے اسلام قبول کر کے مسلمان ہوئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بقیہ ہندو آبادی بھی مسلمان ہو سکتی تھی اگر ان کے سامنے اسلام موثر انداز میں پیش کیا جاتا، لیکن ہم نے برصغیر کی ہندو آبادی کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ دعوت سمجھنے کی بجائے جناح صاحب کی قیادت میں دوقومی نظریہ قبول کر کے غیر مسلم آبادی کو اپنا دشمن بنا لیا جس کے نتیجہ میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔

مرزا صاحب نے ہندو مذہب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے حقیقت یہ ہے کہ ہندو مذہب اس سے بھی گیا گزرا ہے۔ اسی لیے اس مذہب کو فروغ حاصل نہیں ہوا۔ یہ برصغیر تک ہی محدود

رہا۔ برصغیر میں بھی یہ سمٹا ہے، بڑھا نہیں۔ پوری تاریخ میں کبھی کسی مسلمان نے ہندو مذہب قبول نہیں کیا، حتیٰ کہ کبھی کوئی عیسائی، سکھ یا پارسی بھی ہندو نہیں بنا۔ دراصل یہ مذہب ہے ہی نہیں۔ جناب نسیم انصاری (علیگ) لکھتے ہیں:

"واقعہ یہ ہے کہ ہندو مذہب ان معنوں میں کوئی مذہب نہیں جن میں اسلام یا عیسائیت یا یہودیت ہے۔ اصل میں یہ ایک تہذیبی تصور ہے۔"(1)

مسلمانوں کو ہندوؤں سے کبھی کوئی خطرہ نہیں رہا۔ صدیوں سے اکٹھے رہتے چلے آ رہے تھے۔ انگریزوں نے برصغیر پر قبضہ کے بعد "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی کے تحت ان میں منافرت پیدا کی۔ بعد میں انگریز کے ایما پر مسلم لیگ نے اسی منافرت کی بنیاد پر الگ ملک کے لیے تحریک چلائی۔ ہندوؤں کو مسلمانوں کا بہت خوف ناک، دہشت ناک دشمن بنا کر پیش کیا۔ اس مقصد کے لیے ہر طرح کے حربے استعمال کیے گئے۔ جھوٹ اور غلط بیانی سے کام لیا گیا۔ مسلمانوں کو ڈرایا گیا کہ انگریز کے برصغیر سے چلے جانے کے بعد ہندو تم سے ہزار سالہ حکومت کا بدلہ لے گا۔ وہ تمھیں تباہ و برباد کر دے گا۔ وہ تمھیں ہندو بنا لے گا، وغیرہ وغیرہ۔ تمام مسائل کا حل مسلمانوں کے لیے الگ خطہ کو قرار دیا گیا۔ میں یہاں مثال کے طور پر جناح صاحب کی اینگلو عربک کالج دہلی کے یونین ہال میں کی گئی ایک تقریر پیش کرتا ہوں جسے جناب پروفیسر اسرار احمد سہاروی نے خود سنا اور اپنے ایک مشاہداتی و تاثراتی مضمون "قیام پاکستان سے پہلے" میں نقل کیا تھا۔ جناح صاحب نے کہا تھا:

"میرے عزیز دوستو! میں چمچوں سے آپ کو دودھ پلانے کا قائل نہیں ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ آپ خود سوچیں اور تجربہ کریں کہ کیا انگریزوں کے چلے جانے کے بعد آپ ہندو ذہنیت سے کچھ بہتر توقع کر سکتے ہیں۔ آپ نے ان پر تقریباً ایک ہزار سال حکومت کی ہے۔ کیا فطری طور پر اپنی غلامی کا آپ سے اور آپ کی اولاد سے انتقام نہیں لیں گے۔ کیا یہ آپ کو انتقاماً غلام بنانے کی کوشش نہیں کریں گے۔ کیا محمود غزنوی کی بت شکنی کا آپ کی مساجد کو منہدم کر کے یا ان پر قبضہ کر کے بدلہ نہیں چکائیں گے۔ کیا یہ آپ کی تہذیب، آپ کے مذہب اور آپ کی زبان کو دیس نکالا نہیں دیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ آپ ان تمام باتوں کو خود سوچیے، تجزیہ کیجیے اور فیصلہ کیجیے کہ آپ ہندو کی

غلامی میں ہمیشہ رہنے کے لیے تیار ہیں۔ کیا آپ اپنے دین و ایمان، تہذیب و تمدن، زبان و ثقافت، علم و ادب کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر ہندو تہذیب و تمدن، زبان و ثقافت، علم و ادب کو اختیار کر لیں گے اور مسلمان قوم کی جگہ ہندو قوم بن جائیں گے۔"(2)

بعد کے حالات نے جناح صاحب کے حرف حرف کو جھوٹ، فریب اور دھوکہ ثابت کر دیا، لیکن ان کے جیالے آج بھی یہی راگ الاپ رہے ہیں۔ جناب ڈاکٹر رفیق احمد کے ایک بیان کی رپورٹنگ بہ شکریہ نوائے وقت پڑھیے:

"لاہور (خبر نگار خصوصی) تحریک پاکستان کے کارکن اور نظریۂ پاکستان ٹرسٹ کے وائس چیئرمین پروفیسر ڈاکٹر رفیق احمد نے گورنمنٹ کالج برائے خواتین باغبانپورہ لاہور میں ماہ تقریبات یوم پاکستان کے سلسلے میں منعقدہ خصوصی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ: قائداعظمؒ نے ہندومت کے بڑھتے ہوئے خطرے کی نشان دہی کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اگر پاکستان قائم نہ ہوا تو ہندومت کا یہ خطرہ ہندستان کی سرحدوں سے نکل کر قرب و جوار کے دیگر ممالک اور بالخصوص وسطی ایشیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔"(3)

دیکھیے جناح صاحب کے جیالے کس جرأت اور ڈھٹائی کے ساتھ جناح صاحب کی طشت از بام ہو جانے والی کذب بیانیوں کو سچ ثابت کرنے کے لیے آج بھی جھوٹ پہ جھوٹ بولے چلے جا رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہندوؤں نے آزادی کے بعد ہندستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کو انتقاماً غلام بنانے کی کوشش کی؟ کیا مسلمانوں کے مذہب، تہذیب و تمدن اور زبان و ادب کو دیس نکالا دیا؟ کیا ہندومت نے قرب و جوار کے دیگر ممالک، بالخصوص وسطی ایشیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا؟ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ 63 سالوں میں ہندومت کو تو ہندستان میں بھی فروغ حاصل نہیں ہوا۔ کیا مسلم لیگی مثال کے طور پر کسی ایک مسلمان کا نام پیش کر سکتے ہیں جس نے تقسیم ہند کے بعد ہندومت قبول کیا ہو؟ جبکہ تقسیم ہند کے بعد بھی ہزاروں ہندو مسلمان ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

ہندو مذہب تو اتنا گیا گزرا ہے کہ کسی مسلمان کا ہندو مذہب قبول کرنا تو بہت دور کی بات ہے،

کبھی نہیں سنا کہ کسی سکھ، پارسی یا عیسائی نے ہی ہندو مذہب قبول کیا ہو۔ محترمہ حمیرا اشفاق اپنی کتاب اوراق ھند کے مقدمہ میں فریڈا بیدی نام کی ایک انگریز خاتون ادیبہ کے بارے میں معلومات دیتی ہیں کہ وہ تقسیمِ ہند سے قبل اپنے شوہر بی. پی. ایل. بیدی کے ساتھ ماڈل ٹاؤن لاہور میں مقیم تھیں۔ دونوں میاں بیوی سوشلسٹ نظریات رکھتے تھے اور تصنیف و تالیف اور سماجی و سیاسی ہنگاموں میں مگن رہتے تھے۔ تقسیمِ ہند کے بعد انھوں نے پاکستان میں رہنا پسند نہیں کیا بلکہ دونوں میاں بیوی ہندوستان منتقل ہو گئے۔ لیکن ہندوستان میں فریڈا نے ہندو مذہب کو نہیں بلکہ بدھ مذہب کو قبول کیا اور ساری زندگی سماجی کاموں میں گزار دی۔ (4) اس ایک واقعہ سے ہی آپ ہندو مذہب کی بے وقعتی اور عدم مقبولیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

ہندوستان میں جو لاکھوں مساجد، مدارس، کتاب خانے، مکتبے، ادارے اور مزار و قبرستان اجڑے، بے آباد ہوئے بلکہ بُری طرح سے برباد ہوئے اس کی تمام تر ذمہ داری مسٹر جناح اور لیگ پر عائد ہوتی ہے۔ وہ جس طرح کی اشتعال انگیز سیاست کر رہے تھے اور جس طرح کی تقسیم کروا رہے تھے، اس کے نتائج تو ایسے ہی سامنے آنے تھے۔ مثال کے طور پر صرف ایک شہر حصار کی مساجد کے بارے میں پڑھیے۔ جناب خالد بہزاد ہاشمی لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے آخری انٹرویو میں بتایا کہ وہ 90ء کی دہائی کے شروع میں اپنے آبائی شہر حصار بھی گئے تھے۔ حصار میں وہ اپنا آبائی مکان ڈھونڈتے ہوئے مرکزی جامع مسجد کی جانب نکل گئے جہاں وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جامع مسجد میں سرکاری سکول قائم ہے اور مسجد کے احاطہ میں واقع پختہ قبروں کے چاروں جانب مورتیاں نصب ہیں۔ اُس وقت حصار میں 68 مساجد تھیں، جن میں لاٹ کی مسجد، ہمایوں کی جامع مسجد (1553ء)، بہلول لودھی کی مسجد اور دہلی گیٹ کے باہر ہمایوں کی مسجد (1533ء) شامل ہیں۔ اس وقت یہ تمام تاریخی مساجد ہندوؤں کے ناجائز قبضہ میں ہیں۔ ان میں سے صرف ایک مسجد میں، جو نند سینما کے قریب واقع ہے، جمعہ کی نماز ہوتی ہے، جبکہ یہ مسجد بھی باقی اوقات میں رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔" (5)

حقیقت یہ ہے کہ تقسیمِ ہند کے موقع پر مسلمانوں کا جس قدر بھی جان، مال، آبرو اور اسلامی

آثار کا نقصان ہوا، سب مسٹر جناح کی سیاستِ بد کے نتیجے میں ہوا، سب کچھ کے وہ ذمہ دار ہیں۔

مرزا صاحب نے اپنے مضمون "دو قومی نظریہ: پس منظر" میں ہندو آبادی کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے وہ سو فیصد درست ہے۔ لیکن کیا ہندو اولادِ آدم نہیں ہیں؟ کیا وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ دعوت نہیں ہیں؟ کیا اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ برصغیر کی غیر مسلم اور ہندو آبادی میں سے اس کا کچھ حصہ بیسویں صدی میں مسلمان ہو جاتا اور اس طرح برصغیر میں مسلم آبادی کا تناسب چالیس فیصد سے اکاون فی صد یا اس سے بھی زیادہ ہو جاتا اگر ہم نے دو قومی نظریہ قبول کر کے انھیں اپنا دشمن نہ بنایا ہوتا؟

مسلمانوں کی طرف سے دو قومی نظریہ کے پیش کیے جانے کے بعد برصغیر کی ہندو آبادی نے اسلام کے بارے میں اپنے قلب و ذہن پر قفل لگا لیا جبکہ گزشتہ ہزار سال میں مسلمانوں کی طرف سے کسی منظم کوشش کے بغیر ہی ہندو اسلام قبول کرتے رہے۔ مسلمانوں کی قیادت کی طرف سے دو قومی نظریہ کی وکالت کے نتیجہ میں ہندو آبادی نے اسلام کے بارے میں اپنے کان ہی بند کر لیے، لیکن عیسائیت کے بارے میں اپنے کان کھلے رکھے۔ کیونکہ ہندو مذہب کوئی عقلی یا دلیل پر مبنی مذہب (Rational) ہے ہی نہیں۔ وہ تو ایک گورکھ دھندہ اور توہمات کا مجموعہ ہے۔ اہل اسلام نے جب یہ میدان خالی چھوڑ دیا تو عیسائی تبلیغی تنظیموں نے اس خلا کو پُر کر دیا اور وہ ہندو آبادی کو مسلسل عیسائی بنائے چلے جا رہے ہیں۔ اس ضمن میں جناب ڈاکٹر عبدالغنی فاروق اپنے ایک مضمون بعنوان "پس چہ باید کرد" میں رقم طراز ہیں:

"ہندوستان ہمارا قریب ترین ہمسایہ ہے اور وہاں کی غالب ترین آبادی ہندو مذہب کی پیروکار ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں ہندو مذہب کی کوئی عقلی اور سائنسی بنیاد نہیں ہے اور اس اعتبار سے اس کا کوئی مستقبل بھی نہیں ہے۔ چنانچہ سلامت طبع رکھنے والا کوئی ذہین ہندو اس مذہب پر کار بند نہیں رہ سکتا لیکن چونکہ پاکستان اور بھارت میں باہمی دشمنی (دو قومی نظریہ کی برکت سے، ناقل) ہمیشہ عروج پر رہی ہے۔ اس لیے نفرت کے اس ماحول میں تقسیمِ ہند کے بعد عام ہندو نوجوان مسلمان ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکا۔ چونکہ 1947ء کے زمانے میں اور اس کے بعد بہت عرصہ تک بین الاقوامی کیمونزم کا چرچا عام تھا اور سوویت یونین کی قیادت میں کیمونسٹ مملکت سپر

پاور کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس لیے بھارت کے ذہین نوجوان کمیونسٹ بننے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ روس کی کمیونسٹ ایمپائر کو زوال آیا۔ اشتراکی سلطنت ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی، کمیونزم کو نظریاتی طور پر بھی مکمل شکست ہوگئی تو میرے ذہن میں یہ سوال بار بار سر اٹھاتا رہا کہ اب بھارت کا ذہین ہندو کدھر جائے گا اور اکیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی ایک خبر پڑھ کر شدید تشویش میں مبتلا ہوگیا کہ ایک اندازے کے مطابق ہر سال آٹھ لاکھ ہندو عیسائی ہو رہے ہیں اور خدشہ ہے کہ اگر صورت حال یہی رہی آئندہ پچاس سال تک بھارت عیسائی اکثریت کا ملک بن جائے گا''۔(6)

جب برصغیر کے مسلمانوں نے آغا خانی رافضی کی قیادت میں دو قومی نظریہ پیش کر کے یہ تسلیم کر لیا کہ اسلام اپنی تاثیر کھو چکا ہے اور یہ کہ اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ کبھی برصغیر کے مسلمان چالیس فی صد سے اکاون فی صد ہو جائیں تو پھر یہی ہونا تھا جس کا ذکر ڈاکٹر عبدالغنی فاروق نے کیا ہے۔

دنیا میں ہر مذہب کا پیروکار اپنے مذہب کو برحق سمجھتا ہے۔ اس کی اگر کوشش نہیں تو خواہش ضرور ہوتی ہے کہ دنیا کی کل آبادی اس کے مذہب کو قبول کرے۔ اس لیے اپنے مذہب کو برحق تسلیم کرنے والے تبلیغی تنظیمیں قائم کرتے ہیں اور دنیا کے مختلف اطراف میں تبلیغی وفود روانہ کرتے ہیں، تبلیغی مشن قائم کرتے ہیں۔ ہندو مذہب دنیا کا واحد مذہب ہے جس کے ماننے والے اس کے برحق ہونے پر دل سے یقین ہی نہیں رکھتے۔ کسی ہندو نے کبھی یہ خواہش نہیں کی کہ دنیا کی تمام آبادی ہندو ہو جائے۔ ہندوؤں میں تو کوئی تبلیغی تنظیم بھی نہیں ہے۔ نہ انھوں نے کبھی کہیں کوئی تبلیغی جماعت روانہ کی اور نہ کوئی تبلیغ مشن قائم کیا۔ اپنے مذہب کو برحق یقین نہ کرنے کی وجہ سے ہی وہ ہر وقت ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں کوئی ہندو اپنے مذہب کو ترک کر کے دوسرا مذہب قبول نہ کر لے۔ اس لیے ان کی ہر وقت یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہندو کسی دوسرے مذہب بالخصوص اسلام کی بات ہی نہ سنیں تاکہ اس سے متاثر نہ ہوں۔ چھوت چھات کا تصور بھی اصلاً اسی کا نتیجہ ہے۔

جب بھی مسلمان کسی غیر مسلم کو اسلام کی دعوت دیں گے تو پہلے یہ ثابت کرنے پر اپنی قوت صرف کریں گے کہ اُس کا مذہب غلط ہے۔ جب وہ اس سے یہ منوالیں گے تو اس کے بعد ہی اس کے سامنے اسلام کی حقانیت کی کوئی دلیل پیش کر سکیں گے، لیکن ہندو مذہب کے پیروکار نے

مسلمانوں کا آدھا کام خود ہی کر دیا ہے۔ اسے ایسی کوئی دلیل دینے کی ضرورت ہی نہیں کہ اس کا مذہب غلط ہے۔ اس کے سامنے آپ کو صرف اسلام کی حقانیت کی دلیل ہی پیش کرنا ہے اور آپ کا کام ہو گیا۔

برصغیر میں تقسیم سے قبل مسلمانوں کی آبادی تقریباً چالیس فیصد تھی۔ مسلمانوں کو اپنی اکثریت بنانے کے لیے صرف گیارہ فیصد کی ضرورت تھی۔ کیا مسلمان یہ گیارہ فیصد کی کمی پوری نہیں کر سکتے تھے؟ اگر کر سکتے تھے تو ان کی قیادت نے تقسیم کا مطالبہ آخر کس لیے کیا؟

میں اہل دانش سے دریافت کرتا ہوں کہ اگر مسلمان انگریزوں کی رخصتی سے قبل یہ گیارہ فیصد کمی پوری کر کے برصغیر کو مسلم اکثریت کا ملک بنا چکے ہوتے تو کیا پھر بھی ان کی قیادت تقسیم کا مطالبہ کرتی اگر نہیں تو پھر دو قومی نظریہ کا کیا حشر ہوتا؟ تقسیم کروا کے ہم نے برصغیر کے مسلمانوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ لیکن غیر مسلموں کو اکٹھا کر دیا۔ اس تقسیم کے نتیجے میں اہل پاکستان چاہیں بھی تو وہ ان غیر بنگالی مسلمانوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ جو دسمبر 1971ء سے بنگلہ دیش کے کیمپوں میں پڑے جانوروں جیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ ہے انعام دو قومی نظریہ کا اور یہ ہے اس کا پیش منظر۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا ہم دو قومی نظریہ کی بنیاد پر پاکستان میں دو قوموں کی تشکیل کر رہے ہیں یا ایک قومی نظریہ کی بنیاد پر ایک قوم کی تشکیل کر رہے ہیں؟ اس سوال کا جواب کسی دانش ور نے کبھی نہیں دیا۔ کیونکہ جناح صاحب نے 1947ء میں دلّی سے کراچی روانہ ہوتے ہی دو قومی نظریہ کو دفن کر دیا تھا۔ مسلم لیگی رہنما جناب چودھری خلیق الزماں لکھتے ہیں:

''یہ دو نیشن نظریہ تقسیم ہند کے بعد چار کروڑ مسلمانوں کے لیے جو ہندستان میں رہ گئے ہیں بڑا ہولناک ثابت ہوا۔ کیونکہ 14 اور 15 اگست 1947ء کو وہ نہ پاکستانی نیشن رہ گئے اور نہ ہندستانی۔ جس کی وجہ سے ان پر بدترین مصائب نازل ہوئے۔

یکم اگست 1947ء کو مسٹر جناح نے ہندستان کے اقلیتی نمائندوں سے رخصت ہونے کے لیے اُن کو بلوایا۔ اس موقع پر سید رضوان اللہ سیکرٹری یو پی مسلم لیگ اور ممبر کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی نے اقلیتی مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق جناح صاحب سے کچھ بہت ٹیڑھے سوالات کیے جن سے وہ بہت پریشان نظر آئے۔ اس سے پہلے انھیں اس قدر پریشان میں نے نہیں دیکھا تھا۔ گفتگو کی یہ نوعیت دیکھ کر میں نے اسے ختم کرانا ہی

مناسب سمجھا، اب اس کا اعادہ کرنا ضروری نہیں۔ اس کے بعد ہم اُن سے رخصت ہو کر چلے آئے۔ اس گفتگو کا اثر مسٹر جناح پر اتنا گہرا پڑا کہ 11 اگست 1947ء کو بحیثیت ہونے والے گورنر جنرل پاکستان اور پاکستان کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کے پریذیڈنٹ کے انھوں نے اولین موقع پر دوقومی نظریہ کو اپنی ایک تقریر کے ذریعے بالکل ختم کردیا۔ اُن کی تقریر یہ تھی:

”اب اگر ہم پاکستان اسٹیٹ کو بافراغت خوش دیکھنا چاہتے ہیں تو ہم کو کلیتاً عوام کی خصوصاً غربا کی خدمت میں لگ جانا چاہیے۔ اگر ہم سب گزشتہ واقعات کو بھلا کر اور اختلاف کو ختم کر کے متحدہ طور پر کام میں مشغول ہو جائیں تو ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔ اگر ہم اپنا ماضی بدل ڈالیں اور سب مل کر یک جہتی سے کام شروع کردیں، خواہ تم کسی قوم کے ہو، خواہ تمھارے آپس کے تعلقات پہلے کچھ ہی رہے ہوں۔ خواہ تمھارا رنگ، ذات اور دین کچھ ہی رہا ہو مگر وہ اب بہرصورت پاکستان کا شہری ہے، جس کے تمام وہی حقوق اور وہی ذمہ داریاں ہیں جو کسی اور کی ہیں۔ میں اس سے زائد اس پر زور نہیں دے سکتا، ہم کو اسی جذبے سے کام کرنا ہے اور تھوڑے عرصہ میں اکثریت اور اقلیت، ہندو قوم اور مسلم قوم کے قصے ختم ہو جائیں گے۔ کیونکہ خود مسلمانوں میں پٹھان، پنجابی اور شیعہ، سنی وغیرہ ہیں۔ اسی طرح ہندوؤں میں برہمن، ویش، کھشتری، بنگالی اور مدراسی وغیرہ۔ یہ سب دور ہو جائیں گے۔

اگر آپ مجھ سے پوچھیں تو حقیقت یہ ہے کہ ہندستان کی آزادی میں یہی مختلف حالات حارج رہے ورنہ ہم بہت پہلے آزاد ہو گئے ہوتے۔ آپ کسی مذہب، ذات، یا عقیدے کے ہوں، اس کو اسٹیٹ کے کام سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔“(7)

مسٹر جناح نے اگرچہ 11/اگست کی تقریر میں دوقومی نظریہ کو دفن کردیا تھا لیکن اس نظریہ کے اثراتِ بد کے نتیجے میں مسلمان تین حصوں میں تقسیم ہو چکے ہیں اور پاکستان کے منظر پر سات آٹھ قومیتیں اُبھری ہوئی ہیں۔ پاکستان میں اس حوالہ سے صورتِ حال نہایت مخدوش ہے۔ سندھ اور بلوچستان میں علیحدگی کے لیے پُرتشدد تحریکیں سرگرم عمل ہیں، جبکہ کراچی میں اور سرائیکی اور ہزارہ علاقوں میں قومیت کی بنیاد پر الگ صوبوں کے لیے تحریکیں چل رہی ہیں۔ اس سب کے

ذمہ دار مسٹر جناح ہیں۔ لیگی ذہن وفکر رکھنے والے بانی امیر تنظیم اسلامی پاکستان جناب ڈاکٹر اسرار احمد نے اکتوبر 1969ء کے مجلّہ میثاق لاہور کے اداریے میں پاکستان میں قومیتوں کے اُبھار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

”مشرقی پاکستان میں تو بنگالی قومیت کا راگ شروع ہی سے الاپا جا رہا تھا۔ اب سندھ بھی ”جئے سندھ“ کے نعروں سے گونج رہا ہے اور یہی حال بلوچستان اور سابق صوبۂ سرحد کا ہے، وہاں پختونستان کا سٹنٹ تو قدیم تھا ہی، ایک نئی دوعملی یہ ایجاد ہوئی ہے کہ ”عظیم باپ“ افغانستان میں بیٹھ کر آزاد پختونستان کے نعرے کو ہوا دے رہا ہے اور اس کی صُلبی و معنوی ذریّت پاکستان میں بیٹھ کر اس کی ایک دوسری نسبتاً کم قابلِ اعتراض تعبیر پیش کر رہی ہے۔ الغرض وہ نغمہ کہ۔

”بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
کہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی!“

جو تحریکِ پاکستان کے دوران خوب زور شور سے بلند ہوا تھا، ایران و افغانستان تک کیا پہنچتا خود پاکستان میں دم توڑ رہا ہے۔“(8)

ڈاکٹر صاحب نے اس عبارت کے حاشیہ میں مسٹر جناح کی 11/اگست 1947ء کی تقریر پر بایں الفاظ تبصرہ فرمایا تھا:

”خود ہم نے جولائی کے شمارے میں پاکستان کی اجتماعی زندگی کی جن الجھنوں اور پیچیدگیوں کا تذکرہ کیا تھا ان میں سے تیسری الجھن جو مضمون کی دوسری قسط میں بیان ہوئی تھی، یہی ہے کہ پاکستان میں ”قومیت“ کا ایک ہولناک خلا ہے جو کوئی آج پیدا نہیں ہوا بلکہ بالکل ابتدا سے چلا آ رہا ہے لیکن بعد میں ہم نے اس موضوع پر قلم اٹھانے سے اس لیے احتراز کیا کہ:

ع اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں!

سرِدست صرف اس اشارے پر اکتفا مناسب ہے کہ پاکستان قائم تو ”ملت از وطن است!“ کی پرزور نفی اور ”ملتِ اسلامی“ کے تصور کے زوردار اثبات پر ہوا تھا، لیکن خود اس کے قائم کرنے والے نے پہلے ہی روز غیر مبہم الفاظ میں یہ کہ کر کہ: ”پاکستان

میں نہ کوئی ہندو ہندو رہے گا، نہ مسلمان مسلمان، مذہبی اعتبار سے نہیں، اس لیے کہ وہ تو ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے بلکہ سیاسی اعتبار سے!" ملتِ اسلامی کے تصور کی نفی اور "وطنی قومیت" کا اثبات کر دیا تھا۔ چنانچہ اسی وقت سے ہمارے یہاں "ملتِ اسلامی" اور "پاکستانی قومیت" کے مابین ایک کھیلا جاری ہے اور یہ اسی کھیلے کے ثمرات ہیں جو آج علاقائی ولسانی قومیتوں کے فروغ کی صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس لیے کہ نظریۂ ملت کو خود ہم نے منہدم کر دیا اور پاکستانی قومیت کا تصور ہمارے مزاج کے مناسب نہ تھا چنانچہ ہماری اجتماعی زندگی میں وہ خلا پیدا ہوا جو رفتہ رفتہ متذکرہ بالا قومیتوں اور عصبیتوں سے پُر ہوا۔ چنانچہ اب شکایت ہو تو کس سے اور گلہ ہو تو کس کا؟ کہ:

ع اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست!

اگر چہ یہ اندیشہ بھی شدید ہے کہ بات کہیں "حدود" سے تجاوز نہ کر جائے، لیکن دردِ دل بالکل خاموش بھی نہیں رہنے دیتا۔ حیرت ہوتی ہے کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے "مبینہ" الفاظ پر تو ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا اور آج تک بھی ان کا قصور معاف نہیں ہوا، حالانکہ جب انہوں نے اپنے بیان کی وضاحت فرمائی تو علامہ اقبال نے بھی اپنے اشعار سے رجوع کر لیا تھا۔ لیکن بانی پاکستان کے اس نظریہ وطنیت پر تنقید کی جرأت کسی کو نہ ہوئی، حتیٰ کہ علماء بھی منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے۔

دیکھ کعبے میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ!
بتکدے میں برہمن کی پختہ زُناری بھی دیکھ!"(9)

اس بات کو مسلم لیگی ذہن رکھنے والے بریلوی مسلک کے ایک بڑے محقق و مصنف پروفیسر محمد مسعود احمد بھی تسلیم کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"پاکستان بننے کے بعد کچھ کوتاہیاں ہم سے ضرور ہوئیں جن کا تدارک ضروری ہے۔ بہت سی باتیں ہیں چند ایک کا ذکر کرتا ہوں۔

تحریک پاکستان کے زمانے میں جب کانگریسی قائدین یہ کہا کرتے تھے قومیت کی بنیاد مذہب نہیں وطن ہے تو ہم کہا کرتے تھے کہ نہیں مسلم قوم کی تشکیل دین و مذہب

سے ہوتی ہے، جغرافیائی حدود سے نہیں۔ اس لیے ہم "ہندوستانی" نہیں "مسلم" ہیں اور صرف "مسلم" ہیں:

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

مگر جب پاکستان بن گیا تو نہ معلوم کیوں قومیت کے خانے میں "پاکستانی" لکھا جانے لگا حالانکہ "وطنیت" کے خانے میں "پاکستانی" لکھا جاتا اور "قومیت" کے خانے میں "مسلم" لکھا جاتا۔ بہر حال جب لامحدودیت کا دعویٰ کرنے والا محدود ہو گیا تو مختلف مسائل پیدا ہونے لگے۔ بات ملک سے نکل کر صوبوں تک جا پہنچی اور صوبوں سے وابستگی پر اصرار کیا جانے لگا اور اس پر اعتراض ہونے لگا کہ ہندوستان سے ترک وطن کر کے آنے والوں کو "مہاجر" نہ کہو اور یہاں کے خوش آمدید کہنے والوں کو "انصار" نہ کہو۔

حالانکہ یہ وہ پیارے الفاظ ہیں جس کو پہلی صدی ہجری میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرما کر جاوداں بنا دیا اور مہاجر اور انصار کو آپس میں اس طرح ملا دیا کہ دو سگے بھائی بھی کیا ملتے ہوں گے۔ حقیقت میں "مہاجر" اور "انصار" دو تاریخی اصطلاحیں ہیں۔ جب کسی کو "مہاجر" کہا جائے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنا حق جتانے لگے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ اس کا تعلق ان خوش بختوں سے ہے جنھوں نے پاکستان کے لیے جان و مال کی قربانیاں دیں اور جب "انصار" کہا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا تعلق ان سعادت مندوں سے ہے جنھوں نے مہاجرین کو خوش آمدید کہا۔ مصیبت میں ان کا ساتھ دیا اور ہر طرح سے ان کی خدمت کی ایثار و قربانی اور احسان و اخلاق ایسی چیزیں نہیں جن کو بھلا دیا جائے یہ یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

تو عرض یہ کرنا چاہتا تھا کہ ہم نے مسلم قومیت کا دعویٰ کرنے کے باوجود اپنی قومیت کو جغرافیائی حدود سے منسلک کر لیا۔ حالانکہ پردہ غیب سے تو یہ آواز آرہی تھی:

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندہ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا

اس انداز فکر نے پاکستان بننے کے بعد بہت سی پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔"(10)

حقیقت یہ ہے کہ جناح صاحب کی 11 اگست 1947ء کی تقریر ہو یا پاکستان کا سٹیزن ایکٹ، پاکستان کے لوگوں کی "قومیت" "وطنیت" کی بنیاد پر متعین ہو رہی ہے۔ پاکستانیوں کے پاسپورٹ پر "قومیت" کے خانے میں "مسلم" نہیں "پاکستانی" لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ ہمارے ہاں کے نواز شریف ہوں یا جے سالک، قاضی حسین احمد ہوں یا جسٹس بھگوان داس، مولانا شبیر احمد عثمانی ہوں یا جوگندر ناتھ منڈل سبھی کی ایک ہی "قومیت" ٹھہرتی ہے یعنی "پاکستانی"۔ اس صورت میں آپ سوچیں کہ پاکستان میں مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد کا درست "تصور قومیت" رائج ہے یا علامہ اقبال اور مسٹر جناح کا غلط "دو قومی نظریہ":

آپ بتلائیں کہ ہم بتلائیں کیا



حوالہ جات

(1) جواب دوست (خود نوشت آپ بیتی)/ نسیم انصاری/ آج کتب خانہ، کراچی/ 1997ء/ ص:103

(2) ماہنامہ بتول لاہور، آزادی نمبر/ اگست 1996ء/ ص:13

(3) روزنامہ نوائے وقت لاہور/ 3 اپریل 2010ء

(4) اوراق هند [والنٹیر کا گمنام تاریخی اور ادبی شاہکار]/ حمیرا اشفاق/ سانجھ، لاہور/ جنوری 2011ء/ ص 19

(5) روزنامہ نوائے وقت لاہور/ 11 اپریل 2010ء

(6) روزنامہ پاکستان لاہور/ 29 جون 2008ء

(7) شاہراہ پاکستان/ چودھری خلیق الزماں/ ص:942

(8) پاکستان کی سیاست کا پہلا عوامی و ہنگامی دور (69ء تا 72ء کے سیاسی تجزیے)/ ڈاکٹر اسرار احمد/ ص:81

(9) ایضاً/ ص:81-82

(10) دو قومی نظریہ اور پاکستان/ پروفیسر محمد مسعود احمد/ ص:10-11

24

جناب شریف فاروق پاکستان کے ایک بزرگ صحافی ہیں اور جناح صاحب کے زبردست جیالے۔ موصوف کئی سال تک لاہور میں روزنامہ "مشرق" سے وابستہ رہے، بعد میں ان کا تبادلہ مشرق پشاور میں ہو گیا، بعد ازاں انھوں نے پشاور سے ہی روزنامہ "جہاد" جاری کیا جس کے وہ ایڈیٹر ہیں۔ موصوف نے مسٹر جناح کی شان میں ایک زبردست قصیدہ لکھا جو نوائے وقت لاہور میں چار اقساط میں شائع ہوا۔ اس قصیدہ سے تحریک پا کر میں نے ان کی خدمت میں بھی اپنے سوالات ارسال کر دیے۔ جواب میں موصوف نے اپنی ایک تالیف "قائد اعظم جناح. برصغیر کا مرد حریت" بھیج دی۔ ان کی تالیف میں میرے کسی سوال کا جواب تو نہیں تھا، البتہ اس میں ایک ایسی خبر تھی جس پر تبصرہ ضروری ہے۔ اپنی مذکورہ تالیف کے صفحہ 236 پر موصوف فرماتے ہیں:

"حضرت قائد اعظم کی عظمت اور جرأت کے بارے میں لاتعداد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان کی جدوجہد لاجواب اور ان کی شخصیت مجموعۂ کمالات تھی۔ البتہ انھیں ایک مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا جس کا شکوہ خود حضرت قائد اعظم بھی کیا کرتے تھے کہ "ان کی جیب میں کھوٹے سکے ہیں"۔ انھیں کھرا کرنے یعنی ان کی سیاسی تربیت و اصلاح کا موقع حضرت قائد اعظم کو نہ مل سکا۔"

مسٹر جناح کے ایک اور جیالے جناب ڈاکٹر صفدر محمود بضد ہیں کہ جناح صاحب نے یہ بات کبھی نہیں کہی کہ ان کی جیب میں کھوٹے سکے ہیں۔ اس موضوع پر اخبارات کے صفحات میں

ان کا ڈاکٹر مبارک علی سے مضامین کے ذریعے تحریری مکالمہ ومجادلہ بھی ہوا لیکن دونوں حضرات اپنے اپنے مؤقف پر قائم رہے۔ ڈاکٹر صفدر محمود اس بات پر مُصر تھے کہ جناح صاحب نے اپنی زبان سے اپنی جیب میں کھوٹے سکے ہونے کا اعتراف کبھی نہیں کیا تھا۔ اس پر ممتاز دانش ور جناب ارشاد احمد حقانی نے اپنے کالم ''وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے'' میں لکھا تھا:

''میرے عزیز دوست ڈاکٹر صفدر محمود کا یہ دعویٰ بے شک درست ہو کہ قائداعظم نے کبھی یہ نہیں کہا تھا کہ میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں، لیکن ہمیں یہ کہنے پر معاف کیا جائے کہ قائد کے جانشین یا ان کی بہت بڑی تعداد عملاً کھوٹے سکے ہی ثابت ہوئے۔ انھوں نے نو سال تک آئین نہ بنایا، 23 سال تک بالغ رائے دہی کی بنیاد پر کوئی انتخابات نہ کرائے اور جب انتخابات ہو گئے تو وقت کے آمر نے ان انتخابات کو خوشدلی سے قبول نہ کیا۔ نتیجتاً ملک دولخت ہو گیا۔ یحییٰ خان پھر بھی صدارت کے منصب پر فائز رہنے اور اپنا نیا آئین دینے پر مُصر رہے۔ اگر نسبتاً نوجوان فوجی انھیں اٹھا کر باہر نہ پھینک دیتے تو نہ معلوم بقیہ پاکستان کا بھی وہ کیا حشر کرتے۔ بھٹو صاحب کے بعد ایک اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر سازش کے ذریعے ملک پر مسلط ہو گیا اور اس نے داخلی اور خارجی طور پر ملک کے لیے ایسی پیچیدگیاں پیدا کر دیں جن کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔ ضیاء الحق کے بعد سیاسی قیادت کو حکمرانی کا موقع ملا، لیکن اس نے بھی 11 سال باہمی لڑائیوں میں ضائع کر دیے۔ پھر ہماری قسمت میں ایک اور مارشل لا دیکھنا تھا جس کی پیدا کردہ پیچیدگیاں مسائل کو پہلے سے بھی زیادہ سنگین بنا رہی ہیں، لیکن افسوس کہ 18 فروری کے انتخابات کے بعد جو قیادت ابھری وہ بھی چیلنجوں میں کمی کرنے کی بجائے ان میں اضافے کا باعث بن گئی۔''(1)

ڈاکٹر صفدر محمود نے بعد میں بھی جناب عارف میاں کو دیے گئے ایک انٹرویو میں اپنے اسی موقف کا اعادہ کرتے ہوئے کہا تھا:

''اس [''میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں'' کے] حوالے سے میں نے پوری تحقیق کی ہے۔ کتابوں، حوالوں اور تقاریر ومضامین کی چھان بین کی ہے۔ مسلم لیگ کے پرانے کارکنوں سے ملا ہوں اور اُن سے اس بیان کے ضمن میں پوچھا ہے اور پھر اس نتیجے پر

پہنچا ہوں کہ قائداعظم نے کبھی ایسی بات نہیں کی۔''(2)

معروف مسلم لیگی مصنف اور صحافی جناب منیر احمد منیر بھی اپنی کئی تحریروں میں مسٹر جناح کے اس قول کی بغیر کسی ثبوت کے تردید کر چکے ہیں۔ انھوں نے کتاب **قائداعظمؒ— اعتراضات اور حقائق** میں ایک باب بعنوان ''قائداعظمؒ کی تین غلطیاں- ایک نیا شگوفہ؟'' لکھا ہے، جس میں وہ رقم طراز ہیں:

''عطا ربانی صاحب نے پہلی غلطی کے ذکر میں ''کھوٹے سکوں'' والی بات بھی چھیڑی ہے۔ اس سے قبل وہ ''مسٹر جناح بحیثیت سیاسی ولی'' کے تحت یہ بھی لکھتے ہیں: ''یاد رہے، ایک دفعہ انھوں نے کہا،'' میری جیب میں زیادہ تر سکے کھوٹے ہیں۔'' یا اس قسم کے الفاظ کہے تھے۔'' یعنی ربانی صاحب کو اصل الفاظ کا علم نہیں پھر بھی وہ کہتے ہیں، ''لیکن یہ بات ان کے حق میں جاتی ہے کہ انھوں نے یہ'' کھوٹے سکے'' مسلم کاز کے لیے بڑی دانائی سے چلائے۔'' ربانی صاحب جوش میں بھول گئے کہ کھوٹے سکے چلانا قانون کی نظر میں کتنا بڑا جرم ہے۔ لیکن قائداعظمؒ سے منسوب یہ غیر واقعی جملہ یہاں ادا کرنے سے بھی ربانی صاحب کی تسلی نہیں ہوتی۔ وہ ''پہلی غلطی'' تلے جہاں یہ لکھتے ہیں کہ ملک غلام محمد اور سر چودھری محمد ظفر اللہ خاں کی ''دو نامزدگیاں پارلیمنٹری پریکٹس حتیٰ کہ خود مسٹر جناح کے جمہوری اصولوں سے ٹکراتی تھیں'' وہیں وہ اگلے جملے میں رقم طراز ہیں: ''ممکن ہے کہ انھوں نے لیجسلیچر سے باہر دستیاب جوہر قابل ملکی بہتری کے لیے استعمال کرنے کی منصوبہ بندی کی ہو جس طرح کہ چوتھی دہائی کی جدوجہد کے ایام میں انھوں نے ''اپنی جیب کے کھوٹے سکے'' مؤثر انداز میں چلا لیے۔ کھوٹے سکوں والی بات تاریخی اور واقعات لحاظ سے غلط ہے۔ قائداعظمؒ نے اپنے رفقا کے بارے میں کبھی ایسا جملہ ادا نہیں کیا۔ اگر ایسا تھا کہ ان کے قریبی رفقا کھوٹے سکے تھے تو دس کروڑ مسلمانوں میں انھیں چند ایسے افراد بھی میسر نہ تھے کہ جنھیں وہ ان کھوٹے سکوں کی جگہ لے آتے؟ لہٰذا یہ جملہ واقعاتی، تاریخی، حتیٰ کہ منطقی اعتبار سے بھی انتہائی لغو ہے۔''(3)

جبکہ جناح صاحب کے رفیق خاص بلکہ بے حد عقیدت مند، ممتاز مسلم لیگی رہنما جناب

سردار شوکت حیات خاں اپنی خود نوشت آپ بیتی گم گشتہ قوم میں لکھتے ہیں کہ جناح صاحب نے ایک ملاقات میں میرے سامنے کہا تھا کہ ''میں جس جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں، وہاں سے کھوٹا سکہ برآمد ہوتا ہے۔'' سردار صاحب کی کتاب کو 1995ء میں ایک بڑے اشاعتی ادارے جنگ پبلشرز، لاہور نے شایع کیا تھا۔ اس کتاب کا انگلش ایڈیشن بھی چھپا تھا۔ اس کتاب کے دونوں ایڈیشن آج بھی مارکیٹ میں دستیاب ہیں اور ملک کی تمام لائبریریوں میں موجود ہیں۔ یہ کتاب اپنے اندراجات کے اعتبار سے ڈاکٹر صاحب اور منیر صاحب کی دل چسپی کی ہے، لازماً یہ ان کی لائبریریوں میں بھی ہوگی اور انھوں نے اس کتاب کو پڑھا بھی ہوگا۔ حیرت ہے اس مستند حوالے کے دستیاب ہونے کے باوجود ڈاکٹر صاحب اور منیر صاحب کس تیقن کے ساتھ بار بار غلط بیانی کر کے اس قول کی تردید کر رہے ہیں۔ اب آگے حوالہ پڑھیے۔ سردار شوکت حیات خاں لکھتے ہیں:

''قائداعظم، لیاقت علی خان کا اعتماد مکمل طور پر کھو بیٹھے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب قائداعظم نے مجھے اپریل 1948ء میں ملاقات کے دوران بتایا کہ میں جس جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں وہاں سے کھوٹا سکہ برآمد ہوتا ہے۔ ان سکوں میں نوابزادہ لیاقت علی خان بھی شامل ہیں۔ اسی طرح قائد نے ایک بار مسٹر ایوب کھوڑو کو اعتماد میں لیتے ہوئے بتایا کہ ان کا وزیراعظم ایک اوسط درجے کی شخصیت ہے۔ انھی دنوں یہ افواہ بھی پھیلی تھی کہ لیاقت کو وزارت عظمیٰ سے ہٹا کر مشرقی پاکستان میں گورنر لگایا جا رہا ہے۔ قبل اس کے کہ قائد اس پر عمل کرتے ان کی بیماری شدت اختیار کر گئی اور انھیں کوئٹہ اور زیارت لے جایا گیا۔

29 اگست 1948ء کے دن جب لیاقت، قائد سے ملنے زیارت گئے تو قائد نے اپنی بہن سے کہا، ''فاطی! لیاقت یہ دیکھنے نہیں آیا کہ میری صحت کتنی بہتر ہوئی ہے بلکہ وہ یہ دیکھنے آیا ہے کہ میں کب مروں گا۔'' حقیقت یہ تھی کہ قائد، لیاقت علی خان سے اس بنا پر شدید ناراض ہوئے کہ اس نے کشمیر کے متعلقہ کاغذات ان کی خدمت میں پیش کیوں نہیں کیے۔ ڈاکٹر الٰہی بخش کو اپنے مریض کی بیماری کے پیشِ نظر اس معاملے میں مداخلت کرنی پڑی۔ یہ حقائق ڈاکٹر الٰہی بخش نے اپنی کتاب قائداعظم کے آخری ایام میں بھی بیان کیے تھے لیکن بعد میں یہ صفحات بدل دیے گئے۔ میں نے

پنجاب پبلک لائبریری جہاں اصل کتاب ایک سیف میں محفوظ تھی، ان صفحات کو گم پایا۔ کتاب کے معائنہ سے ظاہر ہوا کہ اصل صفحات انتہائی بچگانہ انداز میں نکالے اور ان کی جگہ نئے صفحات لگائے گئے۔ لیاقت نے ڈاکٹر الٰہی بخش کو متنبہ کیا تھا کہ وہ اس کے حقائق کسی پر ظاہر نہ کرے، ورنہ اسے سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بعد میں ڈاکٹر الٰہی بخش فلیش مین ہوٹل راولپنڈی کے ایک کمرے میں مردہ پایا گیا۔ لیاقت کی زیارت میں قائد کے ساتھ ملاقات کا ذکر مس فاطمہ جناح نے اپنی کتاب میرا بھائی (My Brother) میں کیا ہے، جو دستاویزات قائداعظم اسلام آباد میں آج بھی موجود ہے۔

بعد میں قائداعظم کو ایک سٹریچر پر کراچی لایا گیا۔ صرف ایک ایمبولینس انھیں لینے کے لیے ایئرپورٹ بھیجی گئی۔ یہ گاڑی راستے میں خراب ہوگئی۔ ڈرائیور نے کہا، گاڑی میں پٹرول ختم ہوگیا ہے۔ یہ بڑی حیران کن بات ہے کہ صرف ایک گاڑی ایک وی وی آئی پی (VVIP) کو لینے گئی اور اس کے ساتھ کوئی متبادل گاڑی نہ بھیجی گئی۔ حالانکہ سی ایم ایچ یا نیول ہسپتال سے متبادل ایمبولینس ساتھ رکھی جا سکتی تھی۔'' (4)

جناح صاحب کے ایک اور قریبی ساتھی اور تحریک پاکستان کے صفِ اوّل کے راہنما جناب سردار عبدالرب نشتر اپنی آپ بیتی آزادی کی کہانی، میری زبانی میں لکھتے ہیں کہ جناح صاحب نے یہ بات مجھ سے بھی کہی تھی اور فریئر ہال کراچی میں مسلم لیگ کے اجلاس میں بھی کہی تھی۔ یہ کتاب 1950ء کی دہائی میں شایع ہوئی تھی، یہ کتاب بھی لازماً ڈاکٹر صاحب اور منیر احمد منیر کی نظر سے گزری ہوگی۔ اس کے باوجود وہ اس قول کو جھٹلاتے ہیں۔ سردار عبدالرب نشتر لکھتے ہیں:

''مجھے قیامِ پاکستان کے بعد جس چیز کا افسوس تھا اور رہے گا وہ مسلم لیگ کا کردار ہے... پاکستان کے بنتے ہی یہ جماعت ریشہ دوانیوں کا شکار ہوگئی اور اقتدار کے چکر میں پھنس کر نوکر شاہی اور اقتدار پرست ٹولے کی لونڈی بن گئی۔ دراصل اس جماعت کے رہنماؤں نے اس آدرش کو فراموش کر دیا جس کی بنیاد پر پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا اور جس کو پاکستان کی سیاست کے جسدِ خاکی میں جذب کر کے ایک خوشحال اور

مستحکم پاکستان بنانا تھا۔قائداعظم کی زندگی میں ہی مسلم لیگ میں گروہ بندی شروع ہو گئی تھی۔اس گروہ بندی پر انھوں نے سخت برہمی کا اظہار کیا تھا۔ایک دن انھوں نے مجھ سے مسلم لیگ کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں۔اس قسم کے الفاظ انھوں نے فریئر ہال میں مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں بھی کہے تھے۔''(5)

مسٹر جناح کے مبنی برحقیقت اس قول کے راوی ان کے اپنے رفقائے خاص سردار شوکت حیات خاں، سردار عبدالرب نشتر، نواب محمد یامین خان اور جناب عطاء ربانی وغیرہ تھے، اگر مسٹر جناح سے اس قول کا انتساب غلط ہوتا تو وہ لازماً اس کی تردید کرتے کیونکہ اس قول کی زد میں وہ خود بھی آتے ہیں۔ڈاکٹر صفدر محمود اور منیر احمد منیر سے میرا سوال یہ ہے کہ مسٹر جناح نے اپنے رفقاء کے بارے میں غلط بیانی کی ہے یا مسٹر جناح کے رفقاء نے جھوٹ بولا ہے؟ بتائیے درست کیا ہے اور غلط کیا!

اب ڈاکٹر صفدر محمود صاحب اس بات پر آگئے ہیں کہ جناح صاحب نے تو نہیں کہا تھا لیکن جناح صاحب کے رفقا تھے کھوٹے سکے ہی اور انھوں نے ہی ملک کو زوال وادبار تک پہنچایا ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف اپنے کالم ''صبح بخیر'' میں رقم طراز ہیں:

''ہم پر تو قائداعظمؒ کی جیب کے کھوٹے سکوں کے کھوٹے سکے حکمرانی فرماتے ہیں۔ یہاں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ خود قائداعظمؒ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ میری جیب میں کھوٹے سکے ڈال دیے گئے ہیں، لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان کی جیب میں جاگیرداروں کی شکل میں کھوٹے سکے ہی موجود تھے اور اس تناظر میں موجودہ لیڈران اِن کھوٹے سکوں کے کھوٹے سکے ہیں جنھیں عوام سے زیادہ اپنے مفادات سے غرض ہے، جو اقتدار کو دولت بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں، جن کے غیر ملکی بینکوں میں کروڑوں ڈالرز کے اکاؤنٹ ہیں اور جن کی جائیدادوں کا سلسلہ دوبئی، سپین اور لندن سے لے کر امریکا تک پھیلا ہوا ہے، جو مغل حکمرانوں کی مانند زندگی بسر کرتے اور دن میں لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کرتے ہیں لیکن غم ان غریبوں کا کھاتے ہیں جنھیں نان جویں اور خشک روٹی بھی میسر نہیں، جو بارہ بارہ افراد پر مشتمل کنبے ایک کمرے میں

رہتے اور تین ہزار سے چار ہزار روپوں میں مہینہ گزارتے ہیں، کیا یہ غریبوں کا غم کھانے کا نہایت جعلی طریقہ نہیں؟''(6)

ڈاکٹر صاحب موصوف اپنے ایک دوسرے کالم میں لکھتے ہیں:

''میری عادت ہے کہ میں دوران سفر بسوں، ٹرکوں، رکشاؤں وغیرہ کے پیچھے لکھے ہوئے اشعار ضرور پڑھتا جاتا ہوں۔اگر بس کے اندر موجود ہوں تو ڈرائیور کے سر کے اوپر لکھے ہوئے شاہکار کو ضرور پڑھتا ہوں۔بہرحال بس میں بیٹھتے ہی میں نے یہ شعر پڑھا اور سوچ میں گم ہو گیا۔شعر کچھ اس طرح تھا:

نہ انجن کی خوبی نہ ڈرائیور کا کمال
اللہ ہی رکھے اللہ ہی چلائے

بظاہر یہ سادہ سا بے وزن شعر پڑھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ شعر بس کے لیے نہیں بلکہ پورے پاکستان کے لیے لکھا گیا ہے۔کیونکہ غور کیے بغیر بھی ہم جانتے ہیں کہ پاکستان نامی جس بس پر ہم سوار ہیں اسے اللہ نے ہی قائم رکھا ہوا ہے اور اسے اللہ ہی چلا رہا ہے۔ڈرائیور حضرات نہ صرف اہلیت سے محروم ہیں، بلکہ خودغرضی اور خودفریبی کا شکار بھی ہیں۔اس کے باوجود اگر یہ بس مضبوطی سے چل رہی ہے، اُتار چڑھاؤ اور بلندی پستی سے گزر رہی ہے تو یہ صرف اللہ تعالیٰ کا کرم ہے۔''(7)

یہ ڈرائیور حضرات جن کا ذکر ڈاکٹر صاحب موصوف نے کیا ہے وہ کھوٹے سکے ہی تو ہیں جو جناح صاحب کی جیب میں تھے۔جنھوں نے پاکستان کو اس بُرے حال تک پہنچایا ہے کہ الامان الحفیظ۔سوال یہ ہے کہ کھوٹے سکے جناح صاحب کی جیب میں کود کر تو نہیں چلے گئے تھے، انھوں نے خود ہی جیب میں ڈالے تھے۔دریافت طلب امر یہ بھی ہے کہ انھوں نے دانستہ کھوٹے سکے اپنی جیب میں ڈالے تھے یا انھیں کھرے اور کھوٹے کی تمیز ہی نہیں تھی۔ہر دو صورتوں میں جناح صاحب کے انتخاب کی سزا تو اہل پاکستان کو ملی اور ملتی رہے گی۔زیادہ صحیح یہ ہے کہ ان کی ذات میں کشش ہی صرف کھوٹے سکوں کے لیے تھی۔کھرے سکے جناح صاحب کی شخصیت میں کوئی کشش محسوس ہی نہیں کرتے تھے اس لیے وہ تو ان سے دور ہی رہے۔دراصل جناح صاحب

برصغیر میں انگریز کے سب سے بڑے ایجنٹ کا کردار ادا کر رہے تھے۔ انھیں انگریزوں نے مشن یہ سونپا تھا کہ وہ ان کے مراعات یافتہ طبقات (جن کا آزادی کے بعد کوئی پُرسان حال نہ ہوتا) کے مفادات کے لیے بنائے جانے والے ملک کے قیام کے لیے تحریک چلائیں۔ اس مقصد کے لیے انگریزوں نے اپنے حامیوں کو چن چن کر لیگ میں شامل کرایا۔ اہلِ بصیرت و فراست اس چیز کا ادراک و احساس رکھتے تھے کہ جناح صاحب انگریز کے ایما پر جن لوگوں کو مسلم لیگ میں شامل کر کے الگ ملک کے حصول کے لیے تحریک چلا رہے ہیں، ان سے قطعاً کسی بھی قسم کے خیر کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ جناح صاحب اپنے رفقا (کھوٹے سکوں) کو قیامِ پاکستان بعد اگر سمجھے تو کیا سمجھے۔ انھوں نے لیگ میں کس قسم کے لوگوں کو شامل کیا تھا قوم پرست اخبار سہ روزہ مدینہ بجنور کے اداراتی مضمون کا ایک اقتباس پڑھیے:

"وہ لوگ جو پہلے یونین جیک کے سایہ میں جمع تھے اب مسلم لیگ میں شامل ہیں۔ ان کی خود غرضیوں کے سرچشمے مختلف ہیں مگر ان کا جماعتی نظام ایک ہے۔ غور کیجیے کہ مسلم لیگ نے کتنے طبقوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے:

1) انگریزی حکومت کے تمام پرانے خطاب یافتہ شاہی شہزادے۔
2) 57ء کے اصل غداروں کی اولاد جن کو سرسید مرحوم نے یہ سبق دیا تھا کہ انگریزی حکومت لازوال ہے۔
3) انگریزی عہد حکومت کے سرکاری دفاتر کے تنخواہ دار ملازم جنھوں نے پیدائشی طور پر مادر برطانیہ کا دودھ پیا ہے۔
4) 1914ء کی جنگ عظیم اور 1939ء کی عالمگیر جنگ کے فوجی ٹھیکیدار۔
5) وائسرائے اور گورنروں کی کونسل اور اسمبلیوں کے تمام پرانے ممبر جنھوں نے عوام کے ووٹوں کو دیکھ کر قرآن کی تلاوت شروع کر دی ہے اور جو انگریزوں کی امداد سے قرآنی سلطنت قائم کرنے پر مُصر ہیں۔
6) انگریزی درسگاہوں کے طلبا کی فوج۔
7) وہ تمام پیر فقیر، سجادہ نشین درویش حضرات اور عافیت پسند علماء جنھوں نے اسلام کے لیے کبھی کسی مصیبت کے وقت کلمۂ حق زبان سے نہیں نکالا۔

8) مخلص اور بے خبر عوام جنھیں منافقینِ اُمت نے فتح کر لیا ہے۔"(8)

جناح صاحب کے کھوٹے سکوں نے قیامِ پاکستان کے بعد پاکستانی معاشرے میں جو خرابیاں پیدا کیں، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ممتاز دانش ور اور مفکر تعلیم جناب پروفیسر سیّد محمد سلیم رقم طراز ہیں:

"قائداعظم کو تاریخ کے اس نازک موڑ پر جہاں ایک قدم کی لغزش صدیوں کی مسافت پیدا کر سکتی تھی، ایسی ٹیم کو ساتھ لے کر چلنا پڑا جو خود اُن کے بقول "کھوٹے سکے" تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ قائد کی رحلت کے بعد تحریک پاکستان کے عظیم الشان نصب العین کو بڑے حقیر مفادات کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ وہ ملک جو رنگ و نسل، علاقائیت اور لسانیت کی نفی کر کے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے فلسفۂ قومیت پر وجود میں آیا تھا، اس میں علاقائی، نسلی اور لسانی بنیادوں پر تنظیمیں قائم ہوئیں۔ قانون کی بالادستی خواب و خیال ہو کر رہ گئی۔ روپے پیسے کی اندھی ہوس نے اخلاقی اقدار کو پاؤں تلے روند ڈالا اور پاکستان کا مقصد وجود قوم کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ کیفیت وہ ہو گئی جسے قرآن حکیم نے: "ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس" (30: 41) کے معجزانہ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یعنی "زمین کی خشکی اور تری دونوں میں انسانوں کی پیدا کی ہوئی شرارتوں سے فساد پھیل گیا" اور خیر و فلاح کا راستہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ یہ درست ہے کہ اس زوال و انحطاط کے پس منظر میں اغیار کی منصوبہ بندی بھی کارفرما تھی لیکن اپنوں کی "حال مستی" اغیار کے ظلم سے دو چند ہو چکی ہے۔"(9)

جناب شریف فاروق کا یہ فرمان بھی درست معلوم نہیں ہوتا کہ جناح صاحب کو انھیں کھرا کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ جناح صاحب انیسویں صدی کے آخری عشرہ میں انگلستان سے اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس آئے۔ اس طرح ان کو کام کرنے کے لیے نصف صدی کا عرصہ میسر آیا۔ ہر شخص کو دنیا میں کچھ کرنے کے لیے اتنا ہی وقت ملتا ہے، شاید ہی کسی شخص کو اس سے زیادہ عرصہ نصیب ہوا ہو۔ اگر جناح صاحب نصف صدی میں اپنے ساتھیوں کی کردار سازی نہیں کر سکے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کو عرصہ کم ملتا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کام کے اہل ہی نہیں تھے۔

دوسروں کی کردار سازی کا کام تو صرف وہی شخص کرسکتا ہے جس کا اپنا کوئی کردار ہو کیونکہ کردار سازی کے لیے کوئی سکول نہیں کھولنا ہوتا، صاحب کردار شخص کو دیکھ دیکھ کراس کے ساتھ کام کرنے والوں کی کردار سازی ہوجاتی ہے۔

دنیا میں دوقسم کے لوگ سیاست میں حصہ لیتے ہیں۔ ایک قسم تو وہ ہے کہ ایک شخص کے ذہن میں کوئی ایسا پروگرام یا آئیڈیا جڑ پکڑتا ہے جو اس کے خیال میں اس کی قوم کے لیے یا اہلِ ملک کے لیے مفید ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر اس کی قوم یا ملک کے لوگ اس کے پروگرام یا آئیڈیا کو قبول کرلیتے ہیں تو اس سے وہ ترقی کرجائیں گے اور ملک وقوم کو قوت حاصل ہوجائے گی۔ چنانچہ وہ اپنے پروگرام کو اپنی قوم کے سامنے مسلسل پیش کرتا رہتا ہے۔ اس کی منزل اقتدار نہیں ہوتی، اس کو اس کی پروا بھی نہیں ہوتی کہ اس کے پروگرام یا آئیڈیا کو قبول کرنے والوں کی تعداد کیا ہے، کوئی سنے یا نہ سنے وہ اذان دیتا رہتا ہے۔ دوسری قسم کے وہ لیڈر ہیں جو سیاست میں حصہ صرف اور صرف اقتدار کے لیے ہی لیتے ہیں۔ حصولِ اقتدار کے لیے یہ حضرات کچھ بھی کرسکتے ہیں اور کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ہمارے دور میں کئی سیاستدان اس کی ایک نمایاں مثال ہیں۔

جناح صاحب نے بھی سیاست میں حصہ لینے کا پروگرام بنایا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی انھوں نے ملک وقوم کی فلاح کے لیے کوئی آئیڈیا conceive کیا تھا اور اس کو عملی شکل دینا چاہتے تھے۔ انھوں نے بھی اسی طرح سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا جس طرح ملک کے دوسرے اہل ثروت کا طرزِ عمل تھا، ان سب کا جذبہ محرکہ (Motive) خدمت ہرگز نہیں تھا، بلکہ حصولِ عزت، عظمت اور اقتدار تھا۔ جناح صاحب نے وکالت سے کافی مال کمانے کے بعد عملی سیاست کا آغاز انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت سے کیا جہاں ان کو خوب پذیرائی ملی، یہاں تک کہ وہ کانگریس کے صف دوم کے لیڈروں میں شمار ہونے لگے۔ جناح صاحب کانگریس میں رہتے ہوئے کبھی کانگریس کی صدارت تک نہ پہنچ سکے۔ کانگریس میں آغاز سے 1947ء تک کئی مسلمان عہدۂ صدارت تک پہنچے، مگر جناح صاحب اتنے بڑے آدمی نہ تھے، نہ اتنے بڑے لیڈر کہ عہدۂ صدارت تک پہنچ پاتے۔ بہرحال وہ کانگریس میں رہتے ہوئے جداگانہ انتخاب کے مخالف تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کہلاتے تھے۔ یہ ساری کوششیں جب کانگریس کی قیادت تک انھیں پہنچا نہ سکیں تو وہ جداگانہ انتخاب اور پھر تقسیم کے علمبردار بن کر سامنے آئے۔ کانگریس میں رہتے ہوئے

جناح صاحب وطنی قومیت کے نظریہ کے قائل تھے۔ جداگانہ انتخاب کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ جناح صاحب کے ابتدائی طرزِ سیاست کو ایک مؤلف نے اس طرح بیان کیا ہے:

"Because of the circumustances of his birth,early life and training,Jinnah began his political career as a liberal nationalist. He believed in and worked for the evolution of common Inidian nationality for sevral decades.On 13 August 1919,Jinnah was examined before the joint select committee on the Government of India Bill. The following dialogue took place between him and a member of the select committee, Major Ormsley Gore:

Major Ormsley Gore:`You said You spoke from the point of India.You speak really as an Indian nationalist."`

Jinnah: `yes I do.`

Major Ormsley Gore:`Holding that-view,do you contemplate the early disappearance of separate communal representation of the Mohammadan community.?``

Jinnah: ``I think so.``

Major Ormsley Gore:`That is to say, at earliest possible moment you wish to do away in political life with any distinction between Mohammadan

and Hindoos?'

Jinnah:`Nothing will please me more than when that day comes.'

In reply to other questions by Major Ormsley-Gore,Jinnah went on to remark:`In India, the Mohammadans have very few things really which you can call matters of special interest for them ... I really hope and expect that the day is not very far distant when these separate electorate will disappear,'

Again, while being examined by Lord Islington,another member of the select committee, Jinnah reiterated his beleif that separate-electorate would vanish very soon:

Lord Islington: ``You said just now about the communal representation ... that you hoped in a very few years you would be able to extinguish communal representaion ... you said you desired to see that, how soon do you think that happy state of affairs is likely to be realized?`

Jinnah: `I can give you certain facts ... which will give you some idea: that in 1913,at All India Moslem League sessions at Agra, we put this matter to the test ... and we got a division ...

based on provinces , ... and the division came to 40 in favour of doing away with the separate electorate, and 80 odd ... were for keeping the separate electorat.That was in 1913 since then I have had many opportunities of discussing this matter with various Mussalman leaders, and they are changing their angle of vision with regard to this matter.I cannot give you period,but I think it cannot last very long.Perhaps the next enquiry may hear something about it. ``

Lord Islington:`you think at the next enquiry Mahammadans will ask to be absorbed into the whole?`

Jinnah:`yes, I think the next enquiry will probably hear something about it.`(10)

ترجمہ: ''اپنے پیدائشی اور ابتدائی حالات اور تعلیم و تربیت کے زیر اثر جناح نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز ایک لبرل نیشنلسٹ کے طور پر کیا۔ کئی دہائیوں تک ایک مشترک ہندستانی قومیت کے تصور پر انھیں یقین رہا اور وہ اس کی ترویج کے لیے کام بھی کرتے رہے۔ 13 اگست 1919 کو وہ گورنمنٹ آف انڈیا بل کے مسئلہ پر حکومت کی ایک جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے سامنے پیش ہوئے۔ جناح اور کمیٹی کے ایک رکن Major Ormsley Gore کے درمیان درج ذیل مکالمہ ہوا:

Major Ormsley Gore: آپ کا کہنا ہے کہ آپ ہندستان کے نقطۂ نظر سے بات کر رہے ہیں۔ کیا آپ واقعی ایک ہندستانی قوم پرست کے طور پر بات کر رہے ہیں؟

مسٹر جناح: ہاں! ایسا ہی ہے۔

Major Ormsley Gore: اگر آپ کی رائے یہی ہے تو کیا آپ نے اس بات پر غور کیا ہے کہ (اس کے نتیجے میں) محمڈن لوگوں کی جداگانہ نمائندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

مسٹر جناح: میرا یہی خیال ہے۔

Major Ormsley Gore: گویا اپنی سیاسی زندگی میں آپ جلد از جلد یہ چاہیں گے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین کوئی تفریق باقی نہ رہے۔

مسٹر جناح: میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کا دن کوئی نہیں ہوگا۔

Major Ormsley Gore کے دیگر سوالات کا جواب دیتے ہوئے مسٹر جناح نے مزید کہا کہ ہندستان میں ایسی چیزیں بہت کم ہیں جنھیں مسلمانوں کے مخصوص معاملات قرار دیا جا سکے۔ میں امید اور خواہش کرتا ہوں کہ یہ جداگانہ حلقۂ ہائے انتخاب بہت جلد ختم ہو جائیں گے۔ بعدازاں کمیٹی کے ایک اور رکن Lord Islington کے سامنے پیش ہونے پر جناح نے پھر اپنے اس یقین کا اعادہ کیا کہ جداگانہ انتخابات جلد ختم ہو جائیں گے۔

Lord Islington: ابھی آپ نے فرقہ وارانہ نمائندگی کے بارے میں کہا...... کہ چند ہی برسوں میں آپ اسے ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ آپ نے کہا کہ یہ آپ کی خواہش ہے تو آپ کے خیال میں یہ خوشگوار صورتِ حال کب تک وقوع پذیر ہو سکے گی؟

جناح: میں آپ کے سامنے چند حقائق پیش کر سکتا ہوں...... جن سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا...... 1913 میں آل انڈیا مسلم لیگ کے آگرہ میں ہونے والے اجلاس میں ہم یہ معاملہ سامنے لائے...... اور ہمارے درمیان...... صوبوں کی بنیاد پر...... تقسیم موجود تھی۔ 40 جداگانہ حقِ نیابت کو ختم کرنے کے حق میں تھے اور تقریباً 80 اسے برقرار رکھنے کے حق میں۔ یہ صورتِ حال 1913ء کی تھی۔ اس وقت سے آج تک مجھے بہت سے مسلمان رہنماؤں سے اس موضوع پر گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے اور وہ اس

حوالے سے اپنا زاویۂ نظر تبدیل کر رہے ہیں۔ میں آپ کو کوئی معین وقت تو نہیں بتا سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ ہو سکتا ہے آئندہ انکوائری میں ہم اس حوالے سے کچھ سن سکیں۔

Lord Islington: گویا آپ کے خیال میں آئندہ انکوائری میں مسلمان یہ مطالبہ کریں گے کہ انھیں ہندستانی کُل میں جذب کر لیا جائے۔

جناح: ہاں میرا خیال ہے کہ آئندہ انکوائری میں یہ بات سننے کو ملے گی۔"

اب اس مکالمہ کو جناح صاحب کی اس تقریر کے ساتھ ملا کر مطالعہ کیجیے جو اس نے پاکستان کی پہلی قومی اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں کی تھی:

"You are free to go to your temples,you are free to go to your mosques or to any other place of worship in this State of Pakistan. you may belong to any religion or caste or creed ... that has nothing to do with the business of the state ... we are starting in the days when there is no discrimination, no distinction between one community and another."(11)

ترجمہ: "آپ اپنے مندروں میں جانے کے لیے آزاد ہیں۔ آپ اس مملکتِ پاکستان میں مسجدوں میں جانے کے لیے آزاد ہیں۔ آپ کسی دیگر عبادت گاہ میں جانے کے لیے آزاد ہیں۔ آپ کا تعلق کسی بھی مذہب، کسی بھی ذات، کسی بھی عقیدے سے ہو، کاروبارِ ریاست کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ ہم ایک ایسے دور کا آغاز کر رہے ہیں، جس میں کسی گروہ کو دوسرے کے مقابلے امتیاز یا تفریق کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔"

قاری کو جناح صاحب کے اس بیان میں جو اس نے 1919ء میں Select committee میں دیا تھا اور اس تقریر میں جو اس نے پاکستان کی پہلی قومی اسمبلی کے افتتاحی

اجلاس میں کی تھی کوئی فرق معلوم نہیں ہوگا۔1919ء میں بھی وہ مخلوط انتخاب کو پسند کرتے تھے اور مذہب کی بنا پر کسی امتیازی سلوک کے قائل نہیں تھے۔ پاکستان کی قومی اسمبلی میں تقریر سے بھی وہی کچھ ظاہر ہو رہا ہے۔ درمیانی عرصہ میں اگر جناح صاحب نے اسلام، مذہبی قومیت اور جداگانہ انتخابات کا موقف اختیار کیا تو اس لیے کہ وہ برصغیر کو تقسیم کروا کر انگریز کے خیر خواہ طبقات کے لیے ملک بنا کر دے سکیں اور اس ملک کا اقتدار حاصل کر سکیں۔ اپنی زندگی میں جاہ و منصب کے بلند ترین مقام کو حاصل کرنے کے بعد، جو ان کو کانگریس کے پلیٹ فارم کے ذریعے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا، حصولِ اقتدار کے بعد وہ اپنے اسی موقف پر واپس آ گئے جو ان کا ابتدائی موقف تھا اور جو ان کی ذاتی طرزِ زندگی سے بھی بالکل مناسبت رکھتا تھا۔ تمام تگ و دو صرف اور صرف اقتدار کے لیے نہ کہ اسلام کے لیے یا مسلمانوں کے مفاد کے لیے تھی۔ چنانچہ 1937ء کے الیکشن کے بعد جب جناح صاحب اور ان کے ہم نوا حضرات کو اقتدار میں حسبِ منشا حصہ نہ ملا تو انھوں نے انگریزوں سے معاملات طے کیے اور ہندو مسلم منافرت اور دو قومی نظریہ کی بنیاد پر الگ وطن کے لیے تحریک چلائی۔ ان کو علیحدگی میں ہی اقتدار کا حصول ممکن نظر آیا۔

"The turning point in Jinnah`s career came after the 1937 elections when Congress refused to share with him and his Moslem League the spoils of office in those Indian provinces where there was a substantial Moslem minority. Jinnah was a man of towering vanity and he took Congress`s action as a personal rebuke, It convinced him that the Moslim League would never get a fair deal from Congress-run India.The former apostle of Hindu-Moslem unity became the unyielding advocate of Pakistan, the project he had labelled `impossible dream

barely four years earlier."(12)

ترجمہ: ”جناح کے کیریئر میں فیصلہ کن تبدیلی اس وقت آئی جب 1937ء کے انتخابات کے بعد کانگریس نے جناح اور ان کی مسلم لیگ کو ان صوبوں میں شریکِ اقتدار کرنے سے انکار کر دیا جہاں ایک قابلِ ذکر مسلمان اقلیت موجود تھی۔ جناح ایک نہایت مغرور انسان تھے اور انھوں نے کانگریس کے عمل کو ذاتی توہین سمجھا اور یوں وہ شخص جو کبھی ہندو مسلم اتحاد کا سفیر تھا اب پاکستان کے قیام کا داعی بن گیا جبکہ اس منصوبہ کو چار سال قبل وہ خود ایک ناقابلِ حصول خواب قرار دے چکا تھا۔“

جناح صاحب کو متحدہ ہندستان میں اقتدار کی بندر بانٹ میں حسبِ منشا حصہ نہ ملا تو برصغیر کو تقسیم کروانے پر تُل گئے، جو برصغیر کے غیر مسلموں کے لیے بھی قابلِ قبول تھا، اور اس بات کی بالکل پروا نہیں کی کہ اس راستے میں برصغیر کے مسلمانوں کو کس قیامت سے گزرنا پڑے گا۔ جب تک وہاں ان کو اہمیت حاصل رہی وہ کانگریس میں شامل رہے۔ اس دوران میں ان کو ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کا خطاب بھی دیا گیا۔ مسٹر چھاگلا جناح صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"He(Jinnah)was the idol of youth. His personality and his sturdy independence attracted and appealed to the best elements in the city.He was president of the Home Rule League and had made stirring speeches in Shantaram chawl,wihch was the venue of political meetings ... so great was the enthusiasm of the people for Jinnah in those days that from contributions, made by rich and poor alike, they built a Hall, which they named after him."(13)

ترجمہ: ”وہ (یعنی جناح) نوجوانوں کے دیوتا تھے۔ ان کی شخصیت اور وقار شہر کے بہترین عناصر کو متاثر اور مرعوب کرتا تھا۔ وہ ہوم رول لیگ کے صدر تھے اور سیاسی

سرگرمیوں کے مرکز شانتا رام چال میں زبردست تقریریں کر چکے تھے۔ اس زمانے میں جناح کے ساتھ لوگوں کی وابستگی اس قدر زیادہ تھی کہ انھوں نے شہر کے امیروں غریبوں سے چندہ جمع کر کے ان کے نام پر ایک ہال تعمیر کیا۔"

جو لوگ ذاتی جاہ و منصب اور صرف اقتدار کی آرزو کے لیے سیاست میں حصہ لیتے ہیں وہ اس سفر میں آگے بڑھنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ کسی سے بھی سمجھوتا کر سکتے ہیں اور کوئی بھی اصول پامال کر سکتے ہیں۔ جناح صاحب نے بھی ایسا ہی کیا۔ اپنے مقصد کے لیے انھوں نے انگریز کی مدد لینے سے بھی گریز نہ کیا۔

1937 کے الیکشن کے بعد کانگریس نے مسلمان ممبران اسمبلی کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لیے کانگریس کی قیادت نے جناح صاحب سے رابطہ کیا تو انھوں نے مذاکرات کے لیے یہ شرط رکھ دی کہ پہلے کانگریس تسلیم کرے کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور یہ کہ کانگریس ایک قومی جماعت نہیں، بلکہ صرف ہندوؤں کی نمائندگی کرتی ہے۔ پھر کیا ہوا۔ ڈاکٹر عائشہ جلال لکھتی ہیں:

"Congress saw no reason to make a concession which cut against the very basis of its creed, and so Jinnah turned to British. a last resort for so dedicated a nationalist who had devoted his political life to battling against the alien rulers. In August 1938,he asked to meet Lord Brabourne, the acting viceroy,and hinted a deal by which the League might support the British at the centre, if in return,the British accepted the League as the spokesman of the Muslims. According to Lord Brabourne,Jinnah had ended up with the suggestion that we (the

British)should keep the centre as it is now and that we should make friends with Muslims,by protecting them in the Congress provinces,and if this was done,the Muslims would protect us at the centre Jinnah himself confessed that, if the Leage `s interest so demanded,he was ready to be the ally of even the devil..`(14)

ترجمہ: "کانگریس کوئی ایسی رعایت دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی تھی جو اس کے بنیادی نظریے ہی کے خلاف ہو۔ سو جناح نے برطانیہ سے رجوع کر لیا۔ غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف سیاسی جدوجہد کرنے والے اس وطن پرست کے لیے یہ آخری چارۂ کار تھا۔ اگست 1938ء میں انھوں نے قائم مقام وائسرائے Lord Brabourne سے ملاقات کی اور ایک ڈیل کا عندیہ دیا کہ اگر انگریز مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کر لیں تو مسلم لیگ مرکز میں ان کی حمایت کر سکتی ہے۔ Lord Brabourne کا بیان ہے کہ جناح کی گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ ہمیں مرکز میں صورتِ حال کو جوں کا توں رکھنا چاہیے اور مسلمانوں کو کانگریسی صوبوں میں تحفظ دے کر اپنا دوست بنانا چاہیے۔ اور اگر ایسا ہو جائے تو مسلمان مرکز میں ہمیں تحفظ دیں گے۔ جناح نے خود اعتراف کیا کہ اگر لیگ کے مفاد کا تقاضا ہو تو وہ شیطان کا اتحادی بننے کے لیے بھی تیار ہے۔"

جناح صاحب نے اپنی آرزوئے اقتدار کی تکمیل کے لیے انگریز حکمرانوں کا تعاون حاصل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ یہ ہے اس پراپیگنڈے کی حقیقت جو جناح صاحب کی اصول پرستی کے بارے میں کیا جاتا ہے۔

اپنی تمام سیاسی تگ و دو میں جناح صاحب نے نہ تو کبھی اپنا لباس میلا ہونے دیا نہ کبھی کوئی ایسا کام کیا کہ حکومت اسے جیل بھیج دیتی۔ اگر جناح صاحب نے حکومت پر تنقید کرنے کی ضرورت محسوس کی بھی تو بالعموم اسمبلی کے اندر ہی تنقید کی جس پر گرفت نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر کیا ہوا کہ

قومی سیاست اور کانگریس کا پلیٹ فارم چھوڑ کر جناح صاحب نے اپنی سیاست کو مسلمانوں اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم تک محدود کر لیا؟ حالانکہ موصوف کا کوئی مذہبی پس منظر نہیں تھا۔ پیدائشی آغا خانی ہونے کی وجہ سے اسلام سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی نہ ہو سکتی تھی۔ ذاتی زندگی میں ان کا کوئی مذہب تھا ہی نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ موصوف نے قومی سیاست کو خیر باد کہہ کر اور وطنی قومیت کے نظریے کو ترک کر کے فرقہ وارانہ سیاست شروع کر دی اور مذہبی قومیت کے علم بردار بن گئے؟ موصوف میں اس انقلابی تبدیلی کی وجہ ہمیں چھاگلا صاحب سے معلوم ہو جاتی ہے۔ وہ بتاتے ہیں:

Why did Jinnah change? There could be many possible explanations for this, Jinnah`s besetting fault was his obsessive egoism.He had to be a Leader and prime mover in what-ever cause he worked. With the emergence of Gandhi in Indian politics,Jinnah felt that his importance would gradually diminish ... He could not possibly give up his faultlessly tailored suits and his high collars for simple khadi which Gandhi wanted."(15)

ترجمہ: ''جناح کیوں تبدیل ہوئے؟ اس بات کی بہت سی وضاحتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ جناح کی ایک مستقل خامی ان کی حد سے بڑھی ہوئی انا تھی۔ وہ جو بھی کام کرتے، اس میں ان کا ایک رہنما اور بنیادی شخصیت ہونا لازم تھا۔ ہندستانی سیاست میں گاندھی کے ظہور سے جناح کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اب ان کی اہمیت کم ہوتی چلی جائے گی...... گاندھی جس کھدر کا مطالبہ کرتے تھے، جناح اس کے لیے اپنے بہترین سلے ہوئے سوٹ اور اونچے کالر نہیں چھوڑ سکتے تھے۔''

گاندھی نے تمام کانگریسی حضرات کے لیے لازم کر دیا کہ وہ صرف دیسی کھدر کا لباس

استعمال کریں۔ وہ خود بھی کھدر ہی پہنتا تھا اور دوسرے کانگریسی لیڈروں نے بھی گاندھی کی ہدایت کی تعمیل کرتے ہوئے کھدر کا ہی استعمال شروع کر دیا۔ جناح صاحب کے لیے تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ آکسفورڈ کے درآمد شدہ تھری پیس سوٹ کی جگہ کھدر کا کرتا پاجامہ زیب تن کرتے۔ اس لیے ان کو یقین ہو گیا کہ اب کانگریس میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اب سیاسی میدان میں کوئی مقام حاصل کرنے کے لیے ان کے پاس صرف اور صرف مسلم لیگ کا پلیٹ فارم ہی رہ گیا تھا۔ چھاگلا صاحب لکھتے ہیں:

"After he was dropped from Third Round Table Conference, Jinnah became convinced that if he had to have a place under the sun, he would have to stand on a communal platform.Jinnah`s transformation really began when it seemed to him that he was beginning to be considered as a man of no consequance-so much so that he could not find a place in Third Round Table Conference."(16)

ترجمہ: ''تیسری گول میز کانفرنس میں نظر انداز کر دیے جانے کے بعد جناح کو یقین آ چکا تھا کہ اگر وہ اپنے لیے کوئی مقام بنانا چاہتے ہیں تو انھیں فرقہ وارانہ سیاست کے میدان میں آنا ہوگا۔ جناح (کی شخصیت) میں آنے والی تبدیلی کا آغاز اس وقت ہوا جب انھیں یہ اندازہ ہوا کہ انھیں ایک غیر اہم شخص سمجھا جا رہا ہے، یہاں تک کہ انھیں تیسری گول میز کانفرنس میں بلانے کے قابل بھی نہیں سمجھا گیا۔''

جناح صاحب، وقار اور اقتدار کے اگرچہ شدید آرزومند تھے، لیکن کسی ایسی تحریک میں حصہ لینے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے جس میں ان کا Flawlessly tailored لباس شکن آلود ہو جائے یا ان کے جوتے پر مٹی پڑ جائے اور نہ ہی کوئی ایسا قدم اٹھانے کے لیے تیار تھے کہ انگریز حکومت سے ان کا اس حد تک تصادم ہو جائے کہ جیل جانے کی نوبت آ جائے۔ لیکن گاندھی کے

1920ء کے قریب برصغیر میں واپس آنے کے بعد انڈین نیشنل کانگریس کی پالیسی میں تبدیلی آ چکی تھی اور اس نے برصغیر کی مکمل آزادی کو اپنی منزل بنا لیا جس نے جناح صاحب کے لیے کانگریس کے پلیٹ فارم سے سیاست میں حصہ لینا مشکل بنا دیا۔ جناح صاحب اور گاندھی کی شخصیات بالکل ایک دوسرے کی ضد تھیں۔

"Jinnah was no more a maulana than a mahatma and could no sooner have relinquished his elegant legal chambers and clubs for village or prison life than Gandhi could have abandoned spinning to start a probate practice,The pattern of both personalities were by then set too firmly in fundamentally different moulds to be altered without mortal damage."(17)

ترجمہ: ”جناح نہ مولانا تھے اور نہ مہاتما اور جس طرح گاندھی کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ چرخہ کاتنا چھوڑ کر دیوانی مقدمات کی پیروی شروع کر دیں، اسی طرح جناح کے لیے بھی اپنا عالیشان دفتر اور کلب چھوڑ کر دیہات یا جیل کی زندگی اختیار کرنا ممکن نہیں تھا۔ دونوں شخصیات نہایت پختگی کے ساتھ دو مختلف قسم کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی تھیں، جنھیں توڑا تو جا سکتا تھا تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔“

اب اگر جناح صاحب کانگریس سے وابستہ رہتے تو ان کے لیے لازم تھا کہ اس جماعت کے پروگرام (جواب ”مکمل آزادی“ تھا) کے لیے کام کرتے جس میں نہ صرف ولایت کے سلے ہوئے سوٹ ترک کر کے کھدر کا لباس زیب تن کرنا پڑتا، بلکہ جیل جانے کے کافی سے بھی زیادہ امکانات تھے۔ جناح صاحب نے کوشش تو کی کہ مکمل آزادی کے مطالبہ کے بارے میں کانگریس کی قیادت زیادہ سخت موقف اختیار نہ کرے۔ کانگریس کے علاوہ ایک اور تنظیم بھی ہوم رول لیگ (Home Rule Leage) کے نام سے نرم روی کے ساتھ آزادی کے لیے جدوجہد کر رہی تھی جس کی قیادت میں جناح صاحب کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ بمبئی میں اس جماعت کا ایک

اجلاس ہوا جس کی صدارت گاندھی نے کی۔ اس اجلاس میں جناح صاحب بھی شریک ہوئے۔ اس میں کیا ہوا:

"From Calcutta, both Jinnah and Gandhi went by rail to Bombay, to attend a Home Rule League(Swaraj Sabha)meeting there on Octuber 3,1920.Gandhi chaired that meeting and proposed change in Annie Besant`s former orgnization`s constitution to bring its goals more fully into line with his satiyagraha compaign --to secure complete sawaraj for India according to the wishes of Indian people.Jinnah argued against the motion insisting that ``attainment of self -government within British Commonwealth ... by constitutional methods`` remained Sabha`s best goal and the only one he could accept.Gandhi remarked that anyone was "free to resign"from the Sabha who could not accept the majority`s decision.Only sixty one members attended that meeting, which had been called at short notice, but less than one-third, eighteen, agreed with Jinnah,including his loyal Bombay Parsi lieutenants the brohters Jamnadas and Kanji Dwarkadas. The defeated minority left the meeting and before month's end, Jinnah wrote

"with great sorrow"to resign from the (Home Rule) League he had once led."(18)

ترجمہ: ''13 اکتوبر 1920 کو بمبئی میں منعقد ہونے والے ہوم رول لیگ (سوراج سبھا) کے اجلاس میں شرکت کے لیے جناح اور گاندھی دونوں ریل کے ذریعے کلکتہ سے بمبئی پہنچے۔ گاندھی نے اس اجلاس کی سربراہی کی اور تجویز پیش کی کہ اینی بسنت کی سابقہ تنظیم (ہوم رول لیگ) کے آئین میں تبدیلی کی جائے تاکہ ان کی ستیہ گرہ تحریک کے ساتھ زیادہ مطابقت پیدا کی جا سکے...... ہندستانی عوام کی خواہشات کے مطابق ہندستان کی مکمل آزادی کے حصول کی خاطر، جناح نے اس تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ برطانوی دولتِ مشترکہ کے اندر رہتے ہوئے...... آئینی طریقوں سے...... حکومتِ خوداختیاری کا حصول ہی سبھا کے لیے بہترین مقصد تھا اور صرف اسی کی وہ حمایت کر سکتے تھے۔ گاندھی نے کہا کہ جسے بھی اکثریت کے فیصلے سے اتفاق نہ ہو وہ استعفاء دینے کے لیے آزاد ہے۔ جلدی میں بلائے جانے والے اس اجلاس میں صرف 61 ارکان نے شرکت کی تھی۔ ان میں ایک تہائی سے بھی کم تعداد یعنی اٹھارہ نے جناح کی حمایت کی اور اجلاس سے اُٹھ کر چل دیے۔ ان میں جناح کے وفادار پارسی ساتھی، بمبئی کے جمناداس اور کانجی دوارکاداس بھی شامل تھے۔ شکست خوردہ اقلیت اجلاس سے باہر آ گئی اور مہینے کے ختم ہونے سے پہلے جناح نے ''نہایت افسوس کے ساتھ'' اس (ہوم رول) لیگ سے استعفاء دے دیا، جس کی وہ کبھی قیادت کر چکے تھے۔''

اس طرح جناح صاحب نہ صرف کانگریس سے بلکہ ہوم رول لیگ سے بھی باہر آ گئے۔

کیونکہ برصغیر کی مکمل آزادی کے لیے کام کرنا ان کے لیے اس طرزِ زندگی کے ساتھ جس کے وہ عادی تھے جسے ترک کرنا بھی ان کے بس میں نہ تھا ان کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ اس لیے جناح صاحب نے یکم مئی 1947 کو وائسرائے سے ایک ملاقات میں بڑے فخر سے کہا:

''تمام مسلمان شروع ہی سے برطانیہ کے وفادار رہے ہیں۔ ہم نے فوج میں بڑے تناسب سے حصہ ڈالا جس نے دونوں جنگیں لڑیں۔ ہمارا کوئی راہنما برطانیہ سے

عدم وفاداری کی بنا پر کبھی جیل نہیں گیا۔ مسلم لیگ کا کوئی ممبر آئین ساز اسمبلی کے اس اجلاس میں شریک نہیں تھا جس میں کانگریس نے ہندستان کو آزاد اور خودمختار ریاست بنانے کا ریزولیشن پاس کیا۔ درحقیقت ہم میں سے کسی ایک نے بھی ایسی حرکت نہیں جس کی پاداش میں ہم کو سلطنت سے باہر نکال دیا جائے۔''(19)

جب کانگریس کے ساتھ ہم قدم رہنا جناح صاحب کے لیے ناممکن ہو گیا اور اس بات کی بھی امید نہ رہی کہ جناح صاحب کو کانگریس کے اندر وہ مقام حاصل ہو سکے گا جو گاندھی کے آنے سے قبل ان کو حاصل ہونے کا امکان تھا۔ آرزوئے اقتدار سے دستبردار ہونا بھی جناح صاحب کے لیے ممکن نہ تھا۔ جناح صاحب نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے دوسرا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ وہ متحدہ قومیت کو ترک کر کے دوقومی نظریہ کے اور وطنی قومیت کی جگہ مذہبی قومیت کے علم بردار بن گئے۔ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر میں '' متحدہ ہندستان میں اقتدار حاصل نہیں کر سکتا تو ملک کو تقسیم کروا کر اس کے چوتھائی حصہ کا حکمران بن جاؤں''۔ تقسیم کے بارے میں ہر صاحبِ بصیرت شخص یہ کہہ رہا تھا کہ اس کے نتیجے میں قتلِ عام ہوگا یہاں تک کہ پنجاب کے وزیرِاعلیٰ سکندر حیات نے بھی گورنر پنجاب کے سیکرٹری Mr. Moon سے، جب اس نے پاکستان کا ذکر کیا یہ کہا کہ:

"I do hope I won`t hear you talk like this again. Pakistan would mean a massacre"(20)

ترجمہ: ''مجھے امید ہے کہ آپ دوبارہ اس قسم کی بات نہیں کریں گے۔ (قیامِ) پاکستان کا مطلب قتلِ عام ہوگا۔''

میں نے ایک جیالے دانش ور سے سوال کیا کہ اگر برصغیر کے مسلمانوں کو معلوم ہو جاتا کہ پاکستان کے حصول کے لیے ان کو پندرہ لاکھ مسلمان قتل کروانے پڑیں گے اور تقریباً نوے ہزار مسلمان عورتیں بے آبرو کروانا پڑیں گی تو کیا برصغیر کے مسلمان پاکستان کے لیے یہ قیمت ادا کرنے پر تیار ہو جاتے؟ ان کا جواب ایک بہت بڑا ''نہیں'' تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنے بھولپن یا لاعلمی کی وجہ سے برصغیر کے مسلمانوں نے پاکستان کو قبول کیا۔

بہرحال جب ہر شخص یہ کہہ رہا تھا کہ برصغیر کی تقسیم کے نتیجے میں وسیع پیمانے پر قتلِ عام ہوگا تو

جناح صاحب وائسرائے کے معاون Lord Ismay سے کہہ رہے تھے:

"Mr. Jinnah said with the greatest earnestness that once partition had been decided upon, every one would know exactly where they were,all trouble would cease, and they would live happily ever after."(21)

ترجمہ: ''مسٹر جناح نے پورے خلوص کے ساتھ کہا، جب ایک مرتبہ تقسیم کا فیصلہ ہو گیا تو ہر کسی کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کہاں کھڑا ہے، تمام جھگڑے ختم ہو جائیں گے اور پھر سب لوگ اس کے بعد ہمیشہ ہنسی خوشی سے رہیں گے۔''

ستم ظریفی یہ ہے کہ جناح صاحب جب وائسرائے کے معاون سے یہ بات کہہ رہے تھے۔ اس وقت بھی پورے ملک میں آگ لگی ہوئی تھی، جگہ جگہ فسادات ہو رہے تھے، لیکن حرام ہے کہ تاریخ کے اس ''عظیم ترین لیڈر'' نے کبھی کسی فساد زدہ علاقے کا دورہ کیا ہو یا ہسپتال جا کر کسی زخمی کی عیادت کی ہو کیونکہ ایسا کرنے میں ان کے لباس میں شکن پڑ سکتی تھی اور ان کے جوتے پر مٹی پڑ سکتی تھی۔ اب یا تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جناح صاحب حمیت و بصیرت سے بالکل فارغ تھے یا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ برصغیر کے پچیس فیصد سے بھی کم علاقہ کا گورنر جنرل بننے کے لیے وہ اس قدر حریص تھے کہ ان کو اس کی پروا ہی نہیں تھی کہ ان کی آرزوئے اقتدار کو پورا کرنے کے لیے برصغیر کے مسلمانوں کو کیا قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں پندرہ لاکھ مسلمان قتل اور نوے ہزار مسلمان عورتیں بے آبرو ہو گئیں تو کیا ہوا۔ جناح صاحب نے سفید گھوڑوں والی بگھی میں بیٹھ کر شاہانہ جلوس کے ساتھ جا کر گورنر جنرل کا حلف تو اٹھا لیا اور تاج برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے تیرہ ماہ تک برصغیر کے تیئس فیصد رقبے پر حکومت کر کے تاریخ میں پاکستان کے پہلے حکمران کا اعزاز تو حاصل کر لیا۔

میں یہ ذکر تو کر ہی چکا ہوں کہ ذاتی زندگی میں جناح صاحب کا کوئی مذہب تھا ہی نہیں۔ مذہب سے لگاؤ کا جس حد تک بھی جناح صاحب اظہار کرتے تھے وہ صرف سیاسی ضرورت کے لیے کرتے تھے۔ برصغیر کی قومی سیاست سے دستبرداری اور کانگریس کے پروگرام (مکمل آزادی)

سے علیحدگی کے بعد جناح صاحب نے اپنی سیاست کو مسلمانوں تک محدود کر لیا تھا۔ اس لیے یہ ان کی مجبوری تھی کہ وہ گاہے بگاہے اپنی زبان سے اسلام کا نام لیتے رہیں اور مجاہد اسلام ہونے کے مدعی بنے رہیں۔ اسلام سے جناح صاحب کا تعلق صرف نام کی حد تک تھا ورنہ وہ تو اسلام کے بنیادی عقائد تک سے آگاہ نہیں تھے۔ کرۂ ارض کا ہر مسلمان جناح صاحب کی زندگی میں بھی اور آج بھی یہ جانتا ہے کہ ختم نبوت اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اور یہ کہ نبوت نبی اکرم ﷺ پر ختم ہے۔ حضورؐ آخری نبی ہیں۔ ان کی بعثت روئے زمین کے تمام انسانوں کے لیے ہے آپ کا دور نبوت تا قیام قیامت ہے۔ آنحضورؐ کے بعد اگر کوئی شخص (خواہ وہ مسیلمہ کذاب ہو یا مسیلمہ پنجاب) نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تو انڈونیشیا سے لیکر مراکش تک اور ڈغاسکر سے لے کر کرغیزستان تک پوری امت مسلمہ متفق ہے کہ ایسا شخص کافر اور غیر مسلم ہے۔ اس پر ایمان لانے والے بھی کافر ہیں۔ اس مسئلہ پر امت مسلمہ نے اپنی پوری تاریخ میں کبھی کوئی نرمی (Relaxation) نہیں دکھائی۔ ختم نبوت کا عقیدہ امت مسلمہ کی اساس ہے اور ہر مسلمان اس عقیدہ کے تحفظ کے لیے جان تک قربان کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ برصغیر میں برطانوی تسلط کے بعد انیسویں صدی کے نصف آخر میں پنجاب کے ایک گاؤں قادیان کے انگریز کے حامی اور خیر خواہ ایک جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھنے والے شخص مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ اس نے یہ دعویٰ کیوں کیا اور کس کے ایما پر کیا۔ اس کے کیا محرکات تھے۔ یہ ایک الگ موضوع ہے۔ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ہندستان میں اس وقت حکومت انگریزوں کی تھی جو مذہباً عیسائی تھے۔ ان کو نہ تو مسلمانوں سے ہمدردی تھی اور نہ ہی مسلمانوں کے عقائد سے ان کو کوئی دلچسپی تھی۔ انگریزوں کو صرف اس سے غرض تھی کہ ملک میں امن و امان قائم رہے۔ انگریزی حکومت کے تحفظ اور کچھ دیگر وجوہات کی بنا پر مرزا غلام احمد قتل سے محفوظ رہے اور ان کے پیروکار بھی۔ برصغیر میں انگریزوں کے دور حکومت میں بھی اس کے بعد بھی مسلمان یہ جدوجہد کرتے رہے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم ڈکلیر کیا جائے۔ علامہ اقبال مرحوم بھی، جو اگرچہ جدید تعلیم سے بہرہ ور تھے، انھوں نے انگلینڈ سے بار ایٹ لا اور جرمنی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کی تھیں، زندگی بھر قادیانیوں کو غیر مسلم ڈکلیر کیے جانے کا مطالبہ کرتے رہے، لیکن قربان جائیں جناح صاحب کے کہ مجاہد اسلام کے مدعی ہونے کے باوجود قادیانیوں کو مسلمان تصور کرتے تھے۔ 27 مارچ 1939ء کو ہندستان کی مرکزی اسمبلی میں تقریر

کرتے ہوئے جناح صاحب نے کیا کہا، وہ سن لیجیے۔ جناح صاحب فرماتے ہیں۔

''اس موضوع پر مزید کہنے سے قبل میں اپنی اور اپنی پارٹی کی طرف سے آنریبل سر محمد ظفر اللہ خاں کو ہدیۂ تبرک پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ مسلمان ہیں اور یوں کہنا چاہیے کہ میں گویا اپنے بیٹے کی تعریف کر رہا ہوں۔'' (22)

مسائل کی جس دلدل میں پاکستان کے مسلمان پھنس چکے ہیں تو یہ اتفاق نہیں ہے جس قیادت کی پیروی برصغیر کے مسلمانوں نے کی تھی اس کا یہی نتیجہ ہوسکتا ہے۔

برصغیر کے ان علاقوں، جو کسی صورت میں بھی پاکستان کا حصہ نہیں بن سکتے تھے، کے مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے جناح صاحب نے یہ نعرہ لگانا شروع کر دیا تھا کہ پاکستان میں قرآن وسنت پر مبنی نظام حکومت ہوگا۔ 23 مارچ 1940ء کے بعد جب بھی جناح صاحب سے پاکستان میں نظام حکومت کے بارہ میں سوال کیا گیا تو جناح صاحب نے یہی جواب دیا کہ پاکستان کا نظامِ حکومت اسلامی ہوگا۔ مثال کے طور پر اسلامیہ کالج، پشاور میں 25 نومبر 1945ء کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

''مسلم لیگ اس بات کی قائل ہے کہ ہند میں جہاں مسلمانوں کی عددی اکثریت ہے ایسی ریاستیں تشکیل دے دی جائیں جہاں مسلمان اسلامی قانون کے تحت حکومت کر سکیں۔''

'' آیئے۔ ہم واپس چلیں اور اپنی کتاب مقدس قرآن کریم اور حدیث اور اسلام کی عظیم روایات سے رجوع کریں جن میں ہماری رہنمائی کے لیے ہر چیز موجود ہے۔ ہم ان کی درست طور پر تاویل وتعبیر کریں اور اپنی عظیم کتاب مقدس قرآن کریم کا اتباع کریں''۔ (23)

سوال یہ ہے کہ جناح صاحب جو کچھ بھی کہہ رہے تھے، کیا وہ اس میں مخلص تھے، اس کا جواب ''نہیں'' کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا ہے۔ اگر وہ مخلص تھے تو جوگندر ناتھ منڈل کو پاکستان کا وزیر قانون کبھی نہ بناتے۔ اس سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ جناح صاحب 14 اگست 1947ء سے قبل اسلام کے بارے میں جو کچھ بھی کہہ رہے تھے، وہ صرف سیاسی ضرورت کے لیے تھا۔ ایک بات طے شدہ ہے کہ منافقت کبھی سرخرو نہیں ہوسکتی۔ پاکستان کے حالات اس کے گواہ ہیں۔

جناح صاحب کی کتاب زندگی کے مطالعہ سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ان کی تمام تگ ودو میں جو جذبہ، محرکہ (Motive) کام کر رہا تھا وہ ذاتی جاہ وعظمت کا حصول تھا، نہ کہ مسلمانوں کی یا اسلام کی خدمت۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سندھ کے صحراء میں چند ایکڑ بھی قبول کرنے کے لیے تیار تھے بشرطیکہ وہ صرف ان کے اپنے ہوں۔ ذاتی جاہ ومنصب کا حصول جب تک جناح صاحب کو انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے ممکن نظر آیا، وہ متحدہ قومیت کے علم بردار بن کر کانگریس کے ساتھ رہے۔ جب وہاں سے مایوس ہوگئے تو الٹی زقند لگا کر مذہبی قومیت کے اور دو قومی نظریہ کے علمبردار بن کر جو کچھ حاصل کرنا چاہتے تھے کر لیا۔ بعد ازاں دوبارہ وطنی قومیت کے علم بردار بن گئے جس کی گواہی ان کی وہ تقریر ہے جو جناح صاحب نے پاکستان کی پہلی قومی اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں کی تھی۔

میرا صاحب اولاد اور اہل دل حضرات سے سوال ہے کہ فرض کیجیے آج بھارت کی حکومت اہل پاکستان سے یہ کہے کہ اس وقت جتنا رقبہ پاکستان کا ہے اتنا ہی رقبہ بھارت پاکستان کو مزید دینے کے لیے تیار ہے، شرط صرف یہ ہے کہ اس کے لیے اہل پاکستان کو تقریباً پندرہ لاکھ مسلمان قتل کروانے پڑیں گے اور کم وبیش نوے ہزار مسلمان عورتیں بے آبرو کروانا پڑیں گی تو کیا اہل پاکستان اس سودے کو منظور کرلیں گے؟ اس کا جواب ''نہیں'' کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اگر اب یہ سودا قبول نہیں تو جناح صاحب نے 1947ء میں اس کو کیوں قبول کرلیا تھا؟ اس ڈیل پر صاحب بہادر کی تحسین کی جائے گی؟ نہیں قطعاً نہیں، بلکہ حشر کے روز ان سے لاکھوں مسلمانوں کی جان کا اور ہزاروں مسلمان عورتوں کی آبرو کا قصاص لیا جائے گا!



حوالہ جات

(1) روزنامہ جنگ لاہور/11 جولائی 2008ء

(2) برصغیر کیسے ٹوٹا؟/عارف میاں/براڈلے پبلی کیشنز، لاہور/2009ء/ص:92

(3) قائداعظمؒ- اعتراضات اور حقائق/منیر احمد منیر/مکتبہ آتش فشاں، لاہور/2010ء/ص:155

(4) گم گشتہ قوم (خودنوشت آپ بیتی)/سردار شوکت حیات خاں/جنگ پبلشرز، لاہور/اشاعت اوّل: 1995ء/ص:232-33

(5) آزادی کی کہانی، میری زبانی/سردار عبدالرب نشتر (مرتبہ: آغا مسعود حسین)/طاہر نیوز ایجنسی، کراچی/س،ن/ص 182

(6) روزنامہ جنگ لاہور، 21 اگست 2009ء

(7) روزنامہ جنگ لاہور، 15 مئی 2009ء

(8) سہ روزہ مدینہ بجنور/4 مئی 1946ء

(9) ماہنامہ افکار معلم لاہور/دسمبر 1994ء، ص 9

(10)Towards India`s Freedom and Partition page 325-326-327 by S.R.Meehotra

(11)Jinnah of Pakistan page 339 by Stanley wolpert

(12)Freedom at midnight page 127 by Lorry Collins and Dominique Lapiare.

(13)Roses in December page78 by M.C.Chagla.

(14)The sole spokesman page45

(15)Roses in December page 79 by M.C.Chagla

(16)Roses in December page 80 by M.C. Chagla

(17)Jinnah of Pakistan page 68 by Stanley wolpert

(18)Jinnah of Pakistan page 70 Stanley wolpert

(19) تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار (آخری وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کا عہد 22 مارچ 1947ء تا اگست 1947ء)/ترجمہ: محمد فاروق قریشی/ص:447

(20)The Great Divide page 83 by H.V.Hudson

(21)The Great Divide page 229 by H.V.Hudson

(22) ہماری قومی جدوجہد/عاشق حسین بٹالوی/ص:318

(23) قائداعظم: تقاریر و بیانات (حصہ سوم)/مرتبہ: اقبال احمد صدیقی/ص:72

25

تحریک پاکستان کے دوران جناح نے برصغیر کے مسلمانوں سے اسلامی ریاست کی تشکیل اور اسلامی قوانین کے تحت حکومت قائم کرنے کا جو وعدہ کیا تھا، وہ محض دھوکا اور فریب تھا۔ وہ صرف اپنے سیاسی مقاصد کے لیے اسلام کا نام استعمال کر رہے تھے۔ جناب سلمان علی درست لکھتے ہیں:

''جناح اپنی نجی زندگی میں تو یقیناً سیکولر، لبرل اور آزاد خیال تھے، لیکن وہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے مذہب کو استعمال کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔''(1)

جناح صاحب نے ایسا ہی کیا۔ وہ قطعاً نہیں چاہتے تھے کہ پاکستان اسلامی ریاست بنے اور اس میں اسلامی قوانین کا نفاذ ہو۔ اگر وہ اس میں مخلص ہوتے اور انھیں اپنے وعدے کا پاس ہوتا تو وہ گورنر جنرل کی حیثیت سے پاکستان کو اسلامی ریاست قرار دے سکتے تھے۔ اس میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا اعلان بھی کر سکتے تھے۔ انھیں عہدہ بھی ملا، موقع بھی ملا اور مہلت بھی ملی۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ جناح صاحب کے رفیق خاص، ریاست قلات کے والی اور بھٹو دور میں گورنر بلوچستان جناب نواب احمد یار خاں بتاتے ہیں:

''جب پاکستان قائم ہو چکا تو قائداعظم نے مجھے کراچی بلایا۔ میں 22 دنوں تک ان کا مہمان رہا۔ اس قیام کے دوران میں قائداعظم نے فرمایا کہ: ''میں اس ملک کا چلانے والا نہیں ہوں۔'' خدا گواہ ہے وہ کہتے تھے: ''دیکھو خان! میرے عزیز نوجوان! میں

اب بوڑھا ہو چکا ہوں، تم آؤ اور میری مدد کرو۔ اس ملک کو چلانے کے لیے قابل آدمیوں کی ضرورت ہے۔'' اس کے جواب میں مَیں نے قائداعظم سے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو پھر میری کچھ شرائط ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ الیکشن کرادیں، انتخابات آپ کی زندگی میں ہو سکتے ہیں بعد میں نہیں۔ پاکستان کا آئین بنادیں اور پاکستان کو اسلامی ریاست قرار دے دیں۔ یہ سن کر قائداعظم نے فرمایا کہ: ''یہ میں کیسے کرسکتا ہوں۔'' اس پر میں نے کہا کہ جس طرح میں نے اپنی ریاست قلات میں کیا ہے، میری ریاست میں اسلام ہے، میں دس سال سے اسے چلا رہا ہوں۔ آپ بھی اسی طرح کریں۔ یہ سن کر قائداعظم بولے کہ: ''وہ آپ کی ریاست ہے۔ پاکستان میری ریاست نہیں ہے۔ پاکستان میں مختلف الخیال لوگ ہیں، ان کی اپنی ایک آئین ساز اسمبلی ہے۔ اسمبلی کو آئین سازی کا پورا اختیار ہے، مجھے اختیار نہیں ہے، البتہ اسمبلی جو قانون چاہے بنائے۔ یہ اس کا دائرۂ اختیار ہے۔'' جواباً میں نے کہا کہ آپ کی موجودگی میں آئین بن سکتا ہے، آپ کے بعد یہ ناممکن ہے، آپ کے بعد کوئی جناح پیدا نہیں ہوگا۔ اس گفتگو کے بعد پھر قلات واپس چلا آیا۔''(2)

جناح صاحب نے نواب آف قلات سے گفت گو میں جو عذر پیش کیے وہ دراصل ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' کا مصداق تھے۔ تحریک پاکستان میں جو عوام اور علما شامل تھے بے شک وہ مختلف الخیال تھے، لیکن وہ سب اسلامی ریاست چاہتے تھے، اسلامی قوانین کا نفاذ چاہتے تھے۔ پوری تحریک میں جو نعرہ کثرت سے لگایا گیا وہ ''پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ'' تھا۔ افسوس کہ انھوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے ایک گمراہ اور بے دین لیڈر کا انتخاب کیا جو قطعاً اسلامی ریاست کی تشکیل اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے حق میں نہیں تھا۔ وہ سراسر مسلمانوں کو دھوکا اور فریب دے رہا تھا۔ جناح صاحب نے نواب آف قلات سے گفت گو کرتے ہوئے اسمبلی کی بات بھی خوب کی، جبکہ انھوں نے حفظ ماتقدم یعنی پہلے سے بچاؤ کے طور پر چُن چُن کر بے دین اور دین دشمنوں کو کابینہ میں شامل کیا اور وزارتِ قانون جیسا اہم عہدہ ایک ہندو جوگندر ناتھ منڈل کو سونپا، تاکہ دین پسند لوگ اسلامی ریاست کی تشکیل اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے کچھ کوشش کریں بھی تو انھیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑے اور ایسا ہی ہوا۔ جناب قیوم نظامی اپنی کتاب قائداعظم:

بحیثیت گورنر جنرل میں لکھتے ہیں:

''قائداعظم نے گورنر جنرل کا منصب سنبھالنے کے بعد نئی ریاست کی تشکیل کے لیے جو بنیادی فیصلے کیے وہ ان کے تصور پاکستان کا عملی اظہار تھے۔ انھوں نے پاکستان کی پہلی کابینہ کا انتخاب اپنی سیاسی سوچ کے مطابق کیا۔ ایک ہندو جوگندر ناتھ منڈل کو وزیر قانون بنایا گیا تاکہ ایسی قانون سازی نہ ہو سکے جس سے غیر مسلموں کے حقوق سلب ہونے کا خطرہ ہو اور ایک احمدی (قادیانی) سر ظفر اللہ کو وزیر خارجہ نامزد کیا۔ پاکستان کی پہلی کابینہ کا ایک وزیر بھی مذہبی رہنما نہ تھا۔ قائداعظم نے مذہبی وزارت بھی قائم نہ کی۔ اُن کے دونوں ملٹری سیکرٹری انگریز تھے جو اُن کی وفات تک اُن کے ساتھ کام کرتے رہے۔ انھوں نے بری، بحری اور فضائی افواج کے چیفس انگریز نامزد کیے۔ دو صوبوں کے گورنر بھی انگریز تھے جب کہ فوج اور سول سروس کے پانچ سو آفیسر انگریز تھے۔ مسلم لیگ نے پنجاب اسمبلی کے سپیکر کے منصب کے لیے ایک کرسچین دیوان بہادر ایس پی سنگھا کو نامزد کیا۔ معروف مورخ پروفیسر طاہر کامران کی تحقیق کے مطابق ایس پی سنگھا کو قرارداد مقاصد کی منظوری کا شدید صدمہ ہوا اور وہ حرکت قلب بند ہونے سے وفات پا گئے۔ قائداعظم نے گورنر جنرل کا منصب سنبھالنے کے بعد کسی مسجد یا مزار پر حاضری دینے کی بجائے 17 اگست 1947ء کو کراچی کے ہولی ٹرینٹی چرچ (Holy Trinity Church) کا دورہ کر کے پاکستان کے غیر مسلموں کو یہ یقین دلایا کہ وہ پاکستان کے برابر کے شہری تصور کیے جائیں گے۔ قائداعظم نے سرکاری دفاتر اور پاکستانی سفارت خانے کے لیے اپنی جس پورٹریٹ کا انتخاب کیا وہ شیروانی اور جناح کیپ والی نہ تھی بلکہ تھری پیس سوٹ اور ہاتھ میں سگار والی تھی۔ قائداعظم کے یہ اقدامات مذہبی نہیں بلکہ سیاسی اور سیکولر نوعیت کے تھے۔''(3)

جناح صاحب کے قریبی ساتھی، آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے رکن وزیر اعلیٰ سندھ جناب محمد ایوب کھوڑو کھلے لفظوں میں اعتراف کرتے ہیں:

''وہ (یعنی جناح صاحب) اس ریاست کو مذہبی ریاست کا رنگ دینا نہیں چاہتے تھے

اور نہ ہی یہ کوئی مذہبی ریاست تھی اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جناح صاحب اسلامی ریاست کا قیام چاہتے تھے وہ الو کے پٹھے ہیں اور جو لوگ جناح صاحب کو ولی اللہ بنا رہے ہیں وہ غلط ہیں، وہ کوئی ولی اللہ نہیں تھے۔''(4)

اسلامی ریاست کی تشکیل اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے حوالہ سے برصغیر کے مسلمانوں کے، قیامِ پاکستان سے پہلے اور بعد کے جو احساسات تھے وہ بریلوی مسلک کے ایک نامور عالم دین اور جامعہ نعیمیہ لاہور کے بانی مہتمم و شیخ الحدیث مولانا مفتی محمد حسین نعیمی کی ایک گفت گو سے عیاں ہوتے ہیں۔ دراصل یہ ایک انٹرویو ہے جو ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ لاہور کے مدیر جناب مقبول جہانگیر اور نائب مدیر جناب عابد نظامی نے 1970ء میں ان سے کیا تھا۔ پڑھیے:

''ہم نے عرض کیا: ''حضرت! تشکیلِ پاکستان کے واقعے کو آپ نے کس طرح محسوس کیا تھا؟''

مفتی محمد حسین نعیمی نے ارشاد فرمایا: ''قائدین تحریک کے قول کے مطابق ہمارا خیال یہ تھا کہ قرونِ اولیٰ کا دور دیکھنا نصیب ہوگا اور یہاں آ کر اسلامی نظام کے تحت زندگی گزارنے کی سعادت نصیب ہوگی۔ اس وقت ہر شخص اسلامی نظام کے مطابق اپنی زندگی ڈھالنے کو تیار تھا، مگر افسوس یہ آرزو خاک میں مل گئی۔ پہلے لیڈر اسلامی قانون کے لیے ٹال مٹول کرتے تھے، اب کچھ عناصر کھلم کھلا اس کی راہ میں مزاحم ہیں۔ بس ایسا سمجھیے کہ سوچا کچھ تھا اور ہوا کچھ اور۔''

''مفتی صاحب! آزادی کی جو قیمت مسلم عوام نے ادا کی اور اس قیمت کا وہ حصہ جو بھارتی مسلمان مسلسل اقساط میں ادا کر رہے ہیں، اس کے بارے میں آپ کے تاثرات کیا ہیں؟''

''بھارت کے مسلمانوں نے جو قربانیاں دیں وہ محض اس خاطر تھیں کہ پاکستان کے مسلمانوں کو اسلامی سلطنت نصیب ہوگی۔ اگر یہاں واقعی اسلامی حکومت قائم ہو جاتی تو انھیں یہ مسلسل قربانیاں نہ دینی پڑتیں۔ اسلامی حکومت مسلمانوں کی حفاظت کے معاملے میں بڑی غیور ہوتی ہے۔ کیا آپ کو یاد نہیں کہ محمد بن قاسمؒ نے چند مسلمان عورتوں کو بچانے کے لیے راجہ داہر کی سلطنت کا تختہ اُلٹ دیا تھا۔ یہ تو مسلمانوں کی

حفاظت کی بات ہے۔ مسلمان غیر مسلم ذمیوں کی بھی حفاظت کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہو جاتی تو ستمبر 65ء کی جنگ میں مسلمان سپاہی بھارتی فوج میں شامل ہو کر مسلمانوں سے کبھی نہ لڑتے۔''

نعیمی صاحب خطیبانہ جوش و خروش سے بولے جا رہے تھے۔ لمحہ بھر کے لیے وہ رکے تو ہم نے اگلا سوال کیا: ''کیا پچھلے 23 برس میں ہمارے عوام آزادی کی نعمتوں سے مالا مال ہو سکے؟''

''نہیں۔'' مفتی صاحب بولے۔ ''بالکل نہیں، آزادی کے بعد ہمارے عوام کی حالت یہ ہوگئی کہ آسمان سے گرے، کھجور میں اٹکے۔ درحقیقت ہم انگریز کی غلامی سے نجات پانے کے بعد انگریزوں کے غلاموں کے غلام بن گئے۔''

عرض کیا: ''آج ہم سفر آزادی کی کس منزل پر کھڑے ہیں اور ہمارے سامنے کیا مراحل ہیں؟''

''ہنوز روزِ اوّل ہے۔ عوام اپنے آپ کو استبداد کے چنگل میں کسا ہوا محسوس کرتے ہیں اس پر ستم یہ کہ اُن کے سامنے کوئی قانونی و اخلاقی راستہ نہیں کہ وہ درپیش مسائل سے نپٹ سکیں۔ ہم اس وقت ایک مصنوعی آزادی اور بناوٹی جمہوریت کے درمیان زندگی گزار رہے ہیں۔''

''مفتی صاحب! کیا انتخابات سے حالات سدھرنے کی توقع ہے؟''

''نہیں، کوئی توقع نہیں۔ آئندہ انتخابات میں بھی غیر موزوں افراد کی کامیابی ممکن ہے۔ شہروں سے سرمایہ دار اور دیہات سے زمیندار آگے آئیں گے۔ ظاہر ہے ان لوگوں کو عوام سے کوئی ہمدردی نہیں۔ یہ اپنے اقتدار کی خاطر پوری قوم کو نیلام کر سکتے ہیں۔''

ملک کے پرانے سیاسی شعبدہ بازوں کے متعلق نعیمی صاحب کا تجزیہ کتنا حقیقت پسندانہ تھا۔''(5)

اسی حوالے سے تحریکِ پاکستان کے کارکن، کٹر لیگی ذہن رکھنے والے تنظیمِ اسلامی پاکستان کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد، سُنّی دیوبندی مسلک کے ممتاز خطیب مولانا احتشام الحق تھانوی کے

بارے میں لکھتے ہیں:

''فروری 1968ء میں خود راقم نے مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم ایسے کٹر مسلم لیگی کی زبان سے یہ الفاظ جامعہ اشرفیہ لاہور کے ایک اجتماع میں سنے تھے کہ اب جو حالات پیش آ رہے ہیں انھیں دیکھ کر تو خیال ہوتا ہے کہ غالباً اُن علمائے کرام کی رائے زیادہ درست اور صائب تھی جو قیامِ پاکستان کے خلاف تھے!''(6)

مفتی نعیمی اور مولانا تھانوی کے اعترافات پر ہم یہی کہہ سکتے ہیں:

سب کچھ لٹا کے ہوش میں آئے تو کیا کیا؟

لیکن اُس دور کے جو اہل بصیرت وفراست تھے اور وہ سیاسی فکر وتدبر اور شعور وآگہی بھی رکھتے تھے اور مخلص بھی تھے۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ جناح صاحب مسلمانوں کو اسلام کے نام پر دھوکا اور فریب دے رہے ہیں۔ وہ قطعاً ملک میں اسلامی قوانین کا نفاذ نہیں کریں گے۔ وہ اپنے وعدے کا ایفا بالکل نہیں کریں گے۔ ان کے مقاصد وعزائم کچھ اور ہیں۔ جناب محمد صدیق اپنی خودنوشت آپ بیتی ذوق پرواز میں لکھتے ہیں:

''ڈیرہ دون میں ہم تین ساتھیوں کو مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی سے جو علیحدہ علیحدہ ملاقاتیں نصیب ہوئی تھیں، وہ بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔ ہم نے ان حضرات سے یہی سوال کیا تھا کہ آپ صاحبان پاکستان کے قیام کے کیوں مخالف ہیں؟...جبکہ ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ پاکستان میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی صورت پیدا ہو جائے گی۔...اس پر ان دونوں حضرات کا ایک ہی جواب تھا کہ بھئی! جن حضرات کے ہاتھ اس وقت مسلم لیگ کی زمام ہے، خود ان کی اپنی زندگیوں پر اسلام صحیح معنوں میں نافذ نہیں، تو بھلا وہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کیسے کر پائیں گے؟ ہم نے عرض کیا کہ مسلم لیگ کے ساتھ مولانا شبیر احمد عثمانی اور دیگر کئی علماء اور مشائخ ہیں، ان کی موجودگی میں مسلم لیگ کی قیادت اپنے وعدے ایفا کرے گی اور ان نیک ہستیوں کے ہاتھوں ضرور ان شاء اللہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی صورت پیدا ہوگی۔ حیرت کی بات ہے، ان دونوں حضرات نے، الگ الگ مجلس میں ایک ہی فقرہ کہا کہ بھئی! ان طوطیوں کی اس نقار خانے میں کوئی نہیں سنے گا۔ واقعی کچھ ایسے ہی ہوا۔ نہایت مشکل سے قرار داد

مقاصد کو پاکستان کی اسلامی جمہوریہ کے آئین میں دیباچے کے طور پر داخل کیا گیا اور اس کے پیچھے مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان کے ساتھیوں کی پیہم کوششیں اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی کی بے شمار قربانیاں تھیں، جن کے سبب نواب زادہ لیاقت علی خان نے اس قراردادِ مقاصد کو آئین کے دیباچہ کی حیثیت سے شامل کرنا تسلیم کیا۔''(7)

اس دور کے ایک اور صاحب بصیرت وفراست رہنما امیر شریعت جناب مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری نے 1946ء میں دلّی کی شاہی جامع مسجد کے سامنے اُردو پارک میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''حضرات! آج میں نے کوئی تقریر نہیں کرنی بلکہ چند حقائق ہیں جنھیں بلا تمہید کہنا چاہتا ہوں۔ آئینی اور غیر آئینی دنیا میں خواہ اس علاقے کا تعلق ایشیا سے ہو یا یورپ سے، اس وقت جو بحث چل رہی ہے، وہ یہ ہے کہ ہندستان کی ہندو اکثریت کو مسلم اقلیت سے جدا کر کے برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ قطع نظر اس کے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ مجھے پاکستان بن جانے کا اتنا ہی یقین ہے جتنا اس بات پر کہ صبح کو سورج مشرق ہی سے طلوع ہوگا۔ لیکن یہ پاکستان وہ پاکستان نہیں جو دس کروڑ مسلمانوں کے ذہنوں میں اس وقت موجود ہے اور جس کے لیے آپ بڑے خلوص سے کوشاں ہیں۔ ان مخلص نوجوانوں کو کیا معلوم کہ کل ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ بات جھگڑنے کی نہیں، سمجھنے اور سمجھانے کی ہے۔ سمجھا دو، مان لوں گا۔ لیکن تحریک پاکستان کی قیادت کرنے والوں کے قول وفعل میں بلا کا تضاد اور بنیادی فرق ہے۔ اگر آج مجھے کوئی اس بات کا یقین دلا دے کہ ہندستان کے کسی قصبہ کی گلی میں، کسی شہر کے کسی کوچہ میں، حکومتِ الٰہیہ کا قیام اور شریعت اسلامیہ کا نفاذ ہونے والا ہے تو ربِ کعبہ کی قسم! میں آج ہی اپنا سب کچھ چھوڑ کر آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔ لیکن یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جو لوگ اپنے جسم پر اسلامی قوانین نافذ نہیں کر سکتے، جن کا اُٹھنا بیٹھنا، جن کا سونا، جن کا جاگنا، جن کی وضع قطع، جن کا رہن سہن، بول چال، زبان و تہذیب، کھانا پینا اور لباس وغیرہ، غرض یہ کہ کوئی چیز بھی اسلام کے مطابق نہ ہو، وہ دس

کروڑ افراد کے وطن میں کس طرح اسلامی قوانین نافذ کر سکتے ہیں؟ یہ ایک فریب ہے اور میں یہ فریب کھانے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں۔"(8)

اسی دور کے ایک اور رہنما مجاہد آزادی جناب مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے مارچ 1947ء میں، دیوبند میں، شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی کی صدارت میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

"میرے خاندان نے انگریز کے خلاف تقریباً ڈیڑھ سو سال جنگ لڑی ہے۔ جس کی بنا پر کچھ تجربات اور اندیشے ایسے ہیں کہ میرا دل پاکستان کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا۔

انگریز ہندستان سے جا رہا ہے مگر اس طور پر کہ ہندستان کو ٹکڑے اور مسلمانوں کو تقسیم کر کے۔ تمھیں معلوم ہے کیوں؟ میں تم کو بتاتا ہوں۔ تاریخ اٹھا کر دیکھو، ہندستان کی آزادی کی تحریک میں مسلمانوں کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ سب سے زیادہ مشکلات مسلمانوں نے اٹھائیں۔ سب سے زیادہ مار مسلمانوں نے کھائی۔ سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کا ہوا۔ وہ اس لیے کہ انگریز نے مسلمانوں سے اقتدار چھینا تھا۔ قدرتی طور پر شدید ردِّعمل مسلمانوں ہی کی طرف سے ہوا۔ ہندو تو ایک ہزار سال سے مسلمانوں کا محکوم تھا۔ اگر وہ مسلمانوں کی حکمرانی سے نکل کر انگریز کی حکمرانی میں آ گیا تھا تو اس پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔ محکوموں پر حاکم بدل جانے سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔ البتہ حاکم قومیں غلامی برداشت نہیں کر سکتیں۔ مسلمان ہندستان میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ انگریز کو یہ ڈر ہے کہ مسلمان کہیں پھر سے مجتمع ہو کر قوت نہ پکڑ لیں۔ اس لیے مسلمانوں کو تین جگہ پر تقسیم کیا جا رہا ہے۔

دوسری بات یہ ذہن میں رہے کہ پاکستان انگریز کے چنگل سے نکل کر امریکہ کے چنگل میں چلا جائے گا۔ اس کے فیصلے امریکہ میں ہوا کریں گے۔ پاکستان انگریز اور امریکہ کی ضرورت ہے۔ ہندوستان کی سرحدیں افغانستان کے ساتھ روس سے ملتی ہیں۔ روس میں سوشلسٹوں کی حکمرانی ہے۔ نیز روس بذاتِ خود ایک عالمی طاقت کی شکل میں ابھر رہا ہے۔ کانگریس میں جواہر لال نہرو سمیت کئی لیڈر سوشلسٹ نظریات

رکھتے ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ کو خطرہ ہے کہ اگر ہندستان کو اسی حالت میں چھوڑ دیا گیا تو ہندستان کی سوشلسٹ حکومت روس کے ساتھ مل کر ایک زبردست بلاک بنا لے گی۔ جس کی وجہ سے ایشیاء میں برطانیہ اور امریکہ کا ناطقہ بند ہو سکتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ ہندستان اور روس کے درمیان ایک ایسی ریاست قائم کر دی جائے کہ جس کی وجہ سے یہ دونوں ملک آپس میں مل کر کوئی مضبوط محاذ نہ بنا سکیں۔ پاکستان کی ضرورت صرف اتنی سی ہے۔ جب تک پاکستان امریکہ کی یہ ضرورت پوری کرتا رہے گا قائم رہے گا۔ پاکستان کی بقاء کا مدار مادی طور پر صرف امریکہ کی خوشنودی پر رہے گا۔"(9)

پاکستان کے ممتاز ماہر اقتصادیات جناب ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی کا ایک بیان بعنوان "امریکہ مستقبل میں پاکستان کی امداد بند کر دے گا" روزنامہ نوائے وقت لاہور میں شائع ہوا ہے۔ مولانا لدھیانوی کی تقریر کے بعد اس بیان کا متن بھی پڑھ لیا جائے:

"لاہور (کامرس رپورٹر) دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کی مدد کی ضرورت کے پیشِ نظر امریکی کانگریس نے وقتی طور پر پاکستان کی تمام امداد روکنے کی تجویز مسترد کی ہے لیکن مستقبل میں امریکہ نہ صرف پاکستان کی امداد بند کرے گا بلکہ اقتصادی پابندیاں بھی عائد کرے گا۔ اس خدشے کا اظہار انسٹیٹیوٹ آف اسلامک بینکنگ اینڈ فنانس کے چیئرمین ڈاکٹر شاہد حسن صدیقی نے امریکی کانگریس کمیٹی کی جانب سے پاکستان کی تمام امداد روکنے کی تجویز مسترد کیے جانے پر اپنے ردِّعمل میں کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جوں جوں نام نہاد دہشت گردی کی جنگ میں امریکہ کو پاکستان کی مدد کی ضرورت کم ہوتی جا رہی ہے ویسے ویسے امریکہ کا رویہ بھی تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ شروع میں امریکہ کا رویہ ہمدردانہ تھا، اس کے بعد غیر ہمدردانہ ہوا اور اب معاندانہ ہو گیا ہے۔ دہشت گردی کی جنگ پاکستان کے لیے تباہی کا سودا ہے کیونکہ اس سے پاکستان کی معیشت کو 67.9 ارب ڈالر کا نقصان پہنچا ہے جبکہ امریکہ نے پاکستان کو صرف تقریباً 20 ارب ڈالر دیے۔ نائن الیون سے اب تک تقریباً 3 کروڑ سے زائد افراد غربت کی لکیر سے نیچے چلے گئے اور 2003ء کے مقابلے میں معیشت

کی شرح نمو سُست ہے۔"(10)

جناب نذیر ناجی ملک کے ممتاز دانشور اور تجزیہ نگار ہیں۔ وہ آج، قیام پاکستان کے 63 سال بعد، اپنے ایک حالیہ کالم میں جمیعۃ علمائے ہند کے علمائے کرام کی سیاسی بصیرت و فراست اور سیاسی شعور و تدبر کا بایں الفاظ اعتراف کرتے ہیں:

"جمیعت علمائے ہند آزادی کے قومی تصور کی حامی تھی۔ آج 63 برس کے بعد جب میں جمیعت علمائے ہند کے علمائے کرام کی تحریریں پڑھتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مضمون میں یہ خیال پیش کیا گیا تھا کہ "پاکستان سامراجی ضرورت کے تحت بنایا جا رہا ہے۔ برطانیہ اور اس کے اتحادی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہندستان چھوڑ دیا تو چین اور سوویت یونین کی ابھرتی ہوئی کمیونسٹ طاقتوں کے ساتھ ہندستان بھی انقلابی تحریکوں کی لپیٹ میں آجائے گا اور اس طرح ایک بہت بڑا سامراج دشمن محاذ قائم ہو جائے گا اور یہاں سامراجیوں کے لیے قدم رکھنے کی جگہ نہیں رہے گی۔ اس لیے وہ زمین کا کوئی ایسا ٹکڑا بھارت سے علیحدہ کرنا چاہتے ہیں جہاں وہ اپنے فوجی اڈے قائم کر سکیں اور یہاں موجود رہ کر ہندستان اور چین کے حالات پر اثر انداز ہو سکیں۔" یہ ایک خاصے طویل مضمون کا خلاصہ ہے۔ لیکن واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ تجزیہ بڑے بڑے سیاسی مفکروں سے بھی زیادہ حقیقت پسندانہ بلکہ معجزانہ تھا۔ مولانا مفتی محمود نے یونہی نہیں کہہ دیا تھا کہ "شکر ہے ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہیں۔"(11)

علماء اپنی سیاسی بصیرت و فراست سے جو باتیں تقسیم ہند سے قبل کر رہے تھے، ان کی تائید ممتاز سکالر جناب ڈاکٹر منظور احمد (ریکٹر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد) کے اہم مقالہ "پاکستان" سے ہوتی ہے، جس میں وہ رقم طراز ہیں:

"قیامِ پاکستان میں مسلمانوں کی جدوجہد اور قربانیوں سے انکار کیے بغیر پاکستان کے مسئلے کو سمجھنے کے لیے چند اور حقائق پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

غیر منقسم ہندستان میں ہندوؤں کا ایک معتد بہ اور مؤثر طبقہ ہندستان کے مسلمان اکثریتی علاقوں کو اپنے لیے خطرہ سمجھتا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ یہ علاقے اگر آزاد کر دیے گئے تو اپنے درونی معاشرتی تضادات کی وجہ سے یا تو خود ختم ہو جائیں گے یا

مستقل طور پر بدامنی اور بے چینی کا شکار رہیں گے۔ اس لیے ان حصوں کو کاٹ کر الگ کرنے سے ہندستان کو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ ہندستان میں ہندوؤں کی اس فکر کے ساتھ، ایک اور مؤثر طبقہ بھی ہندستان کی تقسیم کا، یا کسی ایسے انتظام کا حامی تھا جہاں اس کو اپنی مقصد براری کے لیے مواقع فراہم ہوں۔ تاریخ کے اس حصہ کے متعلق جواب تک قیاسی تھا، شواہد ملنے لگے ہیں۔ برطانوی حکومت کی سرکاری دستاویزات ان کی مدتِ اخفاء ختم ہونے کے بعد اب لوگوں کی دسترس میں ہیں۔ برطانیہ اور مغربی طاقتوں کی دلچسپی پاکستان کی تشکیل میں اس لیے تھی کہ ان کو آنے والے دنوں میں مشرقِ وسطیٰ اور روس دونوں میں اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے جغرافیائی اعتبار سے ایک ایسا ملک مہیا ہو سکے گا جس کو وہ آسانی سے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کر سکیں گے۔ اور ان کو شمال مغربی علاقوں میں ہوائی اڈے اور کراچی کی بندرگاہ ایک سمندری سہولت کے طور پر میسر ہو سکیں گے۔ پاکستان کے قیام میں یہ سارے محرکات کام کر رہے تھے، جو اس نئی ریاست کے لیے پیچیدہ اور جلد حل نہ ہونے والے مسائل کا پیش خیمہ تھے۔

ماؤنٹ بیٹن کی یادداشتوں میں 7 جولائی 1947ء کی ایک دستاویز ملتی ہے جس کے سرنامہ پر "انتہائی خفیہ" لکھا ہے اور جس پر کسی کے دستخط نہیں ہیں، اس میں لکھا گیا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ اور اس کے تیل کے ذخائر کے لیے کسی بھی دفاعی منصوبہ میں وادیٔ سندھ، مغربی پنجاب، بلوچستان بڑی اہمیت کے ملک ہیں۔ اگر اس خط پر نظر ڈالیں تو دفاعی حصار کی دیوار میں آپ کو پانچ اہم اینٹیں نظر آئیں گی اور یہ ترکی، ایران، عراق، افغانستان اور پاکستان ہیں۔ سوویت یونین کی جارحیت کے مقابلہ کے لیے کراچی ہی وہ بندرگاہ ہے جہاں سے دفاعی عمل ممکن ہے۔ یہ سمندر تمام ملکوں سے رابطہ کا ذریعہ ہے اور اُن سمندری راستوں کی حفاظت کا ضامن ہے جو خشکی سے گھرے ہوئے ہیں اور جو روسی فضائی حملوں کا نشانہ بن سکتے ہیں یا جہاں پر فوجیں اتر سکتی ہیں، دولت مشترکہ برطانیہ اور امریکہ کو مشرقِ وسطیٰ میں اپنے حساس مفادات کے تحفظ کے لیے سب سے زیادہ مناسب اور محفوظ مقام پاکستان کی سرزمین ہے۔ پاکستان اس دفاعی

منصوبہ کی کلید ہے جو بحیرہ ہند اور متعلقہ علاقوں پر کسی حملہ کی صورت میں پیش آ سکتا ہے، پاکستان بننے کے بعد آنے والے دنوں میں جو کچھ ہوا وہ بین الاقوامی کنٹرول حاصل کر لینے کے لیے اسی منصوبہ کا حصہ تھا۔" (12)

مسلم لیگی محقق، تاریخ پاکستان (منظوم) [ایشین بک سینٹر، کراچی/اشاعت اوّل: اگست 1968ء/192ص] اور سندہ کا مقدمہ [شبل پبلی کیشنز، کراچی] کے مصنف جناب شکیل احمد ضیاء نے ایک تیسری کتاب مولانا ابوالکلام آزاد کے انکشافات [شبل پبلی کیشنز، کراچی/مارچ 1988ء/95ص] کے نام سے بھی لکھی تھی۔ اس کتاب میں ضیاء صاحب نے مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت و فراست اور شعور و تدبر کا بھرپور طریقے سے اعتراف کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ مولانا آزاد تقسیم ہند و قیامِ پاکستان کی مخالفت کیوں کرتے تھے۔ جناب شکیل احمد ضیاء لکھتے ہیں:

"اگر مجھ سے سوال کیا جائے کہ ہندستان میں پاکستان اور تحریکِ پاکستان کا سب سے بڑا مخالف کون تھا تو میں خوفِ تردید کے بغیر اس شخص کا نام لوں گا جسے "امام الہند" کہا جاتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد متبحر عالم دین، بے مثل صحیفہ نگار، عدیم النظیر انشاپرداز تھے، جن کی نثر نگاری کو استاذ المکرم سیّد الاحرار مولانا حسرت موہانی نے اس طرح خراج پیش کیا ہے:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظمِ حسرت میں بھی مزا نہ رہا

مولانا آزاد قیامِ پاکستان کے شدید مخالف تھے لیکن اس کے وجود میں آجانے کے بعد انھوں نے کانگریس کے لیڈروں کی منافقت کا پردہ فاش کرتے ہوئے واضح طور پر تحریر کر دیا کہ انھوں نے پاکستان کو دل سے قبول نہیں کیا اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے یہ مشورہ بھی دیا:

...... پاکستان کی نئی ریاست اب ایک حقیقت ہے اور ہندستان و پاکستان دونوں کا فائدہ اور سلامتی اس میں ہے کہ باہم دوستانہ تعلقات بڑھائیں اور اشتراکِ عمل کریں۔ اس کے خلاف کوئی پالیسی اپنائی گئی تو وہ نئے اور بڑے مصائب و آلام کا

باعث بن سکتی ہے۔ (آزادئ ہند)

مولانا آزاد نہ تو منافق تھے نہ وہ منافقت کو پسند کرتے تھے۔ ایسی صورت میں یہ دیکھنا چاہیے کہ پاکستان کی اسکیم کے وہ کیوں مخالف تھے۔ نیز انھوں نے پاکستان کے بارے میں جو پیش گوئی کی وہ کس حد تک درست ثابت ہوئی۔ ان دونوں باتوں کا اجمالی جائزہ پیش کرتا ہوں۔ پاکستان کی اسکیم کے بارے میں مولانا آزاد نے فرمایا:

میں نے مسلم لیگ کی پاکستانی اسکیم پر ہر ممکن نقطۂ نگاہ سے غور کیا ہے۔ ایک ہندستانی کی حیثیت سے پورے ہندستان سے متعلق اس کی پیچیدگیوں کا میں نے جائزہ لیا ہے اور ایک مسلمان کی حیثیت سے ہندستان کے مسلمانوں کی قسمت پر پڑنے والے اس کے ممکنہ اثرات کا میں نے تجزیہ کیا ہے۔

اس اسکیم کے تمام پہلوؤں پر میں نے بہت کچھ غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پورے ہندستان کے لیے اس اسکیم کے جو کچھ بھی نقصان ہیں وہ اپنی جگہ لیکن مسلمان کے لیے یہ تجویز سخت تباہ کن ثابت ہوگی اور اس سے ان کی کوئی مشکل حل ہونے کے بجائے مزید مشکلات پیدا ہو جائیں گی......

ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد 9 کروڑ سے زیادہ ہے اور وہ اپنی زبردست تعداد کے ساتھ ایسی مذہبی اور معاشرتی صفات کے حامل ہیں کہ ہندستان کی قومی اور وطنی زندگی میں پالیسی اور نظم و نسق کے تمام معاملات پر فیصلہ کن اثر ڈالنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ مزید برآں کئی صوبوں میں مسلمانوں کو مکمل اکثریت حاصل ہے۔

پاکستان کی اسکیم کے ذریعے ان کی یہ ساری قوت و صلاحیت تقسیم ہو کر ضائع ہو جائے گی......

میں اس مسئلے کے دوسرے تمام پہلوؤں کو نظر انداز کر کے تنہا مسلم مفاد کے نقطۂ نگاہ سے بھی غور کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر پاکستان کی اسکیم کو کسی طور بھی مسلمانوں کے لیے مفید ثابت کر دیا جائے تو میں اسے قبول کر لوں گا اور دوسروں سے اسے منوانے پر اپنا پورا زور صرف کر ڈالوں گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس اسکیم سے مسلمانوں کے جماعتی اور ملی مفاد کو ذرا بھی فائدہ نہیں پہنچتا اور ان کا کوئی اندیشہ بھی دور نہیں ہوسکتا۔

اب ذرا جذبات سے بالاتر ہو کر اس کے ممکنہ نتائج پر غور کریں کہ جب پاکستان بن جائے گا تو کیا ہوگا؟

ہندستان دو ریاستوں میں تقسیم ہو جائے گا، ایک ریاست میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی، دوسری میں ہندو اکثریت۔

ہندو اکثریت کے علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد ساڑھے تین کروڑ سے زائد ہوگی اور وہ بہت چھوٹی چھوٹی اقلیتوں کی صورت میں پورے ملک میں بکھر کر رہ جائیں گے یعنی آج کل کے مقابلے میں وہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں اور زیادہ کمزور ہو جائیں گے۔ جہاں ان کے گھربار اور بود و باش ایک ہزار سال سے چلی آ رہی ہے اور جہاں انھوں نے اسلامی تہذیب اور تمدن کے مشہور اور بڑے بڑے مراکز تعمیر کیے ہیں۔

ہندو اکثریت کے علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں کو ایک دن اچانک اس صورتِ حال سے سابقہ پیش آئے گا کہ ایک صبح آنکھ کھلتے ہی وہ اپنے آپ کو اپنے گھر اور وطن میں ہی پردیسی اور اجنبی پائیں گے۔ صنعتی، تعلیمی اور معاشی لحاظ سے پس ماندہ ہوں گے اور ایک ایسی حکومت کے رحم و کرم پر ہوں گے جو خالص ہندو راج بن گئی ہوگی......

پاکستان میں خواہ مسلمانوں کی مکمل اکثریت کی حکومت ہی کیوں نہ قائم ہو جائے اس سے ہندستان میں رہنے والے مسلمانوں کا مسئلہ ہرگز حل نہ ہو سکے گا۔

دو ریاستیں ایک دوسرے کے مدمقابل بن کر ایک دوسرے کی اقلیتوں کا مسئلہ حل کرنے کی پوزیشن میں نہیں آ سکتیں۔ اس سے صرف یرغمال اور انتقام کا راستہ کھلے گا۔ عالمی معاملات میں بھی پاکستان کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں کر پائے گا۔" (آزادیِ ہند)

مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق اگر کوئی شخص یہ کہے کہ وہ برصغیر کے مسلمانوں کے مجموعی مفادات کے خلاف کانگریس میں شامل تھے تو اس سے بڑا کاذب کوئی نہیں ہو سکتا۔ مولانا آزاد سے اختلاف ہو سکتا ہے (اور خدا مسلمانوں کو وہ روزِ بد نہ دکھائے کہ ان میں معقولیت کے ساتھ اختلاف کرنے کی صلاحیت ختم ہو جائے)۔ مولانا کو پاکستان کی اسکیم سے اختلاف تھا اور برصغیر کے ان تمام مسلمانوں کو جنھوں نے تشکیلِ پاکستان کے لیے تحریک چلائی، مولانا کے اختلاف سے اختلاف تھا۔ مولانا نے قیامِ پاکستان

کے بعد جو پیش گوئیاں فرمائیں وہ قطعاً درست تھیں، مثلاً انھوں نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی پیش گوئی کی تھی جو درست ثابت ہوئی، لیکن اس علیحدگی کے جو اسباب انھوں نے بیان فرمائے تھے وہ درست نہ تھے۔

مشرقی پاکستان کسی جغرافیائی اور لسانی سبب کی بنا پر علیحدہ نہیں ہوا بلکہ اسے اس طبقے کے استحصالی جبر نے علیحدہ ہونے پر مجبور کر دیا جس کے ایک نمائندہ فوجی نے مشرقی پاکستان کے خلاف فوجی آپریشن سے قبل کہا تھا۔ "ہمیں آدمیوں کی نہیں، زمین کی ضرورت ہے۔"

مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بن جانے کے بعد باقی ماندہ پاکستان بھی مولانا آزاد کی پیش گوئیوں کی زد میں ہے۔"(13)

جناب شکیل احمد ضیاء نے مولانا آزاد کی کتاب آزادیِ ہند سے خاصے اقتباسات "مسلم لیگ کی سیاست اور پاکستان کی تحریک" کے زیرِ عنوان اپنی کتاب میں شامل کیے ہیں۔ ہم ان میں سے چند اقتباسات ذیل میں درج کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ ان اقتباسات سے مولانا آزاد کا موقف مزید واضح ہو جائے گا:

"**پاکستان سے نئے مسائل پیدا ہو جائیں گے:** (اپریل 1946ء، کابینہ وفد آ چکا ہے۔ مولانا آزاد کا خیال ہے کہ ہندستان کے لیے وفاقی دستور موزوں ترین دستور ہو گا۔ مسلم لیگ کے خدشات بھی اس طرح دور ہو جائیں گے)۔

15 اپریل 1946ء کو میں نے ایک بیان شائع کیا تھا اور اب کہ تقسیمِ ہند ایک حقیقت بن چکی ہے اور یہ حقیقت دس سال پرانی بھی ہو چکی ہے۔ آج بھی میں وہی کہتا ہوں جو میں نے اس روز کہا تھا۔ میں نے اپنے بیان میں کہا تھا:

"ہر ممکن نقطۂ نظر سے میں نے مسلم لیگ کی تجویز پاکستان پر غور کیا۔ اس کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ نہ صرف مجموعی حیثیت سے ہندستان کے لیے بلکہ خاص طور پر مسلمانوں کے لیے بھی مضر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس تجویز سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔

لفظ پاکستان سے اختلاف: میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ پاکستان کا لفظ ہی میری

طبیعت قبول نہیں کرتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کا ایک حصہ تو پاک ہے اور باقی سب ناپاک۔ پاک اور ناپاک کی بنیاد پر کسی قطعۂ ارض کی تقسیم قطعاً غیر اسلامی اور روحِ اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسلام اس طرح کی کوئی تقسیم قبول نہیں کرتا۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ خدا نے ساری دنیا کو میرے لیے مسجد بنایا ہے۔ علاوہ ازیں میں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ پاکستان کی اسکیم شکست خوردگی کی ایک واضح علامت ہے۔ اس کی تعبیر جس بنیاد پر رکھی گئی ہے وہ ہے یہودیوں کے قومی وطن کی مثال۔ یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ ہندستانی مسلمان ہندستان کو بحیثیت مجموعی اپنا وطن نہیں بنا سکتے، وہ صرف اس ٹکڑے پر قناعت کریں گے جو ان کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہو۔

وطن الیہود اور پاکستان: جہاں تک یہودیوں کے قومی وطن کا مطالبہ ہے، اس سے ہمدردی کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ وہ ساری دنیا میں بکھرے ہوئے ہیں اور کسی علاقے میں بھی وہاں کے نظم و انصرام پر کوئی اثر نہیں رکھتے۔ لیکن ہندستانی مسلمانوں کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی تعداد نوے (90) ملین سے زیادہ ہے۔ وہ کمیت اور کیفیت ہر لحاظ سے ہندستانی زندگی کا ایک اہم عنصر ہیں۔ وہ انتظام اور پالیسی کے ہر مسئلے پر فیصلہ کن طور پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ قدرت نے ان کی مزید مدد اس طرح کی ہے کہ بعض رقبوں میں ان کی اکثریت بھی ہے۔ اس سے بڑھ کر بزدلانہ بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ پورے آبائی ترکہ سے دستبردار ہو کر اس کے صرف ایک ٹکڑے پر قناعت کر لوں۔

دو قومی نظریہ: جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ مسٹر جناح کے پاکستان کی اسکیم دو قومی نظریہ پر مبنی ہے۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ ہندستان بہت سی قومیتوں پر مشتمل ہے جن کی بنیاد مذہبی اختلافات پر ہے۔ ہندستان میں دو بڑی قومیں ہیں: ہندو اور مسلمان۔

ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے انھیں جداگانہ حکومتوں کا مالک ہونا چاہیے۔ ہمیں ٹھنڈے دل سے ان نتائج پر غور کرنا چاہیے جو پاکستان بن جانے کے بعد رونما ہوں گے۔ ہندستان دو حکومتوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ ایک میں مسلمانوں کی اکثریت ہو

گی، دوسری میں ہندوؤں کی۔ حکومتِ ہندوستان کے پاس ساڑھے تین کروڑ مسلمان ہوں گے جو ایک معمولی اقلیت کی حیثیت سے سارے ملک میں بکھرے پڑے ہوں گے یعنی سترہ فیصد یوپی میں، بارہ فیصد بہار میں اور نو فیصد مدراس میں۔

پاکستان بن جانے کے بعد: لیکن پاکستان بن جانے کے فوراً بعد ان پر یہ منکشف ہوگا کہ ان کی حیثیت ایک غیر ملکی کی ہے۔ صنعتی، تعلیمی اور اقتصادی لحاظ سے پس ماندہ۔ وہ ہندو راج کے رحم و کرم پر چھوڑ دیے جائیں گے۔

پاکستان مسلمانوں کے لیے بھی مضر ہے: خود پاکستان میں بھی ان کی حالت کمزور ہو گی۔ ان کی اکثریت اتنی خفیف ہوگی کہ پاکستان کے غیر مسلموں کی تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی بیداری انھیں ناکارہ بنا دے گی۔ لیکن اگر پاکستان غیر معمولی مسلم اکثریت پر مشتمل ہو تو بھی وہ ہندستان کے مسلمانوں کی مدد نہ کر سکے گا۔''(14)

مولانا ابوالکلام آزاد نے 23 مارچ 1947ء کو دہلی دروازہ لاہور کے بیرونی باغ میں جمعیۃ علماء ہند اور مجلس احرار اسلام کے مشترکہ جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

''سوال یہ ہے کہ بحیثیت ایک ہندستانی مسلمان کے ہمیں مستقبل کے متعلق کیا فیصلہ کرنا چاہیے، میں آنے والے زمانے کو کمزوری و تذبذب سے نہیں دیکھتا، بلکہ عزم و ہمت اور حوصلہ سے دیکھ رہا ہوں۔ جو قوم اپنے آپ کو بچانے پر قادر نہ ہو اس کو تحفظات نہیں بچا سکتے۔ مسلمانوں کی تعداد دس کروڑ ہے، اگر دس کروڑ کی بجائے مسلمان دس لاکھ بھی ہوتے اور ان کے دل میں یہ خیال ہوتا کہ وہ مرنے کے لیے نہیں زندہ رہنے کے لیے ہیں تو کوئی قوم ان کو نہیں مٹا سکتی۔

ہندستان میں آباد اتنی بڑی تعداد کو اقلیت قرار دینا اور ان کے لیے اقلیتی حقوق اور اقلیتی علیحدگی کا مطالبہ کرنا نہ صرف بزدلی ہے بلکہ ان کے شاندار مستقبل کے لیے تباہ کن ہے۔

میرے نزدیک ہندستان میں مسلمانوں کی حیثیت اقلیت کی نہیں، بلکہ دوسری بڑی اکثریت کی ہے۔

پس میری جگہ تذبذب اور کمزوری کی نہیں بلکہ یقین اور ایمان کی ہے، لیکن اگر اتنی بڑی

تعداد یعنی دس کروڑ کے ہوتے ہوئے بھی تم یہ خیال کرتے ہو کہ فنا ہو جاؤ گے، مٹ جاؤ گے، تو اس کا کیا علاج کہ دس کروڑ لاشوں کو کوئی تحفظ اور کوئی دستور نہیں بچا سکتا۔"(15)

ممتاز دانشور، جسٹس (ر) جناب کے۔ایم۔صمدانی نے روزنامہ نوائے وقت لاہور میں بعنوان "پاکستان کس کی جاگیر؟" لکھا تھا جس میں بہت واشگاف الفاظ میں قیامِ پاکستان کے مخالف علماء کی سیاسی بصیرت وفراست کا اعتراف کیا تھا۔ پڑھیے، وہ لکھتے ہیں:

"آزادی سے قبل کا ایک واقعہ ہے جس کا میں عینی شاہد تو نہیں لیکن چونکہ مجھ تک معتبر ذرائع سے پہنچا ہوا ہے اس لیے نقل کر رہا ہوں۔ ابھی پاکستان معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا اور انڈین نیشنل کانگریس کے دو مسلمان اراکین مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی صاحب پاکستان کی پورے شد و مد سے مخالفت کر رہے تھے چنانچہ مسلمان زعما کا ایک وفد ان دو بزرگوں کی خدمت میں اس خیال سے گیا کہ انھیں پاکستان کی مخالفت سے باز رکھے اور مسلم لیگ میں شمولیت کی دعوت دے۔ جب گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھا تو آزاد صاحب اور مدنی صاحب نے فرمایا کہ "بھئی ہم بھی مسلمانوں کے دشمن تو نہیں ہیں لیکن جس علاقہ میں آپ پاکستان بنانا چاہتے ہیں (اشارہ مغربی پاکستان کی طرف تھا) وہاں کا مزاج جمہوری نہیں۔ آپ کی مملکت پاکستان اور بھارت کی ریاست رام پور میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوگا"۔ اب پاکستان بنے ہوئے تقریباً ساٹھ سال گزر چکے ہیں اور ہم انتظار میں ہیں کہ ان کانگریسی مسلمانوں کا قول غلط ثابت ہو لیکن ساٹھ سال گزرنے کے باوجود ایسے کوئی آثار نظر نہیں آتے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس قول کی صداقت واضح ہوتی جا رہی ہے۔

امن وامان کی صورتِ حال دگرگوں ہے۔ تمام تر توجہ چند حکمرانوں کی حفاظت پر ہے جبکہ عام شہری کو بنیادی حقوق بھی حاصل نہیں۔ قانون کی عملداری تو اس ملک میں کبھی رہی ہی نہیں۔ اگر آپ کے پاس اثر ورسوخ ہے، خواہ وہ ناجائز طریقے سے کمائی ہوئی دولت کی وجہ سے ہے یا منصب کے غلط استعمال کی وجہ سے، آپ قتل بھی کریں گے تو چرچا نہیں ہوگا، جبکہ اثر ورسوخ نہ رکھنے والا شہری آہ بھی کرتا ہے تو پکڑا جاتا ہے۔ میری ناچیز رائے میں تو حالات رامپور سے بدتر ہیں۔ رامپور میں بظاہر نوابی تھی، جمہوریت نہیں۔ یہاں نام جمہوریت کا ہے اور سیاستدانوں اور فوجی افسروں نے پاکستان کو اپنی جاگیر بنا رکھا ہے۔"(16)

جسٹس صمدانی صاحب اپنے ایک دوسرے کالم "جمہوریت اور آمریت" میں مزید اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"ایک ٹی وی پروگرام میں جب بعض مہمانانِ گرامی نے ایسے واقعات بیان کیے جس سے پاکستان میں جمہوریت کی نفی ہوتی تھی تو میزبان نے فقط پوچھا کہ آخر ملک میں جمہوری ادارے کیوں مستحکم نہیں ہوئے۔ یہ نہایت ہی اہم سوال ہے اور اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا (یعنی ہمارے معاشرے کا) مزاج جمہوری نہیں ہے۔ اس جواب پر ہم میں سے اکثر تلملا اٹھیں گے۔ اس لیے کہ ایسی بات گالی کے مترادف سمجھی جاتی ہے۔ ادارہ بجائے خود کوئی چیز نہیں ہوتا۔ مثلاً عدلیہ ایک ادارہ ہے لیکن یہ عمارت یا فرنیچر کا نام نہیں۔ ہماری عدالت عالیہ کی عمارت میں کوئی اور دفتر مثلاً سیکرٹریٹ بھی کھولا جا سکتا ہے۔ عدلیہ وہ ہے جو جج صاحبان آ کے بنائیں۔ ہمارے آئین کی رُو سے عدلیہ ایک آزاد ادارہ ہے۔ (تفصیلات کے لیے دیکھئے میرا مضمون "Answerability" جو اخبار "Nation" میں 21 دسمبر 2007ء کو چھپا) لیکن اگر جج صاحبان کی ذہنیت آزاد نہ ہو تو عدلیہ کبھی آزاد نہیں سمجھی جائے گی۔ پس کوئی ادارہ وہ ہے جو اس کے چلانے والے اسے بنائیں۔ اسی طرح سیاست ایک ادارہ ہے، جس کی نوعیت کا یعنی جس کے جمہوری ہونے یا نہ ہونے کا دار و مدار سیاستدانوں پر ہے۔ اگر سیاستدان جمہوری مزاج رکھتے ہیں تو سیاست جمہوری ہے ورنہ نہیں۔ صرف جمہوریت کا نام لینا کافی نہیں ہے۔ ایسی سیاسی جماعت جس کا رہنما نہایت اعلیٰ تعلیم کے باوجود اپنی جماعت کی قیادت کو موروثی منصب سمجھے تو وہ جماعت کیسے جمہوری ہو سکتی ہے اور کیسے جمہوریت کا بول بالا کر سکتی ہے۔ ہمارے سیاستدان اپنے ذاتی مفادات کو اوّل اور قومی مفادات کو آخر میں رکھتے ہیں اور ساتھ ہی جمہوریت کے علمبردار بھی بنتے ہیں۔ چہ خوب! ہمارے فوجی افسر آئین کی پاسداری کا حلف بھی اٹھاتے ہیں اور خود ہی

آئین کی توہین بھی کرتے ہیں۔ یہی حال ہماری اعلیٰ عدلیہ کا بھی ہے جو آئینی حلف کے باوجود فوجی غیر آئینی حکومت کو قانونی قرار دیتے ہیں۔ اگر آپ غور کریں تو ہر ادارے کا یہی حال ہے۔ ہم اصل مرض سے چشم پوشی کر رہے ہیں اور مرض کا علاج بھی ڈھونڈ رہے ہیں۔ جب تک آپ مرض کی صحیح تشخیص نہیں کریں گے علاج کیسے ممکن ہے۔ پاکستان کا اصل مرض یہی ہے جبکہ ہمارا مزاج ہی جمہوری نہیں ہے۔ بعض افراد تو یہاں تک واویلا کرتے ہیں کہ آخر ہندستان اور پاکستان میں کیا فرق ہے، اگر وہاں جمہوریت پنپ سکتی ہے تو یہاں کیوں نہیں۔ ایسے افراد یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم دو مختلف قومیں ہیں۔ پاکستان دو قومی نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آیا۔ ہمارا یہ حال ہے کہ جب مناسب سمجھا دو قومی نظریہ اپنا لیا اور جب مناسب سمجھا ردّ کر دیا۔ ہندستان اور پاکستان دو مختلف قومیں ہیں بلکہ بنگلہ دیش اور پاکستان بھی دو مختلف قومیں ہیں (تبھی تو الگ ہوئے) میں چونکہ ہندستان میں پیدا ہوا اور اٹھارہ برس کی عمر تک (یعنی 50ء تک) وہیں پلا بڑھا اس لیے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندستان، بنگلہ دیش اور پاکستان تین مختلف اقوام ہیں۔ ایک کا دوسرے سے مقابلہ کرنا غلط ہے۔ سنا ہے کہ پاکستان بننے سے قبل مسلمانوں کا ایک وفد ابوالکلام آزاد اور حسین احمد مدنی کے پاس انھیں سمجھانے گیا۔ ان بزرگوں نے کہا کہ ''ہم مسلمانوں کے دشمن نہیں ہیں بلکہ پاکستان کی مخالفت اس لیے کر رہے ہیں کہ جہاں پاکستان بنے گا وہاں کے لوگوں کا مزاج جمہوری نہیں ہے۔ پاکستان کی ریاست بھی ریاستِ رام پور سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوگی۔'' ہم نے اپنے کردار اور اعمال سے ان کی بات سچ ثابت کر دی ہے۔ انتخابات جمہوریت نہیں ہیں، صرف جمہوریت کے حصول کا ایک ذریعہ ہیں، لیکن ہم نے انتخابات میں بھی برادری، تعلق داری اور علاقہ داری کو فروغ دیا ہے، اصول کو نہیں۔ کیا یہی جمہوریت ہے؟

ہم حق بات کہنے سے گریز کرتے ہیں یا حق بات نہ کہنے کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ ایک ٹاک شو میں کراچی کے کسی صاحب نے فون پر یہ جاننا چاہا کہ سیاسی قیادت میں وصیت کیا معنی رکھتی ہے۔ میزبان وقت کی کمی کا بہانہ کر کے اس سوال کو گول کر گئے۔

جب تک ہم میں حق کہنے اور حق کر گزرنے کی جرأت نہیں آتی ہمارے ملک میں کچھ بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ نہ جمہوریت، نہ اشتراکیت، نہ اسلام، صرف ایک چیز کامیاب ہو سکتی ہے، آمریت۔

ازخواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز ازخواب گراں خیز۔'' (17)

بریگیڈیئر (ر) شمس الحق قاضی نے روزنامہ نوائے وقت لاہور میں ایک کالم بعنوان ''میرا مزاج لڑکپن سے ''آمرانہ'' ہوا'' لکھا تھا۔ یہ کالم دراصل پاکستان میں آمریت کی مختصر ترین تاریخ ہے اور اس سے جسٹس صمدانی کے اعتراف کی تائید ہوتی ہے۔ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں جمہوریت بھی آمریت نما ہی ہوتی ہے۔ قاضی صاحب نے اپنے اس کالم کے شروع میں ایک غلطی کی ہے، وہ یہ کہ انھوں نے آمریت کی تاریخ جناح صاحب کے انتقال کے بعد سے شروع کی ہے، جبکہ پاکستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ آمرانہ فیصلے تو خود جناح صاحب نے ہی کیے تھے، ہم نے اس کتاب کے باب نمبر 23 میں جناح صاحب کے نمونہ کے طور پر صرف چند آمرانہ فیصلے لکھے ہیں جبکہ ان کے آمرانہ فیصلے تو اس قدر ہیں کہ ان پر کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں:

''پاکستان کا سیاسی مزاج قائداعظم کے بعد فوراً ہی آمرانہ ہو گیا تھا۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ پاکستان کا سیاسی مزاج پنجابیانہ ہو گیا تھا۔ راقم نے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ تحریک پاکستان کے آخری اور اہم ترین دور میں جبکہ راقم نیو دہلی جی ایچ کیو میں سٹاف کیپٹن تھا تو اکثر خیال آتا تھا کہ مجوزہ پاکستان میں زیادہ ترقی یافتہ اور اہم صوبہ پنجاب ہوگا۔ جبکہ پنجاب ہمیشہ ہی ٹوڈی یعنی اسٹیبلشمنٹ کا غلام تصور کیا جاتا تھا۔
چنانچہ 3 جون کے اعلان پاکستان کے بعد بھی پنجاب کے زمیندار اور جاگیردار، انگریز ڈپٹی کمشنر سے پوچھتے تھے کہ صاحب بہادر! کیا آپ واقعی اب ہمیں چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ چنانچہ ہم سوچتے تھے کہ اگر ہماری سیاست پر پنجابیت چھا گئی تو ہمارے پیارے پاکستان کا کیا بنے گا؟ چنانچہ وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ قائداعظم کے بعد جناب لیاقت علی خان نے ایک طرف دستور نہیں بننے دیا تو دوسری طرف ہندستان سے مسلم لیگ کی اعلیٰ قیادت کو پاکستان نہ آنے دیا بلکہ 1946ء کے کلکتہ ڈائریکٹ

الیکشن کے ہیرو سہروردی کو تو پاکستان اسمبلی میں ہی نہیں بیٹھنے دیا۔ قائداعظم کی وفات پر جانشینی کے لیے قابل ترین امیدوار نواب اسماعیل خاں اور نواب بھوپال تھے۔ لیکن لیاقت علی خان نے بغیر کسی وسیع مشاورت کے کمزور ترین لیڈر خواجہ ناظم الدین کو قائداعظم کا جانشین یعنی ''گورنر جنرل'' نامزد کر دیا اور جب کسی نامعلوم سازش کے تحت لیاقت علی خان صاحب کو راولپنڈی کے جلسہ عام سے خطاب شروع کرتے ہی قتل کر دیا گیا اور جبکہ قاتل سیّد اکبر کو قابو میں کر لیا گیا تھا تو موقعہ پر موجود ڈی آئی جی پولیس نجف خان کے ڈائریکٹ اور بلند آواز حکم کے تحت موقع پر موجود تھانیدار نے سروس ریوالور سے سیّد اکبر کو قتل کر کے براہِ راست شہادت ختم کر دی تو بعد میں صدر ایوب خان نے اسی نجف خان کو اس اعلیٰ کارکردگی کی بناء پر اور بھی بڑے عہدے پر فائز کر دیا تھا۔

خواجہ ناظم الدین بہت کمزور انسان تھے۔ کسی اندرونی دباؤ کے تحت خود وزیراعظم بن کر اپنی جگہ ایک بیوروکریٹ غلام محمد کو قائداعظم کا جانشین یعنی گورنر جنرل لگا دیا۔ جناب لیاقت علی خان کو ایک ملٹری فنکشن میں اٹک چھاؤنی بلایا گیا تھا اور آپ کا پروٹوکول (جی ایچ کیو) میں راقم کے ذمہ تھا۔ اٹک میں ہم لیاقت علی خاں کے استقبال کی تیاریاں کر رہے تھے کہ جی ایچ کیو سے فون پر مجھے بلا کر بتایا گیا کہ لیاقت علی خان کو جلسہ عام میں خطاب شروع کرتے ہی گولی لگ گئی ہے اور ان کو سی ایم ایچ لے گئے ہیں۔ چونکہ لیاقت علی خان کے قتل کی کوئی زوردار تفتیش نہیں ہو سکی اس لیے معلوم نہیں ہو سکا کہ ملٹری فنکشن میں آتے ہوئے پنڈی میں جلسہ عام میں خطاب کرنے کے لیے تجویز کس نے دی تھی۔ دولتانہ صاحب وزیراعلیٰ پنجاب کے خاص مربی، آئی جی پولیس قربان علی خان کو کس نے سکیورٹی کا انچارج بنا دیا جبکہ وزیراعظم ڈیفنس منسٹر کی سکیورٹی جی ایچ کیو سے متعلق ہونی چاہیے تھی۔

اس وقت میرے اوپر افسر اعلیٰ کرنل خواجہ وصی الدین تھے جو گورنر جنرل اور اب نئے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کے داماد تھے۔ آپ کے والد خواجہ شہاب الدین گورنر سرحد تھے جبکہ اب نئی حکومت میں خواجہ ناظم الدین نے خود کو وزیراعظم بنا دیا اور بھائی خواجہ

شہاب الدین کو اپنی حکومت میں ہوم منسٹر لگا دیا گیا تھا۔ میں نے کرنل خواجہ وصی الدین صاحب کو کہا کہ آپ لوگوں نے سیاسی راستہ چھوڑ کر ایک بیوروکریٹ کو گورنر جنرل بنا کر اچھا نہیں کیا کیونکہ بیوروکریٹ اپنے سابقہ سرپرست سے حکمرانوں کے ہاتھ آسانی سے بک جاتا ہے، بہتر ہوتا اگر آپ نواب اسماعیل خاں یا نواب بھوپال میں سے کسی ایک کو ملا لیتے تو کرنل خواجہ وصی الدین نے جواب دیا کہ بطور وزیر خزانہ غلام محمد ہر کام میں رکاوٹ ڈالتا تھا اس لیے ہم نے اسے Kicked him up-stairs کر دیا ہے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ غلام محمد نے خواجہ صاحبان کو kick out کر دیا اور اس کے بعد پاکستانی سیاست پر مکمل پنجابیت چھا گئی اور اب ایوب خان نے حکومت پر قبضہ کر لیا تو قائداعظم کے سارے ساتھی آہستہ آہستہ ایوب خان کے زیرسایہ چلے گئے۔ مجھے سب سے زیادہ دکھ روزنامہ ڈان کے چیف ایڈیٹر بلکہ کنگ میکر جناب الطاف حسین کے منسٹر آف انڈسٹری قبول کرنے پر ہوا۔ میرے الطاف حسین صاحب سے گہرے فیملی تعلقات تھے۔ قائداعظم کے مقرر کردہ ایڈیٹر کی وجہ سے ڈان میں آپ کا رول پاکستان میں کنگ میکر کا تھا بلکہ وزیر بن کر آپ کی اتنی سبکی ہوئی کہ ڈان کے نئے مالکان ہارون صاحب نے ان کو اخبار سے نکال باہر کیا اور پھر جو مکان آپ کو پاکستان آنے پر ملا تھا اس سے بھی نکال باہر کرنے کی کارروائی شروع کر دی۔

بہرحال ایوب خان صاحب نے قائداعظم کو بھی پیچھے چھوڑ دیا اور اعلان کر دیا کہ پچھلے 50 سال میں پہلی بار برصغیر میں مسلمانوں کو ایوب خان کی صورت میں ایک اعلیٰ رہنما میسر ہوا ہے اور سرکاری میڈیا نے آپ کو ڈیگال آف ایشیا کا خطاب دے دیا۔ جیسا کہ بعد میں اسی میڈیا نے بھٹو صاحب کو فخر ایشیا کا خطاب دے دیا تھا۔

راقم جہلم میں سٹیشن کمانڈر تھا تو ایک تقریب میں چودھری ظہور الٰہی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ چودھری صاحب نے فرمایا کہ آپ کی جنرل ٹکا خان صاحب سے خاصی دوستی ہے تو آپ مہربانی کر کے ٹکا خان کو کہیں کہ حکومت پر قبضہ کر کے ہمیں بھٹو کی ظالمانہ آمریت سے نجات دلائیں۔ میں نے عرض کیا کہ چودھری صاحب سابق

فوجی حکمرانوں ایوب خان اور یحییٰ خان نے اپنے لیے حکومت پر قبضہ کیا تھا، سیاسی لوگوں کو دینے کے لیے نہیں اور ہوسکتا ہے کہ فوجی حکومت اور بھی زیادہ سخت گیر ہو۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ حکومت کی تبدیلی کے لیے سیاسی ذرائع استعمال کیے جائیں۔

پھر اس کے بعد ایک لطیفہ پیش آیا یعنی جنرل ضیاء الحق صاحب نے بھٹو حکومت کا تختہ الٹ دیا تو راقم صبح سویرے کالج روڈ پر پاکیزہ ہوٹل میں مقیم پروفیسر غفور احمد صاحب کے پاس حاضر ہوا، مبارک دیتے ہوئے عرض کیا کہ جنرل ضیاء الحق نے آپ کا کام کر دیا ہے اور آپ کو منتخب آمریت سے نجات دلوا دی ہے۔ تو پروفیسر صاحب نے فرمایا، مبارک کس بات کی دیتے ہیں، کل شاید پیپلز پارٹی سے مل کر ہمیں جنرل ضیاء الحق سے جان چھڑانی پڑے۔

یہ لطیفہ مجھے اس لیے یاد آیا ہے کہ آجکل جس تیزی سے آصف علی زرداری آمریت کے راستے پر دوڑ رہے ہیں، کل شاید عوام کو جنرل پرویز مشرف سے مل کر آصف زرداری سے جان چھڑانی پڑے۔" (18)

حقیقت یہ ہے کہ اس دور کے جو اہلِ بصیرت وفراست تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو آنے والے حالات سے آگاہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، لیکن مسلمانوں کی عقلوں پر ہی پردے پڑ گئے تھے۔ علامہ انور صابری برصغیر کے معروف و ممتاز شاعر تھے، انھوں نے تحریکِ آزادی میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا، قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ صابری صاحب نے "پاکستان میں کیا کیا ہوگا؟" کے عنوان سے ذیل کی نظم قیامِ پاکستان سے پہلے 1946ء کے انتخابات کے موقع پر کہی تھی اور یہ ہزاروں کی تعداد میں شائع ہو کر تقسیم ہوئی تھی۔ صابری صاحب نے اس نظم میں جن خدشات کا اظہار کیا تھا وہ تو قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی پورے ہو گئے تھے۔ اس نظم کو جماعت اسلامی پاکستان کے جریدے فرائیڈے اسپیشل کراچی نے 16 جنوری 2009ء کی اشاعت میں شائع کیا ہے، جسے ہم شکریہ کے ساتھ ذیل میں درج کر رہے ہیں:

پاکستان میں کیا کیا ہوگا؟

چار طرف میخانے ہوں گے — گردش میں پیمانے ہوں گے
رندوں کی شمشیر کے نیچے — مذہب کے دیوانے ہوں گے

ختم نئے ماحول کے اندر — واعظ کے افسانے ہوں گے
پاکستان میں کیا کیا ہو گا؟

دور نہ ہو گی فاقہ مستی — یونہی رہے گی فقر کی پستی
مٹ نہ سکے گی مٹ نہ سکے گی — دولت کی انسان شکستی
پاکستان کے اندر ہو گی — دولت مہنگی غربت سستی
پاکستان میں کیا کیا ہو گا؟

تا بہ حدِ معراج کریں گے — جشنِ تخت و تاج کریں گے
مذہب ہی کی اوڑھ کے چادر — مذہب کو تاراج کریں گے
ابن علیؑ کے دشمن بن کر — شمر کے بیٹے راج کریں گے
پاکستان میں کیا کیا ہو گا؟

غیروں سے یارانے ہوں گے — اپنے سب بیگانے ہوں گے
شمع بنے گا خونِ غریباں — روشن عشرت خانے ہوں گے
پرجا کے غمگین دلوں پر — راجا خنجر تانے ہوں گے
پاکستان میں کیا کیا ہو گا؟

رحم سے خالی ہر دل ہو گا — حاکم جور پہ مائل ہو گا
ڈوبے گی ایمان کی کشتی — غرقِ طوفاں ساحل ہو گا
بھیس میں انساں کے خود انساں — انسانوں کا قاتل ہو گا
پاکستان میں کیا کیا ہو گا؟

زرداروں کی عزت ہو گی — ہر مفلس کی درگت ہو گی
رسوا ہو گا نام محبت — اوج پہ جنسِ نفرت ہو گی
پیکرِ عصمت، زینتِ خانہ — بازاروں کی زینت ہو گی
پاکستان میں کیا کیا ہو گا!

پیغمبر اعظم وآخر صلی اللہ علیہ وسلم نے علماء کو انبیاءؑ کا وارث قرار دیا ہے۔ علمائے کرام نے ہمیشہ دینِ اسلام کے محافظ و داعی کا کردار ادا کیا ہے اور وہ ہر دور میں دینِ اسلام کے فروغ کے

لیے کوشاں رہے ہیں اور ہر قسم کی قربانیاں دیتے چلے آ رہے ہیں۔ برصغیر کی تحریکات آزادی میں بھی علمائے حق نے ہراول دستہ کا کردار ادا کیا ہے۔ جو لوگ علمائے کرام سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں وہ دراصل دین سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ جناح صاحب جس مشن پر کام کر رہے تھے، اس کے لیے ضروری تھا کہ معاشرے سے علماء کے وقار کو ختم کیا جائے۔ اس لیے انھوں نے اپنی سی سعی کی۔ انھیں کسی حد تک لیکن وقتی کامیابی ہوئی اور بعد میں جب جناح صاحب کا جھوٹ عوام پر واضح ہو گیا۔ ان کی سیاست بد کے نتائج سامنے آئے تو برصغیر کے مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ کل بھی علماء کا موقف درست تھا اور آج بھی۔ مسٹر جناح کانگریسی علماء کے خلاف بات نہیں کرتے تھے۔ وہ بحیثیت مجموعی علماء کے خلاف نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں صرف تین حوالے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جس سے ان کی علماء بیزاری، جو دراصل دین بیزاری ہے، کے بارے میں جاننے کا موقع ملے گا۔ پہلا حوالہ دراصل ایک پیغام نما خط ہے جو انھوں نے 1942ء میں پروفیسر محمد منظور الحق صدیقی ''صدر مجلس استقبالیہ اجلاس ثانی پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن'' کے نام لکھا تھا، صدیقی صاحب نے جناح صاحب کا یہ پیغام اجلاس عام میں پڑھ کر سنایا تھا۔ یہ خط جناب جمیل الدین احمد کی مرتبہ کتاب: سپیچز اینڈ رائٹنگز آف جناح مطبوعہ: 1952ء میں شامل ہے، اس خط کا اُردو ترجمہ صدیقی صاحب نے اپنی کتاب مآثر الاجداد کے صفحہ 404 کے حاشیہ میں شائع کر دیا تھا۔ اس خط میں جناح صاحب نے اپنی علماء بیزاری کا اظہار کیا ہے اور علماء کو قوم کا سب سے ناپسندیدہ رجعت پسند عنصر قرار دیا ہے اور اسے اپنا کارنامہ قرار دیا ہے کہ ہم نے قوم کو ان کے اثرات سے پاک کر دیا ہے۔ اس خط میں جناح صاحب لکھتے ہیں:

''ہم بڑی حد تک اپنی قوم کو سب سے ناپسندیدہ رجعت پسند عناصر سے پاک کر چکے ہیں۔ ہم نے کسی حد تک اس خاص طبقہ کے اثر کو زائل کر دیا ہے، جو مولانا اور مولوی کہلاتے تھے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ ہماری جدوجہد میں ہماری خواتین ہمارے ساتھ رہیں، جہاں جہاں میں گیا انھوں نے اجتماعات میں شرکت کی اور بہت سی چیزوں میں بڑی دل چسپی ظاہر کی۔''(19)

جناح صاحب نے اوپر درج خط میں علمائے کرام کے لیے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ ان کی وقتی رائے نہیں تھی۔ آپ اسے سبقت قلم کا نتیجہ بھی نہیں کہہ سکتے اس لیے کہ وہ اس رائے

اظہار بار بار کرتے رہے۔ 5 فروری 1938ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا سے خطاب میں مسلم لیگ کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

''مسلم لیگ نے آپ کو مسلمانوں کے رجعت پسند عناصر سے آزادی دلا دی ہے۔ اس نے آپ کو مولویوں اور مولاناؤں کے ناپسندیدہ عناصر سے بھی نجات دلا دی ہے۔''(20)

جناح صاحب نے کلکتہ میں مسلم لیگ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

''ہم کسی حد تک اپنے لوگوں کو ناپسند رجعت پسند عناصر سے، جن کو عرفِ عام میں مولوی، مولانا کہا جاتا ہے، آزاد کرانے میں کامیاب ہوئے ہیں مگر ان کا پرخوف اور مضر اثر مکمل طور پر دور نہیں ہوا ہے۔''(21)

حضرت جبریل امین علیہ السلام اللہ تعالیٰ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان واسطہ ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اُمت کے درمیان واسطہ ہیں۔ اسی طرح نبی اکرمؐ اور امت کے درمیان علمائے کرام بھی ایک واسطہ ہیں۔ جو شخص علمائے کرام کو مجروح کرتا ہے وہ اصل میں نبی اکرمؐ اور اُمت کے درمیان ایک واسطے کو مجروح کرتا ہے اور اس کا مقصد دراصل دین کو مجروح کرنا ہوتا ہے۔ تحریک پاکستان میں جو علماء و مشائخ شریک تھے وہ حیات ہوتے تو میں ان سے پوچھتا کہ جو شخص اس قدر علماء بیزار یعنی دین بیزار تھا، نبی اکرمؐ اور امت کے درمیان واسطہ کو مجروح کرتا تھا، اُس سے آپ اسلامی ریاست کی تشکیل اور اسلامی قوانین کے نفاذ کی توقع رکھتے تھے؟

پاکستان میں اگر دیکھا جائے تو زیادہ عرصہ مسلم لیگ کی ہی حکومتیں رہی ہیں، لیکن نہ جناح صاحب نے اپنے دورِ حکومت میں نفاذِ اسلام کے لیے کوئی پیش رفت کی اور نہ ان کے بعد کے لیگی رہنماؤں نے کوئی سعی کی۔ جناح صاحب نے جوگندر ناتھ منڈل کو ''اسلامی مملکت'' کا پہلا وزیر قانون بنایا ہی اس لیے تھا کہ کہیں اسلامی ذہن رکھنے والے ارکان اسمبلی اپنا جمہوری حق استعمال کر کے ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ میں کامیاب نہ ہو جائیں جبکہ منڈل مسلمان بھی نہیں تھا، مسلم لیگ کا رکن بھی نہیں تھا، اسمبلی کا رکن بھی نہیں تھا اور ہندو بھی تھا۔ اس سلسلے میں وزیر اعظم لیاقت علی خاں کی جو سوچ تھی وہ ذیل کے حوالوں میں پڑھ لیجیے۔ پروفیسر خالد شبیر احمد لکھتے ہیں:

’’اسمبلی میں قرار دادِ مقاصد پاس ہوئی کہ پاکستان پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ہوگی لیکن یہ دھوکا اس تاویل کے تحت دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت عوامی نمائندوں کے ذریعے قائم کی جائے گی لیکن عوامی نمائندے کون تھے؟ وہی جو پروردگان فرنگ تھے اور جن کی سرشت میں اسلام نام کی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی تھی۔ چنانچہ خود ساختہ عوامی نمائندے ہی اسلام نہیں چاہتے تھے تو پھر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کیسے قائم ہوتی۔ منطقی نتیجہ یہ تھا کہ حاکمیت کو قائم ہونا تھا، نہ آج تک اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پاکستان پر قائم ہو سکی۔ اس وقت بھی قرار دادِ مقاصد محض اس لیے پاس ہو گئی تھی کہ مولانا شبیر احمد عثمانی زندہ تھے جنھوں نے قیامِ پاکستان کے لیے مسلم لیگ کا بھرپور ساتھ دیا اور ان کی وجہ سے ہی سلہٹ اور سرحد کا ریفرنڈم مسلم لیگ کے حق میں ممد و معاون ثابت ہوا تھا لیکن مولانا شبیر احمد عثمانی کے ساتھ جو سلوک مسلم لیگ کی قیادت نے بعد میں کیا وہ ہماری پامال تاریخ کا اہم حصہ ہے اور یقیناً تمام اہلِ دانش اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔ جب میں بہ سلسلۂ ملازمت ’’گورنمنٹ ایس۔ ای کالج‘‘ بہاولپور میں بطور پروفیسر کام کر رہا تھا تو اکثر و بیشتر میری ملاقاتیں ایک بزرگ اور دیندار شخصیت سے ہوتی تھیں۔ یہ ’’صحرائی صاحب‘‘ تھے وہ اسی نام سے ہر جگہ ہر خاص و عام میں معروف تھے۔ میرے دوست پروفیسر فروغ جلیل کے والد محترم اور اکثر میرے ساتھ مسلم لیگ کی حمایت میں بحث و مباحثہ کرتے رہتے تھے۔ ایک دن انھوں نے مجھے یہ بات بتائی کہ میں تو تمھارے ساتھ مذاق میں بحث کرتا رہتا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم ٹھیک کہتے تھے کہ مسلم لیگ سے اسلام کا یہ بھاری پتھر نہ اٹھایا جا سکے گا۔ انھوں نے کہا، میرے پاس اس بات کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ بہاولپور میں آخری مرتبہ تشریف لائے تو وہ حالت بخار میں تھے، کسی عقیدت مند نے ان کی زندگی اور صحت کی دعا مانگی تو حضرت مولانا عثمانی رحمہ اللہ نے، جن کی وجہ سے ہم مسلم لیگ میں تھے، میری موجودگی میں جواباً کہا تھا کہ ’’کیسی زندگی اور کیسی صحت؟ میں تو اس دن ہی مر گیا تھا جس دن مجھے لیاقت علی خان نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ حضرت! اب آپ گھر پر تشریف رکھیں، جب کبھی آپ کی مشاورت درکار ہوگی ہم خود آپ کے پاس

آجایا کریں گے۔ اسلام کے لیے آپ کو نہ تو اب زیادہ سرگرم ہونے کی ضرورت ہے اور نہ ہی مضطرب ہونے کی۔‘‘ پھر روایت یہ بھی ہے کہ مولانا عثمانی رحمہ اللہ کی وفات کے بعد ان کی اہلیہ محترمہ کو سرکاری اقامت گاہ میں عدت کی مدت بھی پوری نہ کرنے دی گئی۔‘‘ (22)

سابق وفاقی وزیر ریلوے جناب میاں عطاء اللہ نے ایک انٹرویو میں بتایا:

’’میرے والد میاں محمد عبداللہ کراچی میں قومی اسمبلی کے اجلاس میں گئے تو کسی بات پر لیاقت علی خاں نے اُن سے کہا کہ ہم نے پاکستان ڈاڑھی والوں کے لیے نہیں بنایا۔ چنانچہ اس کے بعد وہ اسمبلی کے اجلاس میں ہی نہیں گئے۔‘‘ (23)

جبکہ بعض مسلم لیگی بقول محمد ایوب کھوڑو: ’’الو کے پٹھے‘‘ آج 63 سال بعد بھی تسبیح پڑھ رہے ہیں کہ جناح صاحب پاکستان کو اسلامی ریاست بنانا چاہتے تھے، اسلامی قوانین کی تجربہ گاہ بنانا چاہتے تھے۔ جبکہ اس بارے میں ہندستان کے ممتاز دانشور عالم دین جناب مولانا وحید الدین خاں کی رائے و تبصرہ بہت مبنی بر حقیقت ہے۔ مولانا واشگاف الفاظ میں لکھتے ہیں:

’’یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ پاکستان کی تحریک کی قیادت مسٹر طبقہ نے کی۔ علما کا طبقہ تقریباً 99 فیصد اس سے الگ رہا۔ بالفاظ دیگر پاکستان کی تحریک ایک قومی اور ماڈی تحریک تھی۔ وہ کسی بھی درجہ میں کوئی مذہبی یا اسلامی تحریک نہ تھی۔ مگر عوام کا استحصال کرنے کے لیے مسلسل طور پر اس کے حق میں اسلام کا نام استعمال کیا گیا۔ اس کی حمایت میں یہ لفظی نعرہ وضع کیا گیا کہ: پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ۔

ایک قومی تحریک کو اسلامی تحریک بنانا سراسر دو عملی کا ایک فعل تھا۔ یہ وہی چیز تھی جس کو شریعت کی زبان میں منافقت کہا جاتا ہے۔ یہ منافقانہ سیاست کا ایک ایسا واقعہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال اسلام کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منافقانہ روش پاکستان کی تمام پالیسیوں کا اہم ترین عنصر بن گیا۔ ہر غیر دینی کام کو دینی اصطلاح میں بیان کرنا پاکستان کے دانش وروں کا کمال قرار پایا۔ اسلام کی پوری تاریخ میں میرے علم کے مطابق، کوئی بھی مسلم گروہ ایسا نہیں جس نے منافقت ہی کو اپنی تمام پالیسیوں کی بنیاد بنایا ہو۔ تقسیم کے نتیجے میں بننے والا مسلم ملک ہی اس کی

واحد تاریخی مثال ہے جس کو برعکس طور پر پاکستان کہا جاسکتا ہے۔‘‘(24)

جناح صاحب پاکستان میں کس طرح کی حکومت چاہتے تھے؟ وہ درج ذیل خط سے عیاں ہو جائے گا۔ یہ خط روزنامہ جنگ لاہور میں بعنوان: ’’قائداعظم کیسا پاکستان چاہتے تھے‘‘ شائع ہوا تھا۔ پڑھیے:

’’مکرمی! یہ ان دنوں کی بات ہے جب مولانا عبدالستار خاں نیازی ہمیں اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) لاہور میں اسلامیات پڑھایا کرتے تھے۔ 1946ء کے آغاز میں جب حضرت قائداعظم مرحوم ومغفور لاہور تشریف لائے، آپ ان سے ملاقات کرنے کے بعد کلاس میں تشریف لائے اور فرمایا، ’’لڑکو! میں آج قائداعظم سے مل کر آیا ہوں اور بہت مایوس ہوا ہوں، اس لیے کہ میں نے ان سے پوچھا کہ ’’آپ پاکستان میں کس قسم کی حکومت قائم کریں گے؟‘‘ تو انھوں نے بلاتامل فرمایا کہ ’’جس طرح کی حکومت اتاترک نے ترکی میں قائم کی تھی۔‘‘

چونکہ یہ تاریخ ساز بات ہے، اس لیے یقیناً مولانا کو بھی یاد ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ میرے تب کے کافی ساتھی ابھی پاکستان میں زندہ سلامت ہوں گے۔ بہت ممکن ہے کہ کینیڈا میں سے بھی کوئی عینی اور تائیدی شاہد مل جائے وگرنہ:

مجھے سب یاد ہے ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اور میں بیان حلفی دینے کے لیے تیار ہوں۔ اس سلسلہ میں مجھے صرف اور صرف اُس دوٹوک فیصلے کی تائید یا تردید چاہیے۔ کسی کے جذبات، احساسات، تفکرات یا نظریات سے مجھے کوئی غرض نہیں۔ گستاخی معاف، مولانا کیا ان دنوں مسلمانانِ ہند کے بیسویں صدی کے ’’سیاسی مجدد‘‘ اور ملت اسلامیہ کی کشتی کے ’’ناخدا‘‘ کے فرمودات کی صریحاً خلاف ورزی نہیں ہو رہی؟ کیا ان کے افکار کی سراسر نفی نہیں کی جا رہی؟ مجھے اپنے استادِ محترم سے ہاں یا نہ میں جواب کا انتظار رہے گا۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ صحیح فیصلہ قوم خود کرے گی۔

حسن اختر مرزا

مسی ساگا، کینیڈا‘‘(25)

جناب مجید نظامی نے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج یونیورسٹی لاہور کی 150 سالہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اعتراف کیا:

’’63 برس ہو چکے ہیں ہم نے ملک کو اسلامی فلاحی جمہوری مملکت کا کہہ کر نعرہ لگایا مگر نہ ہی پاکستان اسلامی بنا، نہ فلاحی اور نہ ہی جمہوری بن سکا اس وجہ سے ہم پر اللہ کا عذاب نازل ہو رہا ہے۔‘‘(26)

نظامی صاحب نے ایوان کارکنان تحریک پاکستان لاہور میں منعقدہ ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

’’میں تمام مسلم لیگیوں کو متحدہ دیکھنا چاہتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اس ملک کو وہی مسلم لیگ ٹھیک طرح چلا سکتی ہے جس نے اس ملک کو قائم کیا ہے۔‘‘(27)

نظامی صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے وقت ہم نے جو نعرہ لگایا تھا، 63 برس بیت جانے کے باوجود پاکستان اسلامی فلاحی جمہوری مملکت نہیں بن سکا۔ جس کی وجہ سے ہم پر اللہ کا عذاب نازل ہو رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مسٹر جناح اور ان کے حوارین کے اور اُن کی جماعت مسلم لیگ کے سوا اس کا ذمہ دار کون ہے۔ دوسری تقریر میں نظامی صاحب خواہش مند ہیں کہ مسلم لیگ متحد ہو اور ملک کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہو۔ جبکہ یہ حقیقت ہے کہ ملک کو سب سے زیادہ نقصان ہی مسلم لیگ نے پہنچایا ہے۔ پاکستان کو اسلامی، فلاحی، جمہوری ریاست بننے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمیشہ مسلم لیگ ہی رہی ہے۔ ملک میں تمام مارشل لاء اسی جماعت کے مرہون منت ہیں۔ ممتاز دانشور اور تجزیہ نگار جناب ارشاد احمد حقانی نے اپنے کالم ’’حرفِ تمنا‘‘ میں بعنوان ’’نئی مسلم لیگ-توقعات اور چیلنج‘‘ لکھا تھا:

’’پاکستان کی چھپن سالہ تاریخ میں بننے اور بگڑنے والی مسلم لیگوں اور ان کی قیادتوں میں سے اکثر کا کردار اور طرزِ عمل ناقابلِ رشک رہا ہے۔ مسلم لیگیوں کو بالعموم (مجھے افسوس سے یہ لکھنا پڑ رہا ہے) اقتدار پرست، ہوا کے رخ چلنے والے، بے اصول، ابن الوقت اور مفاد پرست کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان کی 56 سالہ تاریخ پر نظر ڈال لیجیے۔ مسلم لیگیوں یا مسلم لیگی کہلانے والوں کا کردار انھی خصوصیات سے عبارت نظر آئے گا۔‘‘(28)

جناب ڈاکٹر محمد اجمل نیازی اپنے کالم ''بے نیازیاں'' میں بعنوان ''وکی لیکس اور وکی لیگ'' لکھتے ہیں:

''ایک دوست کو وکی لیگ بنانے کا خیال آ رہا ہے۔ اس وقت دس بارہ مسلم لیگوں میں ایک بھی نہیں جو کسی نہ کسی وقت جرنیلوں کے اقتدار کے لیے سیڑھی نہ بنی ہو۔ سیاسی آمر بھی اسے اسی مقصد کے لیے استعمال کرتے رہے۔ نوابزادہ نصراللہ خاں نے کہا تھا کہ مسلم لیگ جرنیلوں کی لونڈی ہے۔ پیپلز پارٹی بھی پیپلز لیگ بنتی جا رہی ہے مگر مسلم لیگ مسلم پارٹی کبھی نہیں بن سکے گی۔ وکی لیگ کا سربراہ امریکی سفیر کو بنا دیا جائے۔''(29)

اِس باب کو ہم اُس دور کی ایک علمی و روحانی شخصیت مولانا عبدالقادر رائپوری کے ایک ملفوظ پر ختم کرتے ہیں۔ حضرت مولانا خانقاہ رحیمیہ رائے پور (ضلع سہارنپور) کے مسند نشین تھے۔ مولانا نے یہ ملفوظ تقسیم ہند سے قبل 6 ذی الحجہ 1365ھ مطابق یکم نومبر 1946ء کو خانقاہ کی ایک مجلس میں ارشاد فرمایا تھا، پڑھیے، سر دُھنیے اور داد دیجیے کہ یہ عالم یہ درویش ایک قصبے کی خانقاہ میں بیٹھ کر کس فہم و فراست اور دور اندیشی کی باتیں کر رہا تھا۔ وہ کس اعتماد اور تیقن کے ساتھ آنے والے حالات و کیفیات سے آگاہ کر رہا تھا۔ حضرت مولانا نے فرمایا:

''آج کل شخصی حکومتیں ہرگز نہیں چل سکتیں۔ آج کل تو جمہوری اور شورائی حکومتیں ہی چل سکتی ہیں۔ جن میں کچھ لوگوں کا مخالف رہنا عین اصولی بات ہے۔ یہاں (ہندستان میں) تو بھلا غیر مسلم ہیں۔ حجاز، عراق، شام، ایران وغیرہ میں تو غیر مسلم نہیں ہیں، مگر وہاں کے ''پاکستانی'' بھی کوئی ترقی نہیں کر رہے۔ حجاز میں تو بھلا مانس ابن سعود اتنا بھی نہیں کر سکتا کہ زراعت کو پھیلا کر ملک کو غذا کی کمی اور احتیاج سے نجات کا سامان کرے۔

ہاں! ہندستان اگر ایک مرکز پر آزاد ہو جائے تو اپنی آبادی اور وسائل کے لحاظ سے بیس سال میں دنیا کو مات دے سکتا ہے۔ روس کی پندرہ کروڑ کی آبادی کی دنیا تاب نہیں لا سکتی۔ ہندستان کے چالیس کروڑ میں سے آپ خیال کریں کتنے ذہین لوگ مہیا ہو سکتے ہیں اور اگر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے تو یہ افغانستان، ایران، عراق، شام،

حجاز، نجد، یمن اور شرق اُردن وغیرہ (ممالک) کی طرح بڑی (سامراجی) سلطنتوں کی حرص و آز کا شکار ہوتے رہیں گے۔''(30)



حوالہ جات

(1) ہفت روزہ ہم شہری لاہور/25 دسمبر 2010ء/ص 46

(2) قائداعظم کے رفقاء سے ملاقاتیں/ مرتبہ: سیّد محمد ذوالقرنین زیدی/ قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، اسلام آباد/1990ء/ص 59

(3) قائد اعظم: بحیثیت گورنر جنرل/ قیوم نظامی/ جہانگیر بکس، لاہور/2010ء/ص:79

(4) قائداعظم کے رفقاء سے ملاقاتیں/ ص:82

(5) ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ لاہور/اگست 1970ء/ص 12-11

(6) ماہنامہ میثاق لاہور/جنوری 1986ء/ص 43

(7) ذوق پرواز (آپ بیتی)/ محمد صدیق/ انشریات، لاہور/ اشاعت دوم: 2009ء/ص:200

(8) روزنامہ الجمعیت دہلی/28 اپریل 1946ء

(9) ماہنامہ ملّیہ فیصل آباد/ جنوری 2007ء/ص 3

(10) روزنامہ نوائے وقت لاہور/23 جولائی 2011ء

(11) روزنامہ جنگ لاہور/21 مئی 2011ء

(12) جناب ڈاکٹر منظور احمد کا یہ مقالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور کے شمارہ بابت 25 اگست 2008ء میں شائع ہوا تھا لیکن میرے پیشِ نظر اس کی انٹرنیٹ سے لی گئی فوٹو کاپی ہے، جو میرے عزیز دوست جناب شبیر احمد خاں میواتی نے مجھے مہیا فرمائی ہے۔ شکریہ۔

(13) مولانا ابوالکلام آزاد کے انکشافات/ شکیل احمد ضیاء/ شبل پبلی کیشنز، کراچی/ مارچ 1988ء/ص:26-29

(14) ایضاً/ص:50-52

(15) ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور/7 نومبر 1975ء/ص 20

(16) روزنامہ نوائے وقت لاہور/9 جنوری 2008ء

(17) روزنامہ نوائے وقت لاہور/24 جولائی 2008ء

(18) روزنامہ نوائے وقت لاہور

(19) قائداعظم اور راولپنڈی/ منظور الحق صدیقی/ قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، اسلام آباد/1983ء/ ص46

(20) قائداعظم: تقاریر و بیانات/ ص218

(21) Foundation of Pakistan, Documents of All Indian Muslim League, vol. 11, p. 290

(22) ماہنامہ الاحرار لاہور/ دسمبر 2006ء/ ص42

(23) روزنامہ نوائے وقت (سنڈے میگزین) لاہور/ یکم اکتوبر 2000ء/ ص3

(24) ہند۔ پاک ڈائری/ مولانا وحید الدین خاں/ گڈ ورڈ بکس، دہلی/2006ء/ ص90

(25) روزنامہ جنگ لاہور/31 جولائی 1994ء

(26) روزنامہ نوائے وقت لاہور/10 مئی 2010ء

(27) روزنامہ نوائے وقت لاہور/7 دسمبر 2010ء

(28) روزنامہ جنگ لاہور/10 ستمبر 2003ء

(29) روزنامہ نوائے وقت لاہور/13 ستمبر 2010ء

(30) ارشادات حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائپوری/ مولانا محمد عبداللہ/ ص:102

26

پاکستان کے عوام گزشتہ 63 سال سے جن بدترین حالات و واقعات سے دوچار ہیں، اس کے اصل ذمہ دار جناح صاحب ہیں۔ ان کا جرم عظیم یہ ہے کہ انھوں نے جھوٹ، فریب اور دھوکا دہی سے ہندستان کے مسلمانوں کو اپنے وطن اور اپنی دھرتی سے نکلوایا، جہاں وہ گزشتہ تیرہ سو سال سے آباد چلے آ رہے تھے اور جہاں انھوں نے کم و بیش ایک ہزار سال تک حکومت کی تھی۔ جہاں وہ اقلیت میں نہیں تھے بلکہ دوسری بڑی اکثریت کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ وہ خطہ تھا جہاں مسلمان اس رفتار سے بڑھ رہے تھے کہ بہت جلد وہ پہلی بڑی اکثریت بن جاتے۔ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب تفہیمات الٰہیہ میں اپنا ایک الہامی کشف تحریر فرمایا ہے:

> ”ایک وقت آئے گا کہ ہندستان کی اکثریت کے شرفا اسلام قبول کر لیں گے اور تاتاریوں کی طرح اس قوم کے ہاتھوں میں بھی توحید اسلامی کا پرچم ہوگا۔“ (1)

علامہ اقبال نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الٰہ آباد، دسمبر 1930ء میں پیش کیے گئے خطبۂ صدارت میں ہندستان کو نا صرف اپنا وطن قرار دیا تھا بلکہ کہا تھا کہ ہندستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ انھوں نے کہا تھا:

> ”ہندستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ ہندستان ہمارا وطن ہے جس میں ہمیں جینا اور مرنا ہے۔ ہندستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے۔“ (2)

جناح صاحب نے مسلمانوں کو اپنے وطن ہندستان سے نکلوا کر ایک کونے میں لا کر ڈال دیا

تھا جبکہ یہاں تو وہ پہلے ہی اکثریت میں تھے اور یہاں اُن پر جناح صاحب نے اپنے کھوٹے سکوں کو مسلط کر دیا تھا، دراصل انھوں نے یہ ملک بنایا ہی ان کھوٹے سکوں کے لیے تھا۔ جو چند ایک کے استثناء کے سوا تمام کے تمام مسلمانوں کے غدار اور انگریز کے وفادار ایجنٹ تھے۔ جنھوں نے اپنی غداری کے صلے میں انگریزوں سے بڑی بڑی جائدادیں اور مراعات حاصل کی تھیں۔ بعد میں بقول ڈاکٹر صفدر محمود اُن کھوٹے سکوں کے کھوٹے سکے پاکستان پر مسلط ہو گئے اور آج ہم ان کھوٹے سکوں کی دوسری اور تیسری نسل کے زیرِ تسلط ہیں۔ دراصل انگریز نے یہ ملک اپنے اِن وفاداروں کو ان کی خدمات [یعنی مسلمانوں سے غداری اور انگریز سامراج سے وفاداری] کے صلے کے طور پر بنا کر دیا تھا۔ پاکستان کا یا پاکستانی عوام کا ان کے چنگل سے نکلنا اب ناممکن ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ پاکستان میں یہ لوگ جائز و ناجائز ذرائع سے دولت حاصل کر کے امیر سے امیر تر ہو گئے ہیں، جبکہ غریب غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ تقسیمِ برصغیر سے پہلے یہ لوگ برطانیہ کے وفادار تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد سے یہ امریکا کے آلۂ کار ہیں۔ 1947ء سے یہی لوگ اس ملک و قوم پر قابض ہیں اور یہی لوگ یہاں عیش کر رہے ہیں۔ یہی لوگ اسمبلیوں میں جاتے ہیں اور یہی لوگ اہم سرکاری عہدوں پر فائز ہوتے ہیں۔ یہی صدر، وزیر اعظم اور وزیر داخلہ و خارجہ وغیرہ وغیرہ بنتے ہیں۔ ان جاگیرداروں کے بارے میں روزنامہ نوائے وقت لاہور کے کالم نگار معروف دانشور جناب غازی احمد حسن کھوکھر بعنوان: ''جاگیردار تاریخ کے آئینے میں'' نوائے وقت گروپ آف پبلی کیشنز کے ہفت روزہ ندائے ملت لاہور میں لکھتے ہیں:

''انگریز نے جب برصغیر میں قدم جمائے تو اس نے بڑے بڑے راجے، مہاراجے، برہمن، جاگیرداروں، گدی نشینوں، سرداروں، خانوں، چودھریوں کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے جاگیریں عطا کرنے کا اعلان کیا اور نوید سنائی کہ انگریز سرکار کسی بھی جاگیردار سے جاگیر واپس نہیں لے گی، بلکہ جاگیردار کے مرنے کے بعد بھی جاگیر اُس کی اولاد کو منتقل ہو جائے گی۔ اس طرح موروثی جائیداد کا رواج بلکہ قانون بن گیا، کیونکہ پہلے صدیوں سے یہ رواج تھا کہ جاگیردار کے پاس اُس وقت تک جاگیر رہ سکتی تھی جب تک بادشاہ اُس سے خوش رہتا۔ بادشاہ کی ناراضگی جاگیر سے محرومی ہوتی تھی، اس لیے جاگیردار بادشاہ اور اُس کے کارندوں کی خوشامد میں جتا رہتا تھا۔ اسے خوف رہتا

تھا کہ کہیں بادشاہ کا کارندہ بھی ناراض ہو گیا تو جاگیر چھین لی جائے گی اور جب اپنی اولاد اور خاندان کے سامنے بادشاہ اور اُس کے کارندے، جاگیرداروں سے جائز ناجائز مطالبات منواتے اور یہ لوگ اُن کے سامنے مجبور ہو جاتے اور اسی محرومی اور صدیوں سے خوشامد اور چاپلوسی سے تنگ جاگیرداروں نے جب انگریز سرکار کا یہ اعلان سنا تو وہ فوری طور پر انگریز سرکار کے حامی بن گئے، اسی دن دھرتی سے بیوفائی کا آغاز ہوا۔ انگریز سامراج نے اپنے مخالف آواز اٹھانے والوں کو باغی قرار دیا اور انھیں جاگیرداروں، وڈیروں اور مخدوموں کی مدد سے کیفرِ کردار تک پہنچایا۔ جب برطانوی سامراج کے خلاف آواز اٹھائی گئی تو یہ لوگ انگریز کے ساتھ رہے، جب پاکستان بننے لگا اور برطانوی سامراج نے محسوس کر لیا کہ اب اسے ہر حالت میں برصغیر چھوڑنا ہے تو اس نے آخری سالوں میں اپنے ہمنواؤں کو بھی مسلم لیگ میں شامل ہونے کا اشارہ کر دیا تاکہ جب پاکستان بن جائے تو یہ بھی تحریک آزادی میں شامل تصور کیے جائیں۔ یہی ''ہوا'' کہ آخری وقت سندھ، سرحد، بلوچستان اور پنجاب سے جاگیردار لوگ مسلم لیگ میں شامل ہونا شروع ہو گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ابھی تک پاکستان پوری طرح سنبھل نہ سکا تھا کہ یہ بااثر جاگیردار مضبوط ہوتے گئے اور عام لوگ جوش و جذبے اور خوش فہمیوں میں مبتلا رہے۔ بھارت نے جاگیرداری نظام ختم کر کے ساڑھے بارہ ایکڑ سے زیادہ کسی کے پاس زمین نہیں رہنے دی اور اسمبلی سے بل بھی پاس کروا لیا، جبکہ پاکستان میں جاگیرداری نظام مضبوط سے مضبوط ہوتا گیا۔ بالآخر تقریباً 20 سال بعد سندھ کے ایک بہت بڑے جاگیردار نے ایک پارٹی کی بنیاد رکھی جس کو پیپلز پارٹی کا نام دیا گیا، کیونکہ اس وقت عوام میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف سخت نفرت پروان چڑھ چکی تھی کہ پاکستان کو بنانے اور لاکھوں قربانیاں دینے کا آخر کیا فائدہ ہوا۔ ایک طرف یہ نفرت، دوسری طرف مارشل لاء کی طوالت دونوں نے مل کر عوام کے دلوں میں ایسا ''لاوا'' پکایا کہ جب بھٹو نے روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ لگایا تو عوام نے سمجھا کہ شاید یہی وہ ''مسیحا'' ہے۔ عوام کے جذبات اور ''دکھتی رگ'' پر میر ذوالفقار علی بھٹو نے ہاتھ رکھا، عوام اٹھ کھڑے ہوئے

کہ اب محرومیاں ختم ہوں گی، غربت ختم ہوگی۔ حالانکہ یہ سوچ ان کی غلط تھی، غریب پھر بھی غریب رہا۔ سیاسی پارٹیوں میں بھی دولت مند لوگوں کو مسلط کیا جاتا ہے، غریب کارکن غریب کی حمایت نہیں کرتا۔‘‘(3)

مسلم لیگ ابتدا سے قیامِ پاکستان تک جاگیرداروں کی جماعت تھی اور قیامِ پاکستان سے بہت بعد تک جاگیرداروں کی ہی پارٹی رہی ہے۔ 1946ء کے الیکشن میں مسلم لیگ اوّل و آخر جاگیرداروں اور نوابوں کی جماعت تھی۔ مگر جھوٹ اور ڈھٹائی کی انتہا دیکھیے کہ مسٹر جناح لاہور کے ایک جلسہ عام میں عوام سے پوچھ رہے تھے:

’’لوگ کہتا ہے مسلم لیگ نوابوں کا، امیروں کا، جاگیرداروں کا جمات ہے، تم لوگ اتنا بیٹھا ہے تم میں کتنا امیر ہے، کتنا نواب ہے۔‘‘

یہ کہ کر دراصل وہ تاثر یہ دے رہے تھے کہ مسلم لیگ جاگیرداروں سے پاک جماعت ہے۔ آگے مکمل حوالہ پڑھیے۔ پروفیسر خواجہ حمید یزدانی مضمون ’’میرے لڑکپن کا لاہور‘‘ میں لکھتے ہیں:

’’پاکستان سے پہلے ملک میں جنرل الیکشن ہونے والے تھے جن میں مسلمانوں کو یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ ایک الگ قوم ہیں اور مسلم لیگ ان کی نمائندہ جماعت ہے۔ قائداعظم علیہ الرحمۃ شہر شہر پہنچ کر مسلمانوں سے خطاب کر رہے تھے۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے وسیع میدان میں (اب شاید وہ وسعت سمٹ گئی ہے) صبح 9-10 بجے کے قریب مسلم لیگ کا جلسہ تھا۔ کوئی ایک لاکھ کا مجمع ہوگا۔ اس وقت جیسا کہ بیان ہوا، کل تین لاکھ کی آبادی تھی۔ جس میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب شامل تھے۔ حضرت قائداعظم تشریف لائے۔ وہ کبھی لمبی تقریر نہیں کرتے تھے۔ مسلم لیگ پر مخالفین اور دشمنوں کا یہ الزام تھا کہ یہ نوابوں اور جاگیرداروں کی جماعت ہے۔ قائداعظم نے جو اتنا بڑا مجمع دیکھا تو فرمایا (قائداعظم صحیح اُردو نہیں بول سکتے تھے، جب وہ بولتے تو لوگ ہنس دیتے۔ ان کی اس ہنسی میں تمسخر کی بجائے محبت وعقیدت کا رنگ ہوتا):
’’لوگ کہتا ہے مسلم لیگ نوابوں کا، امیروں کا، جاگیرداروں کا جمات ہے۔ تم لوگ اتنا بیٹھا ہے، تم میں کتنا امیر ہے، کتنا نواب ہے‘‘......(ہے کو کھینچ کر ادا کرتے)۔
قائداعظم کا اتنا کہنا تھا کہ پورا مجمع نعروں سے گونج اٹھا۔ کوئی دو تین منٹ تک نعرے

لگتے رہے۔ راقم سٹیج کے قریب بیٹھا تھا۔ نعرے مار مار کر ہمارے گلے بیٹھ گئے۔‘‘(4)

حقیقت یہ ہے کہ غلط بیانی کرنے اور عوام کو بیوقوف بنانے میں مسٹر جناح اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ کیا نواب ممدوٹ نواب نہیں تھے، کیا نواب زادہ لیاقت علی خاں نواب نہیں تھے، کیا دولتانہ، شوکت حیات خاں اور فیروز خاں نون جاگیردار نہیں تھے۔ کیا ملتان اور مضافات ملتان کے گدی نشیں جاگیردار نہیں تھے؟؟؟

ملتان کے اِن گدی نشین جاگیرداروں کا 1857ء کی جنگِ آزادی میں کیا کردار تھا، معروف دانشور و کالم نگار جناب خالد مسعود خان نے اپنے ایک کالم ’’تصوف کی آفاقی قدریں‘‘ میں بیان کیا ہے، گویا حقائق سے پردہ اٹھایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’10 جون 1857ء کو ملتان چھاؤنی میں پلاٹون نمبر 69 کو بغاوت کے شبہے میں نہتا کیا گیا اور پلاٹون کمانڈر کو مع دس سپاہیوں کے توپ کے آگے رکھ کر اُڑا دیا گیا۔ آخر جون میں بقیہ نہتی پلاٹون کو شبہ ہوا کہ انھیں چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں فارغ کیا جائے گا اور انھیں تھوڑا تھوڑا کر کے تہِ تیغ کیا جائے گا۔ سپاہیوں نے بغاوت کر دی۔ تقریباً بارہ سو سپاہیوں نے بغاوت کا علم بلند کیا۔ انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے والے مجاہدین کو شہر اور چھاؤنی کے درمیان واقع پل شوالہ پر دربار بہاءالدین زکریا کے سجادہ نشین مخدوم شاہ محمود قریشی نے انگریزی فوج کی قیادت میں اپنے مریدوں کے ہمراہ گھیرے میں لے لیا اور تین سو کے لگ بھگ نہتے مجاہدین کو شہید کر دیا۔ یہ مخدوم شاہ محمود قریشی ہمارے موجودہ وزیر خارجہ مخدوم شاہ محمود قریشی کے لکڑ دادا تھے۔ ان کا نام انھی کے حوالے سے رکھا گیا تھا۔ کچھ باغی دریائے چناب کے کنارے شہر سے باہر نکل رہے تھے کہ انھیں دربار شیر شاہ کے سجادہ نشین مخدوم شاہ علی محمد نے اپنے مریدوں کے ہمراہ گھیر لیا اور اُن کا قتلِ عام کیا۔ مجاہدین نے اس قتلِ عام سے بچنے کے لیے دریا میں چھلانگیں لگا دیں۔ کچھ لوگ دریا میں ڈوب کر جاں بحق ہوگئے اور کچھ لوگ پار پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ پار پہنچ جانے والوں کو سیّد سلطان احمد قتال بخاری کے سجادہ نشین دیوان آف جلال پور پیروالہ نے اپنے مریدوں کی مدد سے شہید کر دیا۔ جلال پور

پیروالہ کے موجودہ ایم این اے دیوان عاشق بخاری انھی کی آل میں سے ہیں۔
مجاہدین کی ایک ٹولی شمال میں حویلی کورنگا کی طرف نکل گئی جسے مہر شاہ آف حویلی کورنگا نے اپنے مریدوں اور لنگریال، ہراج، سرگانہ، ترگڑ سرداروں کے ہمراہ گھیر لیا اور چن چن کر شہید کیا۔ مہر شاہ آف حویلی کورنگا سیّد فخر امام کے پڑدادا کا سگا بھائی تھا۔ اسے اس قتلِ عام میں فی مجاہد شہید کرنے پر بیس روپے نقد یا ایک مربع اراضی عطا کی گئی۔
مخدوم شاہ محمود قریشی کو 1857ء کی جنگِ آزادی کے کچلنے میں انگریزوں کی مدد کے عوض مبلغ تین ہزار روپے نقد، جاگیر سالانہ معاوضہ مبلغ ایک ہزار سات سو اَسّی روپے اور آٹھ چاہات جن کی سالانہ جمع ساڑھے پانچ سو روپے تھی بطور معافی دوام عطا ہوئی۔ مزید یہ کہ 1860ء میں وائسرائے ہند نے بیگی والا باغ عطا کیا۔ مخدوم آف شیر شاہ مخدوم شاہ علی محمد کو دریائے چناب کے کنارے مجاہدین کو شہید کرنے کے عوض وسیع جاگیر عطا کی گئی۔
حویلی کورنگا کے معرکے میں بظاہر سارے مجاہدین مارے گئے مگر علاقے میں آزادی کی شمع روشن کر گئے۔ حویلی کورنگا کی لڑائی کے نتیجے میں جگہ جگہ بغاوت پھوٹ پڑی اور حویلی کورنگا قتال پور سے لے کر ساہیوال، بلکہ اوکاڑہ تک کا علاقہ خصوصاً دریائے راوی کے کنارے بسنے والے مقامی جانگلیوں کی ایک بڑی تعداد اس تحریک آزادی میں شامل ہو گئی۔ جانگلی علاقے میں اس بغاوت کا سرخیل رائے احمد خان کھرل تھا جو گوگیرہ کے نواحی قصبہ جھامرہ کا بڑا زمین دار اور کھرل قبیلے کا سردار تھا۔ احمد خان کھرل کے ہمراہ مراد فتیانہ، شجاع بھدرو، موکھا وہنی وال اور سارنگ جیسے مقامی سردار اور زمین دار تھے۔
16 ستمبر 1857ء کو رات گیارہ بجے سرفراز کھرل نے ڈپٹی کمشنر ساہیوال بمقام گوگیرہ احمد خان کھرل کی مخبری کی۔ 21 ستمبر 1857ء کو راوی کے کنارے "دلے دی ڈل" میں اسی سال احمد خان کھرل پر جب حملہ ہوا تو وہ عصر کی نماز پڑھ رہا تھا۔ اس حملے میں انگریزی فوج کے ہمراہ مخدوموں، سیّدوں، سجادہ نشینوں اور دیوانوں کی ایک فوج ظفر موج تھی جس میں دربار سیّد یوسف گردیز کا سجادہ نشین سیّد مراد شاہ گردیزی

دربار بہاء الدین زکریا کا سجادہ نشین مخدوم شاہ محمود قریشی، دربار فرید الدین گنج شکر کا گدی نشین مخدوم آف پاکپتن، مراد شاہ آف ڈولا بالا، سردار شاہ آف کھنڈا اور گلاب علی چشتی آف ٹبی لال بیگ کے علاوہ بھی کئی مخادیم و سجادہ نشین شامل تھے۔ احمد خان کھرل اور سارنگ شہید ہوئے۔ انگریز احمد خان کھرل کا سر کاٹ کر اپنے ہمراہ لے گئے۔ احمد غان کھرل کے قصبہ جھامرہ کو پیوند خاک کرنے کے بعد آگ لگا دی گئی۔ فصلیں جلا کر راکھ کر دی گئیں۔ تمام مال مویشی ضبط کر لیے گئے، دیگر سرداروں کو سزا کے طور پر عبور دریائے شور یعنی کالا پانی بھجوا دیا گیا۔ اس طرح جانگلی علاقے کی تحریک آزادی مخدوموں، سرداروں، وڈیروں اور گدی نشینوں کی مدد سے دَبا دی گئی۔" (5)
جناب خالد مسعود خاں اپنے ایک دوسرے کالم "الیکشن میں امیدوار سیاست دانوں کی تاریخ" میں، جو انھوں نے 2008ء کے الیکشن کے موقع پر لکھا تھا، رقم طراز ہیں:
"احمد خان کھرل، موکھا وَہنی وال، نادر شاہ، مہر دلیل فتیانہ اور لال خان بلوچ کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے اور سینہ خوشی سے پھول جاتا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جب میں ملتان کے قریشیوں، گیلانیوں، شیر شاہ کے سیّدوں، جلال پور پیروالہ کے گدی نشینوں، حویلی کورنگا اور قتال پور کے سادات کے بارے میں سوچتا ہوں تو خوشی سے پھولا ہوا سینہ پچک جاتا ہے اور فخر سے بلند سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی کیونکہ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ مذکورہ بالا تمام خاندانوں کے لوگ نہ صرف الیکشن 2008ء میں اپنے اپنے علاقوں سے اسمبلیوں کے امیدوار ہیں بلکہ پاکستان کے قیام کے دن سے ہی کسی نہ کسی صورت میں اقتدار پر فائز ہیں تو مجھے بل شوالہ، شیر شاہ، جلال پور پیروالہ، چناب کے کنارے، چناب اور ستلج کے سنگم پر، نالہ دیوان واہ کے کنارے، قتال پور کے قریب، سرائے سدھو کے بیلے میں، حویلی کورنگا کے ساتھ دریائے راوی کے کنارے اُگے نرسلوں میں اور جھامرہ کے میدانوں میں شہید ہونے والے حریت پسندوں کے اَن دیکھے چہرے سوال کرتے محسوس ہوتے ہیں کہ ہماری قربانیاں کہاں گئیں اور ہمارے وارث کہاں گئے؟ حریت پسندوں کو قتل کر کے، دریا میں ڈبو کر، گرفتار کر کے انگریز

بہادر کے حوالے کر کے فی حریت پسند بیس روپے یا ایک مربع اراضی حاصل کرنے والے ''عزت دار'' تب بھی دربار سرکار میں پہلی قطار کی کرسی پر بیٹھنے کی سند رکھتے تھے اور آج بھی ایوانِ اقتدار میں براجمان ہیں۔ مجھے تاریخ سے آگاہی نے خوشی سے زیادہ ملال دیا ہے، کاش میں نے یہ ساری تاریخ نہ پڑھی ہوتی۔ میں اس ڈیڑھ سو سال پرانی حقیقت سے مکمل آشنا نہ ہوتا تو بہتر تھا۔'' (6)

نوائے وقت گروپ آف پبلی کیشنز کے ہفت روزہ فیملی میگزین لاہور نے پاکستان کے سابق وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب خاں کے نیوز ویک میں شائع ہونے والے انٹرویو کا ملخص تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

''صاحبزادہ یعقوب خان پاکستان کے سابق وزیر خارجہ ہیں۔ وہ دوسری جنگ عظیم (1939-45ء) میں بھی حصہ لے چکے ہیں۔ رام پور کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے صاحبزادہ یعقوب خان کا پاکستان کی خارجہ پالیسی میں اہم کردار رہا ہے۔ ذیل میں نیوز ویک میں شائع ہونے والا ان کا ایک انٹرویو پیش کیا جا رہا ہے۔ [ہم یہاں صرف جاگیرداری سے متعلق دو سوال و جواب شائع کر رہے ہیں۔ ن م ق]

س: آپ کے خیال میں پاکستان کے سیاسی عدم استحکام کی بڑی وجہ کیا ہے؟

ج: ہندستان کی آزادی کے فوراً بعد وزیر اعظم نہرو نے اپنے ملک سے جاگیردارانہ نظام کو جڑ سے ختم کرنے کا فیصلہ کیا جس پر عملدرآمد کرتے ہوئے نہرو نے مسلمان جاگیرداروں کو سب سے پہلے نشانہ بنایا جس کی وجہ سے ان کا اپنے مزارعین پر سے اثر ورسوخ ختم ہو گیا۔ اس طرح ایک تیر سے دو شکار کرتے ہوئے نہرو نے جہاں ایک طرف مسلمانوں کے اثر ورسوخ اور طاقت کا خاتمہ کر دیا تو دوسری جانب ہندوؤں کو پارلیمان تک پہنچنے کے راستے پر گامزن کر دیا۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایسی سوچ پروان ہی نہیں چڑھ سکی۔ بانی پاکستان کے جانشین لیاقت علی خان خود جاگیردار تھے، اس لیے وہ اس طبقے کے مفادات کے خلاف کام نہیں کر سکتے تھے۔ جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو اس وقت میری عمر 26 برس تھی اور جب میں پاکستان پہنچا تو میں گورنر جنرل کے حفاظتی دستے میں شامل تھا۔ مجھے قائد اعظم کو بہت قریب سے دیکھنے کا

موقع ملا۔ اس وقت ہم میں سے کوئی بھی یہ نہیں جانتا تھا کہ قائد اعظمؒ جلد ہم سے رخصت ہو جائیں گے۔

س: تو آپ کے خیال میں جاگیردارانہ نظام ہی سب سے بڑی وجہ ہے؟

ج: جاگیردارانہ نظام تو جمہوریت کے لیے زہر قاتل ہے۔ اگر آپ یورپی جمہوریت کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ جمہوریت یورپ میں اس وقت مضبوط بلکہ رائج ہوئی جب وہاں سے جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ کیا گیا۔ ذرا بھٹو کے دورِ اقتدار کو یاد کیجیے، وہ خود کو جمہوریت کا چیمپئن کہا کرتے تھے لیکن ان کے تمام تر اقدامات خالصتاً جاگیردارانہ سوچ کی عکاسی کرتے تھے۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ صرف اراضی کا مالک ہونے سے کوئی جاگیردار نہیں بن جاتا بلکہ جاگیرداری ایک ذہنیت کا نام ہے۔'' (7)

زمانۂ طالب علمی میں جناح صاحب کے حفاظتی دستے میں خدمات انجام دینے والے بریگیڈیئر (ر) اقبال شفیع آج قیامِ پاکستان کے 63 سال بعد روزنامہ نوائے وقت کو انٹرویو دیتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں:

''ہندستان میں نہرو اور پٹیل نے تین سال کے اندر لینڈ ریفارمز کرا لیں، چھ سو بیس سٹیٹ ختم ہو کر ہندستان کا حصہ بن گئیں۔ ہمارے ملک میں جاگیردارانہ نظام جڑوں میں بیٹھا ہوا ہے۔ صوبائیت کو ہوا دی جاتی ہے۔ لاکھ الیکشن کروا لیں، بلوچستان سے وہی سردار، سندھ سے وہی وڈیرے، پنجاب سے وہی چودھری اور خیبر پختون خواہ سے وہی ملک اور خان سامنے آئیں گے۔'' (8)

ملک ''خداداد'' پاکستان چونکہ ان غداروں کے لیے ہی بنا تھا اس لیے انھی لوگوں نے سامنے آنا تھا۔ یہی لوگ اس ملک میں اسمبلیوں کے رکن منتخب ہوتے رہے ہیں۔ بطور رکن اسمبلی بڑی بڑی تنخواہیں اور بڑی بڑی مراعات حاصل کرتے رہے ہیں۔ اب ان کی جگہ ان کی اولادوں نے لے لی ہے۔ بھلا ہندستان میں انھیں یہ تنخواہیں اور مراعات حاصل ہوتیں؟ لیگی قلم کار جناب فضل حسین اعوان لکھتے ہیں:

''پاکستان اور بھارت ایک ساتھ آزاد ہوئے۔ وہاں مسلسل جمہوریت ہے، ہمارے

ہاں بجلی کی طرح وقفے وقفے سے کبھی آتی ہے اور کبھی جاتی ہے۔ جب آتی ہے تو عوامی نمائندے اگلی پچھلی کسریں پوری کرتے ہیں۔ ایم این اے حضرات کی تنخواہوں اور دیگر مراعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم نے کم از کم ہندستان کو اس میدان میں تو مات دے دی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔ پاکستانی ممبران قومی اسمبلی کی تنخواہیں اور مراعات۔ ماہانہ تنخواہ: ایک لاکھ 20 ہزار سے 2 لاکھ روپے۔ آئینی اخراجات: ایک لاکھ روپے، دفتری اخراجات: ایک لاکھ چالیس ہزار روپے، سفر کی سہولت (8 روپے فی کلومیٹر) 48 ہزار روپے، اسلام آباد ایک بار جانے اور آنے کا بھتہ۔ اجلاس کے دوران روزانہ الاؤنس پانچ سو روپے۔ پاکستان میں کہیں بھی اے سی ٹرین میں سفر کی سہولت جتنی بار مرضی۔ بزنس کلاس میں اپنے پی اے یا اہلیہ محترمہ کے ساتھ جہاز میں سفر کرنے کی سہولت۔ پاکستان میں کسی بھی جگہ سرکاری ہوسٹل میں قیام فری۔ گھریلو استعمال کے لیے بجلی کے 50 ہزار یونٹ مفت۔ لوکل فون کالز ایک لاکھ ستر ہزار فری۔ ملک اور بیرونِ ملک علاج کا خرچہ صحت کی سہولتوں سے محروم عام آدمی کے خون پسینے کی کمائی سے ادا کیا جاتا ہے۔

اس ملک میں جہاں لوگ بھوک اور افلاس کی وجہ سے اپنے بچے فروخت کر دیتے ہیں کچھ اپنی بچیوں کو دلہن کا لباس پہنا کر نہر میں دھکا دے دیتے ہیں، کئی فاقوں سے تنگ آ کر اپنی جان تک دے دیتے ہیں۔ چند سو کی خاطر دوسرے کی جان لے لیتے ہیں۔ اکثر آٹے کا سستا تھیلا خریدنے کی خاطر عزت نفس داؤ پر لگا کر صبح سے شام تک لائن میں لگ کر دھکے، ڈنڈے اور گالیاں کھا کر خالی لوٹ آتے ہیں، وہاں قوم کو ایک ایم این اے تین کروڑ بیس لاکھ روپے سالانہ میں پڑتا ہے۔ 5 سال میں قوم اس پر 16 کروڑ نچھاور کر دیتی ہے۔ حج عمرے نوکریوں کی تقسیم تقرر و تبادلے، ٹھیکے پرمٹ اور دیگر کئی مدوں میں ''تو ہر ٹپہ'' الگ ہے۔

ہم بھارت، اس کی سیاست اور سیاستدانوں پر کشمیر کی آزادی تک لعنت بھیجتے ہیں لیکن اس کے پارلیمنٹیرین کی مراعات پر ایک نظر ڈالنے میں کوئی حرج نہیں۔ تنخواہ سولہ ہزار روپے، اجلاس میں شرکت ایک ہزار روپے روزانہ، حلقہ الاؤنس 20 ہزار روپے، پی

اے کے ساتھ ہوائی سفر مفت، گھر کا کرایہ 650 روپے ماہانہ، بجلی 50 ہزار یونٹ فری سالانہ۔ فون ڈیڑھ لاکھ لوکل کال فری سالانہ۔ ایک موبائل فون بھی اب دے دیا گیا ہے۔

بھارت نے ایک بار آئین بنالیا، اس میں خال خال ہی ترمیم کرنا پڑتی ہے۔ ہمیں ہر اسمبلی میں 58 ٹو بی تو لازماً لانا ہوتی ہے، کبھی یہ منظور اور کبھی ختم کرانے کے لیے۔ بھارت کو کیری لوگر بل، این آر او وغیرہ پر بھی مغز ماری نہیں کرنا پڑتی۔ یہ سیاپا بھی ہمارے معزز اراکین پارلیمنٹ کو کرنا پڑتا ہے۔ پھر اسمبلی میں باقاعدہ دھینگا مشتی اور ڈانس نما احتجاج بھی تو ناگزیر ہے۔ گالم گلوچ اور دست و گریباں تک کی نوبت آ جاتی ہے۔ ان تمام معاملات کو سامنے رکھا جائے تو سال کے 3 کروڑ 20 لاکھ بھی کم ہیں۔''(9)

جیو چینل نے 2009ء میں بعنوان ''ہے نا حیرانی کی بات'' پاکستانی وزرا کی تعداد کا دنیا کے دوسرے ممالک کے وزرا سے موازنہ نشر کیا تھا۔ ملاحظہ کیجیے:

چین: آبادی ایک ارب پینتیس کروڑ، وزرا: 14

بھارت: آبادی ایک ارب ستائیس کروڑ، وزرا: 32

امریکا: آبادی بتیس کروڑ، وزرا: 14

برطانیہ: آبادی 13 کروڑ، وزرا: 12

پاکستان: آبادی 17 کروڑ، وزرا: 96(10)

پاکستان میں وزرا کی تعداد کے بعد اب ان کی تنخواہوں اور مراعات کے بارے میں پڑھیے۔ سید اسرار بخاری روزنامہ نوائے وقت کے معروف کالم ''سر راہے'' میں لکھتے ہیں:

''قومی اسمبلی کے 3 سال مکمل ہو گئے، آج چوتھے پارلیمانی سال کا آغاز ہو گا۔ کیا کھویا کیا پایا، 3 سال میں کیا گُل کھلائے، ذرا عوام کو حساب تو دیں، ایک وفاقی وزیر پر قوم کے سالانہ 6 کروڑ روپے خرچ ہوتے ہیں۔ اگر وہ ''اوور ٹائم'' نہ لگائے۔ پچھلے پونے تین سال میں 94 وفاقی وزیر تھے، اس حساب سے 16 ارب 92 کروڑ روپے جائز طور پر وزرا لے گئے۔ ایک وفاقی وزیر نے دو ماہ کے دوران 4 لاکھ 58 ہزار 8 سو 33

روپے کا صرف پٹرول خرچ کیا تھا، جبکہ ایک وزیر کی چائے کا دو دن کا بل 26 ہزار روپے آیا تھا، جبکہ ہمارے ملک میں عام شہری کی صحت پر سالانہ صرف 194 روپے اور تعلیم پر صرف 145 روپے خرچ ہوتے ہیں۔ ایم این اے، چیئرمین قائمہ کمیٹیاں، سپیکر، ڈپٹی سپیکر، چیئرمین و ڈپٹی چیئرمین سینٹ کی جائز طور پر تنخواہیں اور مراعات اس کے علاوہ ہیں۔" (11)

ممتاز کالم نگار جناب حسن نثار کے کالم سے ایک اقتباس درج ذیل کر رہے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ ان لوگوں کو ملکی دولت سے کس کس طرح نوازا جا رہا ہے اور مراعات دی جا رہی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"بنیادی طور پر تو آج کا کالم تین کتابوں کے لیے وقف تھا کیونکہ پاکستانی سیاست اور سیاسی لیڈروں سے کراہت محسوس ہونے لگی ہے۔ ان میں سے اکثر اتنے بدکردار اور بدبودار ہیں کہ ان کا ذکر کرتے ہوئے متلی سی محسوس ہونے لگتی ہے، سو میں نے سوچ رکھا تھا کہ کتابوں تک محدود رہوں گا، لیکن اچانک برادر بزرگ اور استادِ محترم سرور سکھیرا کا پیغام موصول ہوا جس میں آپ نے پاکستانی عوام کے "غریب نمائندوں" کی کینٹین واقع نیشنل اسمبلی میں مختلف ڈشوں کی قیمتیں درج کی ہیں۔ سستی روٹی اور مہنگے سالن کے مارے ہوئے لوگ ملاحظہ فرمائیں کہ ان کے منتخب نمائندے دیگر لوازمات و مراعات کے علاوہ کیسی کیسی سہولتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ذرا قیمتیں ملاحظہ فرمائیں:

چائے کپ Rs.1.00
سوپ کا پیالہ .... Rs. 5.50
دال .... Rs. 1.50
سبزی بریانی .... Rs. 8.00
مچھلی .... Rs. 130.00
چپاتی .... Rs. 1.00

بھوک سے مرتے، بلکتے، سسکتے، بے روزگاریوں کے مارے ہوئے عوام کے نمائندوں

کے باقی معاملات تو چھوڑیں، صرف ماہانہ تنخواہ 1,80000 روپے ہے، مختلف قسم کے الاؤنسز اپنی جگہ، لیکن اس کے باوجود نیشنل اسمبلی کی کینٹین میں سبسڈی ملاحظہ فرمائیں۔ یہ سب کچھ کرنے والوں کا جواب نہیں لیکن حیرت ان پر ہے، جنھوں نے یہ سب کچھ قبول کر لیا، حالانکہ ان میں سے بھاری اکثریت انتہائی متمول لوگوں کی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ مالی Terms میں کوئی بڑی بات نہیں، لیکن اس سے ان کے رویہ، سوچ، مائنڈ سیٹ کا اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کو "دکھاوے" تک کی بھی پرواہ نہیں اور یہ "شرم بھرم" تک کے قائل بھی نہیں۔" (12)

اس قدر مراعات حاصل کرنے کے باوجود یہ لوگ ملکی پیسے کو کس طرح بے دردی سے اپنے اللّے تللّوں پر خرچ کر کے برباد کرتے ہیں۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور میں جھنگ سے تعلق رکھنے والے مسلم لیگی جاگیردار جناب فیصل صالح حیات کے بارے میں ایک خبر بعنوان "فیصل صالح حیات کے دفتر کی آرائش پر سوا کروڑ روپے کا خرچ، پی اے سی نے تفصیلات طلب کر لیں" شائع ہوئی ہے۔ خبر کا متن ملاحظہ ہو:

"اسلام آباد (خبر نگار خصوصی) قومی اسمبلی کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی نے وفاقی وزیر ہاؤسنگ و تعمیرات مخدوم فیصل صالح حیات کے دفتر کی تزئین و آرائش پر سوا کروڑ روپے خرچ کرنے کی تفصیلات طلب کر لی ہیں۔ قومی اسمبلی کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کا اجلاس پارلیمنٹ ہاؤس کے کمیٹی روم نمبر 2 میں قائم مقام چیئرپرسن یاسمین رحمٰن کی سربراہی میں ہوا۔ اجلاس میں ریاض فتیانہ، سعید ظفر، ندیم افضل چن، نور عالم، حامد یار ہراج کے علاوہ آڈیٹر جنرل کے حکام اور متعلقہ وزارتوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اجلاس میں وزارت پانی و بجلی، ہاؤسنگ و تعمیرات کے آڈٹ اعتراضات کا جائزہ لیا گیا۔ اجلاس کے دوران ریاض فتیانہ نے کہا کہ حالیہ دنوں میں وفاقی وزیر ہاؤسنگ و تعمیرات مخدوم فیصل صالح حیات کے دفتر کی تزئین و آرائش پر سوا کروڑ روپے خرچ کیے گئے ہیں جس پر کمیٹی نے ان اخراجات کی تمام تفصیلات طلب کر لی ہیں۔ کمیٹی نے وزارت ہاؤسنگ و تعمیرات کے مختلف شعبوں میں ہونے والی کرپشن پر سخت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کرپشن اور اختیارات کے غلط استعمال کی وجہ سے ملکی معاشی

حالت خراب ہو رہی ہے اور کرپشن کرنے والوں کو روکنا ہوگا۔"(13)

پاکستانی سیاست دان بڑی بڑی جاگیریں اور بے پناہ دولت رکھنے اور اسمبلیوں اور وزارتوں سے بڑی بڑی تنخواہیں اور بہت زیادہ مراعات حاصل کرنے کے باوجود سرکاری بینکوں سے قرض لیتے ہیں اور پھر واپس نہیں کرتے۔ نوائے وقت میں ایک مسلم لیگی ڈاکٹر ایم اے صوفی کا مراسلہ بعنوان: "قومی اسمبلی کے 93 ممبران چار ارب اکیس کروڑ روپے کے قرض دار" شائع ہوا ہے، پڑھیے:

"انگریزی کے اخبار ڈان (2 مئی 2011ء) کی ایک رپورٹ نے مجھے پریشان کر دیا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی قومی اسمبلی کے 93 معزز ترین ارکان نے چار ارب اکیس کروڑ روپے بطور قرض دینا ہے اور آدھے سے زیادہ ارکان کا تعلق صوبہ خیبر پختون خوا سے ہے۔ آدھی سے زیادہ رقم قرضے کی اس صوبے نے ادا کرنی ہے اور صوبہ پنجاب کے 53 ممبران نے 68 کروڑ 79 لاکھ اسی ہزار روپے ادا کرنا ہیں۔ ان میں حکومتی پارٹی پیپلز پارٹی کے محترم ڈاکٹر ارباب عالم گیر اور ان کی بیگم عاصمہ ارباب نے 28 لاکھ 88 ہزار روپے دینا ہے۔ اسی طرح خیبر پی کے دس ممبران نے 34 لاکھ روپیہ قرض چکانا ہے۔ عالی جناب امیر مقام کے نام اکتالیس کروڑ روپیہ ادائیگی کا ہے۔ اسی طرح ہمایوں خان اور سیف اللہ خان ایک کروڑ سترہ لاکھ روپے کے مقروض ہیں۔ اسی طرح ایک طویل لسٹ ہے جو 2 مئی 2011ء کو ڈان اخبار میں درج ہے۔ سفارش، اقربا پروری کی بنا پر ملک دیوالیہ ہوگیا ہے۔ ہر محکمہ میں کرپشن ہے، ہر آدمی امیر ہونے کے چکر میں مدہوش ہے اور ہر وزیر ممبر کے اتنے بزنس ہیں کہ بیان مشکل ہے۔ وہ بڑی ہمت والے ہیں۔ اتنی مصروف زندگی کے باوجود کارخانہ بزنس چلا رہے ہیں۔ ہمارے وزراء ممبران کو یہ بھی بڑا شوق ہے کہ ان کا روپیہ بیرون ممالک میں بھی ہو، تاکہ کل کا غم نہ ہو۔ ان لوگوں کو فلاحی، معاشرتی کاموں میں کوئی دلچسپی نہیں۔ آٹا مہنگا، سبزی، دالیں مہنگی، گیس غائب، بجلی ناپید۔ قرضے کی بڑی لسٹ میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کے لیڈر ممبران بھی قرضے لینے میں کسی دوسری پارٹی سے پیچھے نہیں۔ رانا نذیر احمد نے ایک ملین روپیہ، جبکہ رانا عبدالستار نے 25 ہزار روپے، عمر

سہیل ضیاء بٹ کے پاس 28 لاکھ روپے کیش ہے۔ ساڑھے چودہ لاکھ قرضہ دینا ہے۔ شیخ آفتاب احمد نے ایک کروڑ سے زائد روپے قرضہ لیا ہے۔ خرم دستگیر نے 24 لاکھ روپے، چودھری محمود بشیر ورک نے 13 لاکھ روپے قرض دینا ہے۔ خواجہ سعد رفیق نے چار کروڑ روپے قرضہ لیا ہے، کس کس کے نام لکھوں؟"(14)

یہ جاگیردار اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ اپنا سرمایہ بیرون ملک بینکوں میں منتقل کرتے ہیں۔ بیرون ملک ان کے کاروبار ہیں، انھوں نے وہاں محلات تعمیر کیے ہوئے ہیں۔ پاکستان کے مؤقر اخبار روزنامہ جنگ لاہور کا ایک اداراتی شذرہ، جو بعنوان "سوئس بینکوں میں 97 ارب ڈالر کے مالک کون ہیں؟" شائع ہوا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

"سوئس بینک کے ایک ڈائریکٹر کے مطابق سوئس بینکوں میں پاکستان کے 97 ارب ڈالر جمع پڑے ہیں جبکہ پاکستانی عوام غربت وافلاس کا شکار ہیں۔ اگر سوئس بینکوں میں موجود 97 ارب ڈالر کا استعمال کیا جائے تو پاکستان تیس سال تک ٹیکس فری بجٹ کے علاوہ چھ کروڑ پاکستانیوں کو ملازمت فراہم بھی کر سکتا ہے۔ 500 سے زائد سوشل پراجیکٹس کو ہمیشہ کے لیے فری بجلی سپلائی کی جاسکتی ہے، پاکستان کا ہر شہری ساٹھ سال کے لیے ماہانہ بیس ہزار روپے تنخواہ حاصل کر سکتا ہے اور پاکستان کو عالمی بینک یا آئی ایم ایف کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔

سوئس بینک کے ایک ڈائریکٹر کا یہ انکشاف اس لحاظ سے بلاشبہ حیرت انگیز ہے کہ کئی سیاسی حلقوں اور ماہرین اقتصادیات، تبصرہ نگاروں اور تجزیہ نگاروں کی طرف سے بڑے بڑے سیاستدانوں، صنعت کاروں اور حکومتی حلقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے غیر ملکی بینکوں میں اکاؤنٹس کا حوالہ تو سامنے آتا رہا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا رہا ہے کہ انہوں نے ملکی سرمائے کے علاوہ بیرونی ملکوں سے خریداری کا کمیشن غیر ملکی بینکوں میں جمع کرا رکھا ہے لیکن اس کے متعلق ٹھوس اعداد و شمار پیش نہیں کیے گئے۔ ایسے افراد میں بعض سابق وزرائے اعظم، وزرائے اعلیٰ اور صدارتی مناصب پر فائز افراد کے نام بھی سامنے آتے رہے لیکن حالیہ انکشاف سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ پاکستان کے بااثر طبقہ کی سوئس بینکوں میں بھاری رقم موجود ہے۔ ان میں جو لوگ شامل ہیں انہیں

بےنقاب کرنا چاہیے۔ اس طرح یہ لوگ ملک کو دیوالیہ کرنے کی پالیسی پر گامزن ہیں اگر 97 ارب ڈالر کا ملک کی تعمیر و ترقی، عوام کی خوشحالی اور معاشی و اقتصادی مسائل کے حل کے لیے استعمال کیا جاتا تو آج پاکستان کا شمار دنیا کے امیر ترین اور خوشحال ترین ممالک میں ہوتا، اسے عالمی بینک، ایشیائی ترقیاتی بینک اور آئی ایم ایف کے سامنے کشکول گدائی نہ اٹھانا پڑتا اور وہ قرضے لینے کی بجائے دوسرے ملکوں کو قرضے دینے کی پوزیشن میں آ جاتا، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 97 ارب ڈالر کا یہ سرمایہ سوئس بینکوں سے پاکستان کون منتقل کرا سکتا ہے، اس کے لیے کسی قانونی ضابطے کی اگر ضرورت محسوس کی جائے تو کون یہ ضابطہ وضع کرے گا، کیونکہ یہ بڑا مشکل مرحلہ ہے اور جن افراد نے یہ رقوم جمع کر رکھی ہیں وہ اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہو سکتے ہیں۔" (15)

مسٹر جناح کے جاگیردار رفقاء نے اور بعد میں ان کی اولادوں نے ملک کو کس کس طرح لوٹا، جس کے نتیجہ میں آج پاکستان کے عوام کس حال میں ہیں، اس بارے میں ہم کتاب میں کافی کچھ لکھ چکے ہیں، لیکن معروف تجزیہ نگار کرنل (ر) اکرام اللہ کا ایک مختصر کالم بعنوان "پاکستان میں خودکشی کی سونامی" ذیل میں نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ اس کے مطالعے سے یہ واضح ہو جائے گا کہ مسٹر جناح کے کھوٹے سکوں نے پاکستان کے غریب عوام کو کہاں پہنچا دیا ہے:

"2 روز قبل 3 اپریل کے قومی اخبارات میں ورلڈ بینک کی طرف سے ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے جس کو اُردو میں ترجمہ کی ہمت نہ پاتے ہوئے، من و عن اسی طرح انگریزی زبان میں ہی قارئین کرام کی خدمت میں نظریں جھکائے پیش کر رہا ہوں۔

"In Pakistan suicide rates have surged in recent years from a few hundred in pre-1990's to almost 7 thousand in 2008, the first year of the present regime after the general elections."

کیا راقم یہ امید کر سکتا ہے کہ ارکان پارلیمنٹ عالمی بینک کی اس 126 صفحات پر مشتمل تفصیلی رپورٹ پر غور و غوض کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے اور اگر اربابِ اقتدار

کے پاس اپنی دیگر اہم مصروفیات کے باعث وقت میسر نہ ہو تو کیا حزب مخالف کی کسی جماعت کا کوئی درد دل رکھنے والا ممبر پارلیمنٹ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے اندر خودکشیوں کے اس خوفناک سیلاب کے اسباب دریافت کرنے کے لیے متعلقہ وزارت یا وزارتوں کی توجہ مبذول کروانے کی زحمت گوارا فرمائے گا کہ ایک سال کے اندر سات ہزار خودکشیوں کا ذمہ دار کون ہے۔ ایک وزیر یا ساری کابینہ۔ چند روز پہلے وزیراعظم سیّد یوسف رضا گیلانی نے اسلام آباد میں دن دیہاڑے گورنر پنجاب سلمان تاثیر اور اس کے فوراً بعد وفاقی وزیر شہباز بھٹی کے قتل پر کابینہ کی طرف سے ذمہ داری قبول کرنے پر ہچکچاہٹ کے بعد سیّد زادے وزیراعظم نے اس بناء پر ذمہ داری قبول کرتے ہوئے وزارت عظمیٰ سے کابینہ کو اپنا استعفیٰ پیش کر دیا تھا کہ خلافت راشدہ کی مستند روایات کے مطابق اگر دجلہ یا فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک پیاس سے مر جائے تو حکمران وقت اس کا ذمہ دار ہے۔ ریاست مدینہ میں احتساب کا عمل اس قدر سخت تھا کہ بھری مسجد میں ایک بدوی بھی خلیفۂ وقت سے سوال کر سکتا تھا کہ اس نے اپنا لمبا چوڑا لبادہ ہر کسی کے حق سے زیادہ کپڑا استعمال کرتے ہوئے کیسے سلوا لیا ہے۔ جس پر خلیفۂ وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو جواب دینا پڑا تھا کہ ان کے بیٹے نے اپنے حصے کا کپڑا اپنے باپ کو تحفہ کے طور پر پیش کر دیا تھا۔ یہ احتساب اس حدیث نبوی پر مبنی تھا جس میں آقائے دو جہان رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر ان کے دل و جان سے عزیز صاحبزادی فاطمہ جس کو حکم خداوندی نے سربراہ خواتینِ جنت قرار فرمایا تھا اگر وہ بھی چوری جیسے کسی جرم میں ملوث پائی جائے تو سرکار دو عالمؐ اس کا ہاتھ کاٹ دینے کے حکم میں ذرا بھر تامل نہیں فرمائیں گے۔ اللہ اللہ۔ یہ ہے اسلام کا حکم احتساب۔ کیا یہ راقم ورلڈ بینک کی مندرجہ بالا شائع شدہ رپورٹ کے بعد ارباب اقتدار سے اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ایک شہری ہونے کے ناطے یہ سوال کرنے کی گستاخی کر سکتا ہے کہ 2008ء میں پاکستان میں عالمی بینک کی طرف سے رپورٹ کی گئی 7 ہزار خودکشیوں کا ذمہ دار کون ہے؟ غالب گمان یہ ہے کہ کئی دن سے عالمی بینک کی طرف سے یہ ہولناک خبر ملک کے کسی گوشے سے

صدائے احتجاج بلند کرنے میں ناکام رہی ہے۔راقم نے نوائے وقت کے صفحات میں اپنا احتجاج اس جذبے کے تحت رقم کیا ہے کہ شاید ذرائع ابلاغ میں اس خاکسار سے کئی گنا زیادہ بااثر کالم نگار اور سماجی شعبہ میں طاقتور آوازیں ان 7 ہزار سسکتے ہوئے بے بس اور مجبور انسانوں کی اموات کے نوحہ کو پوری قوم کی پکار میں تبدیل کر سکیں۔ ایسی پکار کہ حکومت کے علاوہ ملک کی اعلیٰ ترین عدالتوں کو بھی ان تمام 7 ہزار انسانی جانوں کے بے موت مرجانے کا نوٹس لینا پڑے، اگر اس کا سد باب نہ کیا گیا تو نہ جانیں کس کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد۔"(16)

مسٹر جناح کے کھوٹے سکوں نے ملک کی اور عوام کی کیا حالتِ زار بنادی ہے اُس کا تصور کیجیے۔پھر یہ شعر بھی یاد کیجیے:

مرے وطن کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

مسٹر جناح کے رفقا تھے کون؟ سکندر مرزا جو غدار اعظم میر جعفر کا پوتا تھا، سر فیروز خان نون جو انگریزوں سے وفاداری کی تاریخ رکھتا تھا، سر ظفر اللہ جس کا مقتدا یعنی قادیان کا متنبی میرزا غلام احمد انگریزوں کا خود کاشتہ پودا تھا۔ دوسرے رفقا کا بھی یہی حال ہے۔ان کے رفقا سوائے چند ناموں کے سارے کے سارے خاں بہادر تھے، سر تھے، نواب تھے اور انگریزوں کے پشت در پشت وفادار۔جناح صاحب کی سیاست کا ثمر تھا کہ میر جعفر کا پوتا سر سکندر مرزا مسٹر جناح کا جانشین یعنی گورنر جنرل بنا۔واضح ہو کہ پاکستان کا پہلا صدر بننے کا اعزاز بھی اُسے ہی حاصل ہوا تھا۔دوسروں کا حال بھی ایسا ہی ہے:

قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا

جناح کے رفقا کی تفصیل جاننا مشکل نہیں۔آپ مسلم لیگ کے ایک ایک ایم این اے اور وزیر کو لے لیں۔پھر اُس وزیر کا ماضی تلاش کر لیں۔تاریخ بتادے گی کہ وہ 1857ء میں مرزا الٰہی بخش کا ساتھی تھا یا جنرل بخت خاں کا رفیق تھا۔تحریک پاکستان تو اُن لوگوں کا کارنامہ ہے جو جنرل بخت خاں کو کم بخت خاں یا بد بخت خاں کہتے تھے۔محمود خاں کو نامحمود خاں کہتے تھے اور مجاہدین آزادی کو قسم قسم کی گالیوں سے نوازتے تھے۔ستم ظریفی دیکھیے کہ یہ غدارانِ ملک وملت مجاہدین

آزادی مولانا سیّد حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری، چودھری افضل حق، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، خاں عبدالغفار خاں اور آغا شورش کاشمیری وغیرہم کو غدار کہتے تھے بہ مصداق:

بت ہم کو کہیں کافر اللہ کی مرضی ہے



حوالہ جات

(1) تفہیمات الٰہیہ/حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی
(2) علامہ اقبال کا خطبۂ الٰہ آباد مشمولہ: پندرہ روزہ ندا لاہور/15 ستمبر 1991ء/ص22
(3) ہفت روزہ ندائے ملت لاہور/21 دسمبر 2006ء/ص46
(4) ماہنامہ سیارہ لاہور/مئی، جون 1985ء/ص292
(5) روزنامہ جنگ لاہور/فروری 2008ء
(6) روزنامہ جنگ لاہور/2 نومبر 2009ء
(7) ہفت روزہ فیملی میگزین لاہور/14 نومبر 2010ء/ص14
(8) روزنامہ نوائے وقت (سنڈے میگزین) لاہور/12 جون 2011ء/ص6
(9) روزنامہ نوائے وقت لاہور/2 نومبر 2009ء
(10) ماہنامہ افق کراچی/دسمبر 2009ء/ص33
(11) روزنامہ نوائے وقت لاہور/17 مارچ 2011ء
(12) روزنامہ جنگ لاہور/24 مئی 2012ء
(13) روزنامہ نوائے وقت لاہور/15 جون 2011ء
(14) روزنامہ نوائے وقت لاہور/11 مئی 2011ء
(15) روزنامہ جنگ لاہور/20 ستمبر 2011ء
(16) روزنامہ نوائے وقت لاہور/7 اپریل 2011ء

27

جناح صاحب کی ساری سیاست دراصل ایک ہنگامے کی پیداوار تھی۔ یہ ہنگامہ ایک دور میں پیدا ہوا اور پھر ہنگامے کے خاتمے کے ساتھ ہی سارا کھیل ختم ہو گیا۔ ذرا تصور کیجیے، 15 اگست 1947ء سے چند دن پہلے نہیں صرف چند گھنٹے پہلے تک مسٹر جناح پشاور سے راس کماری تک کے مسلمانوں کے لیڈر تھے۔ 15 اگست کو اعلانِ آزادی کے ساتھ ہی جناح صاحب نے ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کو رائٹ آف کر دیا۔ وہ کہتے تھے میں نے ان کی نمازِ جنازہ پڑھ لی ہے، مگر یہ بات غلط ہے۔ وہ نمازِ جنازہ تو پڑھنا جانتے ہی نہیں تھے، پڑھتے کیسے، ہاں رائٹ آف کر دیا۔ ہندستانی مسلمان جب 15 اگست 1947ء کو بیدار ہوئے تو انھوں نے اپنے قائد کو غائب پایا تو انھوں نے اپنے دلوں کو مسٹر جناح کی عقیدت سے پاک کر لیا اور مسٹر جناح کو قائداعظم ماننے سے انکار کر دیا اور ان کے لیے وہ ہیرو سے زیرو ہو گئے۔ اب اُن مسلمانوں کی تعداد کو تصور میں لائیے اور سوچیے کتنی بڑی تعداد میں مسلمان ایک ہی رات میں جناح صاحب کی قیادت سے فارغ ہو گئے۔ پھر چشمِ فلک نے دیکھا کہ جناح صاحب ڈھاکا کے پلٹن میدان میں کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کی قومی زبان اُردو اور صرف اُردو ہوگی، مشرقی پاکستان میں اس بیان کا جس طرح ''خیرمقدم'' ہوا، ہر شخص جانتا ہے۔ پھر 1970ء میں جناح صاحب کی تصویر کا ڈھاکا اور مشرقی پاکستان میں حشر کر دیا گیا۔ 16 دسمبر 1971ء کو ڈھاکا سے جناح صاحب کی تصویر اُتار کر شیخ مجیب الرحمٰن کی تصویر لگا دی گئی۔ اب اُن بنگالیوں کی گنتی کیجیے جو مسٹر جناح کو قائداعظم تسلیم کرتے ہیں۔ پاکستان میں 16 دسمبر 1971ء سے اب تک جناح صاحب کا گراف مسلسل نیچے

جا رہا ہے۔ وہ وقت بہت جلد آنے والا ہے جب پاکستانی عوام کے دلوں سے بھی جناح صاحب کی عقیدت ہندستانی اور بنگالی مسلمانوں کی طرح شدید نفرت میں بدل جائے گی۔ برصغیر میں جناح صاحب سے اگر کوئی محبت کرنے والا ہوگا تو وہ ہندستان میں صرف ''جسونت سنگھی'' ہندو ہوگا اور بس۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستانیوں کو، خاص طور سے پاکستان کی نوجوان نسل کو جناح صاحب کی شخصیت و کردار میں اب کوئی جاذبیت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ جناح صاحب کی شخصیت و کردار، ان کی جماعت ''مسلم لیگ''، ان کے گمراہ کن ''دو قومی نظریہ'' اور ان کے کارنامے ''پاکستان'' کے بارے میں کیا سوچ رکھتے ہیں، چند حوالے ملاحظہ فرمائیں:

1) ایک مسلم لیگی نوجوان رانا محمد شاہد بعنوان ''کیا ہم پاکستانی ہیں؟'' روزنامہ نوائے وقت لاہور کے سنڈے میگزین میں لکھتے ہیں:

''یہ بڑے افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ ہمارے ہاں نئی نسل کے نوجوان، تحریک پاکستان، قائداعظمؒ اور دوسری شخصیات کو پڑھنا بور سمجھتے ہیں۔ چند سال پہلے 25 دسمبر کو ٹیلی ویژن پر ایک پروفیسر صاحب نے بتایا کہ ہمارے نظامِ تعلیم کے ابتدائی نصاب میں تحریک پاکستان سے وابستہ شخصیات کا بہت کم تذکرہ ملتا ہے اور بعض جماعتوں میں قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ جیسی شخصیات کا تذکرہ بھی نہیں ملتا۔ سال 2007ء میں گورنمنٹ کالج ملتان میں منعقدہ آل پاکستان قائداعظم کوئز میں میری پہلی پوزیشن آئی تھی۔ میں نے جب اس پروگرام کے لیے تیاری شروع کی تو میرے بعض دوستوں نے کہا کہ ''کیا تم قائداعظمؒ کوئز کی کتاب پڑھتے رہتے ہو، یار کیا بورنگ سبجیکٹ ہے۔'' یہ بات تو میرے ذاتی تجربے کی تھی۔ ہمارے اکثر نوجوان علامہ اقبالؒ کی شاعری کو بڑی مشکل قرار دے کر آگے نکل جاتے ہیں۔ جدید مگر ''روشن خیال'' شعرا کو پڑھنا زیادہ فخر اور اعزاز سمجھتے ہیں۔'' (1)

2) روزنامہ نوائے وقت لاہور میں ایک خبر بعنوان ''نیویارک میں یومِ تکبیر کے حوالے سے مسلم لیگ (ن) کی تقریب میں بدنظمی، قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کا ذکر ہوا نہ پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگا'' شائع ہوئی ہے۔ خبر کا متن ملاحظہ ہو:

''نیویارک (نوائے وقت) یومِ تکبیر کے حوالے سے یہاں مسلم لیگ (ن) کی منعقدہ

تقریب میں نہ قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کا ذکر ہوا نہ پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگا نہ پاکستان کا قومی ترانہ بجایا گیا۔ نوائے وقت کی نمائندہ نے اس کا نوٹس لیتے ہوئے خواجہ آصف اور مسلم لیگ (ن) نیویارک کے صدر راحیل ڈار سے سوال کیا کہ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) کی تقریب میں کیا فرق ہے۔ اس سے قبل جب صدر زرداری آئے تھے تو ان کی تقریب میں بھی قائداعظم اور پاکستان کے نعرے نہیں لگائے گئے اور جئے بھٹو کے نعرے لگے اور آج مسلم لیگ کی تقریب میں میاں صاحب زندہ باد کے نعرے لگتے رہے۔ لیکن اس سوال کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔'' (2)

3) علامہ چودھری اصغر علی کوثر وڑائچ اپنے کالم ''لاہوریات'' میں نظریہ پاکستان ٹرسٹ لاہور کے زیر اہتمام منعقدہ دو روزہ قائداعظم یوتھ کانفرنس کی رپورٹ میں لکھتے ہیں:

''پنجاب کے ایک وزیر ڈاکٹر تنویر الاسلام کو بھی ایک مہمان خاص کے منصب پر براجمان ہو جانے کی دعوت دی گئی مگر کسی نے بتایا کہ جناب قائداعظم کی ذات والا صفات کے عظیم کارناموں اور نظریۂ پاکستان، دو قومی نظریہ اور پاکستان کے قیام کے عظیم مقاصد سے پوری طرح آگاہ نہ ہو پانے کے باعث ڈاکٹر تنویر الاسلام نے اس نظریاتی قومی محفل میں شرکت اور اظہار خیال کرنے سے گریزاں رہنے کے لیے عدم موجودگی اختیار کر لی، وہی حال مسلم لیگ (ن) کے ایک کارکن اور قومی اسمبلی کے رکن احسن اقبال کا بھی تھا شاید وہ بھی اپنی سیاسی ترقی کا راز عظیم قومی موضوعات پر لب کشا ہونے کے بجائے اپنی پارٹی کے بالائی دو لیڈرز کے آگے پیچھے گھومتے رہنے میں ہی مخفی سمجھتے ہیں۔ قومی اسمبلی کے ایک اور لیگی رکن خرم دستگیر خاں بھی اس تقریب میں نہ پہنچے حالانکہ ان تینوں شخصیات نے ''قائداعظم یوتھ کانفرنس'' کے منتظمین سے اس میں شمولیت کا پورا وعدہ کیا تھا۔'' (3)

4) تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن، فاطمہ جناح کی انتخابی مہم کے انچارج قائداعظم فاؤنڈیشن کے چیئرمین اور مسٹر جناح اور تحریک پاکستان پر 25 کتابوں کے مصنف جناب سیّد رضوان احمد نے ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی کو انٹرویو دیتے ہوئے سوال ''وطن عزیز کے

موجودہ حالات کے حوالے سے آپ کیا کہیں گے؟'' کے جواب میں کہا:

''اب تو میں نے سفر کرنا کم کر دیا ہے، تین چار سال پہلے تک بیرونِ ملک جہاں پاکستانی بڑی تعداد میں آباد ہیں، میں بہت جاتا تھا، تو وہاں ایک لڑکے نے کھڑے ہو کر کہا کہ جناب! آپ لوگوں نے پاکستان بنا کر غلطی کی تھی۔ تو میں نے کہا کہ صاحبزادے! ہم نے تو جنتِ ارضی بنائی تھی، آج یہ دوزخِ ارضی بن چکی ہے، تم کو تکلیف ہوتی ہے اس لیے کہہ رہے ہو، لیکن ہماری تکلیف کا بھی تو اندازہ کرو۔''(4)

لیکن سیّد صاحب! درست بات یہ ہے کہ آپ لوگوں نے جنت ارضی مسلمان عوام کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے بنائی تھی۔ جاگیردار اور سرمایہ دار کے لیے بنائی تھی۔ یہ جنت ارضی مسلمانوں کے غدار اور انگریز کے ایجنٹوں کے لیے بنائی تھی۔ اسی لیے وہ اس تحریک میں شریک رہے۔ بے شک ان لوگوں کے لیے پاکستان شروع دن سے آج تک جنت ارضی ہے جبکہ عوام کے لیے تو یہ روزِ اوّل سے آج تک دوزخِ ارضی ہے۔ عوام کے لیے اس ملک کے حالات دن بہ دن بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔

5) مسلم لیگی بزرگ اور روزنامہ جنگ کراچی کے معروف کالم نگار جناب سعید صدیقی اپنے کالم بعنوان ''بانیان پاکستان کا ہم پر حق ہے'' لکھتے ہیں:

''استحکام پاکستان کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنے بزرگوں، اکابرین کی یاد کو تازہ رکھیں۔ دیکھنے میں یہ آ رہا ہے کہ رفتہ رفتہ اس سلسلے میں بھی غفلت برتی جا رہی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے چند برس پہلے تک میرے پاس فون آ جاتا تھا، سعید صدیقی صاحب! مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح ڈے آ رہا ہے، آپ کا کالم نہیں آیا۔ اب لے دے کر قائداعظم ڈے یا پھر اقبال ڈے باقی رہ گیا ہے لیکن اخبارات پھر بھی حق ادا کر رہے ہیں۔ قومی دنوں پر علیحدہ رنگین صفحہ خصوصیت کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ TV جو سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ ہے پیغام پہنچانے کا، اس قدر کمرشل بن گیا ہے کہ اسے فرصت ہی نہیں ملتی کہ کوئی پروگرام نشر کرے۔ 16 اکتوبر کو شہید ملت لیاقت علی خان کی برسی کا دن گزر گیا، کسی TV چینل نے ان کی زندگی پر کوئی پروگرام نہیں پیش کیا۔ افسوس کا مقام ہے کہ اس سال تو لیاقت علی خان کے مزار پر کوئی فاتحہ پڑھنے نہیں آیا۔

ہر سال سندھ کے گورنر، وزیر اعلیٰ، وزراء کی ٹیم مزار پر حاضری دیتی تھی۔ فاتحہ خوانی ہوتی تھی۔ عمائدین شہر آتے تھے۔ ہاشم رضا مرحوم جب تک زندہ رہے شہید ملت لیاقت علی خان میموریل سوسائٹی کی جانب سے لیاقت علی خان کے مزار پر حاضری کا خصوصی پروگرام کیا جاتا تھا۔ ایم کیو ایم کو بانیان پاکستان کی اولاد ہونے کا شرف حاصل ہے تو ان پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ الغرض ہمیں چاہیے کہ اپنے اکابرین کو خاص کر بانیانِ پاکستان کو یاد رکھیں۔ نومبر کے پہلے عشرے میں اقبال ڈے آ رہا ہے، اسی ماہ کی 17 تاریخ کو مولانا ظفر علی خان کا یومِ وفات ہے۔ ہمارا فرض ہے اقبال ڈے اہتمام سے منائیں۔ اقبال کی ہم عصر دو ہستیاں، مولانا سیّد سلیمان ندوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی اس شہر قائد میں آسودہ خاک ہیں، کبھی کوئی ان کا نام بھی نہیں لیتا۔''(5)

جناب سعید صدیقی اپنے ایک دوسرے کالم ''قائداعظم کا نظریۂ پاکستان'' میں لکھتے ہیں:

''نوجوان آج کل کے حالات دیکھ کر ہم سے سوال کرتے ہیں کہ: آپ یا آپ کے بزرگوں نے اس لیے پاکستان بنایا تھا؟ کیا یہی قائداعظم کا نظریۂ پاکستان تھا۔''(6)

جناب سعید صدیقی اپنے ایک اور کالم ''تیرگی ہے کہ امڈتی ہی چلی جاتی ہے'' میں لکھتے ہیں:

''پاکستان بنانے میں ہم نے جان کی بازی لگا دی تھی، اللہ تعالیٰ نے ہمیں آزادی جیسی نعمت سے نوازا ہے، اب ہم بنگلوں میں رہتے ہیں، کار، کوٹھی ہمارے پاس ہے، لیکن کچھ کھویا بھی ہے، اپنی تہذیب، روایات، اقدار کھو بیٹھے ہیں۔ آج کل حالات دیکھ کر نوجوان ہم سے سوال کرتے ہیں کہ آپ اور آپ کے بزرگوں نے یہ پاکستان کیوں بنایا تھا اور ہم ندامت کے آنسو بہانے کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔

تیرگی ہے کہ امڈتی ہی چلی جاتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے''(7)

6) علامہ اقبال کے فرزند جسٹس (ر) جاوید اقبال اپنے ایک کالم میں رقم طراز ہیں:

''گزشتہ ساٹھ برسوں میں قائداعظم اور علامہ اقبال کو پیچھے چھوڑ کر ہم کسی اور سمت میں اتنی دور نکل آئے ہیں کہ ہماری اپنی نئی نسل کی نظر میں ان دونوں عظیم ہستیوں کی حیثیت

نظریاتی اعتبار سے مشتبہ ہوگئی ہے بلکہ اب تو یہ کیفیت ہے کہ ان کے ایام ولادت اور وفات کے موقعوں پر مزاروں پر گارڈز کے تبادلے یا بچوں کے ان کی بلندیٔ درجات کی خاطر میکانکی دعائیں پڑھ چکنے کے علاوہ جن جلسوں کا اہتمام کیا جاتا ہے ان کی صدارت کے لیے نہ تو کوئی مناسب شخصیت ملتی ہے نہ ایسے مقررین جو اُن کے نظریات کی صحیح طور پر وضاحت کرسکیں۔ اور جہاں تک ناظرین وسامعین کا تعلق ہے وہ تو مختلف سیاسی یا مذہبی دھڑوں میں بٹے ہلڑ بازی ہی میں وقت گزار دینا زیادہ پسند کرتے ہیں۔''(8)

7) پاکستان مسلم لیگ (ن) کے صدر اور سابق وزیر اعظم پاکستان جناب میاں محمد نواز شریف نے مقتول صحافی جناب سلیم شہزاد کے تعزیتی ریفرنس سے جو خطاب فرمایا، اس کا متن پڑھیے:

''لاہور (سپیشل رپورٹر+ ریڈیو مانیٹرنگ) پاکستان مسلم لیگ (ن) کے قائد میاں محمد نواز شریف نے سیفما کے زیرِ اہتمام صحافی سلیم شہزاد کی یاد میں ریفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ فوج اور آئی ایس آئی کا بجٹ پارلیمنٹ میں زیرِ بحث لانا کوئی جرم نہیں، یہاں کوئی مقدس گائے بننے کی کوشش نہ کرے، خارجہ پالیسی پر فوج کا غلبہ ختم کیا جائے، تنقید خود بہ خود ختم ہو جائے گی۔ قانون کی حکمرانی قائم نہ کی گئی تو ملک کسی حادثے کا شکار ہو جائے گا۔ امریکہ سے کہا جا رہا ہے کہ پارلیمنٹ نے قرارداد منظور کی ہے، اس کا احترام کرو۔ اپنے ملک میں پارلیمنٹ کی قرارداد کا احترام نہیں کیا جا رہا تو امریکہ کس طرح کرے گا۔ آج تک کشمیر کاز کو اتنا نقصان کسی نے نہیں پہنچایا جتنا ہمارے اداروں نے پہنچایا ہے۔ پاکستان میں جمہوریت قائم رہتی تو کبھی انتہا پسندی نہ ہوتی۔ قائد اعظم کو پتا ہوتا کہ یہ سب کچھ پاکستان میں ہونا ہے تو وہ پاکستان کبھی نہ بناتے۔''(9)

معروف صحافی جناب سلمان غنی روزنامہ نوائے وقت لاہور کے مستقل کالم ''لاہور کی سیاسی ڈائری'' میں لکھتے ہیں:

''ایک موقع پر جب نواز شریف نے قائد اعظم کا ذکر کیا اور کہا کہ ''قائد اعظم آج کے

حالات دیکھتے تو شاید وہ ملک بنانے کی غلطی نہ کرتے۔'' اس پر یہاں موجود ایک دانشور نے آواز اُٹھا کر کہا کہ ''نہ بناتے تو اچھا ہوتا۔''(10)

8) معروف صحافی و تجزیہ نگار چودھری خادم حسین بعنوان ''63 واں یومِ آزادی! ہمارے آباء نے ہمیں کیا دیا، آج کا سوال'' لکھتے ہیں:

''آج یومِ آزادی ہے۔ پاکستان کو قائم ہوئے باسٹھ سال گزر گئے اور 63 واں یومِ آزادی منایا جا رہا ہے، کہتے ہیں کہ قوموں کی زندگی میں یہ کوئی زیادہ مدت نہیں۔ لیکن غور فرمایئے آج پاکستان کی تیسری نسل جوان ہو چکی ہے۔ آج کے روز بڑے بڑوں کے پیغامات پڑھنے کو ملیں گے، بڑی خوش کن باتیں کی جائیں گی، لیکن یہ بھی دیکھ لیں کہ ان 63 برسوں میں کیا کھویا کیا پایا ہے؟ آج کی نوجوان نسل کا سوال ہے کہ انھیں ان کے آباؤ اجداد نے کیا دیا؟ وہ پوچھتے ہیں: یہ بے روزگاری، بدامنی اور غیر یقینی حالات ان کے نصیب ہی میں کیوں لکھ دیے گئے ہیں۔ وہ یہ بھی پوچھتے ہیں کہ امیر امیر تر اور غریب غریب تر کیوں ہو رہے ہیں اور ان کے مسائل کو حل کرنے کی بجائے ہمیں صرف وعظ کیوں سنائے جا رہے ہیں۔''(11)

9) روزنامہ جنگ کے جشنِ آزادی کے حوالے سے سروے میں پوچھے گئے سوال: ''14 اگست کو ایک دوسرے کو کن الفاظ پر مشتمل ایس ایم ایس بھیجا جائے؟'' کے جواب میں ٹیلی فون کے ذریعے لوگوں کی اکثریت نے حکمرانوں کے نام پیغام (ایس ایم ایس) دیا کہ: آٹا، گھی اور چینی مہنگی کرتے جاؤ اور جشنِ آزادی ہر روز ہی مناتے جاؤ۔'' لوگوں نے کہا کہ موجودہ حالات میں ہمیں جشنِ آزادی منانا ہی نہیں چاہیے کیونکہ ہم آج پھر غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ حکمران قرض لے کر پاکستانی عوام کو غلامی کی زنجیر میں جکڑ چکے ہیں۔(12)

10) جناب پروفیسر محمد مظفر مرزا اپنی کتاب حضرت قائداعظم کے حضور میں اپنی سمجھ کے مطابق جہالت کو اللہ تعالیٰ کی خاص نعمت قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جہالت خدا تعالیٰ کی خاص نعمت کا نام ہے۔ قوم کے وہ افراد جنھیں عرفِ عام میں زیرو (صفر) سے تعبیر کیا جاتا ہے، جہالت کے باعث پاکستان سے لگاؤ رکھتے ہیں نہ محبت، پاکستان کی سرزمین سے تعلقِ خاطر ہے نہ جذباتی نسبت،

ایسے پاکستانی بہت جلد دنیائے فانی سے کوچ فرماتے جا رہے ہیں جن کی نظروں کو یہ شرف نصیب ہوا کہ انھوں نے پاکستان کی تخلیق کا بذاتِ خود مشاہدہ کرنے کے ساتھ ساتھ تحریکِ پاکستان میں عملی طور پر حصہ لیا۔ بچوں کو شہید ہوتے دیکھا، گھربار، کھیت کھلیان جلتے ہوئے دیکھے، مسلسل تخلیقِ پاکستان کی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے رکھے، جب پاک سرزمین پر تشریف لائے تو اُن کی دل شکنی ہوئی، دل آزاری ہوئی، کس نے کی؟ ہمارے سیاسی نظامِ حکومت نے، سیاسی عمائدین نے، مذہبی زعمائے کرام نے، قومی قائدین نے، سربراہانِ پاکستان نے، پاکستان کے سیاست کاروں نے، قوم کی خوشحالی اور درخشندگی کے دعویدار ٹھیکیداروں نے، یہ سبھی ان کے مجرم ہیں۔ آج وہ بزرگانِ تخلیقِ پاکستان یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ اگر اس طرح کا پاکستان بننا تھا تو ہم نے ہجرت کیوں کی، یہ ظلم و ستم، ناانصافیاں، بھوک، افلاس، تنگ دستی، عزت و ناموس کا عدم تحفظ کچھ ایسا ہی رہنا تھا تو قیامِ پاکستان کی کیا ضرورت تھی؟ ہم نے کیوں اس قدر قربانیاں دیں؟ یہ سبھی کچھ تو ہندو مہاشوں، برطانوی استعمار اور دوسری غیر اقوام سے برداشت کر لیتے۔ یہ سوچ، یہ تصور، یہ نظریہ، یہ خیال اور یہ دکھ کیوں اور کیسے پروان چڑھا؟''(13)

11) معروف ادیبہ اور کالم نگار محترمہ پروین عاطف ''سچ کہوں گی'' کے زیرِ عنوان لکھتی ہیں:

''میری خام اطلاع کے مطابق دھرتی کے پیٹ سے یہ عجیب الخلقت سرپیر کے بغیر پیدا ہونے والا بچہ پاکستان اپنی جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے پیدا کیا جانا ضروری تھا۔ ہندستان کی ایک ارب رنگا رنگ آبادی کو انگلیوں پر نچانا مشکل تھا۔ وہ صدیوں سے اپنی طاقت اور خودمختاری کے منتظر تھے۔ وہ گوری قوم کے ذاتی مقاصد کی خاطر غلامی کا طوق دوبارہ گلے میں پہننے کو تیار نہ تھے۔ جناح ایک تنہا آزادی کا متوالا انسان تھے۔ وہ امریکہ اور یورپ کے روس سے لے کر برازیل تک تیل، سونا، گیس حاصل کرنے کے حتمی پروگرام اور ارادے نہیں بھانپ سکتے تھے۔''(14)

12) جناب حامد میر اپنے کالم ''قلم کمان'' میں لکھتے ہیں:

''افسوس کہ اکثر اہلِ سیاست و دانش کی توجہ کا مرکز صرف سوات ہے حالانکہ بلوچستان

کے حالات زیادہ خراب ہیں۔ تربت اور مند کے علاقوں میں اسکولوں اور کالجوں پر آزاد بلوچستان کے پرچم لہرا رہے ہیں، دیواروں پر پاکستان کے خلاف نعرے لکھے ہوئے ہیں۔''(15)

13) جناب ڈاکٹر صفدر محمود بعنوان ''حکمرانو! وقت کی آواز سنو اور......'' میں رقم طراز ہیں:

''اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ بلوچستان کے بعض حصوں میں نہ ہی صرف آزاد بلوچستان کے جھنڈے لہرا رہے ہیں، پاکستان مخالف نعرے بلند ہو رہے ہیں بلکہ ان علاقوں سے آبادکاروں (یعنی غیر بلوچیوں) کو بھی بھگا دیا گیا ہے اور بعض کو نفرت کی آگ میں جلا دیا گیا ہے۔''(16)

ڈاکٹر صفدر محمود اپنے ایک دوسرے کالم ''میں کہاں جاؤں'' میں بلوچستان کے حوالہ سے مزید لکھتے ہیں:

''پائنزئی نے گزشتہ سال ایم اے کیا تھا اور اس سال وہ سی ایس ایس کا امتحان دینا چاہتا ہے۔ میرا اس سے تعارف کوئی دو برس قبل ہوا، جب اس نے میرے بعض کالموں پر پسندیدگی کا اظہار کیا، محبت وخلوص سے بھری ای میلیں بھیجیں اور بتایا کہ وہ میری دو تین کتابیں بھی پڑھ چکا ہے۔ اس طرح پائنزئی سے ایک ذہنی رشتہ قائم ہو گیا جو آج تک قائم ہے۔ پائنزئی کے بزرگ کوئی دو سو سال قبل سرحدی علاقوں سے ہجرت کر کے بلوچستان آئے تھے، یہاں انھوں نے زمینیں خریدیں، انھیں آباد کیا اور ان میں باغات لگائے۔ آج کل وہ ایک سکول میں پڑھا رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مقابلے کے امتحان کی تیاری بھی کر رہا ہے۔ پائنزئی نہایت مخلص انسان اور حد درجہ محب الوطن پاکستانی ہے۔ مجھے ہمیشہ اس کے الفاظ اور گفتگو سے محبت، خلوص اور جذبۂ حب الوطنی کی خوشبو آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ عرصے سے ہم ایک دوسرے سے درد کے رشتے میں منسلک ہو گئے ہیں۔ آج اس کا فون آیا تو اس کی گفتگو سے خوف، خدشات اور اندیشے ٹپک رہے تھے اور اس کی آواز مجھے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا لگ رہی تھی، جس سے میں اداس اور پھر پریشان ہو گیا کیونکہ گزشتہ برسوں سے میں پائنزئی کی جذبوں سے لبریز گفتگو سن رہا ہوں جس میں مجھے کبھی بھی مایوسی یا پست

حوصلگی کی چاپ سنائی نہیں دی۔ اس نے اداس سے لہجے میں السلام علیکم کہا اور پھر یوں پھٹ پڑا جیسے اس کا دل شدتِ غم سے آتش فشاں بن چکا ہو۔ کہنے لگا، ''ڈاکٹر صاحب! حد ہوگئی۔ آج بلوچ قومیت پرست بلوچستان کی آزادی کے نعرے لگاتے ہوئے ہمارے سکول میں آئے تھے۔ انھوں نے آتے ہی سکول کی عمارت سے پاکستان کا جھنڈا اُتار کر بلوچستان کا جھنڈا لہرا دیا۔ میں سکول میں پاکستان سٹڈیز (مطالعۂ پاکستان) پڑھاتا ہوں۔ ایک بپھرے ہوئے باغی نے آگے بڑھ کر میری قمیص کا کالر کھینچا اور غصے سے کہا کہ اگر تم نے آئندہ کبھی پاکستان سٹڈیز پڑھائی تو اپنی جان سے جاؤ گے۔ کل سے تم بچوں کو صرف بلوچستان سٹڈیز پڑھاؤ گے۔ اس کے بعد انھوں نے سکول کے پرنسپل کو حکم دیا کہ کل سے سکول میں پاکستان کا ترانہ نہیں گایا جائے گا۔ یہ کہ کر وہ چلے گئے اور ہم خوف کے مارے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ایک خفیہ ایجنسی کا اہلکار آیا اور سارے واقعے کی تفصیل لے کر چلا گیا۔ وہ بذاتِ خود بھی سہا ہوا تھا اور کہ رہا تھا کہ میں اور میرے ساتھی اپنی زندگیاں ہتھیلی پر رکھ کر کام کر رہے ہیں کیونکہ ہمیں تحفظ دستیاب نہیں ہے۔'' پانزئی کی آواز اُداسی میں ڈوب گئی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی ہوں۔ وہ کہ رہا تھا کہ سر! ہم دو صدیاں قبل یہاں آئے تھے لیکن آج ہمیں یہاں سے نکلنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ بہت سے وہ خاندان جو یہاں گزشتہ چالیس پچاس برسوں سے آباد تھے ان دھمکیوں کے زیرِ اثر پنجاب کی طرف ہجرت کر گئے ہیں۔ بہت سے لوگ ملازمتیں اور کاروبار چھوڑ کر واپس جا رہے ہیں۔''(17)

14) قارئین کے مطالعہ کے لیے ہم ذیل میں ایک ''جدید قومی ترانہ'' پیش کر رہے ہیں۔ یہ ترانہ کریسنٹ ماڈل ہائر سیکنڈری سکول شادمان لاہور کے گیارہویں۔اے کے ایک طالب علم حسن زبیر کے ننھے ذہن کی تخلیق ہے۔ آپ اسے ان کے خون کا اُبال بھی کہ سکتے ہیں۔ یہ ترانہ سکول کے مجلہ الھلال کے شمارہ 23 بابت 3-2002ء میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔ ہم مجلہ کے شکریہ کے ساتھ شاملِ کتاب کر رہے ہیں۔ ہم یہاں یہ وضاحت کرنا بھی مناسب سمجھتے ہیں کہ نظریۂ پاکستان ٹرسٹ کے چیئرمین جناب مجید نظامی ہی مذکورہ سکول کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے

چیئرمین ہیں:

جدید قومی ترانہ

کھیت، گھر، زمین شاد باد　　کار بہترین شاد باد
پگڑیاں، وزارتیں، مکان　　کوٹھیاں، عمارتیں، مکان
لوٹ مار چھین شاد باد
بے وقوف لوگ ہیں عوام　　رہ گئے غلام کے غلام
کرسی، عہدہ، سلطنت　　جوئندہ، پائندہ باد
لیڈروں کی منزلِ مراد
ہر طرف سفارشوں کا جال　　سر نگوں ترقی و کمال
پاک سر زمین میں حلال　　رشوتوں وزارتوں کا مال
لعنتِ خدائے ذوالجلال

اب اگر کسی میں ہمت و حوصلہ ہو تو وہ تحقیق کرے کہ پاکستان میں کتنے فیصد لوگ مسٹر جناح کو دِل سے قائداعظم تسلیم کرتے ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جو دو قومی نظریہ پر اب بھی ایمان رکھتے ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ تقسیم ہند سے اور قیامِ پاکستان سے مسلمانوں کو فائدہ ہوا۔ ہم ذیل میں ایم۔ کیو۔ ایم کے قائد جناب الطاف حسین کا تقسیم ہند کے حوالے سے ایک بیان کتاب میں شامل کرنا مناسب سمجھتے ہیں، جس سے ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ پہلے شہ سرخیاں ملاحظہ ہوں: ''تقسیم برصغیر سے مسلمانوں کو نقصان ہوا، علامہ اقبال نے قیامِ پاکستان کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ اقبال نے مطالبہ کیا تھا جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں ان کی ریاستیں بنادی جائیں، اس کی تصدیق جاوید اقبال سے ہوسکتی ہے۔'' بیان کا متن حسب ذیل ہے۔ پڑھیے:

''کراچی (مانیٹرنگ ڈیسک) متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین نے کہا ہے کہ برصغیر کی تقسیم سے مسلمانوں کو نقصان ہوا، اس سے مسلمان تین حصوں میں بٹ گئے۔ جن میں بھارت، بنگلہ دیش اور پاکستان ہیں۔ انھوں نے کہا کہ علامہ اقبال نے پاکستان کے قیام کا مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ یہ کہا تھا کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں مسلمانوں کی ریاستیں بنادی جائیں۔ یہ باتیں انھوں نے گزشتہ رات نجی ٹی وی

کے ایک پروگرام میں گفتگو کرتے ہوئے کیں۔ انھوں نے کہا، علامہ اقبال کے صاحبزادے ڈاکٹر جاوید اقبال حیات ہیں، میری بات کی تصدیق عوام جاوید اقبال سے کر سکتے ہیں۔'' (18)

علامہ اقبال کے پوتے، ڈاکٹر جاوید اقبال کے بیٹے بیرسٹر ولید اقبال نے 1996ء میں روزنامہ جنگ لاہور کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا:

''میرے والد ڈاکٹر جاوید اقبال، علامہ اقبال کے روحانی واقعات کو تسلیم نہیں کرتے۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ علامہ کی ازدواجی زندگی بھی خوش گوار نہیں تھی۔ انھوں نے کہا کہ علامہ اقبال نے ملک تقسیم کرنے کا خواب نہیں دیکھا تھا بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان معاشی طور پر خوش حال ہوں، لیکن آج مسلمان ویسے کے ویسے ہی ہیں۔'' (19)

گزشتہ صفحات میں آپ جناح صاحب کی مقبولیت کی کہانی پڑھ چکے، اب ان کے دو قومی نظریے کا حال احوال بھی سن لیجیے۔ عرفِ عام میں دو قومی نظریے کا مفہوم یہ تھا کہ مسلمان ایک قوم ہیں اور تمام غیر مسلم دوسری قوم۔ پاکستان بننے کے بعد ہندستان میں ہندو تو ایک قوم ہندستانی بن گئے، لیکن پاکستان میں مسلمان خود دو قوموں میں تقسیم ہو گئے، پاکستانی مسلمان اور ہندستانی مسلمان۔ 16 دسمبر 1971ء کے بعد پاکستانی مسلمان پھر دو قوموں میں تقسیم ہو گئے۔ بنگلہ دیشی مسلمان اور پاکستانی مسلمان۔ ان دنوں پاکستانی قاضی حسین احمد کے نزدیک دو قومیں ہیں یعنی مسلم اور غیر مسلم، خان عبدالولی خان کے مطابق چار قومیں ہیں اور بھائی الطاف حسین کی نظر میں پانچ قومیں۔ دیکھیے آئندہ پاکستانی مسلمان کتنی قومیں بنتے ہیں۔ یہ انتشار مسٹر جناح کا عطیہ ہے۔ اگر انتشار پھیلانے کے حوالے سے بڑا قائد تلاش کرنا ہو تو مسٹر جناح یقیناً قائد اعظم ہیں۔

جو لوگ سیاسی بصیرت و فراست اور شعور و تدبر رکھتے تھے، انھیں اس صورتِ حال کا ادراک قیامِ پاکستان سے پہلے ہی تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے یو۔پی سے پاکستان آنے والے ایک گروہ سے گفت گو کرتے ہوئے کس قدر درست فرمایا تھا:



انجام کیا ہو گا؟

آپ مادرِ وطن چھوڑ کر جا رہے ہیں، آپ نے سوچا اس کا انجام کیا ہو گا؟ ــــ آپ کے اس طرح فرار ہوتے رہنے سے ہندوستان میں بسنے والے مسلمان کمزور ہو جائیں گے۔ اور ایک وقت ایسا بھی آ سکتا ہے جب پاکستان کے علاقائی باشندے اپنی اپنی جداگانہ حیثیتوں کا دعویٰ لے کر اٹھ کھڑے ہوں، بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچ اور پٹھان خود کو مستقل قومیں قرار دینے لگیں۔

کیا اس وقت آپ کی پوزیشن پاکستان میں بن بلائے مہمان کی طرح نازک اور بے کسانہ نہیں رہ جائے گی؟ ــــ ہندو آپ کا مذہبی مخالف تو ہو سکتا ہے، قومی اور وطنی مخالف نہیں۔ آپ اس صورتِ حال سے نمٹ سکتے ہیں۔ مگر پاکستان میں آپ کو کسی وقت بھی قومی اور وطنی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑ جائے گا جس کے آگے آپ بے بس ہو جائیں گے۔

(یو۔پی سے پاکستان جانے والے ایک گروہ سے گفتگو)

بشکریہ روزنامہ نوائے وقت لاہور / 15 جولائی 1995

"آپ مادرِ وطن چھوڑ کر جا رہے ہیں، آپ نے سوچا اس کا انجام کیا ہوگا؟— آپ کے اس طرح فرار ہوتے رہنے سے ہندستان میں بسنے والے مسلمان کمزور ہو جائیں گے اور ایک وقت ایسا بھی آ سکتا ہے جب پاکستان کے علاقائی باشندے اپنی اپنی جداگانہ حیثیتوں کا دعویٰ لے کر اُٹھ کھڑے ہوں۔ بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچ اور پٹھان خود کو مستقل قومیں قرار دینے لگیں۔ کیا اس وقت آپ کی پوزیشن پاکستان میں بن بلائے مہمان کی طرح نازک اور بے کسانہ نہیں رہ جائے گی؟— ہندو آپ کا مذہبی مخالف تو ہوسکتا ہے، قومی اور وطنی مخالف نہیں۔ آپ اس صورتِ حال سے نمٹ سکتے ہیں۔ مگر پاکستان میں آپ کو کسی وقت بھی قومی اور وطنی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑ جائے گا جس کے آگے آپ بے بس ہو جائیں گے۔" (29)

مولانا آزاد کی پیش گوئی تو 1947ء کے بعد کے چند سالوں میں ہی حرف بہ حرف درست ثابت ہوگئی تھی۔ اس پر سیکڑوں مثالیں اور حوالے پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن مہاجرین کے قائد جناب الطاف حسین کے حالیہ بیان نے تو گویا اس پر اتمام حجت کر دی ہے، جو ملک کے تمام اخبارات میں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ پہلے شہ سرخیاں ملاحظہ فرمائیں: "کراچی میں امن کے لیے فوج بلائی جائے۔ وزیر اعلیٰ سندھ ڈرگ، لینڈ مافیا کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ انڈیا والوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ 7 کروڑ مہاجروں کو واپس لے لیں گے۔" اور اب الطاف بھائی کے بیان کا متن پڑھیے:

"کراچی (خصوصی رپورٹر) متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین نے قیامِ امن کے لیے فوج بلانے کا مطالبہ کیا ہے اور کہا ہے کہ فوج بلا امتیاز کارروائی کرے، رینجرز اور فوج دیکھے کہ دہشت گردی میں کون ملوث ہے۔ وہ بدھ کی شام لال قلعہ گراؤنڈ میں ایم کیو ایم کے کارکنوں کے اجلاس سے ٹیلی فونک خطاب کر رہے تھے۔ الطاف حسین نے کہا کہ جب قصبہ کالونی میں گولیاں چل رہی تھیں تو پولیس اور رینجرز کہاں تھی۔ انھوں نے کہا کہ مہاجر کبھی بھوکے ننگے نہیں تھے، ان ہی بھوکوں ننگوں نے قربانی دے کر آزادی دلائی، ہم نے آزادی کے لیے انگریزوں سے جدوجہد کی۔ ہم کبھی بحیرہ عرب میں ڈوب کر نہیں مریں گے۔ مہاجر اب مہاجر نہیں بلکہ پاکستانی ہیں۔ ایم کیو

ایم بننے سے پہلے بھی مہاجر بستیوں پر حملے ہوا کرتے تھے۔ الطاف حسین نے کہا کہ وزیر اعلیٰ سندھ لینڈ مافیا اور ڈرگ مافیا کی سرپرستی بند کریں۔ الطاف حسین نے کہا کہ حکومت قتل و غارت گری کا سلسلہ بند کرائے۔ متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین نے عالمی برادری سے اپیل کی کہ وہ اُردو بولنے والوں کو تسلیم کریں۔ الطاف حسین نے کہا کہ حکومت طاقت کے ذریعے ایم کیو ایم کو کچلنا بند کر دے۔ الطاف حسین نے کہا، میں چند سال قبل انٹرنیشنل کانفرنس میں انڈیا گیا تھا اور وہاں تقریر کرتے ہوئے بھارت کے وزیر اعظم منموہن سنگھ، کانگریس کی سربراہ سونیا گاندھی اور انڈیا کے لیڈروں سے کہا تھا کہ پاکستان میں مہاجروں کی نسل کشی کی جا رہی ہے اور ہمیں دنیا میں کہیں پناہ نہیں مل رہی ہے۔ اگر اب مہاجروں کے خلاف دوبارہ 1992ء جیسا ریاستی آپریشن ہوگا تو اے انڈیا والو! تم ہمیں پناہ دے دو گے؟ میری اس تقریر پر بہت اعتراض ہوا تھا۔ آج میں انڈیا کے وزیر اعظم منموہن سنگھ اور انڈیا کے تمام لیڈروں سے سوال کرتا ہوں کہ کیا تمھارا اتنا بڑا دل جگر ہے کہ تم 7 کروڑ مہاجروں کو واپس انڈیا لے لو گے؟" (21)

ملک کے ممتاز انشا پرداز، ادیب، شاعر جناب ابن انشا نے "ہمارا ملک" کے عنوان سے پاکستانی قومیت پر طنز سے بھرپور تحریر بہ صورت مکالمہ یادگار چھوڑی ہے جسے ذیل میں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

"ایران میں کون رہتا ہے؟ ایران میں ایرانی قوم رہتی ہے۔
انگلستان میں کون رہتا ہے؟ انگلستان میں انگریز قوم رہتی ہے۔
فرانس میں کون رہتا ہے؟ فرانس میں فرانسیسی قوم رہتی ہے۔
یہ کون سا ملک ہے؟ یہ پاکستان ہے۔
اس میں پاکستانی قوم رہتی ہوگی؟ نہیں، اس میں پاکستانی قوم نہیں رہتی۔
اس میں سندھی قوم رہتی ہے۔
اس میں پنجابی قوم رہتی ہے۔
اس میں بنگالی قوم رہتی ہے۔

اس میں یہ قوم رہتی ہے۔
اس میں وہ قوم رہتی ہے۔
لیکن—— پنجابی تو ہندستان میں بھی رہتے ہیں۔
سندھی تو ہندستان میں بھی رہتے ہیں۔
بنگالی تو ہندستان میں بھی رہتے ہیں۔
پھر یہ الگ ملک کیوں بنایا تھا؟
غلطی ہوگئی، معاف کردیجیے، آئندہ نہیں بنائیں گے۔''

مسلم لیگی قلم کار جناب عزیز ظفر آزاد قومیتوں کے حوالے سے اپنے ایک حالیہ مضمون میں لکھتے ہیں:

''پاکستان کا قیام مسلم قومیت کی بنیاد پر ہوا آج یہاں چار یا چھ قوموں کا پرچار کرنے والے ریاست کے بنیادی نظریے سے انحراف کر رہے ہیں تاہم تعجب اور صدمے کا مقام یہ ہے کہ کوئی پاکستان یا نظریۂ پاکستان کا وکیل بننے کو تیار نہیں، جہاں تک نام نہاد مسلم لیگیوں کا تعلق ہے تو ان میں نظریۂ پاکستان سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ ان کا مقصود و مطلوب حصولِ اقتدار، ذاتی تشخص اور انا کی تسکین ہے۔''(22)

نظریہ پاکستان ٹرسٹ کے چیئرمین اور روزنامہ نوائے وقت لاہور کے چیف ایڈیٹر جناب مجید نظامی نے ایوانِ کارکنانِ تحریک پاکستان لاہور میں اساتذۂ کرام سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''قائداعظم نے انگریزوں سے کہا، جانے سے قبل ہندستان کو تقسیم کر کے جائیں۔ آخر کار ہم 1947ء میں آزاد ہوگئے۔ آج ہم جس جگہ بیٹھے ہیں یہاں پہلے ایک ہندو سیٹھ کی کوٹھی کا لان تھا۔ پاکستان کے قیام سے قبل مسلمانوں کی معاشی و سماجی حالت انتہائی بدتر تھی۔ سارے مال روڈ اور انار کلی میں مسلمانوں کی صرف دو تین دکانیں ہی تھیں۔ ہمیں یہ آزادی، خوشحالی اور ترقی سب قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کی وجہ سے ملی ہے۔ اگر ہم آزاد نہ ہوتے تو آج ہندوؤں کے غلام ہوتے اور نہایت کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہوتے۔ بدقسمتی سے ہم اپنی آزادی کو ٹھیک طرح استعمال نہیں کر سکے اور

ہم نے پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ قائداعظم نے ہمیں ایک قوم بنایا تھا، لیکن آزادی کے بعد ہم مختلف گروپوں اور قوموں میں تقسیم ہو گئے۔ ہم پاکستانی بننے کی بجائے سندھی، بلوچی، پٹھان اور پنجابی بن گئے۔ آج ہی نوائے وقت میں یہ خبر چھپی ہے، بلوچستان میں پنجابیوں کی ٹارگٹ کلنگ کی جا رہی ہے۔ بالخصوص اساتذہ کرام کو چن چن کر مارا جا رہا ہے حالانکہ وہ بلوچوں کے بچوں کو تعلیم فراہم کر رہے ہیں۔ اسی طرح کراچی میں بھی روزانہ آٹھ دس افراد کو مارا جا رہا ہے اور پٹھان کہ رہے ہیں کراچی میں ان کی نسل ختم کی جا رہی ہے۔

اس موقع پر ایک سوال کے جواب میں مجید نظامی نے کہا: پاکستان مسلم لیگ نے بنایا تھا لیکن پاکستان بنتے ہی ہم نے نظریۂ پاکستان کو فراموش کر کے بندر بانٹ اور لوٹ مار شروع کر دی۔ مہاجرین اور مقامی لوگوں نے جائیدادوں پر قبضے شروع کر دیے۔ یہ قبضے ناجائز تھے اس لیے ان کی آمدنی ہمارے لیے حرام تھی جو اب تک چلی آ رہی ہے۔ اس حرام خوری نے ہمیں سخت نقصان پہنچایا۔ وزیر مذہبی امور حامد سعید کاظمی پر خود ان کے ساتھی یہ الزام عائد کر رہے ہیں کہ انھوں نے اڑھائی ہزار روپے فی حاجی کمائی کی ہے۔ جب تک ہم یہاں پر اسلامی نظام نافذ نہیں کرتے تب تک ان مسائل سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔''(23)

مسٹر جناح کے گمراہ کن دو قومی نظریہ کا ''اعجاز'' اور ''کمال'' ہے کہ اس کی بدولت برصغیر کے مسلمان تقسیم ہند کے بعد پہلے تین ملکوں میں تقسیم ہوئے اور آج پاکستان میں ہی چھ سات قومیتوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ آگے کا حال معلوم نہیں، البتہ آثار اچھے نظر نہیں آ رہے۔ اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کے حال پر رحم و کرم فرمائے۔ آمین



حوالہ جات

(1) روزنامہ نوائے وقت (سنڈے میگزین) لاہور/8مارچ2009ء
(2) روزنامہ نوائے وقت لاہور/24مئی2009ء
(3) روزنامہ نوائے وقت لاہور/18مئی2009ء
(4) ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی/12تا18اکتوبر2009ء/ص17
(5) روزنامہ جنگ لاہور/24اکتوبر2009ء
(6) ماہنامہ تہذیب کراچی/ستمبر2010ء/ص11
(7) روزنامہ جنگ لاہور/18جنوری2012ء
(8) روزنامہ نوائے وقت لاہور/13ستمبر2008ء
(9) روزنامہ نوائے وقت لاہور/11جون2011ء
(10) روزنامہ نوائے وقت لاہور/16جون2011ء
(11) روزنامہ پاکستان لاہور/16نومبر2009ء
(12) روزنامہ جنگ لاہور/8اگست2009ء
(13) حضرت قائداعظم کے حضور میں/پروفیسر محمد مظفر مرزا/ص12-13
(14) روزنامہ خبریں لاہور/25اپریل2011ء
(15) روزنامہ جنگ لاہور/23اپریل2009ء
(16) روزنامہ جنگ لاہور/25اپریل2009ء
(17) روزنامہ جنگ لاہور/9مئی2009ء
(18) روزنامہ نوائے وقت لاہور/29جون2009ء
(19) روزنامہ جنگ لاہور/7مئی1996ء
(20) روزنامہ نوائے وقت لاہور/15جولائی1995ء
(21) روزنامہ نوائے وقت لاہور/4اگست2011ء
(22) روزنامہ نوائے وقت (سنڈے میگزین) لاہور/12جون2011ء/ص11
(23) روزنامہ نوائے وقت لاہور/24نومبر2010ء

28

اکثر لوگوں کی زبان پر ہوتا ہے کہ جناح صاحب کو مہلت نہیں ملی، وہ جلدی فوت ہو گئے۔ ان کے بعد ملک پر جاگیردار، سرمایہ دار، بیوروکریٹ اور فوجی مسلط ہو گئے۔ بھئی انہی لوگوں نے تو مسلط ہونا تھا، آسمان سے فرشتے تو نازل نہیں ہونے تھے۔ ان لوگوں کا مسلط ہونا تو سب کو نظر آ رہا تھا اگر کسی کو نظر نہیں آ رہا تھا تو وہ مسلم لیگ سے وابستہ بے بصیرت مسلمان تھے۔ لیگی ذہن رکھنے والے معروف دانشور، اور ادیب جناب خالد ہمایوں اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں:

> ''ایک بار میں نے ممتاز ادیب سیّد قاسم محمود سے انٹرویو کے دوران پوچھا: ''شاہ جی! آپ مسلمانانِ برصغیر کے علیحدہ وطن کے مطالبے کو کس طرح ایک درست مطالبہ سمجھتے ہیں؟'' فرمانے لگے: ''مسلمانوں کا پاکستان بنانے کا فیصلہ تو درست ہی تھا، لیکن وہ مقصد پورا نہیں ہو سکا، جس کی خاطر اتنی عظیم الشان تحریک چلائی گئی تھی۔ میں جب چوتھی جماعت میں تھا تو ہمارے ایک ہندو استاد نے ہم مسلمان طلباء سے مخاطب ہو کر کہا: ''پاکستان بنانے چلے ہو، بنا لو، لیکن یاد رکھو، تم پر پھر بھی دولتانے اور ٹوانے ہی حکومت کریں گے۔'' میں آج ساٹھ سال کے عرصۂ آزادی پر نگاہ ڈالتا ہوں تو اپنے اس ہندو استاد کا یہ بصیرت افروز جملہ ضرور یاد آ جاتا ہے۔''(1)

جو لوگ مسلط ہوئے وہ سب جناح صاحب کے رفیق تھے، تربیت یافتہ تھے۔ جناح صاحب نے انہی لوگوں میں سے پہلی کابینہ کا انتخاب کیا تھا۔ جب ان سے کہا گیا وہ مولانا ظفر علی خان اور مولانا حسرت موہانی کو بھی کابینہ میں شامل کریں تو اُن کا کہنا تھا کہ وہ چونکہ مالی طور پر کمزور

ہیں اس لیے انھیں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ وہ تو ان صاحبانِ علم وفضل کی غربت کا مذاق اُڑایا کرتے تھے، ان کی غربت کی مثال دیا کرتے تھے، ان کے ہاں علم وفضل کی کوئی وقعت وحیثیت ہی نہ تھی۔ ان کے ہاں معیار صرف پیسہ تھا، دولت تھی۔ حالانکہ مولانا ظفر علی خاں کی مالی حالت تو اچھی خاصی تھی لیکن چونکہ وہ امیر ترین نہیں تھے اور جناح صاحب سیاست کا حق صرف امیر ترین لوگوں کو ہی دیتے تھے۔ اس لیے جناح صاحب انھیں ورکنگ کمیٹی میں لینے کے بھی روادار نہیں تھے۔ مسٹر جناح کے ساتھی جناب ایس ایم طوسی لکھتے ہیں:

''ایک دفعہ میں نے جناح صاحب سے کہا کہ مولانا ظفر علی خاں نے پنجاب میں بڑا کام کیا ہے، ان کو ورکنگ کمیٹی میں رکھنا چاہیے۔ اس پر وہ بولے کہ ان کے اخراجات کو کون پورا کرے گا۔''(2)

انھوں نے پاکستان بنایا ہی اُن امیر ترین لوگوں کے لیے تھا، جنھوں نے مسلمانوں سے غداری کر کے جاگیریں حاصل کیں۔ جناح صاحب نے ان تمام لوگوں کو مسلم لیگ میں شامل کیا۔ آزادی کے بعد جواہر لال نہرو نے پہلا کام جو کیا وہ ہندستان میں جاگیریں ضبط کرنے کا تھا۔ جبکہ جناح صاحب نے جاگیرداروں کو پاکستان کی پہلی کابینہ میں شامل کیا۔ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں جاگیردار تھے یا سرمایہ دار۔ غریب کوئی بھی نہیں تھا۔ مسٹر جناح سیاست کا حق صرف اُمراء کو دیتے تھے۔ وہ دراصل نوٹوں اور لوٹوں کی سیاست کے قائل تھے۔ مسٹر جناح کے رفیق خاص، تحریک پاکستان کے رہنما سردار شوکت حیات خاں سے انھوں نے کہا تھا کہ سیاست چھوڑ دو، جاؤ جا کر پیسے کماؤ کیونکہ پنجاب کے دیگر لیڈروں کے مقابلے میں تمھارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ یہاں وہی سیاست دان کامیاب ہوسکتا ہے جس کے پاس دولت کے انبار ہوں۔ حسرت موہانی اور ظفر علی خاں کو دیکھو انھیں جائز مقام نہیں ملا، حتیٰ کہ مجھے بھی اس وقت تک تسلیم نہیں کیا گیا تھا، جب تک پچاس ساٹھ لاکھ کے اثاثے نہیں بنے تھے۔ دراصل وہ دولت کو سیاست کا اصل اصول مانتے تھے۔ انھوں نے نوٹوں اور لوٹوں کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا۔ 1937ء میں لیاقت علی خاں الیکشن سے پہلے اور غضنفر علی الیکشن کے بعد لوٹے ہوئے، مگر بالآخر جناح کے پاس لوٹ آئے تو قائد و راہنما ٹھہرے۔ مسلم لیگ میں کیسے کیسے لوٹے آئے اور جناح صاحب نے انھیں دل و جان سے قبول کیا، یہ ایک الگ داستان ہے۔ پہلے نوٹوں کی بابت سنیے، راوی جناح صاحب کے

رفیق خاص سردار شوکت حیات خاں ہیں۔ 1946ء کے الیکشن میں انھیں شوکتِ پنجاب کا لقب عطا ہوا تھا۔ ان کی زبانی سنیے:

''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آغاز 1947ء میں قائداعظم نے مجھے نصیحت کی کہ مجھے سیاست چھوڑ دینا چاہیے میں نے کنکھیوں سے ان کی طرف دیکھا۔ جس پر انھوں نے جواب دیا،'' میں جانتا ہوں کہ تم یہ سن کر ضرور حیران ہو گے کہ میں ایک جان نثار کارکن کو جنگ کے دوران علیحدگی کا مشورہ دے رہا ہوں جب کہ تمھاری ضرورت ہے۔ مگر شوکت! میں جانتا ہوں کہ تم ایک محنتی، بااصول اور ایک دیانتدار شخص ہو۔ تم نے پاکستان کے مقاصد کے حصول کے لیے بڑی قربانی دی ہے لیکن تم میں ایک کمی نظر آتی ہے تمھارے پاس وہ وسائل نہیں ہیں جو پنجاب کے دوسرے لیڈروں کے پاس ہیں۔ براہِ مہربانی جاؤ اور دولت حاصل کرو کیونکہ قوم جس کی تم خدمت کر رہے ہو وہ اپنے لیڈر کی جیب میں سکوں کی کھنک سننے کی عادی ہے۔ مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خان جیسے بڑے لوگوں کو دیکھو کہ انھیں اپنی خدمات کا صلہ کیا ملا۔ حتیٰ کہ مجھے بھی اس وقت تک قبول نہ کیا گیا جس وقت تک میں نے اپنی محنت سے پچاس ساٹھ لاکھ روپے کے وسائل جمع نہ کر لیے، میں نے کہا جناب! کیا آپ سنجیدہ ہیں کہ میں ایسے نازک وقت میں سیاست سے کنارہ کشی کرلوں، میں نے ایک سپاہی کی حیثیت سے یہ نہیں سیکھا کہ حالت جنگ میں راہِ فرار اختیار کی جائے اور میں نے یہ بھی نہیں سیکھا کہ تھوڑے سے وقت میں بڑی دولت کیسے حاصل کی جائے۔ انہوں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا پھر اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کے ایچ خورشید سے کہا کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر مسٹر عزیز الحق کے ساتھ فون پر اُن کی بات کرائے۔ جب مسٹر عزیز فون پر آئے تو انھوں نے کہا کہ میں شوکت کو تمھارے پاس بھیج رہا ہوں تاکہ دیانتداری سے اسے امیر بنایا جائے، تم اس کی کیسے مدد کر سکتے ہو؟ پھر انھوں نے مجھے کہا کہ میں مسٹر عزیز کے پاس چلا جاؤں میں وہاں گیا تو انھیں اپنا منتظر پایا، انہوں نے پوچھا سردار صاحب میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں، میں نے بتایا کہ میں درحقیقت کچھ نہیں جانتا البتہ قائد کے ساتھ ہونے والی گفتگو کو دُہرا دیا۔ سر عزیز نے اپنے چیف

کنٹرولر درآمد مسٹر مہرتہ اور چیف کنٹرولر برآمد میاں امین الدین کو فوراً بلایا۔ شام تک مجھے ایک کروڑ سے زیادہ کے پرمٹ سے لاد دیا گیا۔ یہ وہ لائسنس تھے جن پر دوسری جنگ عظیم کے دوران پابندیاں تھیں اور ابھی ابھی پابندیاں اٹھالی گئی تھیں۔ اگلی صبح ہر ایک کو علم ہو گیا کہ مجھے اتنے بڑے لائسنس عطا کیے جا چکے تھے۔ چنانچہ جلد ہی کاروباری شکاری میرے ہوٹل میں پہنچ گئے اور لائسنسوں کے بدلے 27 لاکھ دینے کی پیشکش کی۔ میں نے قبول کرنا مناسب نہ سمجھا، اس لیے کہ اگر میں ایسا کرتا تو یہ قائداعظم کے نام پر دھبہ ہوتا کہ ان کے نامزد فرد نے غیر قانونی طور پر لائسنس بیچ دیے ہیں۔ اگلے روز میں دوڑا دوڑا پھر محمد علی جناح کے پاس پہنچا اور ان سے کہا جناب! آپ کی شفقت نے مجھے بڑی مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ میں اُس تجارت سے بالکل ناواقف ہوں، دوسرے میں اس کے غیر قانونی سودے سے بھی باز رہنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے خورشید کو بلایا اور کہا کہ وہ ان کا بمبئی میں سیٹھ احمد سے رابطہ کرائے۔ رابطہ ہونے پر سیٹھ احمد سے کہا گیا کہ وہ میرے ساتھ لاہور میں رابطہ کر کے درآمد برآمد کی مشکلات دور کرنے میں مدد کرے۔ احمد کی UK اور یورپ میں تنظیمیں قائم تھیں، اس نے میرے نام چند آرڈر بک کیے۔''(3)

ممتاز دانشور جناب سیّد نصیر شاہ اپنے ایک مضمون ''سیاست اور دولت مندی'' میں سردار شوکت حیات خان کی کتاب گم گشتہ قوم سے درج بالا اقتباس نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''اس طویل اقتباس سے چند اُمور کھل کر سامنے آتے ہیں:

1) محمد علی جناح سیاست کے لیے سرمایہ دار ہونا ضروری سمجھتے تھے۔

2) محمد علی جناح نے انگریز سے آزادی حاصل کرنے کی مسلم لیگی کوشش کو حالت جنگ کہا تھا، ظاہر ہے یہ جنگ انگریز کے ساتھ تھی مگر اسی انگریز کی حکومت چلانے والوں کے ساتھ اتنا اچھا تعلق کہ ان کے ایک اشارے پر ایک کروڑ روپے کے لائسنس مل گئے۔ خیال رہے کہ اس زمانے کے ایک کروڑ روپے آج کے 50 کروڑ کے برابر ہوں گے۔

3) یہ لائسنس ایسے شخص کو دیے گئے جو اس کاروبار کا اہل نہ تھا۔

4) محمد علی جناح نے یہ بھی بتایا کہ خود انھیں سیاست میں داخل ہونے کے لیے دولت مند ہونا پڑا تھا۔''(4)

جناح صاحب یہ مشورہ کسی غریب کو امیر بنانے کا نہیں، بلکہ ایک امیر کو امیر تر بنانے کا دے رہے تھے۔ جناح صاحب کے ہاں صرف لوٹے نظر آتے ہیں یا نوٹ۔ وہ سیاست کو صرف امرا کا شوق خیال کرتے تھے۔ اسی لیے سردار شوکت حیات خاں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی دولت میں اضافہ کرے۔ دولت ہوگی تو وہ سیاست کر سکے گا، ورنہ وہ مجاہدین آزادی کی طرح زندگی پر تہمت بن کر رہ جائے گا۔ جناح صاحب کے پاکستان میں بھی صرف نوٹوں والے ہی سیاست کر سکتے تھے اور کر سکتے ہیں۔ مسٹر جناح کے ساتھیوں نے اُن کے کہے پر بھرپور طریقے سے عمل کیا۔ ان کے عین نقشِ قدم پر چلے۔ قیامِ پاکستان کے بعد انھوں نے جس طرح دولت اکٹھی کی، جائدادیں بنائیں۔ سیکڑوں نہیں ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ حوالے موجود ہیں۔ سندھ کی دو شخصیتوں کے بارے میں ایک حوالہ ملاحظہ ہو۔ دی نیوز لاہور کے سابق ایڈیٹر اور ممتاز اخبار نویس جناب حسین نقی نے معروف صحافی جناب اصغر عبداللہ کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

میں ذاتی طور پر جانتا ہوں غلام مصطفیٰ جتوئی کو، جو اب سندھ کے ایک بڑے جاگیردار ہیں، ان کی بہت مختصر زمینداری تھی۔ آصف علی زرداری کے والد حاکم علی زرداری کے پاس بھی تھوڑی سی زمین تھی، چند ایکڑ، لیکن ہندوؤں کے انخلا کے بعد یہ بڑے جاگیردار بن گئے۔''(5)

واضح ہو کہ ہر دو حضرات کا شمار پاکستان کے امیر کبیر لوگوں میں ہوتا ہے۔ اوّل الذکر جناب غلام مصطفیٰ جتوئی پہلے سندھ کے وزیر اعلیٰ رہے، بعد میں پاکستان کے عبوری وزیر اعظم بنے۔ آج ان کی حیثیت ایشیا کے سب سے بڑے زمیندار کی ہے۔ جبکہ ثانی الذکر جناب حاکم علی زرداری بھی کئی مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور کئی اہم عہدوں پر فائز رہے۔ جبکہ ان کے فرزند جناب آصف علی زرداری پاکستان کی سابق وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کے شوہر ہیں)۔ انھوں نے کرپشن کی وجہ سے آٹھ سال جیل کاٹی ہے اور وہ اس وقت صدرِ پاکستان کے عہدے پر براجمان ہیں۔ ملک کے ممتاز دانشور جناب ارشاد احمد حقانی جناب آصف علی زرداری کی کرپشن کے حوالے سے اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں:

"آج کے حالات میں ہم پاکستانیوں کی دل شکنی، افسردگی اور مایوسی کا اندازہ کرنا مشکل نہ ہونا چاہیے۔ مایوسی تو ایک عرصے سے ہمیں اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے لیکن آج کے اخبارات میں ملک کے ممتاز قانون دان اور پیپلز پارٹی کے ایک اعلیٰ عہدیدار چودھری اعتزاز احسن کا بےنظیر بھٹو اور آصف علی زرداری کے بارے میں جو بیان چھپا ہے اس نے (کم از کم فی الحال) اس تنکے کا کام دیا ہے، جس نے اونٹ کی کمر توڑ دی تھی اس لیے آج میں کوئی کالم لکھنے لکھانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میرے اندر اس کی ہمت ہی نہیں ہے۔ میں اپنی مایوسی پر وقتی طور پر بھی غلبہ نہیں پا سکتا۔ جناب اعتزاز احسن نے کہا ہے کہ ان کی دانست میں بی بی اور زرداری کے بارے میں کرپشن کے جو الزامات عائد کیے جاتے ہیں وہ بڑی حد تک درست معلوم ہوتے ہیں بلکہ انھوں نے تو مالی بدعنوانیوں کے علاوہ زرداری صاحب کے بارے میں دوسرے، بہت سے الزامات کے درست ہونے کا بھی یقین ظاہر کیا ہے۔ ان الزامات کی تفصیل لکھنے کی مجھ میں جرأت اور ہمت نہیں ہے!" (6)

مسلم لیگی خاتون سیاست دان محترمہ تہمینہ دولتانہ نے لاہور میں منعقدہ ایک تقریب سے خطاب میں زرداری صاحب کے صدر بننے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

"ہم پاکستانیوں سے نامعلوم کیا گناہ سرزد ہوا جس کی پاداش میں آصف علی زرداری ایسا کرپٹ شخص ہم پر حکمران بنا۔" (7)

جبکہ سندھ نیشنل فرنٹ کے چیئرمین، سندھ کے ممتاز سیاست دان جناب ممتاز علی بھٹو نے جناب خواجہ فرخ سعید کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

"ایسے حکمران ملک کی بدقسمتی ہیں، لگتا ہے کہ پاکستانیوں سے کوئی بڑا گناہ ہوا ہے جس کی انھیں پروردگار سزا دے رہا ہے۔" (8)

روزنامہ نوائے وقت لاہور کے چیف ایڈیٹر، نظریۂ پاکستان ٹرسٹ کے چیئرمین مجید نظامی نے آصف علی زرداری کو "مردِحر" کا خطاب عطا فرمایا اور بار بار بڑے فخر کے ساتھ کہا کہ میں نے زرداری صاحب کو مردِحر کا خطاب ان کے طویل قید کاٹنے پر دیا تھا۔ حالانکہ زرداری صاحب نے قید اپنے اعمالِ بد، اپنے سنگین جرائم کے نتیجے میں کاٹی تھی۔ ہم نظامی صاحب سے پوچھتے ہیں کہ

آپ جو ایک عرصہ سے اپنے اخبار کی پیشانی پر حدیث رسولؐ: "بہترین جہاد جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے" شائع کرتے ہیں، کیا اس کا تقاضا یہی ہے کہ زرداری صاحب ایسے کرپٹ صدر پاکستان کی خوشامد اور چاپلوسی کی جائے اور اُسے "مردِحر" قرار دیا جائے حالانکہ زرداری صاحب کو مردِحر قرار دینا اس لقب کی توہین ہے۔

واضح ہو کہ نظامی صاحب کا زرداری صاحب کو مردِحُر کا خطاب دینا پاکستانی عوام وخواص کو بھی ناگوار گزرا ہے۔ انھوں نے اسے سخت ناپسند کیا ہے۔ نظامی صاحب کے اخبار نوائے وقت کی معروف کالم نگار محترمہ طیبہ ضیاء چیمہ لکھتی ہیں:

"شاید ہی کوئی محفل یا نشست ایسی ہو جس میں "مردِحر" کے خطاب کو مذاق اور تنقید کا نشانہ نہ بنایا گیا ہو۔" (9)

نظامی صاحب نے زرداری صاحب کو مردِحر کا خطاب 2008ء میں دیا تھا۔ اب چونکہ زرداری حکومت کا پانچواں سال جا رہا ہے، حکومت اپنی مدت پوری کرنے والی ہے، اب نظامی صاحب نے ایک تقریر میں فرمایا:

"ملک میں اس وقت زرداری اور اُن کے پیر کی حکومت ہے جس پر بدعنوانی اور کرپشن کے حوالے سے شاید ہی کوئی ایسا الزام ہو جو نہ لگا ہو۔ حکمران یہ نہیں دیکھ رہے کہ ملک میں غربت، بے روزگاری اور مسائل بڑھ رہے ہیں۔ ان کی نظر صرف بینک بیلنس پر ہے۔" (10)

اس تقریر کے دوران جب ایک سامع نے نظامی صاحب پر اعتراض کیا کہ آپ نے تو زرداری صاحب کو "مردِحر" کا خطاب دیا تھا۔ اس پر انھوں نے فرمایا:

"میں نے زرداری کو مردِحر کا خطاب بہادری سے جیل کاٹنے پر دیا تھا، جیبیں کاٹنے پر نہیں دیا تھا۔" (11)

سوال یہ ہے کہ زرداری نے جیل کس جرم میں کاٹی تھی، قوم کی جیبیں کاٹنے کے جرم میں ہی تو وہ جیل گئے تھے اور پھر پاکستان میں سیاست دانوں کا جیل کاٹنا کیسی بہادری، کہاں کی بہادری؟ پاکستان میں سیاست دانوں کے لیے جیل کاٹنا بھی کوئی مشکل ہے، انھیں تو جیلوں میں تمام سہولتیں میسر ہوتی ہیں۔ تمام آسائشیں ملتی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ہم برصغیر کے مسلمان خطابات سے

نوازنے میں بہت فراخ دل واقع ہوئے ہیں۔ ہم نے تو اس شخص کو قائداعظم کا خطاب دیا تھا جس نے برصغیر کی تاریخ میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شخص کی قیادت کو قبول کرنے کی سزا ہمیں گزشتہ 64 سال مل رہی ہے اور نا معلوم ہمیں یہ سزا مزید کتنے 64 سال بھگتنا پڑے۔

اوپر جو لوٹ مار کے ذریعہ سے امیر بننے کا حوالہ گزرا، وہ تو صرف دو پاکستانیوں کے بارے میں تھا، اب اگلے حوالے میں صرف ایک شہر یعنی سیالکوٹ کے پاکستانیوں کی کارستانی کے بارے میں پڑھیے۔ ممتاز دانشور ادیب جناب ڈاکٹر عبدالغنی فاروق بعنوان ''بلاشبہ ہم حالتِ عذاب میں ہیں'' لکھتے ہیں:

''آج مجھے اس امر میں کوئی شبہ نظر نہیں آتا کہ ہم حالتِ عذاب میں مبتلا ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہمارے اجتماعی اعمال کے نتیجے میں کوئی بدترین سزا دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ کسی بالغ نظر شاعر نے کہا تھا:

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

اور اِس حادثے کا آغاز تقسیم کے ساتھ ہی ہو گیا تھا چنانچہ بدقسمتی سے انصار اور مہاجرین دونوں کی اکثریت نے حلال وحرام کے تقاضوں کو نظرانداز کر کے ہندوؤں کی جائیدادوں پر قبضہ کرلیا۔ خصوصاً مقامی باشندوں نے غاصبانہ قبضے میں حد کر دی صرف ایک مثال پر اِکتفا کروں گا۔ ڈاکٹر قاضی حمید اللہ مرحوم سیالکوٹ کے مقامی باشندے تھے۔ انھوں نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ سیالکوٹ میں ہندو اور سکھ بائیس سو دکانیں چھوڑ کر گئے تھے۔ ان میں سے سولہ سو دکانوں پر مقامی لوگوں نے قبضہ کرلیا اور چھ سو دکانیں مہاجرین کو ملیں۔ کم وبیش اس طرح مہاجرین کی بہت بڑی تعداد نے غلط کلیموں کے ذریعے ناجائز الاٹ منٹیں کرائیں۔ گویا مالِ حرام پاکستان کی جڑوں میں بیٹھ گیا اور یہ بات حتمی حیثیت رکھتی ہے کہ جہاں مالِ حرام کارفرما ہو وہ معاشرے کے ایک ایک شعبے پر اپنے منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ چنانچہ پورا پاکستانی معاشرہ جھوٹ بددیانتی منافقت اور بے عملی کے سیلاب میں ڈوب گیا۔ چھچھورا پن اور

غیر سنجیدگی قومی زندگی کے ہر شعبے میں سرایت کر گئی اور ان صفات نے سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے جسد قومی کو وہ زخم دیے کہ جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ناسور بنتے چلے گئے۔

شومئی قسمت سے پاکستان بنتے ہی اقتدار اور سیاست پر جاگیردار طبقے کا تسلط قائم ہو گیا جس نے اپنے مزاج اور کلچر کے مطابق ہر طرح کی بے اصولی، دھاندلی اور آمریت کو رواج دیا اور بنیادی انسانی حقوق اور جمہوری آزادیوں پر طرح طرح کی پابندیاں نافذ کر دیں۔ بعد میں اس طبقے نے افسر شاہی اور فوجی جرنیلوں کے ساتھ مل کر ملک میں ہر طرف اندھیر مچا دیا۔ ملک کا ہر شعبہ کرپٹ ہوتا چلا گیا۔ جس کا وبال یہ پڑا کہ ہم سیاسی، تہذیبی، معاشی، تعلیمی، غرض ہر اعتبار سے زوال کی نذر ہو گئے۔

اللہ نے اس دوران میں مختلف صورتوں میں بار بار تنبیہات فرمائیں، یعنی 1971ء میں سقوطِ ڈھاکہ کا المیہ، بھٹوشاہی کا عذاب، پرویز مشرف کا عذاب اور 2005ء کا شدید ترین زلزلہ، مگر افسوس کہ ہم نے کسی حادثے سے کوئی سبق نہ سیکھا اور کمال بے حسی کے ساتھ تباہی کے راستے پر گامزن رہے، دیکھیے کتاب زندہ قرآن پاک اس حوالے سے کیا تبصرہ کرتا ہے۔ سورہ توبہ میں ہے: کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال آزمائے جاتے ہیں ایک یا دو بار پھر نہ وہ توبہ کرتے ہیں نہ نصیحت پکڑتے ہیں۔ (آیت126)''(12)

جناح صاحب کے رفیقِ خاص، ممتاز مسلم لیگی رہنما سردار شوکت حیات خاں پاکستان کے ابتدائی ایام میں وزیرِ بحالیات تھے۔ وہ اس حوالے سے اپنی آپ بیتی میں اپنے مشاہدات و تاثرات بیان کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ مسلم لیگیوں نے کس طرح ناجائز زمینیں الاٹ کرائیں کس طرح وہ ناجائز جائیدادوں پر قابض ہوئے۔ وہ اپنی آپ بیتی میں ان عوامل کی بھی نشاندہی کرتے ہیں جن کی وجہ سے پاکستانی معاشرہ زوال پذیر ہوا۔ وہ پاکستانی لیڈروں اور جرنیلوں کو شرم دلاتے ہیں کہ انھوں نے ناجائز ذرائع سے دولت کے انبار جمع کیے ہیں، اس وجہ سے دنیا بھر میں پاکستان کی بدنامی ہو رہی ہے۔ وہ پاکستان کے مسلمانوں (یعنی مسلم لیگیوں) کو ایک ایسے جانور سے تشبیہ دیتے ہیں، جس کا نام بھی مسلمانوں کے نزدیک ناپاک اور نجس ہے۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں

کہ پاکستان کے مسلمانوں کا حال کتوں جیسا ہے اور تائید کے لیے کہانی ایک ہندو کی زبانی سناتے ہیں۔ لیجیے صاحب! ان کے مشاہدات و تاثرات کو پڑھیے اور اس آئینے میں مسلم لیگیوں کی شکل دیکھ لیجیے:

''میں نے لائل پور ریسٹ ہاؤس جا کر محکمہ مال کے پٹواریوں کو بلوایا۔ ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ لوگ اپنے گھروں سے لٹے پٹے، اپنی جائیدادیں چھوڑ، مظلومیت کے عالم میں ہمارے پاس پہنچے ہیں۔ ان مصیبت زدہ مہاجرین کی مدد کرنا ہمارا اخلاقی اور قانونی فرض ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ مجھے بتا دیا جائے کہ کس شخص نے غیر قانونی طور پر متروکہ زمین پر قبضہ کر رکھا ہے؟ میرے استفسار پر ان جہاندیدہ لوگوں میں سے کسی ایک نے بھی کچھ بتانے سے گریز کیا۔ پھر میں نے دوسرا پہلو اختیار کرتے ہوئے کہا: ''جو کوئی مجھے بتائے گا اسے انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔'' اس پر ایک نوجوان پٹواری نے کھڑے ہو کر کہا: ''جناب عالی! اگر مجھے حفاظت فراہم کی جائے تو میں آپ کو بتاؤں گا کہ ایک نواب نے، جو مسلم لیگ میں ایک بڑا لیڈر ہے اُس نے چالیس مربعے زمین پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔'' میں نے اس زمین کے حاصل کرنے کا فوری حکم دیا اور قانون بنا دیا کہ کیمپ میں موجود ہر کنبے کو وقتی طور پر آٹھ ایکڑ زمین مہیا کر دی جائے۔ جب ریکارڈ ہندستان سے آئے گا تو اس کے مطابق ردّوبدل اور مستقل الاٹمنٹ کر دی جائے گی۔ میں نے فنانشل کمشنر کو طلب کر کے دریافت کیا کہ کیا وہ پٹواری کو ترقی دینے کے مکمل اختیارات رکھتا ہے۔ جواب اثبات میں ملنے پر میں نے فنانشل کمشنر سے کہا کہ وہ اس پٹواری کو دو درجے ترقی دے کر نائب تحصیلدار بنا دے۔ ایک بوڑھا پٹواری جو اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا کہ لائل پور میں کوئی متروکہ زمین کسی مقامی کے قبضہ میں نہ تھی، کو فوری طور پر ڈی جی خان تبدیل کر دیا گیا۔ یہ ضلع اس زمانے میں ملازمین کے لیے ایک تکلیف دہ مقام سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے پٹواریوں نے جب انعام و سزا کا یہ منظر دیکھا تو ایک کے بعد دوسرا کھڑا ہوتا گیا اور پوشیدہ راز فاش ہونے لگے۔ مزید زمینوں کی نشاندہی ہوئی۔''(13)

''اگر کوئی مجھ سے اس نقصان عظیم کے بارے میں پوچھے کہ میں ان اسباب کی

نشاندہی کروں جن کی بنا پر وہ جذبہ حب الوطنی اور وہ ایثار جو مسلم لیگ نے 1947ء سے پہلے لوگوں میں پیدا کیا تھا کیوں ختم ہو گیا اور وہ کیا چیز تھی جس کی بنا پر ہماری قوم نے مشرقی پنجاب کے ان پانچ لاکھ مسلمانوں کے قتل، ایک لاکھ مسلم خواتین کا اغوا اور پچاس لاکھ مسلمانوں کی ہجرت کو بھلا دیا تو میرا جواب درج ذیل ہوگا:

1) حرص، لالچ اور کرپشن
2) غلام محمد اور نوکر شاہی
3) ایوب خان کا حب جاہ کی بنا پر حلف وفاداری کی خلاف ورزی جس کی پیروی دوسرے فوجی آمروں نے بھی کی
4) ناتجربہ کار اور ناموزوں سیاسی رہنما

کرپشن کا آغاز جائیداد اور کاروبار کے ناجائز حصول کی بنا پر ہوا جو غیر مسلم اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ اس چیز نے لوگوں کو طمع اور دولت حاصل کرنے کی دوڑ میں مبتلا کر دیا۔ ہمارے لوگوں نے اسلام کو بھلا دیا اور ہندوؤں کی دولت کی دیوی لکشمی کے پجاری بن گئے۔ اسلام کی بجائے انھوں نے دولت کو ذریعۂ نجات سمجھ لیا۔''(14)

''کیا ہمیں یہ دیکھ کر شرم نہیں آتی جب ہم غیر ملکی اخبارات و رسائل میں پڑھتے ہیں کہ پاکستان کے لیڈر اور جرنیل دنیا کے امیر ترین لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس یہ دولت کہاں سے آئی؟ میں ان میں سے بیشتر کی کمائی کے پس منظر کو جانتا ہوں۔ ان میں سے ایک نے بھی اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر جائز طریقے سے دولت نہیں کمائی۔ ہم عرصہ ہوا عادلانہ راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ آج ہم ان ڈاکو بیرنز (Robber Barons) سے بھی بُرے ہیں۔ ہم ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ کیا وہ لوگ اسلام کے دوسرے خلیفہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے نقشِ قدم پر چل سکتے ہیں جنھوں نے مالِ غنیمت میں سے اپنے لیے صرف ایک چادر لی اور جب دیکھا کہ صرف ایک چادر سے کرتا نہ سِل سکے گا تو انھوں نے اپنے بیٹے کے حصے کی چادر بھی شامل کر کے کرتا سلوایا۔ جب انھوں نے یہ کرتا پہنا تو ایک عام مسلمان نے برسرِ عام کھڑے ہو کر اعتراض کیا: ''عمر! تمھارے لیے یہ کیسے

ممکن ہوا کہ تم ایک چادر سے کرتا سلوا سکو جس کا بننا تمھارے جسم کی مناسبت سے ممکن نہیں۔'' جواب میں حضرت عمرؓ نے وضاحت کی کہ کس طرح انھوں نے اپنے بیٹے کی چادر شامل کر کے کرتا سلوایا تھا۔ یہ تھی اصل بڑائی اور عظمت۔ آج کی طرح نہیں کہ راتوں رات امیر بنا جائے اور دنیاوی جاہ وجلال کی نمائش کی جائے اسلام کی بڑائی کھوکھلے نعروں میں پنہاں نہیں، نہ ہی اس منافقت میں پنہاں ہو سکتی ہے جو آج کے حکمران کر رہے ہیں۔''(15)

''مجھے یاد ہے کہ لاہور کا رہنے والا ایک دوست میرے پاس آیا۔ دورانِ گفتگو اس نے کہا،''شوکت جی! تمھارا پاکستان پنپ نہیں سکے گا اس لیے کہ ہم نے تمھارے لیے معاشی ادارہ چھوڑا ہے نہ کوئی صنعت کار یا بینکر'' میں نے اسے کہا کہ وہ احمقوں کی جنت میں رہنا چھوڑ دے۔ وہ قوم جو پچاس لاکھ مہاجرین کے بوجھ کو سہار سکتی ہے جو تم نے اچانک ہم پر ٹھونس دیے تھے تو ایسی قوم کسی بھی صورتِ حال سے نبٹ سکتی ہے۔ اس نے کہا، شوکت! تم نے میری بات سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ میرا نکتہ سمجھنا چاہتے ہو تو میرا مشورہ ہے کہ اپنی واپسی پر کتوں کی ایک جوڑی خریدو، دونوں کو الگ الگ زنجیر میں مخالف کونوں میں باندھ دو۔ تین چار دنوں تک انھیں کھانے کو کچھ نہ دو، پھر ایک بکری کاٹو اور گوشت دونوں کے درمیان رکھ کر دونوں کی زنجیریں بیک وقت کھول دو۔ تم دیکھو گے کہ گوشت کو دیکھ کر دونوں کتے پہلے آپس میں لڑیں گے۔ ان میں سے جیتنے والا کتا ضرورت سے زیادہ کھا کر گر پڑے گا۔ اس کے بعد دوسرا پہلے کے چھوڑے ہوئے گوشت کو ضرورت سے زیادہ کھائے گا۔ دونوں بدہضمی کا شکار ہو کر بیمار ہو جائیں گے۔ ہم نے تمھارے بھوکے اور غریب لوگوں کے لیے وہاں پر بے انتہا دولت چھوڑی ہے وہ اس چمک کو دیکھ کر ایک دوسرے کا گلا کاٹیں گے۔ بعد میں وہ کتوں کی مانند ہو جائیں گے۔ وہ لالچ کی بنا پر تمھارے طے شدہ اصول بھول جائیں گے۔ ہم نے تمھارے حصے کے پنجاب میں اتنی زیادہ دولت چھوڑی ہے کہ تمھاری قوم بددیانت ہو جائے گی۔ سونے کی چمک دیکھ کر وہ دولت کی دیوی لکشمی دیوی کی پوجا کرنا شروع کر دیں گے۔ آج سینتالیس (47) سال بعد اُس کی یہ پیش گوئی کس قدر

سچ ثابت ہوئی ہے۔ قوم اپنی روح ہی کھو بیٹھی ہے۔''(16)

سردار شوکت حیات خاں نے اوپر درج عبارت کے آخری پیرے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ محض سبقتِ قلم کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ وہ ان کی بہت سوچی سمجھی رائے تھی، جس کا برملا اظہار انھوں نے روزنامہ جنگ لاہور کو دیے گئے اپنے ایک انٹرویو میں بھی کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا:

''بڑا المیہ یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد وہ جذبہ ختم ہو گیا جو تحریک پاکستان میں کارفرما تھا۔ پاکستان کے قیام کے بعد انھیں ایک ہندو دوست ملا جس نے بتایا کہ ہم پاکستان میں بے انتہا دولت چھوڑ کر آئے ہیں جو آپ کے جذبے کو ختم کر دے گی چنانچہ یہی ہوا۔ ہندو کی جائیداد، فیکٹریاں اور دیگر تمام چیزیں ہمارے کردار کو لے کر بیٹھ گئیں اور ہم کتوں کی طرح آپس میں لڑے۔ ہم نے جھوٹ سچ بول کر جائیدادیں حاصل کیں۔''(17)

سیاست کرنے سے پہلے دولت جمع کرنے کا مشورہ دینے والے مسٹر جناح نے خود کس طرح اور کس قدر دولت جمع کی، اس حوالے سے محقق اور دانشور جناب عارف میاں نے اپنی کتاب برصغیر کیسے ٹوٹا؟ میں ایک سوال اٹھایا ہے، مطالعہ کیجیے:

''محمد علی جناح جب عارضی مجسٹریٹ بنے تھے، اس وقت ان کے حالات مایوس کن تھے۔ وکالت نہ چلتی تھی۔ ان کی سماجی حیثیت ایک مقروض شخص کی تھی جس کے پاس ذاتی گھر تھا اور نہ دفتر۔ وہ جس دفتر میں کام کرتے تھے اس سے، جس ہوٹل میں رہتے تھے اس تک کا طویل سفر وہ پیدل کرتے تھے۔ ان تلخ حالات نے محمد علی جناح کے مزاج پر بھی اثر ڈالا تھا اور ان میں چڑچڑا پن آ گیا تھا جو قریباً زندگی بھر اُن کے ساتھ رہا۔ اس حالت میں ایک پارسی بزرگ وکیل نے ان سے ہمدردی کی اور انگریز ایڈووکیٹ جنرل میکفرسن سے ملاقات کرا دی، جن کی سفارش پر محمد علی جناح کو تین ماہ کے لیے عارضی مجسٹریٹ مقرر کر دیا گیا۔ بعد میں محمد علی جناح کو مزید تین ماہ کے لیے عارضی مجسٹریٹ رہنے کا موقع مل گیا لیکن ان چھ ماہ میں محمد علی جناح نے جو کچھ کمایا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنا سارا قرض اتار دیا۔ گاڑی خرید لی۔ بہن کو اچھے سکول میں داخل کرا دیا۔ اپنا الگ دفتر بنایا جس میں بہترین فرنیچر ڈالا۔ اس

سب کچھ کے باوجود نہ صرف کچھ رقم بچا بھی لی بلکہ آئندہ ملازمت جاری رکھنے سے انکار کر دیا۔سوال یہ ہے کہ محمد علی جناح کی تنخواہ کتنی تھی؟ اور کیا یہ ساری تبدیلیاں تنخواہ کی رقم سے ممکن تھیں؟''(18)

مسٹر جناح نے جو دولت جمع کی، جو جائیداد بنائی، اب ذرا اُس کے بارے میں پڑھیے، اس کے بارے میں سرسری آگاہی لیگی قلم کار فضل حسین اعوان کے کالم سے ملتی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''قائداعظم محمد علی جناح 1936ء میں انگلینڈ سے ہندستان لوٹے تو بمبئی مالا بار ہلز میں اپنے لیے شاندار اور وسیع وعریض رہائش گاہ تیار کروائی۔قائداعظم نے تعمیر کی خود نگرانی کی۔قائداعظم کے اس مسکن کو برطانوی حکومت نے جناح ہاؤس کا نام دیا۔ اس وقت اس بنگلے پر 2 لاکھ روپے کے اخراجات ہوئے تھے۔یہ وہ دور تھا جب سونے کی فی تولہ قیمت دس روپے تھی۔17 ایکڑ پر مشتمل آج جناح ہاؤس کی قیمت ایک محتاط اندازے کے مطابق 60 لاکھ ڈالر ہے۔جناح ہاؤس مہاراشٹر کے وزیراعلیٰ ہاؤس کے برابر میں ہے۔جناح ہاؤس کی خوبصورتی میں اٹلی کے ماربل اور اخروٹ کی لکڑی کے کام نے بے انتہا اضافہ کیا۔جناح ہاؤس مالا بار ہل کے علاوہ قائداعظم کے کئی کئی ایکڑ پر پھیلے ہوئے دہلی، کراچی اور لاہور میں گھر موجود تھے۔''(19)

جناب فضل حسین اعوان اپنے ایک دوسرے کالم میں جناح صاحب کی جائیداد کے بارے میں مزید بتاتے ہیں:

''قائداعظم محمد علی جناح کا بمبئی کا گھر گورنر ہاؤس کے بعد سب سے بڑا گھر تھا۔دہلی میں ان کے گھر کا شمار چار پانچ بڑے گھروں میں ہوتا تھا۔لاہور میں آرمی ہاؤس، گورنمنٹ ہاؤس کے بعد سب سے بڑی عمارت ہے۔یہ قائداعظم کی ذاتی پراپرٹی ہے جو انھوں نے فوج کے نام کی تھی۔قائداعظم نے شاہانہ زندگی گزاری۔اس دور میں جب پورے لاہور میں 2 کاریں ہوا کرتی تھیں، قائداعظم کے ہر گھر میں سات آٹھ گاڑیاں بمعہ ڈرائیوروں کے موجود ہوتی تھیں۔چار پانچ باورچی، ڈرائیور اور تمام محافظ مسلمان تھے۔وہ بڑے دولت مند تھے۔''(20)

جناح ہاؤس کے حوالے سے روزنامہ نوائے وقت لاہور میں ایک خبر شائع ہوئی ہے، اسے

بھی ملاحظہ فرمائیے:

''ممبئی (آن لائن) ممبئی میں جناح ہاؤس کی ملکیت کے حوالے سے قائداعظم محمد علی جناح کی وصیت کی کاپی مل گئی۔جس میں بانی پاکستان نے اس جائیداد کو اپنی بہن فاطمہ جناح کے حوالے کرنے کا کہا ہے۔پریس ٹرسٹ آف انڈیا کے مطابق ممبئی میں کسٹوڈین دفتر کے انچارج دنیش سنگھ کے مطابق قائد کی وصیت تیس مئی 1939ء کی تحریر کردہ ہے۔جس کی کاپی بھارت کے کسٹوڈین پراپرٹی کے ریکارڈ سے برآمد ہوئی۔ یاد رہے کہ 1960ء میں بھارتی ہائیکورٹ فاطمہ جناح کے حق میں مذکورہ وصیت کو قانونی طور پر درست تسلیم کر چکی ہے۔دنیش سنگھ کے مطابق وصیت کی کاپی بھارتی وزارت خارجہ کو بھجوا دی گئی ہے۔یاد رہے بانی پاکستان کی بیٹی وینا نے جناح ہاؤس پر ملکیت کے دعوئی میں موقف اختیار کیا ہے کہ ان کے والد کھوجہ مسلم تھے اور یہ فرقہ ہندو قوانین کی پیروی کرتا ہے لہٰذا ان کی جائیداد کی ملکیت کا فیصلہ اسلامی شریعت کے بجائے ہندو قوانین کے تحت کیا جائے۔جنوبی ممبئی کے علاقے مالا بار ہل میں واقع جناح ہاؤس کو بھارتی حکومت متروکہ جائیداد قرار دے چکی ہے اور ہائیکورٹ میں حکومت نے بیانِ حلفی میں اسے جنوبی ایشیا سینٹر فار آرٹس اینڈ کلچر میں تبدیل کرنے کا اعلان کیا ہے۔''(21)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جناح صاحب نے لوٹوں اور نوٹوں کی سیاست کیوں کی۔وہ سیاست کرنے کا حق صرف دولت مندوں کو ہی کیوں دیتے تھے۔اس سوال کے جواب میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ بات ملت کے مفاد میں کی ہوگی۔ہم مان تو لیتے، مگر ملت کا مفاد ماؤنٹ بیٹن کو گورنر جنرل مان لینے میں ہو سکتا تھا، مگر جناح صاحب نے ایسا نہ کیا۔مقصد تو یہی تھا کہ کسی نہ کسی طور کرسی اقتدار حاصل ہو۔کسی نہ کسی طرح لیلیٰ اقتدار سے ہم آغوشی ہو جائے۔دراصل ان کی زندگی کا مقصد ہی شہرت، دولت اور عہدہ تھا اور گورنر جنرل کے عہدے کو وہ اپنی معراج سمجھتے تھے۔پاکستانی جناح صاحب کی اور کسی بات پر عمل کرتے ہوں یا ناں، البتہ ان کے دولت جمع کرنے کے ''فرمان'' پر ضرور عمل پیرا ہوتے ہیں اور وہ عربی کے مقولے: الناس علی دین ملوکھم (یعنی: لوگ اپنے حکمرانوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں) کو سچ ثابت کرتے ہیں۔

حوالہ جات

(1) روزنامہ پاکستان لاہور/18 نومبر 2009ء

(2) قائداعظم کے رفقا سے ملاقاتیں/ص 116

(3) گم گشتہ قوم/سردار شوکت حیات خاں/جنگ پبلشرز، لاہور/دسمبر 1995ء/ص 219-218

(4) ماہنامہ نیا زمانہ لاہور/مارچ 2012ء

(5) ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور/مارچ 1995ء/ص 31

(6) روزنامہ جنگ لاہور/3 جون 2008ء

(7) روزنامہ نوائے وقت لاہور/26 فروری 2008ء

(8) روزنامہ نوائے وقت (سنڈے میگزین) لاہور/2 جنوری 2011ء/ص 2

(9) روزنامہ نوائے وقت لاہور/25 نومبر 2012ء

(10) روزنامہ نوائے وقت لاہور/23 اپریل 2012ء

(11) ایضاً

(12) روزنامہ نوائے وقت لاہور/16 اگست 2009ء

(13) گم گشتہ قوم/ص 261

(14) ایضاً/ص 441

(15) ایضاً/ص 287

(16) ایضاً/ص 263

(17) روزنامہ جنگ لاہور/25 اگست 1987ء

(18) برصغیر کیسے ٹوٹا/عارف میاں/لاہور/اگست 2009ء/ص 46

(19) روزنامہ نوائے وقت لاہور/29 اگست 2010ء

(20) روزنامہ نوائے وقت لاہور/7 نومبر 2009ء

(21) روزنامہ نوائے وقت لاہور/31 مارچ 2010ء

29

مسلم لیگی غلطیاں کرتے ہیں اور اپنی غلطیوں کے جواز کے لیے حوالے جناح صاحب کے دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر مسلم لیگ (قائداعظم گروپ) کے باغی ارکان کو ''یونی فکیشن'' کے نام سے گروپ بنا کر مسلم لیگ (ن) کی حمایت کر کے لوٹے بننے پر ٹوکا گیا تو ان کے قائد ڈاکٹر طاہر علی جاوید نے کہا کہ ''کیا ہوا، قائداعظم بھی ایک زمانے میں بیک وقت انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے رکن تھے، تو ہم بیک وقت دو جماعتوں کے رکن کیوں نہیں بن سکتے۔'' ڈاکٹر جاوید نے اپنی غلط حرکت یعنی لوٹے پن کو جواز بخشنے کے لیے جو حوالہ دیا وہ بالکل درست ہے۔

حامد میر نامی ایک صحافی کو یہ بہت ناگوار گزرا ہے۔ انھوں نے روزنامہ جنگ میں ایک کالم بعنوان: ''ناقابلِ معافی سیاسی گناہ'' لکھا ہے، جس میں میر صاحب نے مسٹر جناح کے کردار کو بطور دلیل کے پیش کرنے کو تاریخ کے ساتھ مذاق قرار دیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

> ''یونی فکیشن بلاک کے قائدین سے میری کوئی ذاتی مخاصمت نہیں ہے لیکن قائداعظم کے نام کے غلط استعمال پر مجھ سمیت بہت سے پاکستانیوں کو تکلیف ہوئی ہے۔''

حامد میر کے مذکورہ کالم کے اختتامی جملے یہ ہیں:

> ''مسلم لیگی قائدین ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے لڑتے بوڑھے ہو چکے ہیں لیکن لڑائی سے باز نہیں آتے۔ ان سب سے ہاتھ باندھ کر گزارش ہے کہ بے شک آپس میں لڑو، لیکن خدا کے لیے قائداعظم کو بیچ میں نہ لاؤ۔ وہ مذاق نہ دہراؤ جو پرویز مشرف نے (مسلم لیگ میں قائداعظم گروپ قائم کر کے) قائداعظم کے ساتھ کیا تھا۔

قائداعظمؒ کے نام پر قائداعظمؒ کے پاکستان میں سیاسی مفاد پرستی کو جائز قرار دینا ناقابلِ معافی گناہ ہے۔"(1)

جبکہ حامد میر اس کالم میں خود تسلیم کرتے ہیں کہ جناح صاحب انڈین نیشنل کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے بیک وقت آٹھ سال رکن رہے۔ چونکہ وہ غلط بیانی کے سہارے جناح صاحب کی حرمت بچانے نکلے ہیں، اس لیے وہ جناح صاحب کی بہت بڑی سیاسی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لیے ذیل کے پیرے میں مزید کئی غلط بیانیاں کر گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"قائداعظمؒ نے 1906ء میں انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کی تو مسلم لیگ کی حیثیت سیاسی جماعت کی نہیں بلکہ مسلمان نوابوں اور جاگیرداروں کے ایک سوشل کلب کی تھی۔ اس سوشل کلب نے آہستہ آہستہ سیاسی سرگرمیاں شروع کیں اور قائداعظمؒ کو مسلم لیگ میں شمولیت کی دعوت دی۔ قائداعظمؒ نے 1913ء میں مسلم لیگ جوائین کی تو وہ انگریزوں کے خلاف ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے۔ وہ کانگریس کو مسلم لیگ کے قریب لائے اور 1916ء میں دونوں جماعتوں کے درمیان لکھنؤ پیکٹ کرایا۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ کانگریس کی قیادت انگریزوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے حقوق غصب کرنا چاہتی ہے تو انھوں نے 1920ء میں کانگریس چھوڑ دی تھی۔"(2)

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ کو روافض اور انگریز کے وفادار، غدار مسلمان نوابوں اور جاگیرداروں نے انگریز کے ایما پر سیاسی جماعت کے طور قائم کیا تھا، نہ کہ ایک سوشل کلب کے۔ لیگ کے قیام کے موقع پر جو اغراض و مقاصد بیان کیے گئے اور شائع کیے گئے وہ کیا تھے۔ معروف محقق ڈاکٹر زاہد منیر عامر لکھتے ہیں:

"اجلاس کے نومنتخب صدر جناب وقار الملک نے اپنے خطاب کے بعد نواب آف ڈھاکہ کو دعوت دی کہ وہ آج کے اجلاس کی پہلی قرارداد پیش کریں، جس پر نواب سلیم اللہ خان نے مندرجہ ذیل قرارداد پیش کی:

"ہندوستان کے تمام حصوں سے جمع ہونے والے مسلمانوں کے اس اجلاس میں طے پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے مندرجہ ذیل مقاصد کے حصول کے لیے ایک

سیاسی تنظیم قائم کی جائے۔

(الف) مسلمانانِ ہند میں برطانوی حکومت کے لیے وفاداری کے جذبات پیدا کرنا اور حکومت کے اقدامات کی بنا پر پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کو دُور کرنا۔

(ب) مسلمانانِ ہند کے سیاسی حقوق اور مفادات کا تحفظ کرنا اور ان کے مطالبات اور ضروریات کو باوقار انداز سے حکومت تک پہنچانا۔

(ج) کسی تعصب کے بغیر مذکورہ مقاصد کو مدِنظر رکھتے ہوئے مسلمانانِ ہند اور ملک کے دوسرے طبقات کے درمیان معارضے کو بڑھنے سے روکنا۔

قیام مسلم لیگ کے مندرجہ بالا مقاصد جن الفاظ میں متعین کیے گئے ان کا اصل انگریزی متن یہ تھا:

(a) To promote, among the Musalmans of India, feelings of loyalty to the British Government, and to remove any misconception that may arise as to the intention of Government with regard to any of its measures.

(b) To protect and advance the political rights and interests of the Musalmans of India, and to respectfully represent their needs and aspirations to the Government.

(c) To prevent the rise, among the Musalmans of India, of any feeling of hostility towards other communities, without prejudice to the other aforementioned objects of the League."(3)

لیگی محقق جناب پروفیسر سیّد محمد ذوالقرنین زیدی اپنی کتاب قائداعظم کے رفقا سے ملاقاتیں کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"اس طرح مسلمانوں کی پہلی سیاسی جماعت 1906ء میں قائم کی گئی۔ یہ کلیتاً ایک سیاسی جماعت تھی اور اس کے دعوے سیاسی تھے۔"

آگے مکمل حوالہ پڑھیے۔ زیدی صاحب لکھتے ہیں:

"جونہی انگریزوں نے 1905ء میں اپنی سیاسی اغراض کی تکمیل کے لیے بنگال کو تقسیم کیا تو ہر طرف سے آل انڈیا نیشنل کانگریس نے جلسے، جلوس، ہڑتالیں اور ہنگاموں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ کانگریس اس تقسیم کے خلاف تھی۔ انگریزی مال کا بائیکاٹ اور سودیشی تحریک کا پرچار ایسے سیاسی حربے تھے جس سے انگریز چکرا گئے۔ یہ ہتھیار 1857ء کی تلواروں اور نیزوں سے زیادہ کارگر تھا کیونکہ برطانیہ کی صنعت اور تجارت اس سے متاثر ہوتی تھی۔ لہٰذا انگریزوں نے وقتی طور پر کانگریس کی طاقت کو توڑنے کے لیے مسلمانوں کی پشت پناہی شروع کی۔ اب حکومتِ ہند خود ایک ایسی جماعت کے ہاتھوں تنگ ہو رہی تھی جس کو اس نے خود ہی جنم دیا تھا۔ لہٰذا اس سیاسی جماعت کا جواب دوسری سیاسی جماعت ہی دے سکتی تھی۔

اس زمانہ میں مسلمان خود بھی چاہتے تھے کہ وہ بھی کسی طرح ہندستان کے سیاسی اُفق پر کانگریس کی طرح ابھریں۔ ان کی رائے میں کانگریس ان کے جذبات، احساسات، اور مفادات کی ترجمانی نہیں کرتی تھی۔ تقسیم بنگال سے مسلمانوں کو تھوڑا سا اقتصادی فائدہ پہنچنے کی امید تھی، کچھ ملازمتوں کے ملنے کی توقع تھی، لیکن کانگریس کی شدتِ مخالفت بنگال کے مسلمانوں کو اور زیادہ تقسیم بنگال کی حمایت میں سرگرم کر رہی تھی، مسلمانوں کے حلقوں میں سیاسی گہما گہمی ہونے لگی۔ اس وقت سر آغا خاں مسلمانوں میں ایک ایسی شخصیت تھے جو برطانیہ کے شاہی خاندان اور سرکاری حلقوں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ وہ لندن میں سیکرٹری آف اسٹیٹ مسٹر مارلو سے ملے اور ان کے سامنے مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کیا۔ پھر فوراً لندن سے شملہ آ کر وائسرائے ہند سے ملاقات کی اور پھر بعد میں مسلمانانِ ہند کا ایک وفد لے کر اکتوبر 1906ء میں وائسرائے ہند سے شملہ میں ملاقات کی۔ مسلمانوں کے اس وفد نے وائسرائے ہند سے یہ درخواست کی کہ ان کی سیاسی اور تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر ان کے مفادات کا

خیال رکھا جائے۔

اس کے بعد 31 دسمبر 1906ء میں انڈین محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا آخری اجلاس ڈھاکہ میں منعقد ہوا اور اس اجلاس میں آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔

اس موقع پر جناب وقار الملک نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا:

"جس مقصد کے لیے آج ہم مجتمع ہوئے ہیں وہ نیا نہیں، یہ اسی روز پیدا ہو گیا تھا جب انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی گئی تھی...... آج جب کہ برٹش کی سلطنت اپنی رعایا کی محافظ ہے جس قسم کی مشکلات بسا اوقات ہم کو اپنے ہمسایہ دوستوں سے پیش آتی ہیں اس کے نظائر کم و بیش ہر صوبے میں موجود ہیں تو وائے اُس وقت پر جب ہم کو ان لوگوں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے گا جو اورنگ زیب کا بدلہ صد ہا برس بعد آج ہم سے لینا چاہتے ہیں۔"

اس طرح مسلمانوں کی پہلی سیاسی جماعت 1906ء میں قائم کی گئی، یہ کلیتاً ایک سیاسی جماعت تھی اور اس کے دعوے سیاسی تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد مندرجہ ذیل قرار پائے:

الف: حکومتِ برطانیہ سے وفاداری

ب: مسلمانانِ ہند کے سیاسی حقوق اور مفادات کی حفاظت کرنا

ج: دوسری جماعتوں کے ساتھ خوش گوار تعلقات قائم کرنا۔"(4)

زیدی صاحب حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"اس موقع پر اگر یہ حقیقت بیان کر دی جائے تو مناسب ہو گا کہ شملہ وفد کی تیاری میں اور اس کے راستے میں حائل سیاسی کانٹوں کو صاف کرنے میں جناب آرچی بالڈ پرنسپل علی گڑھ کالج، کا بڑا ہاتھ تھا۔"(5)

آئندہ صفحات میں ہم جناح صاحب کے ایک اور انتہائی غیر جمہوری رویے اور سیاسی غلطی پر کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن پہلے تین لیگی قلم کاروں کی تحریریں پڑھیے۔ ان تحریروں کے مطالعہ سے یہ بات آپ پر واضح ہو جائے گی کہ جناح صاحب اصلاً تھے کیا اور ان کو جھوٹ کے سہارے کس قدر مقدس بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ مسلم لیگی مؤرخ ڈاکٹر صفدر محمود اپنے کالم میں بعنوان "دو

احتیاط، ذرا سی احتیاط" لکھتے ہیں:

"خدارا قائداعظمؒ کے بارے میں کوئی سیاسی فتویٰ دینے سے قبل تھوڑی سی تحقیق کر لیا کریں تاکہ آپ تاریخ کو مسخ کرنے کے مجرم نہ ٹھہریں۔ گزشتہ دنوں صدر زرداری صاحب نے اپنے دو عہدوں کے جواز کے لیے قائداعظم کا حوالہ دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ عملاً قائداعظم قیامِ پاکستان کے بعد مسلم لیگ کی سیاست سے الگ ہو گئے تھے۔ اگست سے لے کر دسمبر تک مسائل نے ان کو سر اُٹھانے کی مہلت نہ دی۔ اس کے باوجود انھوں نے دسمبر 1947ء میں کراچی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس بلایا جس میں پاکستان اور ہندستان کے لیے الگ الگ مسلم لیگیں معرضِ وجود میں آئیں۔ کونسلروں کے اصرار کے باوجود قائداعظم نے پاکستان مسلم لیگ کا صدر بننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ملک کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے وہ کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں ہوں گے۔ یہ ساری سبق آموز تفصیل میری کتاب "مسلم لیگ کا دورِ حکومت" میں موجود ہے۔"(6)

فضل حسین اعوان "قائد پر الزام" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"جھوٹ، فریب، دھوکہ دہی سیاست نہیں سیاہ کاری و مکاری ہے۔ صدر کا عہدہ نہایت ذمہ داری کا متقاضی ہے۔ اپنی بلاجوازیوں کا جواز ثابت کرنے کے لیے نادانستگی میں بھی تاریخ کو گرد آلود نہ کیا جائے۔ صدر محترم نے فرمایا کہ قائداعظم گورنر جنرل کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ کے صدر بھی رہے۔ صدر صاحب قائداعظم کا حوالہ دے کر بیک وقت صدر پاکستان اور پارٹی سربراہ، دو عہدے رکھنے کو جائز ثابت کر رہے ہیں۔ گویا باقی تمام کام بھی قائداعظم والے ہیں۔ اس لیے دو عہدے رکھنا بھی لازم ہے۔

بیک وقت دو عہدے رکھنے جیسی قائداعظم سے بے اصولی کی توقع بھی کیسے کی جا سکتی ہے! قائداعظم نے 1948ء کو سربراہ مملکت ہونے کے باعث ساتھیوں کے بھرپور اصرار کے باوجود مسلم لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ یہ سب تاریخ کا حصہ ہے۔ تاریخ اوپر سے نازل ہو کر ازبر نہیں ہوتی اس کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔

ہمارے ممدوح نے تاریخ کا مطالعہ کیا ہوتا یا نصابی سلیبس ہی غور سے پڑھا ہوتا تو قائد محترم پر دو عہدے رکھنے کا الزام نہ لگاتے۔"(7)

اور حامد میر اپنے مذکورہ کالم "ناقابل معافی سیاسی گناہ" میں رقم طراز ہیں:

"فروری 1948ء میں پیر آف مانکی شریف نے تجویز پیش کی کہ قائداعظمؒ گورنر جنرل کے منصب کے ساتھ مسلم لیگ کے صدر کے عہدے پر بھی فائز رہیں لیکن قائداعظمؒ نے انکار کر دیا۔"(8)

جو کچھ ڈاکٹر صفدر محمود، فضل حسین اعوان اور حامد میر نے لکھا ہے وہ سراسر خلاف واقعہ اور غلط بیانی پر مبنی ہے۔ یہ لوگ مسٹر جناح کی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے غلط بیانی کرتے ہیں، جھوٹ لکھتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ ان سے بڑھ کر کوئی سچا ہے ہی نہیں۔ ان حضرات کی تحریروں پر ایک مرتبہ پھر نظر ڈالیے اور دیکھیے وہ کس تیقن کے ساتھ غلط بیانی کر رہے ہیں، جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس اجلاس میں پیر آف مانکی شریف جناح صاحب کے حامی کیمپ میں نہیں بلکہ مخالف کیمپ میں پیش پیش تھے۔ دوسری بات یہ کہ جناح صاحب دو عہدوں کے خود خواہش مند تھے۔ اس پر ایک نہیں تین مستند حوالے صرف ایک کتاب سے پیش کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ محولہ کتاب قائداعظم کے رفقاء سے ملاقاتیں ایک مسلم لیگی محقق کی تالیف ہے اور اسے سرکاری ادارہ "قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت پاکستان، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد" نے شایع کیا ہے۔

1) ممتاز مسلم لیگی رہنما، مسٹر جناح کے ساتھی، پیر آف مانکی شریف کے معتمد جناب ارباب عبدالغفور نے پاکستان مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ فریئر ہال، کراچی، فروری 1948ء کی کارروائی کے جو مشاہدات بیان کیے، وہ یہ ہیں:

"اس میٹنگ میں پاکستان مسلم لیگ دو واضح گروپوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ مسئلہ یہ زیر بحث تھا کہ آیا مسلم لیگ کا عہدہ اور حکومت کا عہدہ جدا جدا رہیں یا دونوں عہدوں کو اکٹھا رکھا جائے۔ جدا رکھنے کے حق میں جو حضرات تھے اس میں نمایاں شخصیتیں پیر صاحب مانکی شریف اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی تھیں اور میں خود بھی اسی گروہ سے وابستہ تھا۔ تین دنوں تک اس مسئلہ پر بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ قائداعظم اس رائے کے

حق میں تھے کہ یہ عہدے اکٹھے رہیں۔ دو دِنوں تک قائداعظم نے اس مسئلہ پر تقریریں کیں۔ ان کی بڑی زوردار تقریریں تھیں۔ انھوں نے تیسرے دن بھی اُردو میں تقریر کی۔ شاید خیال کر کے کہ یہ لوگ مسئلہ کی نزاکت کو انگریزی زبان میں نہیں سمجھ رہے ہیں۔ ان کی اُردو ٹوٹی پھوٹی تھی۔ مگر پھر بھی اکثریت ہاؤس میں مخالفین کی تھی، لہٰذا بالآخر اس مسئلہ پر لوگوں کی رائے طلب کی گئی۔ ہم لوگ دس ووٹوں کی اکثریت سے جیت گئے۔ اس کے بعد قائداعظم ایک دم سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میز پر جو کاغذات تھے اُن کو اکٹھا کیا اور غصہ میں چلے گئے۔ اس کے بعد لیاقت علی خاں کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ ابھی تک جماعت تھی وہ ٹوٹ گئی ہے۔ اس کا کوئی صدر نہیں رہا ہے۔ اس کا جنرل سیکرٹری نہیں ہے۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ اس میٹنگ کے لیے عبدالرب نشتر صدر ہو جائیں۔ لہٰذا وہ صدر ہو گئے۔ نشتر صاحب نے فرمایا کہ میں وہ کچھ کروں گا جو آپ کی مرضی ہوگی۔ یہ کام کسی کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے یا ایک شخص واحد کو اختیار دے دیا جائے۔ اس موقع پر کسی نے آواز دی کہ ایک آدمی کے ہاتھ میں دے دو۔ ان کا خیال تھا کہ پیر مانکی شریف یا مولانا شبیر احمد عثمانی میں سے کوئی ایک صدر ہو جائے گا۔ مگر انھوں نے فرمایا کہ ہم لیڈر بننے کے لیے نہیں آئے۔ بالآخر چودھری خلیق الزمان کا نام پیش ہوا اور ان کے مقابلے میں فیروز خان نون کھڑے ہو گئے۔ خلیق الزمان کو اکثریت نے ووٹ دیے اور اس طرح وہ مسلم لیگ کے صدر منتخب ہو گئے۔"(9)

2) ممتاز مسلم لیگی، جناح کے غالی عقیدت مند، چودھری نذیر احمد خاں نے تحریک پاکستان میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا تھا۔ وہ پنجاب مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے بھی رکن تھے۔ وہ لیاقت علی خاں کی وزارتِ عظمیٰ میں مرکزی وزیر صنعت بھی رہے۔ چودھری صاحب آل پاکستان مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس [منعقدہ: فریئر ہال، کراچی، فروری 1948ء] میں شریک تھے۔ وہ اپنا مشاہدہ بایں الفاظ بیان کرتے ہیں:

"اس موقعہ پر مسلم لیگ پارٹی دو واضح گروپوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک گروپ کا خیال تھا کہ پارٹی کا عہدہ اور حکومت کی ذمہ داری ساتھ ساتھ نہ ہونی چاہئیں۔ جبکہ دوسرا

گروپ اس خیال کا حامی تھا کہ پارٹی کا عہدہ اور حکومت کا عہدہ اکٹھا رہنا چاہیے، اس مسئلہ پر ہاؤس کے اندر کافی بحث مباحثہ ہوا تھا۔ اس موقعہ پر مجھے قائداعظم نے ووٹ گننے پر مقرر فرمایا تھا۔ حسب حالات مخالف گروپ جیت گیا تھا۔ جلسہ کی کارروائی کے دوران ایک موقعہ ایسا بھی آیا جب قائداعظم ایک دم جلسہ چھوڑ کر ناراضگی کے عالم میں تشریف لے گئے۔ قائداعظم کے اس طرح چلے جانے سے ہم لوگوں کے اوپر ایک سناٹا چھا گیا تھا اور ہم لوگ بڑے حیران تھے۔"(10)

3) مسلم لیگی مورخ جناب پروفیسر سیّد محمد ذوالقرنین زیدی لکھتے ہیں:

"قائداعظم کا موقف یہ تھا کہ مسلم لیگ کا عہدہ اور حکومت کا عہدہ اکٹھے رہنا چاہیے۔ مگر ہاؤس نے اس خیال کو مسترد کر دیا تھا۔"(11)

اس پر مزید حوالے بھی پیش کیے جا سکتے ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صفدر محمود، حامد میر اور فضل حسین اعوان کے غلط مؤقف اور غلط بیانی کو بے نقاب کرنے کے لیے یہ حوالے کافی ہیں۔

اوپر ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ تاریخ کو کوئی اور نہیں بلکہ مسلم لیگی ہی مسخ کر رہے ہیں اور نہایت جرأت اور ڈھٹائی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ وہ جناح صاحب کے لیے ایسے اوصاف و کمالات گھڑ رہے ہیں جن کا جناح صاحب کے لیے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ غلط بیانی کر کے اور جھوٹ لکھ کر کے جناح صاحب کی شخصیت کے اردگرد تقدس کا ایسا ہالا بنا رہے ہیں جو نہ صرف تاریخ کے ساتھ زیادتی ہے بلکہ جناح صاحب کے ساتھ بھی زیادتی ہے۔ وہ اس مقصد کے لیے واقعات میں تحریف کر رہے ہیں۔ واقعات کو برعکس طور پر لکھ رہے ہیں۔ جعلی تحریریں ان سے منسوب کر رہے ہیں، ان پر لکھی گئی کتابوں کے مسودوں میں تبدیلی کر رہے ہیں۔ انھوں نے تو اس مقصد کے لیے بہت سا ریکارڈ بھی ضائع کر دیا ہے۔ معروف مورخ جناب قیوم نظامی اپنی کتاب **قائداعظم بحیثیت گورنر جنرل** کے پیش لفظ بعنوان "قارئین کی عدالت میں" لکھتے ہیں:

"مجھے اس موضوع پر لکھتے ہوئے انتہائی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ حیران کن اور افسوس ناک امر یہ ہے کہ پاکستان کے بانی اور پہلے گورنر جنرل کا وہ سرکاری ریکارڈ نیشنل آرکائیوز میں موجود نہیں ہے جو قائداعظم کے پالیسی ساز فیصلوں پر مشتمل تھا۔

قائداعظم بحیثیت گورنر جنرل اہم فائلوں پر نوٹ لکھ کر حکم جاری کرتے رہے۔ وہ فائلیں کسی سرکاری اور نجی ادارے میں موجود نہیں ہیں اور نہ ہی ان کا ذکر ڈاکٹر زوار زیدی کے ''جناح پیپرز'' میں ملتا ہے۔ میرا گمان یہ ہے کہ قائداعظم کی وفات کے بعد جو سیاست دان، سول سرونٹس اور فوجی آفیسر مقتدر ہو گئے وہ قائداعظم کے سیاسی نظریات سے متفق نہیں تھے۔ انھوں نے چونکہ ریاست کو قائداعظم کے تصور سے انحراف کرتے ہوئے اپنی مرضی اور منشا کے مطابق چلانا تھا لہٰذا انھوں نے قیمتی قومی ریکارڈ ضائع کر دیا۔ مجھے تحقیق کے دوران انکشاف ہوا کہ بعض مصنفین نے فکری بددیانتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود ساختہ تحریریں قائداعظم کے نام منسوب کر دی ہیں۔ شخصیت کو مسخ کرنا یا اُسے میک اپ کر کے پیش کرنا ہماری روایت رہی ہے۔''(12)

مسلم لیگیوں نے مسٹر جناح کو معصوم اور مقدس بنانے کے لیے تمام اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ مسلم لیگی اہلِ قلم پر یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ جب جھوٹ کے بعد سچ سامنے آتا ہے تو جھوٹ بولنے والے اپنا اعتبار بھی کھو دیتے ہیں اور عوام کا اعتماد بھی! لطیفہ کی بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب کا حوالہ دیا ہے اور اعوان صاحب نے نصابی سلیبس کو غور سے پڑھنے کا مشورہ دیا ہے، خوب بہت خوب! اعوان صاحب سے میری گزارش ہے کہ وہ اپنے کالم کے پہلے جملے کو ایک بار خود بھی پڑھیں، لیکن لفظ ''سیاست'' کو ''صحافت'' میں بدل کر پڑھیں اور اپنے گریباں میں جھانکیں۔

حامد میر نے اپنے ممدوح مسٹر جناح کی فاش غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ایک ہی کالم میں کئی جھوٹ بولے ہیں، غلط بیانیاں کی ہیں، لیکن طرّہ دیکھیے کہ وہ ایک کالم ''سچ اور صرف سچ'' کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں اور اس میں بایں الفاظ سچائی کا درس دیتے ہیں:

''ٹھوکر پہ ٹھوکر کھانے کے باوجود حکمران اشرافیہ سبق سیکھنے کے لیے تیار نہیں۔ اس اشرافیہ کی حالت مغلیہ سلطنت کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر سے مختلف نہیں ہے جو کہنے کو تو بادشاہ تھا لیکن سلطنت پر اس کی گرفت ختم ہو چکی تھی اور وہ ایک غیر ملکی طاقت کے ہاتھوں یرغمال بن چکا تھا۔ ہمارے حکمرانوں کی بھی ریاست پر گرفت تیزی سے

ختم ہو رہی ہے اور وہ ایک غیر ملکی طاقت کے یرغمال بنے نظر آتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ حکمران اشرافیہ کے مختلف افراد اور اداروں کو ایک دوسرے پر کوئی اعتماد نہیں بلکہ یہ سب ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے میں مصروف ہیں۔ ان کی اصلیت اور اوقات سے پاکستان کا بچہ بچہ واقف ہو چکا ہے لیکن احمقوں کی جنت میں رہنے والے یہ حکمران بدستور اپنی رعایا کو بے وقوف سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ جھوٹ پر جھوٹ بولے چلے جا رہے ہیں۔ یہ سب اپنا اپنا جھوٹ اور فریب قومی مفاد کے نام پر بیچتے ہیں۔ ٹھوکر پہ ٹھوکر کھا رہے ہیں لیکن سبق نہیں سیکھ رہے۔ ان کی بقا جھوٹ اور فریب میں ہے جبکہ پاکستان کی بقا صرف اور صرف سچائی میں ہے۔ صرف سچائی ایک دوسرے پر اعتماد کی بحالی میں معاون ثابت ہوگی، صرف سچائی قوم کو متحد کر سکتی ہے۔ صرف سچائی قوم کو بیرونی آقاؤں کی غلامی سے نجات دلا سکتی ہے اور صرف سچائی ہمیں بہادر شاہ ظفروں اور محمد شاہ رنگیلوں سے چھٹکارا دلائے گی تو پھر آئیے ایک دوسرے کے ساتھ صرف سچ بولیں۔''(13)

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ جناح صاحب کو عہدوں کی کس قدر ہوس تھی۔ عہدوں کے حصول کے لیے وہ کسی اصول، کسی قانون کو نہیں مانتے تھے۔ جمہوری تقاضوں اور قدروں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ وہ مسلم لیگیوں کے ''قائداعظم'' تھے، آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان مسلم لیگ کی صدارت انھوں نے اپنے پاس رکھی اور وہ اس عہدے پر سات آٹھ ماہ براجمان رہے۔ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے اور انھوں نے دستور ساز اسمبلی کی صدارت بھی اپنے پاس رکھی اور خواہش مند تھے کہ یہ تمام عہدے بیک وقت ان کے پاس رہیں۔ یہ بالکل غیر جمہوری رویہ تھا۔ علاوہ ازیں جناح صاحب کا ایک اور غیر جمہوری رویہ ملاحظہ ہو۔ پوری دنیا میں یہ طے شدہ اصول ہے کہ صدر کی یا وزیراعظم کی اہلیہ ہی ''خاتونِ اوّل'' کہلانے کا استحقاق رکھتی ہیں۔ لیکن جناح صاحب گورنر جنرل آف پاکستان کی حیثیت سے اور وہ بھی اپنی اہلیہ کے لیے نہیں بلکہ اپنی بہن محترمہ فاطمہ جناح کے لیے چاہتے تھے کہ خاتونِ اوّل کا مقام اور مرتبہ انھیں دیا جائے۔ حالانکہ اس طرح حق دار (بیگم رعنا لیاقت علی خاں) کا جائز حق غصب ہوتا تھا۔ جناح صاحب نے اس خواہش کے لیے اپنے رفیق خاص وزیراعظم لیاقت علی خاں سے

تعلقات بھی خراب کر لیے تھے۔ ان کے تعلقات کے بگاڑ کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ فاطمہ جناح خاتونِ اوّل بننے کا استحقاق قطعاً نہیں رکھتی تھیں۔ ان کا ''مادرِ ملت'' کہلانا خاتونِ اوّل کہلانے سے بھی از حد زیادہ غلط بلکہ مذموم ہے۔ اوّل اس لیے کہ مادرِ ملت دراصل امّ المومنین کا ترجمہ ہے اور یہ لقب شرعاً اور قانوناً امہات المومنین کے علاوہ کسی دوسری خاتون کے لیے بولا یا لکھا ہی نہیں جا سکتا۔ دوم: اس لیے کہ ''بابائے قوم'' کی بہن کو ''مادرِ ملت'' کہنا اخلاقاً اور روایتاً غلط ہی نہیں بلکہ لغو اور بیہودہ ہے۔ اگر فاطمہ جناح صاحبہ کے لیے کچھ ضروری تھا تو انھیں ''پھوپی قوم'' کا خطاب دیا جا سکتا تھا۔ یہ لقب گرامر کے لحاظ سے غلط سہی لیکن معنوی اعتبار سے تو مناسب ہے۔
پوری دنیا کی تاریخ میں یہ مثال مسٹر جناح اور اُن کے کھوٹے سکے ہی پیش کرتے ہیں۔ مسٹر جناح کے قریبی رفیق، آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے رکن، سابق وزیرِ اعلیٰ سندھ جناب محمد ایوب کھوڑو بتاتے ہیں:

''پاکستان بننے کے بعد جناح صاحب اور لیاقت علی کے درمیان تعلقات میں تبدیلی کا باعث مس فاطمہ جناح اور بیگم لیاقت علی کی آپس کی چپقلش بھی تھی۔ مس جناح قائدِاعظم کی بہن تھیں۔ قائدِاعظم چاہتے تھے کہ ان کا احترام ملک کی خاتونِ اوّل کی طرح ہونا چاہیے۔ بیگم رعنا لیاقت علی خاں اس بات پر معترض تھیں۔ ان کا موقف تھا کہ مس فاطمہ جناح قائدِاعظم کی بہن ہیں۔ اگر وہ اہلیہ ہوتیں تو پھر ان کا خاتونِ اوّل ہونے کا حق بنتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ قائدِاعظم کی بہن ہیں، اس لیے وہ ملک کی خاتونِ اوّل نہیں بن سکتیں۔ میں وزیرِاعظم کی بیوی ہوں اس لیے میں خاتونِ اوّل ہوں۔ بہرحال یہ تنازعہ وقت کے ساتھ ساتھ سنجیدگی اختیار کرتا چلا گیا۔''(14)

جناح صاحب کے ایک اور ساتھی جناب سردار شوکت حیات خاں اپنی خودنوشت سوانح حیات گم گشتہ قوم میں لکھتے ہیں:

''ایک اور قابلِ ذکر نامناسب قدم وہ تھا جو نوابزادہ نے اپنی بیگم کے کہنے پر اُٹھایا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ قائدِاعظم نے رعنا لیاقت علی خان کو ایک ڈنر کے دوران ڈانٹ دیا تھا اس لیے کہ وہ غیر ضروری طور پر اپنی اہمیت جتاتے ہوئے اپنے آپ کو پاکستان کی خاتونِ اوّل ظاہر کر رہی تھیں۔ حالانکہ مس فاطمہ جناح ان سے سینئر تھیں اور ایک ایسی خاتون

تھیں جو قیامِ پاکستان میں ہر مشکل وقت میں قائدِاعظم کے شانہ بشانہ کھڑی رہیں۔ لیاقت نے اپنی بیگم کے کہنے پر پرائم منسٹر شپ سے استعفیٰ بھیج دیا۔ اس امر سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیگم لیاقت علی خان کتنی مضبوط تھیں اور وہ سیاسی معاملات میں بھی اپنے خاوند پر اس قدر حاوی تھیں کہ وہ انھیں پرائم منسٹر شپ سے مستعفی ہونے پر مجبور کر سکتی تھیں۔''(15)

وزیرِاعظم لیاقت علی خاں کی اہلیہ رعنا بڑی دبنگ خاتون تھیں۔ مسٹر جناح اور فاطمہ جناح کی کوششوں کے باوجود رعنا نے خاتونِ اوّل کا اعزاز ایک لمحے کے لیے بھی فاطمہ جناح کو نہیں دیا، اپنے پاس ہی رکھا۔ اس کے باوجود مسلم لیگی تاریخ نگار بلکہ تاریخ ساز فاطمہ جناح کو ہی پاکستان کی ''پہلی خاتونِ اوّل'' قرار دیتے ہیں۔ جناب زاہد حسین انجم اپنی کتاب انسائیکلو پیڈیا پاکستان میں اوّل اوّل کے صفحہ 163 پر رقم طراز ہیں کہ ''محترمہ فاطمہ جناح پاکستان کی خاتونِ اوّل ہیں۔'' اور اسی کتاب کے اگلے صفحہ 164 پر پھر لکھتے ہیں کہ: ''وہ پاکستان کی پہلی خاتونِ اوّل تھیں۔'' حالانکہ فاطمہ جناح کو خاتونِ اوّل قرار دینا صریحاً غلط ہے، جھوٹ ہے۔
جناح صاحب دراصل مزاجاً غیر جمہوری شخصیت تھے، وہ آمرانہ ذہنیت کے مالک تھے۔ اس بات کے ثبوت میں چند حوالے پیشِ خدمت ہیں۔ معروف صحافی جناب سلمان عابد، جناب قیوم نظامی کی کتاب قائداعظم بحیثیت گورنر جنرل پر تبصرہ کرتے ہوئے مسٹر جناح کی سیاسی غلطیوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ہمیں یہ پہلو بھی سامنے رکھنا چاہیے کہ قائدِاعظم کوئی ربر اسٹیمپ گورنر جنرل نہیں بننا چاہتے تھے بلکہ انھوں نے تو 1935ء کے ایکٹ میں بنیادی تبدیلیاں بھی کیں جو اُن کے اختیارات میں اضافے سے متعلق تھیں۔ اسی طرح وہ کابینہ کے اجلاسوں کی خود صدارت کرتے رہے۔ حالانکہ لیاقت علی خاں وزیرِاعظم تھے۔ ان پر یہ الزام بھی ہے کہ ایک طرف وہ مسلم لیگ کے صدر تھے اور دوسری طرف وہ گورنر جنرل اور آئین ساز اسمبلی کے صدر بھی تھے جو ایک بڑا سیاسی تضاد تھا۔ اسی طرح سرحد اسمبلی کی منسوخی بھی ان کے دورِ اقتدار میں ہوئی۔ اس لیے ہمیں یہ ماننے میں بھی عار نہیں ہونا چاہیے کہ انسان سیاسی طور پر غلطیاں کر سکتا ہے اور شخصیات کو اس انداز میں پیش کرنا کہ وہ

غلطیوں سے مبرا ہوتی ہیں، ایک مناسب سوچ کی عکاسی نہیں۔'' (16)

مسٹر جناح نے نہ صرف سرحد اسمبلی، بلکہ سندھ اسمبلی بھی توڑی تھی۔ انھوں نے ان کے علاوہ بھی بہت سے غیر جمہوری فیصلے کیے تھے۔ پاکستان مسلم لیگ (قائداعظم گروپ) کی رہنما، معروف دانشور، سابقہ وزیر تعلیم سندھ محترمہ حمیدہ کھوڑو نے جناب سہیل وڑائچ سے ایک انٹرویو میں جناح صاحب کی سیاسی غلطیوں کے بارے میں اپنی رائے کا برملا اظہار کیا ہے:

''س: پاکستان بننے کے بعد قائداعظمؒ نے جب سندھ اسمبلی توڑی تو آپ کے والد (محمد ایوب خاں کھوڑو) سندھ کے وزیراعلیٰ تھے۔ آپ کے خیال میں کیا یہ فیصلہ صحیح تھا؟

ج: میرے خیال میں یہ ایک غلط فیصلہ تھا۔ میرے نزدیک نہ تو سندھ حکومت کو ختم کرنا چاہیے تھا اور نہ ہی اسمبلی توڑنی چاہیے تھی، یہ ایک غلط روایت ڈالی گئی۔ قائداعظمؒ خود بھی جمہوری نہیں تھے۔ اس بات کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ جب پاکستان بننے کے بعد وہ گورنر جنرل بنے تو ان کی کابینہ میں اکثریت ایسے افراد کی تھی جن کا تحریک پاکستان میں کوئی کردار نہ تھا۔ وہ لوگ بیوروکریٹس تھے، مثلاً ظفر اللہ خان، غلام محمد، چودھری محمد علی وغیرہ، قائد کے ساتھ میرے والد صاحب کے اچھے مراسم تھے، میرے والد صاحب نے کبھی شکوہ نہیں کیا لیکن قائداعظمؒ کا یہ عمل غیر جمہوری تھا۔ ساری سندھ اسمبلی اس فیصلے کے خلاف تھی، سندھ اسمبلی نے میرے والد صاحب کو مینڈیٹ دیا تھا کہ آپ کراچی کی سندھ سے علیحدگی پر اتفاق نہ کریں۔ اس لیے وہ وفاقی حکومت کے فیصلے کو کیسے مان سکتے تھے۔

س: آپ تاریخ نویس ہیں۔ قائداعظمؒ، لیاقت علی خان اور تحریک پاکستان کے دیگر رہنماؤں کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہیں؟

ج: میرے خیال میں پاکستان کی جو آج غیر جمہوری صورتِ حال نظر آ رہی ہے اس کی اصل وجہ وہ غیر جمہوری اقدامات تھے جو قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی کیے گئے، اس ملک میں جمہوریت تو پہلے دن سے نہیں ہے۔ یہ جو غیر جمہوری اقدام اٹھائے گئے، سرحد، سندھ اسمبلی کو توڑنا اور پنجاب میں مارشل لا لگانا وغیرہ، پہلے قائداعظمؒ نے

غیر جمہوری اقدامات کیے اور بعد میں دوسروں کو بھی قائداعظمؒ کی وجہ سے غیر جمہوری اقدامات کرنے کی جرأت مل گئی۔'' (17)

حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کی تاریخ میں مسٹر جناح ہی وہ شخصیت ہیں جنھوں نے سب سے زیادہ سیاسی غلطیاں کیں۔ ان کی تمام غلطیاں غیر معمولی تھیں۔ ان غلطیوں کا خمیازہ مسلمان آج بھی بھگت رہے ہیں اور صدیوں بھگتیں گے۔ گورنر جنرل آف پاکستان کی حیثیت سے مختصر عرصے میں انھوں نے جو غلطیاں کیں، وہ اس قدر ہیں کہ ان پر چار پانچ سو صفحے کی کتاب آسانی سے لکھی جا سکتی ہے۔ گورنر جنرل کی حیثیت سے انھوں نے جو غلطیاں کیں ان پر پردہ ڈالنے کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ بے اختیار گورنر جنرل تھے، حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ معروف دانشور جناب لیاقت علی ایڈووکیٹ ایک ایسی ہی تحریر کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ کہنا کہ قائداعظمؒ بے اختیار سربراہ مملکت تھے، تاریخی طور پر درست نہیں ہے۔ کابینہ کے اجلاس کی صدارت قائداعظمؒ خود کیا کرتے تھے اور جب جولائی 1948ء میں ریاستی امور کی دیکھ بھال کے لیے ایک نئی وزارت تشکیل دی گئی تو انھوں نے یہ وزارت اپنے پاس رکھی تھی۔ پاکستان کی پہلی آئین ساز اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کی تھی، جس میں کہا گیا تھا کہ وہ کوئی قانون قائداعظمؒ کے پیشگی مشورے کے بغیر منظور نہیں کرے گی۔

قائداعظمؒ کے پہلے سوانح نگار ہیکٹر بولیتھو کے مطابق، مرکزی حکومت کے سارے محکموں کے سیکرٹری مشورے اور احکامات کے لیے قائداعظمؒ سے رجوع کیا کرتے تھے۔

کراچی انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز کے سابق ریسرچ آفیسر اور روزنامہ مارننگ نیوز کے سابق ایڈیٹر مشتاق احمد لکھتے ہیں کہ ''قائداعظم نے نا صرف کابینہ تشکیل دی تھی بلکہ وہ کابینہ کے لیے پالیسیاں بھی وضع کرتے تھے۔ وہ کابینہ کی میٹنگوں کی صدارت کرتے تھے اور کابینہ کی ایمرجنسی کمیٹی، جس کے وہ چیئرمین تھے، کی میٹنگیں بھی ان کی صدارت میں ہی ہوتی تھیں۔ وہ وزیراعظم کی عدم موجودگی میں بھی کابینہ کے اجلاس طلب کر کے فیصلے کیا کرتے تھے۔ بلوچستان کی انتظامیہ پر بھی

قائداعظم کا کنٹرول تھا کیونکہ یہ انتظامیہ ایک ایجنٹ کے ذریعے چلائی جاتی تھی جو گورنر جنرل کو جواب دہ ہوتا تھا۔ کراچی کو قائداعظمؒ ہی کی ہدایت پر سندھ سے الگ کیا گیا تھا۔ سٹیٹ بنک اور فیڈرل کورٹ کا قیام بھی ان کے احکامات کے تحت عمل میں آیا تھا اور ریاستوں کے الحاق کی زیادہ تر ذمہ داری بھی قائداعظمؒ پر عائد ہوتی تھی۔ وہ وزیر اعظم، وزرا اور محکموں کے سیکرٹریوں کو اپنے مشوروں اور ہدایات سے مستفید کرتے رہتے تھے۔'' معروف بیوروکریٹ اور ایک وقت میں پاکستان کے وزیراعظم چودھری محمد علی نے اپنی آپ بیتی ظہور پاکستان میں صفحہ 386-385 پر لکھا ہے کہ'' قیامِ پاکستان کے چند ماہ بعد کابینہ نے فیصلہ کیا تھا کہ قائداعظم کابینہ کی رائے کو مسترد کر سکتے تھے اور اشخاص اور معاملات کے بارے میں ان کا فیصلہ حرفِ آخر تھا۔'' ان شواہد کی موجودگی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ قائداعظم بااختیار سربراہ مملکت تھے۔''(18)

مسٹر جناح کے بحیثیت گورنر جنرل غیر جمہوری بلکہ آمرانہ رویوں کے بارے میں گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کے شعبہ تاریخ کے سربراہ جناب ڈاکٹر طاہر کامران اپنی کتاب پاکستان میں جمہوریت اور گورننس میں لکھتے ہیں:

''ابتداء ہی سے حکمران طبقے کی خودغرضی اور عنان اقتدار پر قابض رہنے کی خواہش نے جمہوریت کی افزائش اور ارتقاء کو ناممکن بنادیا۔ مسلم لیگ کی اپنی قیادت جمہوریت کی ترویج وترقی کے راستے میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی۔ لیگ کی زیادہ تر قیادت مغربی پاکستان کے زمیندار طبقہ سے تعلق رکھتی تھی لہٰذا قدرتی طور پر عوام کی پہنچ سے دور تھی۔ عام طور پر محمد علی جناح (قائداعظم) کے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد فوت ہو جانے کو جمہوریت کے پروان نہ چڑھ پانے کی بنیادی وجوہات میں سے ایک بیان کیا جاتا ہے لیکن تاریخی حقائق اس نقطۂ نظر کی تصدیق نہیں کرپائے۔ دیگر وجوہات کے علاوہ گورنر جنرل کے انتظامی اختیارات کا استعمال اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ پاکستان کے جمہوری ڈھانچے کی بنیاد میں ہی غیر معمولی سقم تھا۔ انتظامی اختیارات کا مرکز ومحور تو وزیراعظم کو ہی ہونا چاہیے تھا لیکن جناح صاحب کے گورنر جنرل ہوتے ہوئے وزیراعظم محض عضوِ معطل ہوکر رہ گیا تھا۔ جناح صاحب اپنے سیاسی رفقائے

کار سے زیادہ بیوروکریٹوں پر انحصار کرتے تھے جس کی وجہ سے پاکستان میں غیر سیاسی عناصر ابتداء ہی سے مضبوط ہوگئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ آزادانہ اور منصفانہ انتخابات ہوسکے اور نہ ہی آئین تشکیل پاسکا کیونکہ ایسا ہونے کی صورت میں غیر سیاسی عناصر (بیوروکریٹ اور فوجی ہائی کمان) اُن وسیع اختیارات سے محروم ہوجاتے جن پر اُن کی اجارہ داری تھی۔ یاد رہے کہ سول بیوروکریسی کی لگام ملک غلام محمد، چودھری محمد علی اور سکندر مرزا کے ہاتھوں میں تھی اور بیوروکریٹوں کی یہ مثلث جنرل ایوب خان کو ساتھ ملاکر 1950ء کی دہائی میں پاکستانی عنانِ اقتدار پر قابض رہی۔ اس دہائی کو سیاسیات اور تاریخ کی کتب میں جمہوری یا پارلیمانی دور سے موسوم کیا جاتا ہے جو کہ حقائق کی رُو سے درست نہیں۔''(19)

ڈاکٹر طاہر کامران اسی حوالے سے مزید لکھتے ہیں:

''اگر جناح صاحب کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ ان کے گورنر جنرل کے عہدے پر فائز ہونے سے پاکستان کی آئندہ سیاست پر کافی ناخوش گوار اثرات مرتب ہوئے۔ محمد علی جناح دراصل اس وقت دنیا کے سب سے بااختیار گورنر جنرل تھے۔ جناح صاحب کے حوالہ سے کیمبل جانس اپنی ڈائری میں نوٹ کرتا ہے کہ گورنر جنرل کے طور پر اپنا نام تجویز کرنے کے فوراً بعد وہ 1935ء کے ایکٹ کے شیڈول 9 کے اختیارات کے حصول کے لیے کوشاں ہوگئے جو کسی بھی آئینی گورنر جنرل کو جو کہ بادشاہ کا نمائندہ ہو، اُسے بھی حاصل نہ تھے۔(20) ایک نوزائیدہ ریاست میں بانی کی حیثیت سے جناح صاحب کو غیر مشروط قبولیت اور اختیار حاصل تھا جو کہ کسی بھی آئینی یا قانون ساز ادارے کو حاصل نہ تھا۔ ڈان نے اپنے ایک اداریہ میں لکھا کہ ایک ڈومینین میں گورنر جنرل کے جو بھی آئینی اختیارات ہوں مگر جہاں تک قائداعظم کا تعلق ہے اُن پر کسی قسم کی قانونی یا رسمی حد بندی لاگو نہیں۔''(21)

''گورنر جنرل مسٹر جناح نے وزیراعظم لیاقت علی خاں کو بہت حد تک بے وقعت کر دیا۔ اس لیے کہ تمام انتظامی اختیارات گورنر جنرل استعمال کرتا، جس کی وجہ سے وزیر اعظم محض ایک ربڑ سٹیمپ بن کر رہ گیا۔ علاوہ ازیں طاقت کا یہ عدم توازن جس کی

شروعات ابتدا ہی سے ہوگئی تھی آگے چل کر شدید سیاسی ابتری کا سبب بنا۔ اس کا ایک بڑا نتیجہ تو یہ برآمد ہوا کہ پاکستان میں پارلیمانی جمہوریت کو فروغ حاصل نہ ہو سکا۔ گورنر جنرل کے تمام تر اختیارات ''1935ء انڈین انڈیپنڈنس ایکٹ'' کے اس سیکشن کے مرہونِ منت تھے جس نے لامحدود اختیارات اسے تفویض کر دیے تھے کہ وہ ایک سادہ سے حکم سے ہی آئین میں ترمیم کر سکتا ہے۔''(22)

جناح صاحب کو علم و ادب سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ ان کی علم و دانش سے عدم دلچسپی اور کتاب سے بے اعتنائی کے بارے میں ایک حوالہ ملاحظہ فرمائیے۔ مسٹر ی. ایم. چھاگلا جناح صاحب کے رفیق سیاست تھے، رفیق وکالت تھے، ان کی الیکشن مہم میں کام کرتے رہے تھے، وہ جناح صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

> I have never come across any man who had less humanity in his character than Jinnah. He was cold and unemotional and apart from law and politics he had no other interests. I do not think he ever read a serious book in his life. His staple food was newspapers, brief and law books. (23)

ترجمہ: میں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جس کے کردار میں جناح سے کم انسانیت ہو۔ وہ ایک سرد مزاج اور غیر جذباتی شخص تھا۔ قانون اور سیاست کے علاوہ اسے کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس نے اپنی پوری زندگی میں کوئی سنجیدہ کتاب نہیں پڑھی ہوگی۔ ان کا بنیادی ذریعۂ علم اخبارات، مقدمات اور قانون کی کتابیں تھیں۔

علم و دانش کے حوالے سے بحیثیت مجموعی مسلم لیگی قیادت (مسٹر جناح اور اُن کے رفقا یعنی کھوٹے سکوں) کی جو حالت و کیفیت تھی اس سلسلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر، معروف دانشور جناب نسیم انصاری لکھتے ہیں:

''مسلم لیگ کی قیادت میں بہت کم دانشور تھے۔ خود جناح صاحب بہت اچھے وکیل

اور بڑے ہوشیار سیاست دان تھے، لیکن میری نظر سے ان کی کوئی تحریر ایسی نہیں گزری جس میں کوئی فلسفیانہ، ادبی یا اقتصادی مسئلہ اٹھایا گیا ہو۔''(24)

مسٹر جناح کی علم سے رغبت کا حال آپ نے پڑھ لیا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے ارکان اسمبلی کو بھی تعلیم اور تعلم سے کوئی رغبت نہیں ہے۔ جب الیکشن کے لیے بی اے کی شرط رکھی گئی تو انھوں نے جعلی ڈگریاں پیش کر دیں اور یہ سب جعلی ڈگریوں والے خاندانی مسلم لیگی اور جاگیر دار ہیں۔ ان کے بڑے تحریک پاکستان میں شامل رہے۔ یہ لوگ پاکستان پر مسلط ہو گئے۔ ان کی قابلیت ان کی جاگیر اور ان کی دولت ہے۔ جناح صاحب کے یہ کھوٹے سکے گزشتہ 63 سال سے ملک کی غریب عوام کا جس طرح استحصال کرتے چلے آرہے ہیں، اس کے بارے میں پڑھ، سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ اپنے علاقوں میں تعلیمی ادارے قائم نہیں ہونے دیتے۔ دراصل یہ غریب کے بچے کو معمولی تعلیم حاصل کرنے یعنی دو چار جماعتیں پڑھنے کا حق بھی نہیں دیتے۔ انھیں ڈر ہوتا ہے کہ کہیں غریب کا بچہ تعلیم حاصل کر کے ان کی چاکری سے نہ نکل جائے۔ گزشتہ 63 سال سے پورا ملک جہالت و غربت میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس کے ذمہ دراصل جناح صاحب کے یہی کھوٹے سکے ہیں۔ ڈاکٹر صفدر محمود کے بقول ''پاکستان کی پچاس فیصد آبادی جہالت کے اندھیروں میں بھٹک رہی ہے اور پچاس فیصد خواندہ آبادی میں سے صرف آٹھ دس فیصد کے قریب گریجوایٹ ہیں۔''(25) اور ان آٹھ دس فیصد میں سے بھی اکثر جعلی ڈگریوں والے ہیں جبکہ قومی و صوبائی اسمبلیوں کے ارکان میں بڑی تعداد جعلی ڈگریوں والوں کی ہے۔ یہ لوگ غریب کے بچوں کو پڑھنے نہیں دیتے جبکہ ان کے بچے تمام سہولتوں کے باوجود پڑھ کر نہیں دیتے۔ نتیجتاً سارا ملک جہالت میں غرق ہے۔



حوالہ جات

(1) روزنامہ جنگ لاہور/28 مارچ 2011ء

(2) روزنامہ جنگ لاہور/28 مارچ 2011ء

(3) ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور، اشاعت خصوصی: مسلم لیگ کے 100 سال/ستمبر 2007ء/ص 22-23

(4) قائداعظم کے رفقا سے ملاقاتیں/سید محمد ذوالقرنین زیدی/قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد/1990ء/ص 32-33

(5) ایضاً/ص 33

(6) روزنامہ جنگ لاہور/26 مارچ 2011ء

(7) روزنامہ نوائے وقت لاہور/17 مارچ 2011ء

(8) روزنامہ جنگ لاہور/28 مارچ 2011ء

(9) قائداعظم کے رفقا سے ملاقاتیں/ص 90-91

(10) ایضاً/ص 71-72

(11) ایضاً/ص 72

(12) قائداعظم بحیثیت گورنر جنرل/ص 5

(13) روزنامہ جنگ لاہور/جون 2011ء

(14) قائداعظم کے رفقا سے ملاقاتیں/ص 82

(15) گم گشتہ قوم/ص 232

(16) ہفت روزہ فرائیڈے اسپیشل کراچی/19 نومبر 2010ء/ص 40

(17) روزنامہ جنگ (سنڈے میگزین) لاہور/15 اپریل 2007ء/ص 6

(18) ماہنامہ تجزیات اسلام آباد/شمارہ 21 بابت ستمبر 2010ء/ص 129

(19) پاکستان میں جمہوریت اور گورننس/ڈاکٹر طاہر کامران/ساؤتھ ایشیا پارٹنرشپ پاکستان، لاہور/اکتوبر 2008ء/ص 11

(20) Alan Campbell Johnson, *Mission with Mountbatten* (London: Robert Hale, 1952), p. 156

(21) Editorial, Freedom and After, *Dawn*, Delhi, 18 August 1947, p. 4

(22) پاکستان میں جمہوریت اور گورننس/ص 28

(23) *Roses in December* by M.C. Chagla, p. 55

(24) جواب دوست/نسیم انصاری/ص 22

(25) روزنامہ جنگ لاہور/5 دسمبر 2010ء

30

لوگ اس پر تعجب کرتے ہیں کہ تقسیمِ ہند و قیامِ پاکستان کے بارے میں جب علمائے حق کا مؤقف اس قدر درست تھا تو عوام نے اُن کا ساتھ کیوں نہیں دیا۔ سو اس سلسلے میں عرض ہے کہ مسٹر جناح اور اُن کے رفقاء (کھوٹے سکے) مسلمانوں سے جھوٹ بولتے تھے، جھوٹے وعدے کرتے تھے، انھیں لالچ دیتے تھے، سبز باغ دکھلاتے تھے۔ کہتے تھے کہ پاکستان ایک اسلامی اور فلاحی ریاست ہوگی۔ جہاں اسلامی شریعت کا نفاذ ہوگا۔ جہاں سے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوگا۔ یہ ہر قسم کے جرائم سے پاک ایک خطہ ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسے سبز باغ تھے جن سے عوام تو عوام، پڑھے لکھے لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور یہ باتیں مسلمانوں کے ذہنوں میں بے حد راسخ اور پختہ کر دی گئی تھیں۔ کٹر مسلم لیگی ذہن رکھنے والے تنظیم اسلامی پاکستان کے امیر جناب ڈاکٹر اسرار احمد نے اسے ''مسٹر جناح کی اسلام کی قوالی گانے اور راگ الاپنے'' سے تشبیہ دی ہے اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی جو کیفیت ہوئی، اسے ڈاکٹر صاحب نے ''حال چڑھنے'' کا نام دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں یہ بہت مبنی بر حقیقت تشبیہ ہے۔ ہمارے معاشرے میں قوال کی پہچان یہ ہے کہ وہ عمل کا نہیں محض قول کا آدمی ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ کہہ رہا ہوتا ہے وہ زبان کی حد تک ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اس کا کہنے کا اپنا ایک خاص انداز ہوتا ہے جس کے نتیجے میں سننے والے کو ''حال'' چڑھ جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جناح صاحب بھی صرف قول کے آدمی تھے، ان کا عمل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ کردار کے نہیں، گفتار کے غازی تھے۔ انھوں نے جب ''اسلام کی قوالی گائی اور راگ الاپا'' تو برصغیر کے مسلمانوں کو ''حال'' چڑھ گیا۔ اور ڈاکٹر صاحب ہی بتاتے ہیں کہ ''حال'' چڑھنے سے

ذہن ماؤف ہو جاتا ہے، عقل کی حکمرانی ختم ہو جاتی ہے۔ اور یہی ہوا۔ گویا پاکستان مسلمانوں کی بے عقلی کا اور عقل سے ماورا جذباتیت کا نتیجہ تھا۔ مسٹر جناح کے اسلام کی قوالی گانے اور راگ الاپنے سے جاہل عوام پر ہی نہیں، بہت سے پڑھے لکھے خواص پر بھی حال طاری ہو گیا تھا۔ ان میں ایسے بھی تھے جن پر آخر عمر تک ''حال'' طاری رہا اور آخری عمر تک ان کی عقلوں نے کام نہیں کیا۔ جس کے نتیجے میں وہ آخر عمر تک مسٹر جناح اور ان کے گمراہ کن دوقومی نظریہ کی مالا جپتے رہے، انھی لوگوں میں خود ڈاکٹر اسرار احمد کا شمار بھی ہوتا ہے۔ وہ آخر عمر تک دوقومی نظریہ اور نظریہ پاکستان کے بارے میں تقریریں فرماتے رہے اور خامہ فرسائی کرتے رہے۔ انھوں نے 2008ء میں ''علامہ اقبال، قائداعظم اور نظریۂ پاکستان'' کے عنوان سے ایک تقریر کی، جسے روزنامہ نوائے وقت لاہور نے 23 اکتوبر 2008ء کے شمارے میں پورے صفحے پر شایع کیا تھا بعد میں ڈاکٹر صاحب نے اسے کتابچہ کی صورت میں بھی چھاپ دیا تھا، ''حال'' میں مست شخص کبھی کبھی صحیح باتیں بھی کر جاتا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے کی ہیں، وہ فرماتے ہیں:

''محمد علی جناح نے 1937ء سے لے کر 1947ء تک پورے دس برس اسلام کی قوالی گائی۔ یعنی دس برس تک مسلسل تکرار کے ساتھ صرف اسلام کی بات کی کہ ہمیں اسلام چاہیے، ہم اسلامی تہذیب، اسلامی قوانین چاہتے ہیں جو ہندو قوانین سے یکسر الگ ہیں۔ اسلام صرف ہمارا مذہب نہیں، بلکہ دین ہے۔ یہ زندگی کے تمام معاملات پر حاوی ہے۔ اس چیز نے مسلمانوں کے اندر ایک ولولۂ تازہ پیدا کر دیا۔ جیسے اقبالؒ نے کہا:

اک ولولۂ تازہ دیا جس نے دلوں کو
لاہور سے تاخاکِ بخارا و سمرقند

اب محمد علی جناح کی زبان سے جب یہ آواز بلند ہوئی جو مسلمانوں کے دلوں کی آواز تھی اور ان کی روح کی پکار تھی تو سب نے اس پر لبیک کہا اور اب مسلم لیگ ایک عوامی جماعت بن گئی اور محمد علی جناح اب ''قائداعظم'' قرار پائے۔''(1)

ڈاکٹر صاحب نے اس تقریر میں مزید کہا:

''قائداعظم محمد علی جناح نے جب اسلام کا راگ الاپا اور قوالی گائی تو اس کے نتیجے میں

قوم کو ''حال'' آ گیا۔ آپ ذرا سوچیے کہ مسلم اقلیتی صوبوں کے لوگوں نے مسلم لیگ کو کیوں ووٹ دیے؟ کیا اتر پردیش اور مدراس پاکستان آ سکتے تھے؟ اور کیا بمبئی اور CP پاکستان کا حصہ بن سکتے تھے؟ یہ بات بظاہر عقل کے خلاف معلوم ہوتی ہے، لیکن یہ دراصل مسلمانوں کے ''حال'' میں آنے کا نتیجہ تھا۔ جہاں جذبات کی حکمرانی ہو جاتی ہے وہاں عقل ایک طرف رہ جاتی ہے، ورنہ اور کوئی وجہ نہیں تھی کہ پاکستان کے ساتھ کسی تعلق کے نہ ہونے کے باوجود اقلیتی صوبوں کے مسلمان پاکستان کے لیے مسلم لیگ کو ووٹ دیتے۔ قرارداد پاکستان 1940ء میں منظور ہو چکی تھی۔ اس کے بعد 1946ء میں مسلم لیگ کامیاب ہو گئی اور اسے پورے ہندستان میں نہ صرف اکثریتی صوبوں میں، بلکہ اقلیتی صوبوں میں بھی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

اس دوران میں دعائیں بھی بہت مانگی گئیں اور نعرہ لگایا گیا، ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ''۔ اگرچہ کچھ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ یہ کوئی سنجیدہ نعرہ نہیں تھا، بلکہ بچوں کا بنایا ہوا نعرہ تھا۔ بے شک یہ بچوں کا بنایا ہوا نعرہ ہو لیکن بہرحال یہ مسلمانانِ ہند کے دلوں کی آواز بنا ہے۔ میں تو خود اُن لوگوں میں سے ہوں جنھوں نے یہ نعرے لگائے ہیں۔ اس وقت میں ہائی سکول کے طالب علم کی حیثیت سے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن ضلع حصار کا جنرل سیکرٹری تھا۔ ہم نے جلسوں جلوسوں میں یہ نعرے لگائے ہیں، اور جمعہ اور عیدین کے اجتماعات میں گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگی ہیں کہ اے اللہ! ہمیں انگریز اور ہندو کی دوہری غلامی سے نجات دے دے، ہمیں ایک آزاد خطۂ ارضی عطا فرما، وہاں پر ہم تیرے دین کا بول بالا کریں گے اور تیرے نبیؐ کی شریعت نافذ کریں گے۔ درحقیقت اگر یہ نعرہ اور پیغام نہ ہوتا تو پورے ہندستان کے مسلمان 1946ء کے ''الیکشن'' میں مسلم لیگ کو ووٹ نہ دیتے۔ لہٰذا اس اعتبار سے یہی فیصلہ کن نظریہ تھا جو پاکستان کی بنیاد بنا۔''(2)

مسٹر جناح کے اسلام کی قوالی گانے اور راگ الاپنے کے نتیجے میں بمبئی اور سی. پی کے مسلمانوں کو حال چڑھ جانا اور پھر بلاوجہ تحریک پاکستان میں شریک ہونا، مسلم لیگ کو ووٹ دینا

معمولی بات نہیں۔ یہ ان کی حماقت تھی، جرم تھا۔ گناہ بے لذت و بے فائدہ تھا۔ ان علاقوں کے تمام مسلمانوں کو 1947ء میں اس کی بہت کڑی سزا ملی اور آج تک مل رہی ہے۔ اس کے اصلاً ذمہ دار بھی مسٹر جناح ہیں۔ دوقومی نظریہ کی گمراہی میں مسٹر جناح کے برابر کے شریک مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی اسے مسٹر جناح اور مسلم لیگ کی بہت بڑی غلطی قرار دیا تھا۔ مودودی صاحب نے قیامِ پاکستان کے بعد مسٹر جناح اور مسلم لیگ کی غلطیوں کی ایک چارج شیٹ تیار کی تھی جس میں وہ رقم طراز ہیں:

''اس قیادت کی غلطیاں اس سے بہت زیادہ ہیں کہ چند سطروں میں انھیں شمار کیا جا سکے۔ مگر اس کی چند غلطیاں تو اتنی نمایاں ہیں کہ آج ہر ذی ہوش آدمی ان کو بُری طرح محسوس کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر:

1) اس نے حصولِ پاکستان کی جنگ میں ان علاقوں کے مسلمانوں کو شریک کیا جنھیں لامحالہ ہندستان ہی میں رہنا تھا۔ آج یہ اسی کا خمیازہ ہے کہ ہندستان کی سرزمین اُن غریبوں کے لیے جہنم بن گئی ہے۔ حالانکہ اگر تقسیم کے بعد ہندستانی اور پاکستانی مسلمانوں کا مستقبل ایک دوسرے ... بالکل مختلف ہو جانے والا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ تقسیم سے پہلے دونوں کی پالیسی ایک ہوتی۔

2) اس نے ہندستانی مسلمانوں کو ایک ہفتہ پہلے بھی خبردار نہ کیا کہ تقسیم کے وقت اُن پر کیا طوفان ٹوٹنے والا ہے۔ اگر فی الواقع اسے ان حالات کا اندازہ ہی نہ تھا تو اس کی غفلت و بے خبری قابلِ ماتم ہے۔ اور اگر اس نے جان بوجھ کر مسلمانوں کو بے خبر رکھا تو اس غداری کے لیے اسے کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔

3) جن لیڈروں پر ہندستان کے مسلمان آخر وقت تک اندھا اعتماد کیے ہوئے تھے وہ عین وقت پر انھیں چھوڑ کر پاکستان اٹھ آئے اور انھیں کچھ بھی نہ بتایا کہ ان کے پیچھے وہ کیا کریں۔

4) جو عجیب و غریب ہدایت ہندستان کے مسلمانوں کو دی گئی وہ یہ تھی کہ ایک رات میں وہ اُن سارے اصولوں کو نگل جائیں جن پر وہ دس برس سے کانگریس کے خلاف لڑ رہے تھے۔ 14 اگست کا سورج دوقومی نظریے کا کلمہ پڑھتے ہوئے غروب ہوا اور 15 اگست

کا سورج طلوع ہوتے ہی ہر ہندی مسلمان ہندستانی قومیت کا معتقد بن کر اُٹھے۔

5) پچھلے دس سال کی قومی تحریک میں اسلام کا نام جس قدر لیا گیا اُس کا پچاسواں حصہ بھی مسلمانوں کے اندر اسلامی اخلاق پیدا کرنے کے لیے کام نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کے قومی اخلاق کو پہلے سے کچھ زیادہ ہی پست کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ قومی جنگ میں مسلمان ان تمام اخلاقی جرائم کے مرتکب ہوئے، جن کا ارتکاب ان کے حریفوں نے کیا۔ مظالم کی مقدار میں چاہے کتنا ہی فرق رہا ہو، مگر مظالم کی نوعیت میں دونوں کے کارنامے ایک دوسرے سے کچھ بھی مختلف نہ رہے تھے۔ اگر ہماری قومی قیادت نے ہمارے عوام کی اخلاقی تربیت کے لیے کوئی کوشش کی ہوتی اور اکثریت کے علاقوں کے مسلمان وہ حرکات نہ کرتے جو انھوں نے کیں تو اقلیت کے مسلمان اس بری طرح نہ پیسے جاتے، اور آج پاکستان کی اخلاقی پوزیشن ہندستان سے اتنی زیادہ اونچی ہوتی کہ ہندستان اس سے آنکھ ملا کر بات نہ کرسکتا۔''(3)

اس تقریر میں ڈاکٹر صاحب یہ بھی فرماتے ہیں:

''اسی زمانے میں ہندو مسلم کشاکش بھی انتہا کو پہنچ گئی۔ چونکہ ہندوؤں کے لیے بھارت ماتا نہایت مقدس تصور ہے اور الگ وطن کا مطالبہ کر کے مسلمان گویا بھارت ماتا کو ٹکڑے کرنا چاہتے تھے لہٰذا ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف شدید نفرت اور دشمنی پیدا ہو گئی اور اس دشمنی کا ظہور تقسیم ہند کے وقت ہوا۔ چنانچہ مسلمانوں کا قتلِ عام ہوا، انسان بھیڑیوں سے بڑھ کر سفاک بنا، چھوٹے چھوٹے بچوں کو اچھال کر نیزوں میں پرو دیا گیا، لاکھوں عورتوں کی عصمت دری ہوئی، بے شمار عورتیں اغوا ہوئیں، لاکھوں آدمی قتل ہوئے۔ ایک کروڑ انسان اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر منتقل ہوئے۔ آبادی کی اتنی بڑی ہجرت تاریخ انسانی میں کبھی نہیں ہوئی۔

اس کے حوالے سے میں قائداعظم کا ایک اور اقتباس پیش کر رہا ہوں جو 18 جنوری 1948ء کو سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شائع ہوا۔ حبیبیہ حال، اسلامیہ کالج لاہور میں مسلمان خواتین کا ایک اجلاس ہوا جس میں قائداعظمؒ نے فرمایا:

اگر ہم پاکستان کے حصول کی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے تو ہندستان سے مسلمانوں

اور اسلام کا نام ونشان مٹ جائے گا۔"(4)

ہندو مسلم کشاکش از خود انتہا کو نہیں پہنچی تھی بلکہ اس کے پیچھے انگریز کا ہاتھ تھا۔ مسلم لیگ نے اس میں شرم ناک کردار ادا کیا۔ جناب کے ایم اعظم لکھتے ہیں:

"جلیانوالہ کے حادثے کے دور میں (20-1919ء) میں ہندو مسلم اتحاد اپنے عروج پر تھا اور ہندو مسلم آپس میں شیر وشکر تھے۔ کانگریس کی تحریک ترک موالات اور مسلمانوں کی تحریک خلافت آپس میں جڑی ہوئی تھیں۔ خلافت کے جلسوں میں ہندو لیڈر مولویوں کی طرح تقریریں کرتے تھے اور مہاتما گاندھی کو دہلی کی بادشاہی مسجد میں منبر پر لا بٹھایا گیا۔ مسلمان مشائخ کی "تحریک ریشمی رومال" میں ہندو جوش وخروش سے شامل تھے۔ اس صورت حال کو دیکھ کر انگریز حکمران اپنے مفادات کو بچانے کے لیے مستعد ہو گئے۔ انتشار، نفاق اور نفرت وحقارت کی خوب آبیاری کی گئی، جس نے تناور درخت کی شکل اختیار کر لی۔ یہودی نژاد وائسرائے ہند، لارڈ ریڈنگ وزیر ہند کو اپنے 12 ستمبر 1922ء کے مراسلے میں رقم طراز ہیں کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مکمل تفرقہ ڈالنے میں قریب قریب کامیاب ہو گئے ہیں۔"(5)

ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر میں مسٹر جناح کا جو "فرمان" درج کیا ہے اُسے میں جناح کی لن ترانی ہی کہوں گا۔ اس حوالے سے چونکہ میں اس کتاب میں کافی کچھ لکھ چکا ہوں۔ مزید کچھ لکھنے کی اب ضرورت باقی نہیں سمجھتا۔ ڈاکٹر صاحب نے اوپر درج پیرے میں ہندو مسلم فسادات کے نتیجے میں ہونے والی قتل وغارت پر جو روشنی ڈالی ہے، وہ تو اپنی جگہ بہت بڑی حقیقت ہے، اس قتل وغارت کے ذمہ دار مسٹر جناح اور ان کے رفقاء ہیں۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ مسٹر جناح نے اسلام کی جو "قوالی" گائی تھی، جو "راگ" الاپا تھا اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو جو "حال" چڑھا تھا اور ان کی جو عقلیں ماؤف ہوئیں تھیں، اس کے نقصانات 1947ء کی قتل و غارت تک محدود نہیں تھے بلکہ اس کی سزا مسلمان صدیوں بھگتیں گے۔ ہندستان میں مسلمانوں کی لاکھوں مساجد، مدارس، کتاب خانے، مکتبے، ادارے اور مزار وقبرستان اجڑے، بے آباد ہوئے بلکہ بری طرح سے برباد ہوئے اس کی تمام تر ذمہ داری مسٹر جناح اور لیگ پر عائد ہوتی ہے۔ وہ جس طرح کی اشتعال انگیز سیاست کر رہے تھے اور جس طرح کی تقسیم کروا رہے تھے، اس کے

نتائج تو ایسے ہی سامنے آنے تھے۔ ہم یہاں ڈاکٹر اسرار احمد کا ہی حوالہ دیں گے۔ جناب خالد بہزاد ہاشمی لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے آخری انٹرویو میں بتایا کہ وہ 90ء کی دہائی کے شروع میں اپنے آبائی شہر حصار بھی گئے تھے۔ حصار میں وہ اپنا آبائی مکان ڈھونڈتے ہوئے مرکزی جامع مسجد کی جانب نکل گئے جہاں وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ جامع مسجد میں سرکاری سکول قائم ہے اور مسجد کے احاطہ میں واقع پختہ قبروں کے چاروں جانب مورتیاں نصب ہیں۔ اُس وقت حصار میں 68 مساجد تھیں جن میں لاٹ کی مسجد، ہمایوں کی جامع مسجد (1553ء)، بہلول لودھی کی مسجد اور دہلی گیٹ کے باہر ہمایوں کی مسجد (1533ء) شامل ہیں۔ اس وقت یہ تمام تاریخی مساجد ہندوؤں کے ناجائز قبضہ میں ہیں۔ ان میں سے صرف ایک مسجد جو نند سینما کے قریب واقع ہے، میں صرف جمعہ کی نماز ہوتی ہے، جبکہ یہ مسجد بھی باقی اوقات میں رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔"(6)

حقیقت یہ ہے کہ تقسیم ہند کے موقع پر مسلمانوں کا جس قدر بھی جان ومال، آبرو اور اسلامی آثار کا نقصان ہوا، سب مسٹر جناح کی سیاست بد کے نتیجے میں ہوا، سب کچھ کے وہ ذمہ دار ہیں۔

قیام پاکستان سے قبل مسلم لیگ نے کذب بیانی کر کے برصغیر کے مسلمانوں کے ذہنوں میں پاکستان کا جو تصور قائم کیا تھا وہ کس قدر خوب صورت تھا اس کا اندازہ درج ذیل تحریر سے ہوتا ہے جو جریدہ ماہنامہ مولوی دہلی کے شمارہ بابت شعبان 1363ھ مطابق اگست 1944ء کا ادارتی شذرہ ہے۔ دراصل یوپی کے ایک مسلم لیگی نے انگریز گورنر کے اعزاز میں ناؤ نوش کا اہتمام کیا تھا، اس پر جریدہ مولوی کے مدیر مسئول کٹر مسلم لیگی جناب عبدالحمید خاں نے ادارتی شذرہ میں اس پر شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"سید اعزاز رسول اور اُن کی بیگم جن کی یوپی مسلم لیگ میں نہایت ذمہ دارانہ حیثیت ہے، انھوں نے گورنر یوپی کو شراب خوری کی دعوت دی اور اس کا نہایت شاندار اہتمام کیا۔ غالباً اسی کے صلہ میں نواب بنا دیے گئے۔ مسلم لیگ کو ایسے نوابوں اور خان بہادروں کی ضرورت نہیں جو بغیر ضمیر فروشی اور ایمان فروشی کے زندگی بسر نہ کر سکیں۔ یہ

روپیہ جو اس ذلیل اور لغو کام میں صَرف کیا گیا، اگر قومی فنڈ میں دے دیا جاتا تو ایک بات بھی تھی۔ افسوس ہے کہ سیّد صاحب نے اپنے مذہب اور نسب کی علانیہ بے حرمتی کی۔ ایسے لوگوں کے وجود کو مسلم لیگ میں کسی ذمہ دارانہ حیثیت سے کیسے برداشت کیا جا سکتا ہے۔ مسلم لیگ جس پاکستان کے قیام کے لیے جدوجہد کر رہی ہے اس میں تو شرابیوں کو دُرّے لگائے جائیں گے اور وہ بھی چوراہے پر کھڑا کر کے۔ اس میں تو زانیوں کو سنگسار کیا جائے گا، وہاں عورتوں کو غیر مردوں کے ساتھ تخلیہ کا موقع نہیں ملے گا، وہاں عورتیں عریاں لباس میں باہر نہیں جا سکیں گی، بلکہ گھر میں بھی اس طرح نہیں رہ سکیں گی، وہاں تو ہر شخص مجبور ہوگا کہ سوائے عذر شرعی کے ہر حال میں نماز باجماعت مسجد میں ادا کرے۔ سیّد صاحب کو اگر یہ کڑی حکومت منظور ہے تو اپنے ناشائستہ کردار سے علانیہ توبہ کریں، ورنہ مسلمان تلے ہوئے ہیں کہ اس قسم کے غلط عنصر کو اپنی سیاسی جماعت میں حتماً اور یقیناً نہیں رہنے دیں گے۔ گورنر اپنے عہدے سے جب ریٹائر ہوتے تو اس وقت سیّد صاحب ان کو بحیثیت دوست کے الوداعی پارٹی دیتے اور اسلامی طریقے پر دیتے تو ہم معترض نہ ہوتے۔ لیکن موجودہ صورت میں ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ سیّد صاحب نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے یہ روپیہ ضائع کیا اور مسلم لیگ کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اس طرح ملتِ اسلامیہ کی سخت ترین توہین کی۔''

ملک کے معروف دانشور، ادیب اور شاعر جناب احمد ندیم قاسمی نے جناب انور حسین ہاشمی کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا:

''میں قیامِ پاکستان سے قبل مسلم لیگ کے ساتھ رہا اور تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ میں تحریک پاکستان میں مسلم لیگ کے ممبر کے طور پر کام کرتا رہا۔ خاص طور پر اپنے علاقے میں جو ملک خضر حیات خان کا حلقہ تھا میں نے مسلم لیگ کے لیے بڑا کام کیا، وہاں مسلم لیگ کے جلسوں میں میاں ممتاز دولتانہ اور سردار شوکت حیات خاں، غضنفر علی خان، فیروز خان نون جیسے نامور لیڈر شرکت کرتے۔ وہاں اتنے بڑے جلسے اور جلوس ہم نے آرگنائز کیے کہ وہ لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ تحریک پاکستان کے دوران مسلم لیگ کے لیڈر جس انداز میں تقریریں کرتے تھے، میرا کچا ذہن تھا، میں ان کی باتوں

سے بڑا متاثر ہوتا تھا، وہ جس انداز میں پاکستان کا نقشہ کھینچتے تھے ایسے معلوم ہوتا تھا زمین پر ایک جنت بن جائے گی۔ لیکن افسوس کہ جب پاکستان قائم ہوا تو وہی جاگیردار اُس پر قابض ہو گئے۔ قیامِ پاکستان سے قبل انھوں نے جو تقریریں کیں اس کے مقابلے میں ان کا کردار منفی رہا، میں یہ دیکھ کر مسلم لیگ سے مایوس ہو گیا اور پھر مسلم لیگ سے میرا کوئی تعلق نہ رہا۔'' (7)

کٹر مسلم لیگی جناب ایم۔ اے۔ ذکی بعنوان ''دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو'' لکھتے ہیں:

''ہم نوجوان سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی سیاسی جماعت مسلم لیگ پاکستان کے نام سے ایک اسلامی ملک بنانا چاہتی ہے جہاں اسلامی نظام قائم کیا جائے گا، جو دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے جائے پناہ ہوگا، اس مقصد کے لیے ہم نے بھرپور جدوجہد کی۔'' (8)

بزرگ شاعر اور ادیب جناب سرور میواتی اپنی آپ بیتی **اک شکستہ داستان، کچھ شگفتہ تذکرے** میں رقم طراز ہیں:

''پاکستان کے قیام کے لیے مسلم لیگ نے دینِ اسلام کا سہارا لیا تھا۔ مسٹر جناح اور ان کے ساتھی کہتے تھے کہ پاکستان میں مکمل اسلامی شریعت کا نفاذ ہوگا۔ وہاں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کا عہد پھر سے نظر آئے گا۔ مسلم لیگی پاکستان کا مطلب لا الٰہ الا اللّٰہ کو قرار دیتے تھے۔ 1946ء کے الیکشن میں مسلم لیگی ایک طرف گاندھی کی ٹوپی اور دوسری طرف حضرت اقدس و اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دستار مبارک کی شبیہ رکھ کر مسلمانوں سے کہا کرتے تھے کہ مسلمانو! تم ووٹ گاندھی کی ٹوپی کو دو گے یا حضور اکرم کی دستار مبارک کو؟

حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ نے جو ہوشیاری کی، جو چالاکی دکھائی، جو سبز باغ دکھلائے اور جو نعرہ (پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللّٰہ) لگایا اس سب نے مقناطیسی قوت کا کام دیا جس کے نتیجہ میں مسلمانانِ برصغیر یکجا ہو کر مسلم لیگ کی طرف کھنچے چلے گئے۔ ورنہ 1936-37 کے پہلے ملکی انتخابات میں مسلم لیگ نے 498 مسلم نشستوں میں سے صرف 128 نشستیں حاصل کیں، لیکن جب 1946 میں جھوٹ، فریب اور

جھوٹے وعدوں کا سہارا لے کر کلمہ طیبہ کے نام پر الیکشن لڑا تو 498 مسلم نشستوں میں سے 428 نشستیں مسلم لیگ نے جیت لیں اور مرکز کی تیس نشستیں بھی لیگ کے حصے میں آگئیں تھیں۔ دراصل یہ نتائج ثابت کرتے ہیں کہ برصغیر کے مسلمانوں نے ووٹ مسلم لیگ کو نہیں دیے تھے، بلکہ لیگ نے اسلام اور کلمۂ اسلام کے نام پر جو بھیک مانگی تھی، اس کے نتیجے میں مسلمانوں نے مسلم لیگ پر اعتماد کیا تھا۔ لیکن اس سب کے باوجود ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہجرت کریں۔ لیکن مسلم لیگ کی منافرت کی سیاست کے نتیجہ میں حالات ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ ہمیں بہ امر مجبوری وہاں سے نکلنا پڑا۔ لیکن جب ہم اپنا سب کچھ ہندستان میں چھوڑ چھاڑ کر اور بدترین سفری حالات سے دوچار ہو کر پاکستان پہنچے تو دیکھا کہ یہاں تو اسلام کا کوئی معاملہ ہی نہیں، ہم لوگ یہاں اسلام کا علم سربلند دیکھنے کے متمنی تھے، لیکن یہاں تو مسلمان بھی خطرے میں تھے، مسلمانوں کا ایمان بھی خطرے میں تھا۔ یہاں تو شعائرِ اسلام کا کھلے عام مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ یہاں تو برصغیر بھر کے بے دین، بے ایمان، بے اصول اور کرپٹ لوگ تمام چھوٹے بڑے عہدوں پر فائز ہو گئے تھے۔ ہم یہاں اقدار کی تلاش میں آئے تھے، یہاں مقدار کے پجاری نظر آئے۔ یہاں تو ظلم کا دور دورہ تھا۔ امن تو کب کا رخصت ہو چکا تھا۔ لوٹ مار تھی۔ ناجائز الاٹ منٹیں تھیں۔ رشوت ستانی اور بددیانتی تھی۔ یہاں تو ایمانداری، دیانت، صدق مقال وغیرہ قسم کی چیزیں عنقا تھیں۔ بددیانتی، جھوٹ، بدعہدی، ناجائز منافع خوری اور مال کی محبت نے گھر بنالیا تھا۔ ہم دیکھتے اور سوچتے کہ یہ پاکستان ہے یا ناپاکستان۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ ہمیں تصور کی آنکھوں سے پاکستان کا جو ''سبز باغ'' دکھایا گیا تھا اُسے جب حقیقی نظروں سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ تو ''کالا باغ'' تھا۔ یہاں نہ کردار پاک تھا، نہ مقال، نہ قیادت میں سچائی تھی، نہ پیروکار ہی سچ پر چلنے کے لیے تیار تھے۔ جھوٹے کلیم داخل ہو رہے تھے اور جھوٹا حلف نامہ داخل کرنا تو روزمرہ کا معمول تھا۔ کسی کو یہ فکر ہی نہیں تھی کہ جھوٹ بولنا حرام ہے، ناجائز الاٹ منٹ اور لوٹ مار حرام ہے۔ خدا کی قسم ہندستان میں مسلمان ایک دوسرے کے مال کو ناجائز طریقے سے ہڑپ کرنے یا کھانے کو خنزیر کھانے سے بھی

زیادہ برا سمجھتے تھے اور یہاں پاکستان میں آ کر ہم نے دیکھا کہ مسلمانوں میں حلال و حرام کی تمیز ہی ختم ہو گئی ہے، ہم وہاں ہندستان میں رشوت لینے اور دینے کا تصور ہی نہیں رکھتے تھے، لیکن یہاں ہمیں اتنا مجبور کر دیا گیا تھا کہ رشوت دیے بغیر کوئی چارا ہی نہیں تھا۔ یار لوگوں نے رشوت کے پیسے کا نام ہی ''قائداعظم'' رکھ چھوڑا تھا۔ ہم اسے کب تک پاکستان مانتے۔ بس یہ باتیں سوچ سوچ کر کڑھتے رہے اور اپنی یہ حالت بنالی:

خود ہی مثالِ لالۂ صحرا لہو لہو
میں خودفراز اپنے تماشائیوں میں ہوں

یہ بھی حقیقت ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد اشرافیہ کا ایک نیا طبقہ معرضِ وجود میں آیا جسے عرفِ عام میں ''نودولتیے'' کا نام دیا گیا۔ ان ''نودولتیوں'' نے اوّل دن سے ہی ملک میں حرص و ہوس کو ہوا دی، راتوں رات امیر ہونے کے نسخے عام کیے، انھوں نے جھوٹے کلیموں، جھوٹے گواہوں، جھوٹی قسموں اور رشوتوں کے ذریعے بڑی بڑی حویلیاں، بڑے بڑے بنگلے، بڑے بڑے مکانات اور بڑی بڑی جاگیریں الاٹ کرائیں۔ ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی دولت پر ان لوگوں نے ناجائز قبضے کیے، جن پر ان کا کوئی حق نہ تھا۔ اس کے نتیجے میں حرام خور طبقہ امیر سے امیر تر ہو گیا جبکہ غریب غریب تر، بلکہ بے شمار تو بالکل ہی کنگال ہو گئے۔ یہ سب کچھ چونکہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہوا تھا۔ گویا پاکستان کی بنیادوں میں ہوا، آج 45 سال بعد بھی اگر پاکستان کے حالات بدتر سے بدتر ہی ہوئے ہیں تو کوئی تعجب یا پشیمانی کی بات نہیں۔ ایسا ہی ہونا تھا اور ایسا ہی رہنا ہے۔ یہاں میں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ اگر مسلم لیگ اسلام کا نام نہ لیتی، اگر نفاذ و فروغ اسلام کی بات نہ کرتی، اگر مثالی فلاحی ریاست کا لالچ نہ دیتی اور مسلمانوں کو ورغلانے کے لیے علماء کو ساتھ نہ ملاتی تو مسلمان انھیں کبھی ووٹ نہ دیتے کیونکہ مسلمان خوب سمجھتے تھے کہ یہ لوگ اچھے کردار کے نہیں ہیں۔ ان کا ماضی اچھا نہیں ہے۔ ان میں اکثریت غداروں کی ہے، انگریز کے ایجنٹوں کی ہے۔ مسلم لیگ نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اسلام کا نام لیا اور اسلام کو بدنام کیا۔ مسلمان بیچارے اسلامی و فلاحی و جمہوری ریاست کے لالچ میں آ گئے تھے۔

دراصل لالچ بُری بلا ہے۔"(9)

معروف دانشور جناب کے۔ایم۔اعظم اپنے ایک کالم بعنوان "قائداعظم کا پاکستان" میں لکھتے ہیں:

"علی گڑھ کے طالب علم، سیاسی ورکر پنجاب کے دہقانوں کو پاکستان کی طرف مائل کرنے کے لیے زمین پر لکیر کھینچ کر یہ بتاتے تھے کہ مسلم لیگ وہ لیک (لکیر) ہے جس کے ایک طرف مسلمان ہیں تو دوسری طرف ہندو۔ یہ دلیل ہر طبقہ کے لوگوں میں مقبول تھی۔ چنانچہ فرنٹیئر میں ریفرنڈم کے موقع پر پٹھان علماء کو پاکستان کی طرف مائل کرنے کے لیے ایک طرف قرآن کریم اور دوسری طرف کانگریسی ٹوپی رکھ کر یہ کہا گیا کہ آپ ان دونوں میں سے ایک کو چن لیں۔ اس پر پٹھان علماء کے لیے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ قرآن کے سوا کسی اور چیز کی طرف دیکھتے۔"(10)

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مسٹر جناح اور اُن کے رفقاء نے قیامِ پاکستان کے وقت مسلمانوں سے جو وعدے کیے تھے ان میں صداقت نہیں تھی۔ وہ وعدے صرف سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے تھے، ان کا پروگرام اسلامی وفلاحی ریاست قائم کرنے کا تھا ہی نہیں۔ اگر پروگرام ہوتا تو کم از کم جناح صاحب تو اپنے دورِ اقتدار میں اپنے وعدوں کے ایفا کے لیے کوئی عملی قدم اٹھاتے۔ انھوں نے نہ اسلام کے نفاذ کے لیے کوئی کوشش کی اور نہ فلاحی ریاست بنانے کے لیے کوئی سعی فرمائی۔ بعد میں ان کے رفقاء بھی انھی کے نقشِ قدم پر چلے۔ جبکہ یہ بھی ایک بڑی حقیقت ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ کرپشن، لوٹ مار، ناجائز الاٹ منٹیں مسٹر جناح کے دور میں عین ان کی ناک کے نیچے ہوئیں۔ گویا کہ ابتدا ہی بُری ہوئی تھی۔



حوالہ جات

(1) روزنامہ نوائے وقت لاہور/23 اکتوبر 2008ء
(2) ایضاً
(3) ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور/جون 1948ء/ص 136
(4) ماہنامہ روزنامہ نوائے وقت لاہور/23 اکتوبر 2008ء
(5) روزنامہ نوائے وقت لاہور/29 اکتوبر 2010ء
(6) روزنامہ نوائے وقت لاہور/11 اپریل 2010ء
(7) روزنامہ نوائے وقت سنڈے میگزین لاہور/17 جنوری 1999ء/ص 4
(8) روزنامہ نوائے وقت سنڈے میگزین لاہور/19 اکتوبر 2008ء/ص 14
(9) اک شکستہ داستان، کچھ شگفتہ تذکرے/سرور میواتی/ص 44
(10) روزنامہ نوائے وقت لاہور/29 اکتوبر 2010ء

31

پاکستان میں شروع سے اب تک جس قدر بھی مارشل لاء لگے، ان میں مسٹر جناح کے ایک رفیق خاص ضرور شامل رہے اور کسی نہ کسی اہم عہدے پر فائز رہے۔ میری مراد سیّد شریف الدین پیرزادہ ہیں۔ انھوں نے 1968ء میں جب وہ وزیرِ خارجہ تھے، جناب الطاف حسن قریشی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا:

> ''تحریک پاکستان کے پیچھے جو جذبہ کارفرما تھا، وہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا تھا۔ ہندو قائدین اس جذبے سے خوفزدہ تھے۔''(1)

سوال یہ ہے کہ ہمارے قائدین نے اس سلسلہ میں قیامِ پاکستان کے بعد عملاً کیا پیش رفت کی۔ دراصل یہ ایک سیاسی نعرہ تھا جس سے مسلمانوں کو بے وقوف بنایا جا رہا تھا اور ہندوؤں اور سکھوں کو چوکنا اور متحرک کیا جا رہا تھا۔ اصلاً ان کا مقصد محض امریکہ کو اس خطہ میں ایک اڈا مہیا کرنا تھا اور بس۔ اس مقصد میں وہ پوری طرح کامیاب ہوئے۔ مقاصد بُرے تھے اور لیبل اچھائی کا لگا رکھا تھا۔ اب جو نتائج سامنے آئے اور سب کچھ واضح ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ ملک اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بنا ہی نہیں تھا، بلکہ اسلام کو اور مسلمانوں کو پوری دنیا میں بدنام کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔

آج پوری دنیا میں پاکستانیوں کو کوئی اچھا نہیں سمجھتا، سب لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں، انھیں بے عزت کرتے ہیں، ان کی تذلیل کرتے ہیں۔ دراصل پاکستانیوں کے کرتوت ہی ایسے ہیں۔ کون سا ایسا گھناؤنا کام ہے جسے پاکستانی انجام نہیں دیتے؟ باہر کے ممالک میں پاکستانی

31

پاکستان میں شروع سے اب تک جس قدر بھی مارشل لاء لگے، ان میں مسٹر جناح کے ایک رفیق خاص ضرور شامل رہے اور کسی نہ کسی اہم عہدے پر فائز رہے۔ میری مراد سیّد شریف الدین پیرزادہ ہیں۔ انھوں نے 1968ء میں جب وہ وزیر خارجہ تھے، جناب الطاف حسن قریشی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا:

> ''تحریک پاکستان کے پیچھے جو جذبہ کارفرما تھا، وہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا تھا۔ ہندو قائدین اس جذبے سے خوفزدہ تھے۔'' (1)

سوال یہ ہے کہ ہمارے قائدین نے اس سلسلہ میں قیامِ پاکستان کے بعد عملاً کیا پیش رفت کی۔ دراصل یہ ایک سیاسی نعرہ تھا جس سے مسلمانوں کو بے وقوف بنایا جا رہا تھا اور ہندوؤں اور سکھوں کو چوکنا اور متحرک کیا جا رہا تھا۔ اصلاً ان کا مقصد محض امریکہ کو اس خطہ میں ایک اڈا مہیا کرنا تھا اور بس۔ اس مقصد میں وہ پوری طرح کامیاب ہوئے۔ مقاصد بُرے تھے اور لیبل اچھائی کا لگا رکھا تھا۔ اب جو نتائج سامنے آئے اور سب کچھ واضح ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ ملک اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بنا ہی نہیں تھا، بلکہ اسلام کو اور مسلمانوں کو پوری دنیا میں بدنام کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔

آج پوری دنیا میں پاکستانیوں کو کوئی اچھا نہیں سمجھتا، سب لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں، انھیں بے عزت کرتے ہیں، ان کی تذلیل کرتے ہیں۔ دراصل پاکستانیوں کے کرتوت ہی ایسے ہیں۔ کون سا ایسا گھناؤنا کام ہے جسے پاکستانی انجام نہیں دیتے؟ باہر کے ممالک میں پاکستانی

پاسپورٹ کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ پاکستانی وہاں اپنی شناخت اور اپنے پاسپورٹ کو چھپاتے ہیں۔ وہ وہاں پاکستانی کی بجائے ہندستانی کہلانا پسند کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح وہ اس نفرت سے بچ جائیں گے، جو ہر پاکستانی سے کی جاتی ہے۔ بیرون ممالک حتیٰ کہ متحدہ عرب امارات میں بھی پاکستانیوں کی بہ نسبت ہندستانیوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ محترمہ طیبہ ضیاء چیمہ بعنوان ''منموہن سنگھ کا دورہ سعودی عربیہ'' لکھتی ہیں:

''بھارتی اخبارات کی رپورٹ کے مطابق بھارتی وزیراعظم منموہن سنگھ اور ان کے ہمراہ 100ء رکنی وفد کا ریاض پہنچنے پر فقید المثال استقبال کیا گیا۔ منموہن سنگھ کے حالیہ دورہ سعودی عربیہ سے 28 برس پہلے اندرا گاندھی نے سعودی عرب کا دورہ کیا تھا جبکہ 1965ء میں شاہ عبدالعزیز بھارت کا دورہ کر چکے تھے جس کے دوسرے برس پنڈت جواہر لال نہرو نے سعودی عرب کا دورہ کیا۔ یاد رہے کہ شاہ عبداللہ بھی 2006ء میں بھارت کا دورہ کر چکے ہیں۔ وزیراعظم اور ان کے وفد کا قیام شاہ سعود کے محل میں کیا گیا جہاں اب تک کسی بھی بیرونی مہمان کو یہ اعزاز حاصل نہیں ہو سکا۔''(2)

کینیڈا میں مقیم ایک پاکستانی سردار کیناف حسین پاکستان کے ممتاز کالم نگار جناب جاوید چودھری کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''کینیڈا میں رہنے والے پاکستانی ٹیکسی ڈرائیوروں سے جب کوئی پوچھتا ہے کہ ''آپ کہاں سے ہو؟'' تو وہ فوراً کہہ دیتے ہیں ''انڈیا سے!'' کیوں کہ یہاں کینیڈا میں بھارتیوں کی بہت عزت ہے۔''(3)

روزنامہ جنگ لاہور میں ایک خبر بعنوان ''امریکہ نے سب سے زیادہ ورک ویزے بھارتیوں کو جاری کیے۔ بھارت سٹوڈنٹس ویزوں میں تیسرے نمبر پر آ رہا ہے، پاکستان کا خصوصیت سے ذکر نہیں کیا''۔ اس خبر میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ نے ایک سال میں سب سے زیادہ ورک ویزے بھارتی شہریوں کو جاری کیے ہیں اور بھارت ورک ویزا حاصل کرنے والوں میں اوّل نمبر پر رہا۔ اسٹوڈنٹ ویزا حاصل کرنے والوں میں بھارت کی تیسری پوزیشن رہی، بھارت کے مقابلے میں پاکستان کا ذکر ہی نہیں کیا گیا۔(4)

دراصل ہمارے کرتوت اتنے گندے، ہمارا کردار اتنا شرم ناک ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔

روزنامہ جنگ لاہور میں اسلام آباد میں مائیکرو سافٹ کے زیر اہتمام منعقدہ ایک روزہ ورکشاپ کی رپورٹ بعنوان ''پاکستانی رہنما پہلے اپنا حصہ طلب کرتے ہیں۔ پاکستانی عہدے دار ذاتی مفادات کو سامنے رکھ کر بات کرتے ہیں'' شائع ہوئی ہے۔ متن پڑھیے:

''اسلام آباد (خصوصی رپورٹر) انفارمیشن ٹیکنالوجی سیکٹر میں ترقی کی راہ میں بیورو کریٹس اور سیاستدان اصل رکاوٹ ہیں، جب بھی غیر ملکی سرمایہ کاری کے لیے آتے ہیں تو بیورو کریٹس اور حکومتی عہدوں پر فائز سیاسی رہنما ان سے پہلے اپنا حصہ طلب کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بل گیٹس کی سابق صدر جنرل پرویز مشرف اور وزیراعظم شوکت عزیز سے ملاقاتیں کامیاب ثابت نہ ہوئیں۔ ان خیالات کا اظہار مائیکرو سافٹ کے زیر انتظام ایک روزہ ورکشاپ میں مقررین نے کیا جس میں سافٹ ویئر میں جعل سازی اور نقالی کے حوالے سے صحافیوں کو حقائق سے آگاہ کیا گیا۔ مائیکرو سافٹ کے سٹیزن شپ منیجر افضل مرزا نے کہا کہ پاکستان میں عالمی ادارے انفارمیشن ٹیکنالوجی سیکٹر میں بھاری سرمایہ کاری کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں لیکن جب بھی ترقیاتی منصوبوں پر، حکومتی عہدیداروں اور بیورو کریٹس سے تبادلہ خیال کرتے ہیں تو سب سے پہلے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ فنڈ میں سے ان کا کتنا حصہ ہے بعض اوقات کل رقم کا 90 فیصد تک مانگ لیا جاتا ہے جس کی وجہ سے غیر ملکی سرمایہ کار بھاگ جاتے ہیں جبکہ بھارت میں ایسا رجحان نہیں ہے۔ افضل مرزا نے بتایا کہ مائیکرو سافٹ کے سربراہ بل گیٹس نے سابق صدر پرویز مشرف اور سابق وزیراعظم شوکت عزیز سے چین میں ملاقات کی تھی لیکن ان ملاقاتوں پر مزید پیش رفت نہیں ہو سکی تھی کیونکہ پاکستانی عہدیدار ذاتی مفادات کو سامنے رکھ کر بات کرتے تھے۔ مائیکرو سافٹ کے جینوئن سافٹ ویئر منیجر سلمان صدیقی نے ورکشاپ کے شرکاء کو کہا کہ نقالی ایک عالمگیر مسئلہ ہے۔ جس کی وجہ سے 40 ارب ڈالر سالانہ خسارہ ہو رہا ہے۔ پاکستان میں جعل سازی سے تیار ہونے والے سافٹ ویئر کا استعمال وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے جس میں حکومتی اور غیر سرکاری ادارے پیش پیش ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جعلی سافٹ ویئر کے استعمال میں 10 فیصد کمی کر دی جائے تو مجموعی شرح نمو میں 163

ملین ڈالر کا اضافہ ہوسکتا ہے اور حکومتی خزانہ کو 23 ملین ڈالر آمدنی حاصل ہوسکتی ہے۔"(5)

پاکستانیوں کے شرم ناک کارناموں کا ایک اور حوالہ پڑھیے۔ روزنامہ جنگ لاہور میں ایک خبر بعنوان "کھانے پینے کی اشیاء میں ملاوٹ، برآمدی آرڈر ضبط ہوگئے۔ یورپی یونین نے 126 اشیاء کو ملاوٹ زدہ قرار دے کر مال وصول کرنے سے انکار کر دیا" شائع ہوئی ہے۔ خبر کا متن حسب ذیل ہے:

"اسلام آباد (آن لائن) یورپی ممالک نے ملاوٹ اور ناقص کوالٹی کی بنا پر پاکستان کی برآمدی اشیاء کے 126 آرڈر ضبط کر لیے ہیں جبکہ پاکستان میں کھانے پینے کی اشیاء میں ملاوٹ کی مقدار میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، یہ انکشاف وفاقی وزارت خوراک و زراعت نے پارلیمانی کمیٹی برائے خوراک و زراعت کے اجلاس میں پیش کی گئی ایک رپورٹ میں کیا ہے، اس رپورٹ کے مطابق 2004ء سے لے کر اب تک 16 یورپی ممالک 126 بار پاکستانی برآمدات ضبط کر چکے ہیں اور رواں مالی سال میں 24 بار برآمدی اشیاء ضبط کی گئیں، برطانیہ اب تک 56، جرمنی 9، یونان 14، اٹلی 11، ناروے 4، سپین 4، آسٹریا 1، پولینڈ 4، بلجیم 2، ڈنمارک 1، ہالینڈ 3، لتھوانیا 31، جبکہ تائیوان، سوئٹزرلینڈ، سویڈن اور فرانس 1-1 بار پاکستانی ایکسپورٹ کو ضبط کر چکے ہیں۔"(6)

معروف صحافی اور تجزیہ نگار جناب رؤف کلاسرا "جنم جنم کا انتقام" کے عنوان سے میچ فکسنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہمارے اخلاقی دیوالیہ پن کی انتہاء پر آپ غور فرمائیں کہ پورا ملک کرکٹر یاسر حمید پر ناراض ہے کہ اس نے کیونکر یہ انکشاف کیا ہے کہ تقریباً پاکستان کا ہر میچ فکس ہوتا ہے۔ سب کھلاڑی ایک خوفناک مافیا کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ سڈنی ٹیسٹ کو بھی اٹھارہ لاکھ پاؤنڈ میں ان کھلاڑیوں نے بیچ ڈالا تھا۔ میں یاسر حمید کو داد دیتا ہوں۔ ایک ایماندار اور کھرے انسان کو یہی باتیں کرنی چاہییں جو اس نے کی ہیں۔ سچ وقتی طور پر سب کو برا لگتا ہے، لیکن آخر عزت و توقیر اسی بندے کے حصے میں آتی ہے جو محض

تالیاں پیٹنے والوں کو خوش کرنے کے لیے اپنی ایمانداری کا سودا نہ کرے۔ غیرت لابی اب اس بات پر خفا ہے کہ یہ سب کچھ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ کیسے ہمارے یہ کھلاڑی پورے ملک اور قوم کی عزت کا سودا محض اٹھارہ لاکھ پاؤنڈ لے کر کر رہے تھے۔ یاسر حمید پر ہونے والی تنقید سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہم مالی کے علاوہ اخلاقی اور ذہنی طور پر بھی گر چکے ہیں۔ یاسر کو گالیاں دے کر ہم مستقبل میں کسی بھی کھلاڑی کو کرکٹ ٹیم کے ان جواریوں کے خلاف کوئی بھی انکشاف کرنے سے روک رہے ہیں۔ ہم ایک ایسا بیمار معاشرہ بن کر رہ گئے ہیں جو سارا دن خون کی اُلٹیاں کرتا رہتا ہے لیکن ڈاکٹر کے پاس جا کر اس سے علاج کرانے کا حوصلہ اس میں نہیں ہے۔ خوفناک ثبوتوں کی موجودگی کے باوجود ہم غیرت و عزت کے نام پر ہر شے ماننے سے انکاری ہو چکے ہیں۔ ان دس لڑکوں نے ہمیں پوری دنیا کے سامنے ایسے ذلیل کیا ہے کہ مجھے نہیں لگتا کہ ہماری آنے والی نسلیں بھی مہذب قوموں کے سامنے نظر اُٹھا سکیں گی۔ آج سے سو سال بعد بھی یہ کالک ہمارے منہ پر کرکٹ کی تاریخ میں زندہ رہے گی۔ دنیا ہمیں فراڈی سمجھتی ہے اور سمجھتی رہے گی۔ بریڈفورڈ میں پہلے ہی تین سو گوروں نے مظاہرہ کر کے وہاں سے پاکستانیوں کو ملک بدر کرنے کی تحریک شروع کر دی ہے۔ آپ لوگ تسلی رکھیں اگلے آنے والے سالوں میں سارے یورپی ملک وہاں رہنے والے پاکستانیوں کے ساتھ یہی سلوک کریں گے۔ آپ بڑے بڑے اخبارات کے سروے اٹھا کر دیکھ لیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ یورپی اقوام میں اب مسلمانوں اور پاکستانیوں کے خلاف نیگیٹو جذبات تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے ہمیں لندن کے اخبار کا یہ سروے انتہائی بوگس محسوس ہو کہ یورپ میں 63% عوام اب مسلمانوں اور پاکستانیوں کو شہریت دینے کے حق میں نہیں۔ مجھے تو ابھی سے شرم محسوس ہو رہی ہے کہ کس منہ سے جا کر ہیتھرو ایئرپورٹ پر اپنا سبز پاسپورٹ نکال کر امیگریشن افسر کو دکھاؤں۔ اب کی دفعہ گوروں نے بڑا پکا ہاتھ ڈالا ہے کیونکہ انھیں علم تھا کہ پاکستانی ہمیشہ Self state of denial میں زندہ رہتے ہیں۔ آپ پھر بھی ہمیں داد دیں کہ اتنے ویڈیو ثبوتوں کے باوجود بھی ہم لوگ دنیائے کرکٹ سے سوری

کرنے کی بجائے بڑی ڈھٹائی سے نہ صرف اپنے کھلاڑیوں کا دفاع کر رہے ہیں، بلکہ اس میں سے تن من دھن کی بازی لگا کر بھارتی سازش تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔ ہم میں سے کسی کو شرم نہیں آتی کہ محض ان دس کھلاڑیوں کی وجہ سے اس ملک کا امیج کتنے برے طریقے سے تباہ ہوا ہے۔ وہی برطانوی میڈیا اور عوام جو سیلاب میں پھنسے ہوئے پاکستانیوں کے لیے پچھلے ایک ماہ سے بڑے جوش وخروش سے عطیات اکٹھے کر رہے تھے آج وہ ہر وقت ہمارے ان دس شیروں کی شرمناک داستانیں چھاپ اور پڑھ رہے ہیں۔ وہ کیونکر اپنی محنت کی کمائی سے ہمارے دو کروڑ کسانوں اور غریب دیہاتیوں کے لیے عطیات دیں جب انھیں یہ پتا ہے کہ اسی قوم کے کھلاڑی محض دو نو بالز پھینک کر ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈ کما سکتے ہیں یا محض ایک ٹیسٹ ہار کر اٹھارہ لاکھ پاؤنڈ جیبوں میں بھر لیتے ہیں۔ اب پاکستان کے اسی کرکٹ میچوں کی تفتیش ہو رہی ہے جن کے بارے میں شک کیا جا رہا ہے کہ وہ سب بک تھے۔ ہم اور ہمارے بچے احمقوں کی طرح ٹی وی سکرین پر بیٹھے دعائیں مانگ رہے ہوتے تھے اور ہمارے یہ کرپٹ شیر جوان اس میچ کا فیصلہ پہلے ہی لاکھوں پاؤنڈ لے کر کر چکے ہوتے تھے۔ پتا نہیں اس ملک اور قوم سے کون کون اپنے کس کس جنم کا بدلہ لے رہا ہے!''(7)

ہم سے کوئی بدلہ نہیں لے رہا، یہ سب ہمارے اعمالِ بد کی سزا ہمیں مل رہی ہے۔ 1947ء سے پہلے تحریکِ آزادیِ برصغیر کے دوران ہمارے قائدین نے بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے نام نہاد اسلامی فلاحی جمہوری ریاست کے قیام کے لیے تحریک کا رُخ تلا، گویا تحریکِ آزادی کو ہائی جیک کیا۔ اس دوران تحریکِ آزادی کے جو حقیقی ہیروز تھے، جو رہنما تھے، جن کی بے پناہ قربانیاں تھیں، جنھوں نے سزائیں بھگتی تھیں، جائیدادیں ضبط کرائی تھیں، جیلیں کاٹی تھیں، مسٹر جناح، ان کے رفقا (کھوٹے سکوں) اور ان کے عوام نے انھیں غدار کہہ کر بدنام کرنے کی کوششیں کیں، انھیں بے عزت کیا، ان پر شرابیں پھینکیں، ان پر تھوکا، ان کی پگڑیوں اور ٹوپیوں کو پاؤں تلے روندا، ان کے سامنے ننگے ہو کر رقص کیا، ان پر تشدد کیا۔ دراصل ایسا کر کے وہ اپنے ہی منہ پر کالک مَل رہے تھے اور اپنی ہی دنیا اور آخرت خراب کر رہے تھے۔۔ اگست 1947ء سے لے کر آج تک جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے وہ ہمارے بڑوں کے اعمالِ بد کی سزا ہے جو ہمیں مل رہی ہے۔ آج جو پوری

دنیا میں ہم ذلیل و رسوا ہو کر رہ گئے ہیں۔ کسی حوالے سے بھی ہماری عزت نہیں ہے۔ پوری دنیا ہم پر لعنت ملامت کر رہی ہے۔ آج ایئر پورٹوں پر ہمارے ساتھ جو کچھ کیا جاتا ہے اور ہمارے ہی ساتھ کیا جاتا ہے، کیا یہ ہمارے لیے ڈوب مرنے کا مقام نہیں ہے؟ مسلم لیگی سینیٹر جناب ظفر علی شاہ نے میر خلیل الرحمٰن میموریل سوسائٹی (جنگ گروپ آف نیوز پیپرز) اور تعمیر پاکستان پارٹی کے زیرِ اہتمام ''پاکستان کا حق کون ادا کرے گا؟'' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''کسی بھی ملک میں جائیں اور اپنی پہچان بتائیں تو امیگریشن والے الگ کر کے کپڑے اتار کر چیک کرتے ہیں، اس سے زیادہ شرمناک کیا ہوگا۔''(8)

پاکستان کے عظیم سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے اہلِ پاکستان کی بے غیرتی پر ''بے غیرتی'' کے عنوان سے ہی دو کالم لکھے ہیں۔ کالم نہیں لکھے بلکہ اس غیرت وحمیت اور شرم وحیا پر ماتم کیا ہے، نوحہ پڑھا ہے، جو کب کی پاکستانیوں کے دلوں سے رخصت ہو چکی ہیں، وہ اپنے دوسرے کالم میں لکھتے ہیں:

''اپنے ایک پچھلے کالم میں (7 اکتوبر 2009ء) غیرت پر میں نے کچھ تبصرہ کیا تھا اور کچھ مثالیں بھی پیش کی تھیں۔ اس سے ایک بہت اچھا مفید مباحثہ شروع ہو گیا اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس ناپید جنس سے اب بھی کچھ لوگ واقف ہیں۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ کچھ غیور یعنی غیرت مند لوگ تو اس مضمون سے بہت خوش ہوئے کہ میں نے وقت کی ایک اہم ضرورت کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے لیکن بعض دوسری طرف کے لوگ ''چور کی ڈاڑھی میں تنکا'' کی ضرب المثل کے مصداق بہت برہم ہوئے اور غیر منطقی تشریحات دینے لگے۔ آپ کو میں نے بتلایا تھا کہ کس طرح غیور عربی شاعر عمرو بن کلثوم نے اپنی ماں کی ہتک عزت کا بدلہ حکمران وقت عمرو بن ہند کا سر قلم کر کے لیا تھا۔ موجودہ دور میں اس کی ایک مثال سب سے نمایاں ہندستان سے تعلق رکھنے والے مزدوروں کے ویلفیئر رہنما اور سابق وزیر دفاع جناب جارج فرنانڈس کی ہے۔ جب وہ سرکاری دورہ پر امریکہ گئے تو وہاں سیکورٹی والوں نے ان کی جامہ تلاشی لینا چاہی تو انھوں نے ان کو للکار کر دور کر دیا، واپس جہاز پر گئے اور ہندستان واپس آ گئے۔

ہندستانی حکومت نے حکم دے دیا جو بھی امریکن، خواہ وہ سفیر ہو، کوئی افسر ہو، سابق صدر ہو، آئندہ جب ہندستان آئے تو اس کی جامہ تلاشی لی جائے اور جوتے اتروائے جائیں۔ چند دن بعد سابق صدر کلنٹن آنے والا تھا، امریکن بہت گھبرائے اور ہندستان سے اس ''غلطی'' پر تحریری طور پر معافی مانگی اور آئندہ ایسی حرکت نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ اس کے برعکس ہم سب نے امریکہ کے ایک ایئرپورٹ پر اپنے سینئر وزیر (مشیر) شریف الدین پیرزادہ اور اس کے وفد کے ارکان کو ٹوپیاں، جوتے اتارتے دیکھا اور جیبیں خالی کرتے اور مجرموں کی طرح ہوا میں ہاتھ اٹھائے جامہ تلاشی کراتے دیکھا۔

سب سے دردناک اور ناقابل فراموش بے غیرتی کا مظاہرہ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی نے 16 دسمبر 1971ء کو ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں جنرل اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈال کر کیا تھا۔ یہ دھبہ اتنا بدنما ہے جو ہماری تاریخ کے صفحات سے کبھی بھی نہ دھویا جا سکے گا۔

غیرت مند قوموں کے کردار کو دیکھنا ہو تو ایران، شمالی کوریا، وینزویلا کو دیکھو اور اگر بے غیرتی کی مثالیں تلاش کرنا چاہتے ہو تو دور جانے کی ضرورت نہیں، ہمارے باقی اسلامی ممالک کی سابقہ اور موجودہ تاریخ اس سے پُر ہے۔ مشرف کا امریکنوں کے ایک فون پر لیٹ جانا، دور حاضر کی بدترین بے غیرتی کی ایک مثال ہے جو ہمارے لیے باعث شرم اور عبرت ہے۔

انسان کے اخلاقی کردار کے دو پہلو ایسے ہیں جن کا بے غیرتی سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ ہیں منافقت اور بے حیائی۔ منافقت یعنی قول و عمل میں تضاد، کھلے عام دیدہ دلیری سے جھوٹ بولنا، جھوٹے وعدے کرنا، اپنے پر بھروسہ کرنے والوں کو دھوکا دینا، یہ سب بے حیائی، منافقت اور بے غیرتی کی بدترین مثالیں ہیں۔ حیا غیرت سے بھی اعلیٰ ایک شریفانہ جذبہ ہے جو انسانی شرافت کی روح ہے۔ جب حیا رخصت ہو جائے تو ایسی ہی کیفیت ہو جاتی ہے جیسے کسی دوڑتی ہوئی گاڑی کا ٹائی روڈ کھل جائے اس کے بعد گاڑی کسی بھی سمت میں جا کر ٹکرا سکتی ہے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: ''جب تم میں حیاء باقی نہ رہے تو پھر جو جی چاہے کرو۔''

ہمارے ہاں بے حیائی اور بے غیرتی کا یہ سلسلہ ایوب خان کے دور سے شروع ہوا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس نے ہمارے معاشرے میں جڑ پکڑ لی اور رفتہ رفتہ بے حد توانائی حاصل کر لی اور موجودہ دور میں تو یہ علت اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ مشرف نے ٹی وی پر وعدہ کیا تھا کہ وہ دسمبر 2004ء میں فوجی وردی اتار دے گا مگر وہ اس سے مکر گیا۔ یوں اس نے بے غیرتی کا بہت بڑا ثبوت دیا۔ کچھ اسی قسم کے واقعات موجودہ دور میں بھی بار بار نظر آئے ہیں، افسوس یہ ہے کہ وہ زبان جس پر اللہ کا نام آتا ہے، جس سے ہم کلمہ پڑھتے ہیں، جس زبان سے اللہ سے دعا مانگی جاتی ہے، اسی زبان کو بے غیرتی کے اظہار کے لیے استعمال کرنے میں قطعی شرم نہیں آتی۔ حیاء کے لفظی معنی تو شرم و غیرت کے ہیں مگر حقیقت میں اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ہر وہ عمل جو بے حیائی اور بے غیرتی کے زمرہ میں آتا ہے وہ حیاء کے سنہری اصول کی نفی اور ضد ہوتا ہے، حیاء اسلامی شخصیت کا اتنا لازمی جز ہے کہ حدیث نبویؐ ہے، ''حیاء جز ایمان ہے''۔

پچھلے تقریباً پانچ سال سے میں نہایت سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں کہ بے غیرتی کی یہ لعنت کس طرح ہماری قوم میں، خاص کر لیڈروں میں، تاجروں میں، اساتذہ کے خون میں سرایت کر گئی ہے۔ آپ نیچے سے اوپر کی جانب چلیں تو اس میں آپ کو اضافہ ہی ہوتا نظر آئے گا اور یہ محسوس ہوگا کہ دن بدن یہ لعنت پھیلتی ہی جا رہی ہے۔

آیئے آپ کو کلام الٰہی کی جانب متوجہ کرتا ہوں کہ اس نے ایسے لوگوں اور اقوام کے لیے کیا تنبیہ کی ہے۔ سورۃ ہود، آیت: 95 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اور یہ وہی عاد ہیں، جنھوں نے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے انکار کیا اور اس کے پیغمبروں کی نافرمانی کی اور ہر سرکش و متکبر کے احکام کی تعمیل کی۔'' اس طرح انھوں نے ہر متکبر، سرکش (اور بے غیرت) حکمران کے احکام کی تعمیل کی اور جہنم کے مستحق ہوئے۔ سورۃ بنی اسرائیل، آیت: 61 میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اور جب ہمارا ارادہ کسی بستی کے ہلاک کرنے کا ہوتا ہے تو ہم وہاں کے صاحب اقتدار، امیر لوگوں کو اللہ کے احکام کی کھلم کھلا نافرمانی

کے راستوں پر چلنے دیتے ہیں اور وہ نافرمانیاں (گناہ) کرتے رہتے ہیں اور پھر اس بستی پر عذاب کا حکم نازل ہو جاتا ہے اور ہم اس کو ہلاک کر ڈالتے ہیں۔'' یہاں اللہ تعالیٰ گنہگار، ظالم، بے غیرت حکمرانوں کو مہلت دینے کی بات کر رہا ہے اور پھر ان کے پیچھے چلنے کی پاداش میں سب کو عبرتناک سزا دینے کی۔ اور سورۃ انعام، آیت: 123 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اور اسی طرح ہم نے ہر بستی (قوم) میں اس بستی (قوم) کے بڑے بڑے (صاحب اقتدار) مجرمین بنا دیے ہیں تاکہ وہ وہاں اپنے مکر وفریب کا جال پھیلاتے رہیں۔ حالانکہ وہ اپنے فریب کے جال میں خود ہی پھنستے ہیں مگر وہ اس بات کو سمجھتے نہیں۔''

بدقسمتی سے موجودہ دور میں صاحبان اقتدار کی ایک بڑی اکثریت میں وہ تمام خرابیاں گھر کر گئی ہیں جن کو آپ صرف ایک لفظ بے غیرتی سے بیان کر سکتے ہیں۔

آخر میں ذرا غور فرمایئے کہ ایک شعر جواب ایک ضرب المثل بن گیا ہے، علامہ اقبال نے کہا تو تیموری خاندان کے بارے میں تھا، مگر کیا یہ آج ان تیموریوں سے زیادہ ہم پاکستانیوں پر صادق نہیں آتا؟ جب ملک وقوم کی موجودہ حالت دیکھتا ہوں تو علامہ اقبال کی غلام قادر رہیلہ نامی نظم کا وہ شعر بار بار یاد آتا ہے۔ علامہ اقبال سے معذرت کے ساتھ کچھ ردوبدل کر کے وہ شعر حاضر خدمت ہے:

مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا، گئی اس قوم کے دل سے

معذرت: (اصل مصرعہ ہے ''حمیت نام تھا جس کا، گئی تیمور کے گھر سے۔'')(9)

ممالک غیر میں پاکستان کو کس نگاہ سے دیکھا جاتا ہے وہ ہمیں روزنامہ نوائے وقت لاہور کے ممتاز فوجی تجزیہ نگار جناب سکندر خاں بلوچ بتاتے ہیں۔ وہ اپنے مستقل کالم ''ضرب سکندری'' میں بعنوان ''خبردار! آگے پاکستان ہے'' لکھتے ہیں:

''باہر سے کوئی آدمی پاکستان آنے کو تیار نہیں۔ تمام مغربی ممالک نے اپنے لوگوں کو پاکستان آنے سے سختی سے منع کر دیا ہے۔ مغربی ممالک کی طرف سے ایک ایسی وارننگ درج ذیل ہے:

''تمام عوام کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ اگر آپ پاکستان جانے کا سوچ رہے ہیں تو دوبارہ سوچیں، کوشش کریں کہ پاکستان نہ جائیں، لیکن اگر پھر بھی مجبوری ہو تو اپنی حفاظت کا پہلے سے بندوبست کر لیں۔ پاکستان کے تمام علاقوں میں سفر سخت خطرناک ہے۔ حفاظت کی گارنٹی حکومت بھی نہیں دے سکتی کیونکہ حکومتی ادارے، سیکورٹی اہلکار، پولیس اور فوج تک کچھ بھی محفوظ نہیں۔ آپ کو مزید ہدایت کی جاتی ہے کہ اپنے پاسپورٹ، بینک کارڈ، بیگز، جیولری، لیپ ٹاپ، موبائل فونز اور نقدی وغیرہ کی خصوصی حفاظت کریں۔ جعلی پاسپورٹس، کریڈٹ کارڈز اور ہر قسم کے جعلی ڈاکومنٹس کی بلیک مارکیٹ عام ہے۔ ہر مقام پر ہر قسم کا فراڈ رواج بن چکا ہے۔ کریمنل تشدد، سٹریٹ کرائمز، مسلح ڈکیتیاں، کار چوری، کاریں چھیننا، اغوا، ٹارگٹ کلنگ، ڈرگ اور انسانی ٹریفکنگ عام ہیں، اس لیے اپنے سفارتخانہ کے اردگرد، بازار، پرہجوم جگہ، ریسٹورنٹ، شاپنگ سنٹرز، مسجدوں، مزاروں، تاریخی مقامات، مذہبی جلوسوں اور تفریحی مقامات کے نزدیک نہ جائیں۔''

نیچے کسی منچلے نے ان ہدایات میں مزید اضافہ کر دیا ہے:

خبردار! آگے پاکستان ہے۔ اپنی ذمہ داری پر داخل ہوں۔''(10)

ہم اس باب کو پاکستان مسلم لیگ کے صدر، سابق وزیر اعظم پاکستان جناب میاں محمد نواز شریف کے ایک اخباری بیان پر ختم کرتے ہیں، جسے اخبار نے ایک چوکھٹے میں نمایاں کر کے بعنوان ''کیا یہ سچ نہیں'' شائع کیا ہے۔ پہلے میاں صاحب کے بیان کی سرخیاں ملاحظہ فرمائیں، بعد میں متن پڑھیں: ''سبز پاسپورٹ بیشتر ممالک میں اپنی عزت کھو بیٹھا، ہم تنہائی کا شکار ہوتے جا رہے ہیں'' ''ایٹمی قوت ہونے کے باوجود ہماری حالت یہ ہو گئی ہے کہ ہر کوئی ہمیں دھمکیاں دے رہا ہے'' ''دنیا ہمیں دہشتگردوں کی پرورش اور برآمد کرنے والا ملک سمجھنے لگی'':

''اسلام آباد (خصوصی نامہ نگار) مسلم لیگ ن کے سربراہ میاں محمد نواز شریف نے پریس کانفرنس کے دوران کہا کہ کیا یہ سچ نہیں کہ ساری دنیا میں ہمیں Image کا مسئلہ درپیش ہے؟ کیا یہ سچ نہیں کہ دنیا کے بیشتر ممالک میں سبز پاسپورٹ اپنی عزت کھو بیٹھا ہے؟ کیا یہ سچ نہیں کہ ہم تنہائی کا شکار ہوتے جا رہے ہیں؟ کیا یہ سچ نہیں کہ

ہمارا کشمیر کیس کمزور پڑ گیا ہے؟ کیا یہ سچ نہیں کہ دنیا ہماری قربانیوں کے باوجود ہمیں شک کی نظر سے دیکھتی ہے؟ کیا ایٹمی قوت ہونے کے باوجود ہماری یہ حالت نہیں ہو گئی کہ ہر کوئی ہمیں دھمکیاں دے رہا ہے؟ کیا آج کی صورتِ حال 1971ء کے دنوں کا نقشہ پیش نہیں کر رہی؟ کیا یہ سچ نہیں کہ اس غیرت مند قوم کو کاری قوم بنا دیا گیا ہے؟ کیا یہ سچ نہیں کہ دنیا ہمیں دہشت گردوں کی پرورش کرنے اور دہشت گردی برآمد کرنے والا ملک سمجھنے لگی ہے؟ کیا یہ سچ نہیں کہ دنیا میں ہونے والی ہر واردات کا کھرا ہمارے گھر تک آتا ہے؟ انھوں نے کہا کہ اگر ہم ان سوالوں کا جواب چاہتے ہیں تو پھر ہمیں لیپا پوتی کرنے، اپنے آپ کو فریب دینے اور دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے بجائے پوری سنجیدگی کے ساتھ، اپنی پوری تاریخ کو سامنے رکھتے ہوئے، ایبٹ آباد کے افسوسناک واقعے کی مکمل چھان بین اور تحقیقات کرنا ہوگی۔ خود اپنے گریبان میں جھانکنے کا حوصلہ نہ ہوا تو دوسروں کا ہاتھ ہمارے گریبان پر ہوگا۔ کسی ادارے کے بارے میں تحقیقات سے وہ ادارہ کمزور نہیں، مضبوط اور توانا ہوتا ہے۔"(11)



حوالہ جات

(1) ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ لاہور/ مئی 1968ء/ ص 17
(2) روزنامہ نوائے وقت لاہور/ 3 مارچ 2010ء/ ص 2
(3) روزنامہ ایکسپریس لاہور/ 3 جولائی 2005ء
(4) روزنامہ جنگ لاہور/ 27 اکتوبر 2010ء
(5) روزنامہ جنگ لاہور/ 7 لاہور 2008ء
(6) روزنامہ جنگ لاہور/ 5 جون 2010ء
(7) روزنامہ جنگ لاہور/ 9 ستمبر 2010ء
(8) روزنامہ جنگ لاہور/ 14 دسمبر 2010ء
(9) روزنامہ جنگ لاہور/ 2 دسمبر 2009ء
(10) روزنامہ نوائے وقت لاہور/ 25 جنوری 2012ء
(11) روزنامہ جنگ راولپنڈی/ 12 مئی 2011ء

32

اس دور کے جو مخلص رہنما تھے، جنھیں اللہ تعالیٰ نے بصیرت و فراست سے نوازا تھا۔ انھوں نے جو خدشات ظاہر کیے تھے، آنے والے دور کی جو تصویر کشی کی تھی اور جو پیشین گوئیاں کی تھیں وہ سب حرف بہ حرف درست ثابت ہوئیں۔ ان کے خدشات کا اور ان کی پیشین گوئیوں کا درست ثابت ہونا آج مسلم لیگی بھی تسلیم کر رہے ہیں۔ علماء نے کہا تھا کہ مسٹر جناح اور اُن کے حواری مسلمانوں کو انگریزوں اور ہندوؤں سے آزادی نہیں دلا رہے، بلکہ وہ مسلمانوں کو بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے برطانیہ کی غلامی سے امریکہ کی غلامی میں دینے کے پروگرام پر کام کر رہے ہیں۔ ان کا کردار ایک بروکر کا سا ہے۔ مسٹر جناح کی سیاستِ بد کے نتائج و عواقب آج سب کے سامنے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستان کو شروع میں ہی برطانیہ اور امریکہ کے ان بہی خواہوں نے امریکہ کی گود میں ڈال دیا تھا۔ آج پاکستان مکمل طور پر امریکہ کی گرفت میں ہے۔ پاکستانی عوام غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پاکستان میں سب کچھ امریکہ کی خواہش اور مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔

پاکستان پر امریکہ کس قدر مسلط اور حاوی ہو چکا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جنرل پرویز مشرف نے بلوچستان کے قصبہ والبندین سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر قائم شمسی ایئر بیس امریکہ کے حوالے کر دیا تھا، جہاں سے امریکہ پاکستان کے قبائلی علاقوں میں حملے کے لیے اپنے جاسوسی طیارے اور ڈرونز اُڑا تا رہا ہے۔ 29 جون (2011ء) کو پاکستان کے وزیر دفاع جناب چودھری احمد مختار نے کہا کہ "امریکہ کو شمسی ایئر بیس خالی کرنے کا کہہ دیا ہے۔" انھوں

نے اپنے اس بیان میں یہ بھی کہا تھا کہ ''پاکستان جدید ہتھیاروں کے حوالے سے بھارت کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ پاکستان کے پاس بھارت سے 45 روز تک جنگ لڑنے کی صلاحیت بھی نہیں ہے۔'' اگلے روز اس حوالے سے ایک متعلقہ امریکی عہدے دار نے بہت رعونت آمیز لہجے میں کہا کہ ''شمسی ایئربیس خالی کرنے کے لیے ہمیں نہ کسی نے کہا ہے اور نہ ہم خالی کریں گے۔'' اس سے اگلے روز وفاقی وزیر اطلاعات محترمہ ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان کا ایک بیان اخبارات میں شائع ہوا جس میں انھوں نے یہ کہ کر امریکی عہدے دار کے بیان کی تصدیق کی کہ ''امریکہ سے شمسی ایئر بیس واپس لینے کی باتیں صرف بیانات ہیں، عملی پیش رفت نہیں ہوئی۔'' امریکی عہدے دار کے بیان اور وفاقی وزیر اطلاعات کی طرف سے تائید نے پاکستانیوں کو چونکا کر رکھ دیا۔ انھیں معلوم ہوا کہ امریکہ پاکستان میں اس قدر تسلط جما چکا ہے کہ وہ اب کسی معاملے کو خفیہ رکھنا بھی مناسب نہیں سمجھ رہا۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ جناب میاں محمد شہباز شریف نے 2 جولائی کو نظریہ پاکستان ٹرسٹ لاہور کے زیر اہتمام الحمرا ہال میں منعقدہ پاکستان پائندہ باد کانفرنس سے خطاب کیا جو روزنامہ نوائے وقت میں بعنوان ''شمسی ایئربیس خالی نہ کرنے کی دھمکی پوری قوم کے منہ پر طمانچہ ہے'' شائع ہوا جس میں انھوں نے کہا:

> ''وقت آ گیا ہے کہ ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم نے عزت کی موت قبول کرنی ہے یا ذلت کی زندگی۔ سبز ڈالروں کا لفافہ جیب میں ڈال کر ڈکٹیشن کا لفافہ واپس نہیں لوٹایا جاتا ہم نے پنجاب سے عزت و وقار کا سودا کرنے والی اغیار کی امداد سے جان چھڑانے کے عمل کا آغاز کر دیا تھا۔ یہ سمجھتے تھے کہ یہ قومی سطح پر قومی خودمختاری کی منزل پر پہنچنے کا پہلا قدم ثابت ہوگا لیکن بدقسمتی سے آج ارباب اقتدار وہ ہیں جنھیں نہ اپنی عزت کا کوئی پاس ہے اور نہ قوم کی عزت کا۔ ان کی عقل پر ماتم کرنے کو دل چاہتا ہے یہ لوگ خدا اور عوام کو چھوڑ کر اپنی امیدوں کا محور کہیں اور تلاش کرتے ہیں۔ ہمارا فیصلہ ہے کہ گردن کٹا لیں گے، غیرت و توقیر پر حرف آنے والی امداد نہیں لیں گے۔ کیونکہ بھیک کی افیون نے آج ملک کو اس نہج پر پہنچا دیا ہے کہ آج پاکستان کو دھمکی دی جاتی ہے کہ شمسی ایئربیس خالی نہیں کریں گے، امریکہ کا یہ انکار پوری قوم کے منہ پر طمانچہ ہے۔ اس سے بڑھ کر ذلت و رسوائی کا سامان نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے کہا، اغیار کی اس دھمکی کو

اپنی دھرتی میں دفن نہ کیا تو تاریخ میں ہمارا نام لینے والا کوئی نہ ہوگا۔ یہ ہماری بدقسمتی نہیں کہ ہماری فضاؤں کو محکوم بنانے کا عمل ہوتا ہے اور قوم کا صدر اغیار کو مبارکبادوں کے خطوط لکھتا ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر دنیا میں پاکستان کی جگ ہنسائی اور مذاق ہوسکتا تھا۔ پوری قوم آپریشن ایبٹ آباد پر زخموں سے چور چور اور مغموم تھی۔ خوف کے سائے ملک و قوم پر منڈلا رہے تھے، ملک کا صدر مبارکبادیں دیتا اور اسے عظیم فتح قرار دیتا نظر آ رہا تھا۔ آج اگر ہم عزم و حوصلہ اور مضبوط ارادوں کے ساتھ قومی سلامتی اور خود مختاری کا عزم ظاہر نہیں کریں گے تو پھر ہمارے ساتھ خیمے اور اونٹ والی کہانی دہرائی جا سکتی ہے۔ شہباز شریف نے شمسی ایئربیس خالی نہ کرانے کی امریکی ڈکٹیشن کو لمحہ فکریہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ لہجہ اور تحکمانہ انداز کیا یہ نہیں بتاتا کہ وہ یہ کہ رہے ہیں کہ ہمیں سے لے کر کھاتے اور ہمیں ہی گھورتے ہو، ''ہماری بلی اور ہمیں سے میاؤں'' انھوں نے کہا کہ ڈالروں کی امدادوں نے ہمیں چپ لگا رکھی ہے، ہمیں جینے کے قابل نہیں چھوڑا گیا، آخر کیوں جواب نہیں دیا جاتا کہ یہ طرزِ عمل ہماری آزادی خودمختاری پر اثر انداز ہونے کے مترادف ہے۔ انھوں نے کرپشن کے رجحانات پر شدید تنقید کرتے ہوئے کہا کہ سیاستدانوں، عدلیہ سمیت عام اداروں میں کرپشن نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ آج کا پاکستان اپنی تاریخ کے جس نازک موڑ سے گزر رہا ہے اس کی سنگینی وضاحت کی محتاج نہیں۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد شاید ہی کبھی اہلِ پاکستان کو ایسے دلگداز اور حوصلہ شکن حالات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں دیانتداری سے سمجھتا ہوں کہ اگر ہم نے پاکستان کو قوموں کی صفت میں باوقار مقام دلانا ہے تو ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہماری 63 سالہ فردِ عمل میں ہماری غلطیوں کی تعداد ہمارے صائب فیصلوں اور درست اقدامات کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ہماری کامیابیاں محدود اور ہماری ناکامیوں کی داستان طویل تر ہے۔ میں قنوطیت کا سوداگر نہیں ہوں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہماری روایت میں مایوسی کو کفر قرار دیا گیا ہے، لیکن آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ غلطیوں کا اعتراف کیے بغیر ان کی اصلاح کا کوئی خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ آج وقت آ

گیا ہے کہ ہمیں اپنی ناکامیوں اور شکستوں کو تسلیم کر کے ان کی وجوہات اور اسباب پر کھلے دل و دماغ سے غور کرنا ہوگا۔ آج ہمیں اپنی قومی زندگی سے متعلق بعض اہم سوالات کا جواب دینا ہوگا۔ آخر کیا وجہ تھی کہ جمہوریت کے نام پر بننے والا پاکستان اپنی تاریخ کے پہلے 60 برسوں میں سے 23 برس تک فوجی ڈکٹیٹروں اور آمروں کی خواہشات کی چراگاہ بنا رہا۔ وہ کیا عوامل اور اسباب ہیں جنھوں نے ہماری قومی غیرت اور ملکی خودمختاری کو اغیار کے ہاتھوں میں کھلونا بنا کر رکھ دیا ہے۔ وہ کون سی پالیسیاں اور اقدامات تھے جن کے نتیجے میں وطن عزیز کے تمام وسائل آبادی کے ایک محدود ترین طبقے یعنی نام نہاد اشرافیہ کے لیے شیر مادر کا درجہ اختیار کر چکے ہیں اور زندگی کی بنیادی نعمتوں سے محروم پاکستان کے 90 فیصد عوام کے لیے جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنا روز بروز مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ ہیں وہ چبھتے ہوئے سوالات جن کا آج ہم سب کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر جواب تلاش کرنا ہے۔ آج ہم نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم نہ صرف اپنی ماضی کی غلطیوں کو تسلیم کریں گے بلکہ خود سے، اپنے خدا سے اور عوام سے وعدہ کریں گے کہ ہم اپنے حکمرانوں کو، اپنے پالیسی سازوں اور اپنے ناخداؤں کو کسی صورت میں ان غلطیوں کو دُہرانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ آج پاکستان جس صورتِ حال سے دوچار ہے اس کی ذمہ داری کسی ایک طبقے پر عائد کرنا انتہائی نامناسب ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ حالات کے بگاڑ میں سیاستدانوں کی غلطیوں اور نااہلیوں سے صرفِ نظر کرنا حقائق سے روگردانی کرنے کے مترادف ہے۔ لیکن مجھے کہنے دیجیے کہ آج پاکستان کے وجود کو لاحق بیشتر بیماریوں اور امراض کا باعث شخصی آمریت کا وہ ناسور ہے جو ہمارے قومی وجود پر وقفے وقفے کے ساتھ حملہ آور ہوتا رہا ہے۔ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ اگر سابق ڈکٹیٹر مشرف میں اس غیرت اور حمیت کا ایک فیصد حصہ بھی موجود ہوتا جس کا مظاہرہ مسلم لیگ (ن) کے قائد محمد نواز شریف نے ایٹمی دھماکوں کے موقع پر امریکی صدر کے ٹیلیفونوں کے جواب میں کیا تھا تو آج پاکستان کو ریمنڈ ڈیوس اور سانحہ ایبٹ آباد جیسے شرمناک واقعات کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔''(1)

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد مسٹر جناح ہی وہ شخص تھے جنھوں نے امریکہ کی طرف ''دوستی'' کا ہاتھ بڑھانے میں پہل کی۔ یہ دراصل دوستی کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ بدترین اقتصادی غلامی کے لیے خود کو پیش کرنا تھا۔ اس موضوع پر میں اپنی اس کتاب میں کافی لکھ چکا ہوں لیکن یہاں دو حوالے پیش خدمت ہیں۔ پاکستان کے معروف دانشور اور تجزیہ نگار جناب روئیداد خاں نوائے وقت گروپ آف پبلی کیشنز کے ہفت روزہ فیملی میگزین لاہور میں لکھتے ہیں:

''یادش بخیر! یکم مئی 1947ء کو قائداعظمؒ سے ان کی بمبئی (موجودہ ممبئی) کی رہائش گاہ پر دو امریکی شہریوں نے ملاقات کی تھی۔ ان میں سے ایک امریکی محکمہ خارجہ کے جنوبی ایشیائی ونگ، کے سربراہ ریمنڈ اے ہیر اور دوسرے بھارت میں امریکی ایمبیسی کے سیکرٹری تھے۔ اس موقع پر قائداعظمؒ نے کہا تھا کہ ''نئی آزاد اور خودمختار ریاست امریکی مفادات کو ساتھ لے کر چلے گی۔ پاکستان ایک مسلمان ملک کے طور پر سوویت یونین کی جارحیت کے خلاف ہوگا۔'' یہ امریکا کے ساتھ ہمارے رومانس کا آغاز تھا۔''(2)

ممتاز دانشور، ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ لاہور کے مدیر جناب الطاف حسن قریشی اپنے ایک حالیہ کالم بعنوان ''حیرت انگیز حقائق'' میں لکھتے ہیں:

''امریکہ نے بلاشبہ دوسری جنگ عظیم کے بعد محکوم قوموں کو آزادی دلانے اور انسانی مساوات، جمہوری اقدار اور بنیادی حقوق کو فروغ دینے میں قابلِ تحسین کام کیا ہے، لیکن اس اعتبار سے بڑا بدقسمت ہے کہ وہ غیر ملکی عوام کے دل نہیں جیت سکا۔ پاکستان ہی میں دیکھ لیجیے کہ روسی نظریات کے دم بھرنے والے دانشوروں اور اسلام کو ہدفِ تنقید بنانے والے کاغذی سورماؤں اور مفاد پرست سیاست دانوں کے سوا سبھی لوگ امریکہ بہادر سے شدید نفرت کرتے ہیں۔

قائداعظم نے ایک بہت بڑے مدبر کی حیثیت سے دونوں ملکوں کے باہمی رشتے کے بارے میں ایک چشم کشا بیان دیا تھا جسے امریکی میگزین لائف نے نوٹ کیا تھا کہ پاکستان کو جتنی امریکہ کی ضرورت ہے، اُس سے کہیں زیادہ امریکہ کو پاکستان کی ضرورت ہے کہ وہ محل وقوع کے لحاظ سے دنیا کا مرکز ہے۔ اس حقیقت پسند تجزیے کی بنیاد پر دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات کے رشتے قائم ہوئے۔

پاکستان کو بھارت کی ریشہ دوانیوں سے نمٹنے اور معاشی استحکام کے لیے امریکہ کی ضرورت تھی، چنانچہ قائداعظم نے اپنے خصوصی نمائندے کے طور پر حیدرآباد دکن کے میر لائق علی کو امریکہ روانہ کیا اور پانچ سال پر محیط دو ارب ڈالر امریکی امداد کے لیے باضابطہ درخواست کی جو مسترد کر دی گئی اور صرف 10 ملین ڈالر مہاجرین ریلیف فنڈ میں دیے گئے۔" (3)

مسٹر جناح نے ملک کو امریکہ کی غلامی میں دے کر قوم پر جو "احسان" فرمایا تھا اُس کا نتیجہ ہے کہ گزشتہ 63 سال سے امریکہ پاکستان پر قابض ہے۔ پاکستان میں امریکہ کی خواہش و مرضی کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا۔ نوائے وقت کی معروف کالم نگار محترمہ طیبہ ضیاء چیمہ (مقیم نیویارک) "واشنگٹن کی مرضی" کے زیرِ عنوان لکھتی ہیں:

"پاکستان میں "واشنگٹن کی مرضی" چلتی ہے۔ وہی ہوتا ہے جو واشنگٹن کو منظور ہوتا ہے۔ پاکستان اللہ کی مرضی سے محروم ہے اور جو اللہ کی مرضی سے بغاوت کرے اُسے دنیا کی کوئی طاقت تحفظ نہیں دے سکتی۔" (4)

محترمہ چیمہ اپنے ایک دوسرے کالم "امداد روک دی جائے" میں رقم طراز ہیں:

"پاکستان کی تاریخ میں سیاسی و عسکری قیادتیں امریکہ کی دُم ہیں۔ امریکہ کے یہ دُم چھلے محض ذاتی مفادات کی خاطر ملک کو غلامی کی دلدل میں دھکیلتے چلے گئے۔ ذاتی مفادات کی بنیاد پر بنائے گئے تعلقات کا انجام وہی ہوتا ہے جو پاکستان اور امریکہ کے تعلقات میں ہوا ہے۔ دوستی کی اس کہانی کا اینڈ ہو جاتا تو خوشی ہوتی مگر یہاں تو ڈیڈ اینڈ ہو گیا ہے۔ معاملہ بند گلی میں جا کر رُک گیا ہے۔ امریکہ اپنے ان دُم چھلوں پر کسی صورت اعتبار کرنے کے لیے راضی نہیں۔" (5)

محترمہ اپنے ایک تیسرے کالم میں لکھتی ہیں:

"پاکستان کی معاشی و نفسیاتی حالت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ داخلی و خارجی صورتِ حال نوحہ کناں ہے۔ عوام کی بے بسی و لاچاری اذیت ناک ہے۔ پاکستان کو پاک فوج کی جتنی آج ضرورت ہے شاید پہلے نہ تھی کہ زمین پر بھارت ہے اور فضاؤں میں امریکہ منڈلا رہا ہے۔ وطنِ عزیز ہر طرف سے خطرات میں گھیرا جا چکا ہے۔ پاکستان

میں طالع آزما قیادتوں نے اس ملک کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے جبکہ جمہوری قیادتوں نے بھی ان طالع آزماؤں کو بارہا آزمایا اور ہر بار دھوکہ کھایا۔ بوٹوں کی چاپ میں عوام کی آواز کچلی جاتی رہی، جمہوریت کا خون ہوتا رہا مگر مفاد پرست قیادتیں امریکہ کی "گڈ بک" میں ریکارڈ بناتی رہیں۔ ملک کا وقار تباہ و برباد کرتی رہیں۔" (6)

نوائے وقت لاہور کے صحافی جناب اسرار بخاری "امریکہ اور پاکستان اور پاکستان یا امریکہ" کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں:

"چاہیے تو یہ تھا کہ امریکہ ایک الگ ملک اور پاکستان ایک علیحدہ ریاست ہوتا، دونوں میں دو طرفہ دوستانہ برابری کے تعلقات ہوتے، لیکن ایسا نہ ہوا، بلکہ اب تو نوبت بہ اینجا رسید کہ پاکستان کو امریکہ کہیں یا پاکستان، کیونکہ امریکہ ہمارے وطنِ عزیز میں وہ وہ ناکردنیاں کر رہا ہے کہ جیسے پاکستان اس کی کالونی، غلام اور باجگزار ہو، اس وقت اگر اعداد و شمار اکٹھا کیے جائیں تو پاکستان میں امریکیوں کی موجودگی سینکڑوں کی تعداد میں ہے اور اس کے علاوہ اس کی واریشن بھی کھلم کھلا یہاں پر ایسی کارروائیاں کر رہی ہے کہ اب تک 30 ہزار سویلین اور 3 ہزار فوجی مارے گئے ہیں، ریمنڈ ڈیوس کی قاتلانہ واردات نے کچھ اور اتنی کہانیاں کھول کر سامنے رکھ دی ہیں کہ جن کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ امریکہ ریمنڈ کی امریکہ واپسی میں پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے خلاف سازش کے طشت از بام ہونے کے باعث خاصا پریشان ہے، ورنہ اس کو ریمنڈ کو سزا ہو جانے کی کوئی پروا نہیں، کیونکہ امریکہ اپنے کاز کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے جیسا کہ اس نے سابق صدر ضیاء الحق کو مروانے کے لیے اپنے بندے بھی جہاز میں دھاکہ کر کے مروائے تھے۔ اس لیے ریمنڈ امریکہ کے لیے اتنا اہم نہیں جتنا کہ اس سے وابستہ راز، اسی لیے یہ بھی کوششیں شنید میں ہیں کہ ریمنڈ کے مقدمے کو عالمی عدالت انصاف میں لے جایا جانے والا ہے کہ ہم اب حکومت پاکستان سے تو کچھ توقع نہیں رکھتے کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز سن کر امریکہ کے ساتھ وہی سلوک کرے جو ایک خود مختار ریاست کرتی ہے، اس لیے اب پاکستانی قوم خود اپنا بندوبست کرے، ورنہ یہ امریکہ نا صرف ان کے بچے ہلاک کرے گا، بلکہ خدانخواستہ پاکستان کو ایٹمی قوت سے محروم کر

دے گا اور اس کے بعد پاکستان کی قدر و قیمت بالخصوص بھارت امریکہ اور اسرائیل کے سامنے کیا رہ جائے گی، بلکہ اس طرح تو پاکستان ایک یتیم ملک کے طور پر ظاہر ہو گا، جسے امریکہ اور بھارت جب چاہیں روند سکیں گے۔" (7)

بخاری صاحب مزید لکھتے ہیں:

"امریکہ کا عمل دخل پاکستان میں اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ اس کے اہلکار جب چاہیں پاکستان میں کسی کو مار دیں، سی آئی اے اس وقت پاکستان کی رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے اور ہماری ایجنسیاں اپنوں کے تعاقب میں لگی ہوئی ہیں۔" (8)

نوائے وقت لاہور کے ایک اور صحافی جناب فضل حسین اعوان لکھتے ہیں:

"ہمارے حکمران امداد اور خیرات کی بندش کے خوف سے امریکی ڈانٹ، دھتکار اور پھٹکار خندہ پیشانی کے ساتھ ہضم کر رہے ہیں۔" (9)

جبکہ نوائے وقت کے چیف ایڈیٹر جناب مجید نظامی نے "ہم" ٹی وی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ "پاکستان میں حکمران امریکہ بہادر کی مرضی سے آتے ہیں اور اس کی مرضی سے ہی جاتے ہیں۔(10)

سابق سیکرٹری خارجہ، ممتاز دانشور جناب شمشاد احمد خاں نے معروف صحافی جناب تنویر قیصر شاہد کے اس سوال: "خارجہ امور کے ماہر کی حیثیت سے خرابی کی اصل جڑ کیا ہے؟" کا جواب دیتے ہوئے کہا:

"اصل بات یہ ہے کہ ہم نے پاکستان بننے کے بعد راستہ ہی غلط منتخب کیا اور امریکہ کے ساتھ چلے گئے۔ ہم نے ایک دیہاڑی دار یا مزدور کے طور اپنے آپ کو امریکہ کے پاس گروی رکھ دیا۔ تقسیم ہند کے بعد ہندستان نے ایک ایسا راستہ چنا جو آزادی کا راستہ تھا، جمہوریت کا راستہ تھا، لیکن ہم نے آمریت کا راستہ چن لیا۔ پہلے سویلین آمر آیا، پھر فوجی آمر قابض ہو گیا۔ ہم نے خود کو امریکہ کے حوالے کر کے اس کے مفادات کے تحفظ کے لیے کردار ادا کرنا شروع کر دیا اور سرد جنگ کو انجام تک پہنچانے میں امریکہ کی بھرپور معاونت کی۔ تقسیم ہند کے بعد ہمارے پاس ہر طرح کی آپشن موجود تھی لیکن ہم نے جو راستہ چنا اُس کی سزا ہم آج بھی بھگت رہے ہیں۔" (11)

جناب شمشاد احمد خاں نے اس انٹرویو میں امریکہ کی خود اختیار کردہ غلامی کی قباحتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے ایٹمی دھماکوں کے حوالے سے یہ بھی کہا تھا:

"ہندستان نے 11 مئی کو اور پاکستان نے 28 مئی 1998ء کو جو ایٹمی دھماکے کیے اس پر امریکہ کی جانب سے جو معاشی پابندیاں لگائی گئیں وہ امریکی قانون کا تقاضا تھا کیونکہ امریکہ میں مختلف ترامیم کے تحت ایک قانون موجود ہے جس کے تحت کوئی بھی ملک اگر دھماکے کرتا ہے تو اس پر پابندیاں لگتی ہیں۔ ہم پر پابندیاں لگا کر وہ ہمیں تکلیف دے رہے تھے لیکن ہندستان پر پابندیوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندستان کسی دوسرے ملک کی مدد پر انحصار نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا ہے۔ پاکستان اور ہندستان میں یہ فرق بڑا واضح ہے کہ ہندستان کو اپنی مضبوط معیشت کی وجہ سے کبھی کسی پابندی سے کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ پابندیوں کا قانون سب پر لاگو ہوتا ہے جیسا کہ اس وقت ہندستان پر بھی پابندیاں عائد تھیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ ہندستان کو نہ تو آئی ایم ایف کی کسی قسم کی مدد کی ضرورت تھی نہ اسے امریکہ کی ضرورت تھی لیکن ہمیں ہر وقت امداد کی ضرورت ہوتی ہے۔" (12)

جناب احمد ندیم قاسمی ملک کے ممتاز دانشور، ادیب اور شاعر ہیں، ان کے ایک انٹرویو (مطبوعہ نوائے وقت لاہور) سے دو سوال و جواب ذیل میں نقل کر رہے ہیں۔ ان کے خیالات کے مطالعہ سے یہ مسئلہ منشرح ہو گا اور یہ بات واضح ہو گی کہ ہمیں آزادی کے نام پر امریکہ کی غلامی میں دینے والے دراصل کون لوگ تھے؟ قاسمی صاحب بتاتے ہیں:

"جب پاکستان قائم ہوا تو ہم بلندی پر تھے اور پھر آہستہ آہستہ ہم اس بلندی پر سے نشیب میں آ گئے۔ خرابی کے ذمہ دار جاگیردار سیاستدان ہیں۔ آج بھی ہماری پارلیمنٹ کی اکثریت جاگیرداروں پر مشتمل ہے۔ صوبائی اسمبلیوں میں بھی اکثریت جاگیرداروں کی ہے۔ آزادی کے بعد بھارت کو وہ مسائل درپیش نہیں ہیں جو آج ہمیں درپیش ہیں۔ وہاں درمیانے طبقے کے لوگ بھی منتخب ہو کر آتے ہیں۔ یہاں اگر کوئی اکا دکا منتخب بھی ہوا تو وہ بھی آہستہ آہستہ امرا میں شمار ہو گیا۔ ہمارے اسی فیصد مسائل ان لوگوں کی وجہ سے ہیں اور ہمارے مسائل یہ لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ اس لیے

کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ ہر مسئلے سے نئے سے نئے مسائل جنم لیتے ہیں۔

س: لیکن جاگیرداروں کے ساتھ ساتھ صنعت کاروں کا گروپ بھی سیاست میں سامنے آیا ہے؟

ج: اگرچہ صنعت کار پڑھا لکھا اور باشعور ہوتا ہے لیکن ہمارے ہاں بڑے بڑے صنعت کار بھی بڑی بڑی زمینیں خریدنا شروع کر دیتے ہیں۔ صنعت کار سے بھی کوئی اچھی امیدیں وابستہ نہیں کی جاسکتیں۔ اب تک کوئی مثال ایسی سامنے نہیں آئی کہ انھوں نے کوئی قدم ایسا اٹھایا ہو کہ عوام کے مسائل حل ہوئے ہوں۔

س: بطور دانشور اور تجزیہ نگار آپ بتائیں کہ یہ بات کہاں تک درست ہے کہ پاکستان کی سیاسی واقتصادی ترقی اور آزادانہ پالیسیوں میں امریکہ رکاوٹ ہے بلکہ پاکستان کے اہم معاملات میں امریکہ کی مداخلت رہتی ہے؟

ج: یہ تاثر صد فیصد درست ہے کہ پاکستان امریکہ کے شکنجے میں ہے۔ لیاقت علی خان نے سب سے پہلے سوویت روس جانے کا پروگرام بنایا تھا، یہ اچھی بات تھی کیونکہ روس ایک طرح سے ہمارا پڑوسی ملک بھی ہے اور ہمارے قریب ہے لیکن پھر خدا جانے کیا مجبوری تھی کہ وہ امریکہ چلے گئے۔ تب سے ہم امریکہ کے شکنجے میں ہیں۔ میرا ایک شعر ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایشیاء، افریقہ اور جنوبی امریکہ میں جتنے بھی غریب ممالک ہیں جو امریکہ معاشی شکنجے میں ہیں ان کے بارے میں وہ شعر ہے:

بے وقار آزادی، ہم غریب ملکوں کی
تاج سر پہ رکھا ہے، بیڑیاں ہیں پاؤں میں

میں سمجھتا ہوں ہماری یہ غلامی اس غلامی سے زیادہ خطرناک ہے جو انگریز کے دور میں تھی۔ وہ تو سیاسی غلامی تھی یہ اقتصادی غلامی ہے۔ ہم کتنے مجبور ہیں کہ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک والے کہتے ہیں ایسا کرو، ویسا کرو، ورنہ ہم کچھ نہیں دیں گے اور ہمیں ویسا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی نرخوں میں کوئی اضافہ ہو رہا ہے اور کبھی کوئی اور۔ غریبوں کی گزر بسر کا اندازہ ہمارے رہنماؤں میں سے کسی کو نہیں۔ لفظی طور پر تو رہنما بہت کچھ کرتے ہیں لیکن افسوس کہ عملاً کچھ نہیں کرتے۔'' (13)

آج پاکستان کے متعدد جنگی ہوائی اڈے امریکہ کے قبضے میں ہیں، جہاں سے وہ قبائلی علاقے کے نہتے مسلمانوں پر ڈرون حملے کر رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں ہزاروں بے گناہ مسلمان مرد، عورتیں، بزرگ اور بچے شہید ہو چکے ہیں۔ جناب فضل حسین اعوان لکھتے ہیں:

''آج ہمارے حکمرانوں نے اتحادیوں کو ارضِ پاک پر بمباری کرنے کی اجازت دے رکھی ہے جہاز آتے ہیں، نہتے انسانوں کو خاک اور خون میں لت پت کر کے چلے جاتے ہیں، ان کے لواحقین اپنے پیاروں کے غم میں زندہ لاشیں بنے پھرتے ہیں، زندوں میں شامل نہ مردوں میں۔ اب اسلام آباد میں امریکہ کو سفارت خانے کی توسیع کے نام پر کئی ایکڑ زمین الاٹ کر دی گئی ہے۔ اب بلیک واٹر کو مزید کھل کھیلنے کا موقع ملے گا۔ فلسطینیوں نے بھی لالچ میں آ کر اپنی زمینیں منہ مانگی قیمت پر یہودیوں کو بیچ دی تھیں۔ نتیجہ اسرائیل کی صورت اور فلسطینیوں کی ذلت کی شکل میں سامنے ہے۔ جن سیاستدانوں کے ہاتھ میں خدا نے ہماری تقدیر تھما دی ہے کیا ان کو سرے محل، پام سٹی، رائیونڈ سٹیٹ، لال حویلی، نائن زیرو، ولی باغ، سوئٹزر لینڈ کے بینک اکاؤنٹس، ہیروں اور جواہرات کی چکاچوند اور بلٹ پروف گاڑیاں بچالیں گی؟ تاریخ ان کو کس نام سے یاد اور کس فہرست میں شامل کرے گی اس کے جواب کے لیے دانش سقراط اور حکمت بقراط کی ضرورت نہیں۔ تاریخ کارنامے اور فتوحات شمار کرتی ہے، محل، زرق برق لباس، زیورات، ہیرے جواہرات، ٹھاٹھ باٹھ اور انواع واقسام کے کھانے نہیں۔ تاریخ بڑی بے رحم ہے کسی کو اس کے گناہوں پر معاف نہیں کرتی۔'' (14)

ہم ہندستان میں برطانیہ کے سیاسی غلام تھے جبکہ جناح صاحب اور ان کے کھوٹے سکوں کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہمیں امریکہ کا اقتصادی غلام بنا دیا ہے۔ بقول احمد ندیم قاسمی، ''یہ غلامی اُس غلامی سے زیادہ خطرناک ہے۔ ہم بری طرح سے امریکہ کے شکنجے میں کسے ہوئے ہیں۔'' ہم ہر ہر معاملے میں امریکہ کے محتاج ہیں۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ جناب میاں محمد شہباز شریف کا ایک بیان بعنوان ''اب باتھ روم جانے کے لیے بھی بیرونی طاقتوں سے اجازت درکار ہوتی ہے۔'' اخبارات میں شائع ہوا ہے، جس کا متن حسب ذیل ہے:

''لاہور (بی بی سی) وزیر اعلیٰ شہباز شریف نے ایوانِ وزیر اعلیٰ میں لاہور کے سینئر

صحافیوں، مدیروں اور کالم نویسوں سے غیر رسمی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان میں جتنی غیر ملکی مداخلت اب ہو رہی ہے اس کی اس سے پہلے مثال نہیں ملتی۔ ان کے بقول پاکستان کے انتہائی چھوٹے چھوٹے فیصلے تک بیرونی طاقتیں کر رہی ہیں حتیٰ کہ اگر باتھ روم جانا ہو تب بھی بیرونی طاقتوں سے اجازت درکار ہوتی ہے۔" (15)

پاکستان کو امریکہ کی اقتصادی غلامی اور محتاجی نے از حد ذلت میں مبتلا کر دیا ہے۔ آج ملک کی بقا کا انحصار امریکہ کی امداد کو بتایا جا رہا ہے۔ امریکہ میں پاکستان کی سابق سفیر سیّدہ عابدہ حسین نے ایک بیان میں کہا:

"حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے میں یہ کہوں گی کہ ہمارا ملک ابھی خود کفیل نہیں ہے، اس کو اپنی معیشت چلانے کے لیے بیرون ملک سے قرضوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم لوگ ریمنڈ ڈیوس کو امریکہ کے حوالے نہیں کرتے تو ہماری معیشت داؤ پر لگ جاتی۔ امریکہ ہمیں سالانہ 20 کھرب روپیہ ایڈ دیتا ہے۔ اگر یہ نہ ملے تو سوچیں کہ یہاں بھوک افلاس میں کس قدر اضافہ ہوگا۔" (16)

اقتصادی غلامی کو اس لیے ہی بدترین غلامی کہا جاتا ہے کہ اس میں مبتلا ریاستیں یا قومیں اپنی مرضی یا اپنی خواہش سے کچھ نہیں کر سکتیں۔ ہمیشہ ہر ہر چیز کے لیے دوسروں کی محتاج رہتی ہیں۔ معاشرے میں غلام اور وہ بھی قرض خواہ ہو، بھلا اس کی بھی کوئی عزت ہوتی ہے۔

دراصل ہمارے بڑے وہ تھے جنھیں آزادی سے کوئی دلچسپی تھی، نہ آزادی چاہتے تھے، اور نہ انھوں نے آزادی کی تحریک میں کوئی حصہ لیا، اور نہ انھوں نے آزادی کی قدر کی اور نہ حفاظت! دراصل یہ وہ لوگ تھے جو انگریز کے زیر سایہ رہنا پسند کرتے تھے۔ انھیں پریشانی تب شروع ہوئی جب انگریز یہاں سے جانے لگا۔ تب انھوں نے ایک ایسے ملک کا مطالبہ شروع کر دیا جو انگریزوں کے تعاون سے ہی قائم ہو اور آئندہ بھی انھی کے زیر سایہ رہے، انھی کے اشاروں پر چلے اور اس ملک کا نظام انگریزوں کے انھی وفاداروں کے ہاتھ میں ہو، اور یہ لوگ یہاں باتھ روم بھی جائیں تو انگریزوں سے پوچھ کر جائیں۔

آج ہم پر ان ہی غداروں کی اولادیں مسلط ہیں جن کے خون میں سامراج نے مراعات کی شکل میں خوئے غلامی شامل تھی اور ذہنوں میں راسخ کر دی تھی۔ آج اگر نوبت یہاں تک پہنچ گئی

ہے کہ کٹر مسلم لیگی بھی پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ہم امریکہ کی بدترین غلامی میں مبتلا ہو گئے ہیں تو وہاں کچھ مسلم لیگی دانشور اس پر فخر کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ دراصل یہ وہ لوگ ہیں جن میں "خوئے غلامی" نسل در نسل منتقل ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صفدر محمود نے اپنے ایک حالیہ کالم میں امریکی غلامی کے تمام مضرات کو تسلیم کیا ہے لیکن ساتھ ہی پاکستان کے عوام کو یقین دلایا ہے کہ "امریکہ پاکستان کو نقصان پہنچائے گا، نہ اندر سے کمزور کرے گا۔ امریکہ کا پاکستان کے ساتھ وہی رویہ رہے گا جو ایک حاکم ملک کا محکوم قوم سے ہوتا ہے۔" یعنی جیسے آزادی سے پہلے برطانیہ کا رویہ برصغیر سے تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا امریکہ کے اس رویہ کے بعد ہم پاکستان کو آزاد کہیں گے یا غلام۔ اگر آزاد کہیں گے تو پھر غلامی کیا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب! صاف لفظوں میں تسلیم کیجیے کہ ہم امریکہ کے غلام ہیں۔ 1947ء سے پہلے ہم برطانیہ کے سیاسی غلام تھے، 1947ء کے بعد ہم جناح صاحب کی "مہربانیوں" کے نتیجے میں امریکہ کی اقتصادی غلامی میں ہیں۔ واضح ہو کہ سیاسی غلامی سے اقتصادی غلامی کہیں زیادہ بدتر ہوتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اس غلامی پر خوش ہو رہے ہیں، مسرت کا اظہار فرما رہے اور یقین دلا رہے ہیں کہ "امریکہ پاکستان کو نقصان پہنچائے گا، نہ اندر سے کمزور کرے گا" لیکن ہم اس پر یہی کہیں گے کہ تف ہے ایسی آزادی پر، ایسی آزادی دینے اور دلانے والوں پر اور 63 سال بعد بھی ایسی سوچ رکھنے والوں پر!

مغلیہ حکمران خاندان کے پسماندگان کے بارے میں کہیں پڑھا تھا کہ مغلوں سے حکومت تو کب کی چلی گئی لیکن ان کی باقیات سے، حتیٰ کہ چوتھی، پانچویں نسل سے بھی خوئے شہزادگی نہیں گئی۔ یہی حال ہمارے ڈاکٹر صاحب اور ان کی قبیل کے لوگوں کا ہے۔ ڈاکٹر صفدر محمود رقم طراز ہیں:

"آپ کو شاید یاد نہیں کہ امریکہ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد ہی سے پاکستان کے داخلی معاملات میں دخیل ہو گیا تھا۔ آپ کو یاد دلانا ضروری ہے کہ پاکستان کی جغرافیائی حیثیت اتنی اہم ہے کہ پاکستان ماضی میں بھی امریکی توجہ اور محبت کا اسیر رہا ہے اور مستقبل میں بھی رہے گا۔ ماضی میں اگر ایسا روس فیکٹر کی وجہ سے تھا تو اب چین فیکٹر اور سنٹرل ایشیا کے سبب پاکستان امریکی ترجیح رہے گا اس لیے یقین رکھیے کہ امریکہ پاکستان کو نقصان پہنچائے گا، نہ اندر سے کمزور کرے گا۔ امریکہ کا پاکستان کے

ساتھ وہی رویہ رہے گا جو ایک حاکم ملک کا محکوم قوم سے ہوتا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ایوبی دور میں امریکہ کا یوٹو طیارہ روس کی جاسوسی کے لیے پشاور (بڈبیر) بیس سے اڑا تھا جسے روس نے مار گرایا اور پھر روسی حکمران خروشیف نے نا ہی صرف پاکستان کے اردگرد سرخ دائرہ لگا دیا تھا، بلکہ اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل کے اجلاس میں اپنا جوتا اتار کر میز پر زور زور سے مارا تھا۔ بھلا یہ ''جوتا دھمکی'' کسے دی گئی تھی؟ اس دور میں بھی پاکستانی قوم اسی طرح صدمے اور سکتے کی حالت میں رہی۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں روس کا کردار نہایت اہم تھا اور ہمیں یہ سزا امریکی دوستی کی وجہ سے ملی۔ مختصر یہ کہ امریکہ کئی دہائیوں سے پاکستان کے معاملات میں پوری طرح دخیل ہے اور اب یہ بدمست ہاتھی اس قدر طاقتور ہو چکا ہے کہ حکومتیں بناتا اور گراتا ہے، اس لیے دنیا ہمیں امریکہ کا مزارع یا کلائنٹ ریاست سمجھتی ہے اور ہماری خام خیالی کہ ہم اس لیبل کے ساتھ دنیا کا احترام مانگتے ہیں؟''(17)

ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمانا کہ ''یقین رکھئے، امریکہ پاکستان کو نقصان پہنچائے گا، نہ اندر سے کمزور کرے گا۔'' چلئے تسلیم۔ لیکن کیا اس اقتصادی غلامی کے نتیجہ میں ملک کی جو حالت بنی ہوئی ہے وہ انتہائی بدتر نہیں ہے۔ کیا یہاں لوگ جینے پر مرنے کو ترجیح نہیں دے رہے۔ کیا لوگ بہ کثرت خودکشیاں نہیں کر رہے؟ اقتصادی غلامی کے نتیجہ میں پاکستان روزِ اوّل سے ہی بدترین حالات و واقعات سے دوچار ہے۔ لوگ پہلے دن سے ہی مایوسی کا شکار ہیں۔ گزشتہ 63 سالوں سے لوگ اس ملک کے جواز و عدم جواز پر، بچنے نہ بچنے پر گفتگو کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ایسی ہی ایک مجلس کا حال جناب توفیق بٹ نے اپنے حالیہ کالم میں بیان کیا ہے۔ اس کالم کے مطالعے کا حاصل جناب فیض احمد فیض کا یہ فرمان ہے کہ ''مجھے اس سے بھی بڑا خطرہ ہے، یہ کہ پاکستان اسی طرح چلتا رہے گا۔'' بٹ صاحب لکھتے ہیں:

''چند روز قبل اچھے دل و دماغ والے افسر قاضی آفاق حسین نے ایک واقعہ سنایا کہ پاکستان بننے کے چند برس بعد شاید 1957ء میں چند قلم کار پاک ٹی ہاؤس میں چائے کی پیالی میں طوفان اٹھا رہے تھے۔ قتیل شفائی کی کہی ہوئی اس بات کی تائید موجود بہت سے قلم کاروں نے بھی کی کہ ''مجھے خطرہ ہے پاکستان نہیں بچے گا۔'' فیض احمد فیض صاحب بھی اس موقع پر موجود تھے۔ انھوں نے کہا: مجھے اس سے بھی بڑا خطرہ ہے، یہ کہ پاکستان اسی طرح چلتا رہے گا۔''(18)

دیکھئے، ڈاکٹر صفدر محمود اور جناب فیض احمد فیض کی سوچ اور فکر میں کس قدر فرق ہے۔ ڈاکٹر صاحب پاکستان کے قیام کے جواز میں دلیل اپنی خوش حالی کی دیتے ہیں۔ واضح ہو کہ وہ لاہور کے سب سے مہنگے رہائشی علاقے ڈیفنس میں رہتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ وہ اگر متحدہ ہندستان میں ہوتے تو وہ اتنی اچھی زندگی نہ گزار رہے ہوتے۔ ڈاکٹر صاحب ان لوگوں کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے ہیں جو ملک کے جواز و عدم جواز کو موضوعِ گفت گو بناتے ہیں یا ملک کی یا عوام کی بدحالی کا ذکر کرتے ہیں، یا اپنی بدحالی کا رونا روتے ہیں۔ حالانکہ ملک میں عوام کی اکثریت بدترین معاشی مسائل سے دوچار ہے۔ بدترین بدحالی کا شکار ہے۔ یہ لوگ اس ملک میں جی نہیں رہے بلکہ مر مر کے جی رہے ہیں اور یہ صورتِ حال گزشتہ 63 سال سے چلی آ رہی ہے۔ ''بڑا خطرہ یہ ہے کہ پاکستان میں آئندہ بھی اسی طرح کے حالات رہیں گے اور یہ ملک اسی طرح چلتا رہے گا۔'' مسلم لیگی قلم کار جناب فضل حسین اعوان نے اپنے ایک کالم میں ملکی حالات کا نوحہ بایں الفاظ لکھا ہے:

''خوں آشام ہوائیں، زرد خزائیں، شعلہ بار گھٹائیں، جاں لیوا بلائیں، وبائیں اور ابتلائیں ہمیں چاروں طرف سے اپنی لپیٹ میں لے چکی ہیں۔ وطن کے بدن کا رواں رواں شعلہ بار، جوڑ جوڑ بیقرار، ہر عضو خوں بار ہے۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر محب وطن طبقات بے بسی کی تصویر، بے کسی کی تعبیر بنے اشک بار و سوگوار ہیں۔ یہ ہماری شامتِ اعمال ہے، کسی کی بددعاؤں کا نتیجہ یا آزمائش خداوندی کہ ہر طرف گھٹا ٹوپ تاریکی، وحشت، دہشت، بربریت، سفاکی اور لاقانونیت ہے۔ خون کی موجیں لہو کے قلزم میں ڈھل گئیں۔ انسان کی قدر ہے نہ انسانیت کی اہمیت۔ میرا وطن غیروں کی لڑائی میں مقتل بن گیا جہاں خون بہہ رہا ہے تو اپنوں کا۔ لاشیں گر رہی ہیں تو اپنوں کی۔ اعضا کٹ رہے ہیں تو اپنوں کے۔ غارت گر بگولوں، ستم گر طوفانوں کی زد میں ہیں تو سب اپنے پاکستانی۔ پاکستانیوں کا سکون چھن چکا، اضطراب بڑھ رہا ہے۔ مایوس چہرے منحوس حالات کا عکس ہیں۔ جس دہشت کے بھنور اور وحشت کے سمندر نے عام آدمی پر سکوتِ مرگ طاری کر دیا، اسے ہر شے کی گرانی محض خون کی ارزانی کا سامنا

ہے۔ ان حالات میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو ہر غم سے آزاد اور خوش و خرم مطمئن ہے۔ آسودہ حال روشن آنکھیں، شگفتہ چہرے، یہ سب ان کی زرد آرزوؤں اور سرد احساسات و جذبات کا کمال ہے۔ انھیں فکر نہیں کہ ہم وطن کس حال و وبال میں ہیں۔ جب برق گرتی ہے ہم وطنوں کے آشیانوں پر تو ڈالروں کی برکھا برسنے لگتی ہے ان کے کاشانوں پر۔ شکم، شکم جہنم ہے کہ بھرتا نہیں۔ ھل من مزید کی گردان جاری رہتی ہے، وطن فروشی پر ندامت نہ بیٹے بیٹیوں کی سوداگری پر احساسِ اہانت۔" (19)

دکھ اس بات کا ہے کہ یہ ملک امریکہ کی اقتصادی غلامی کے نتیجے میں بہ الفاظِ فیض "اسی طرح چلتا رہے گا" کیونکہ ڈاکٹر صاحب بھی مانتے ہیں:

"امریکہ کئی دہائیوں سے پاکستان کے معاملات میں پوری طرح دخیل ہے اور اب یہ بدمست ہاتھی اس قدر طاقت ور ہو چکا ہے کہ حکومتیں بناتا ہے اور گراتا ہے اس لیے دنیا ہمیں امریکہ کا مزارع یا کلائنٹ ریاست سمجھتی ہے اور ہماری خام خیالی کہ ہم اس لیبل کے ساتھ دنیا کا احترام مانگتے ہیں۔"

مسٹر جناح نے پاکستان کو امریکہ کی غلامی میں دیا اس کے بدلے میں امریکہ نے پاکستان کو سوائے دھوکہ اور فراڈ کے کیا دیا۔ جناب اکرام اللہ میر "پاک امریکی دوستی یا دشمنی!" کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

"امریکہ آستین کا سانپ ہے۔ اگر ہم پچھلے ساٹھ سال کی تاریخ دیکھیں تو ہمیں پختہ یقین ہو جائے گا کہ بوقت ضرورت ہر دفعہ امریکہ نے ہمیں اندھیرے میں رکھا، دھوکہ دیا اور اپنے مفادات کو مقدم رکھا۔ مثلاً 1965ء کی جنگ میں ہمیں یہ کہا گیا کہ اگر مقبوضہ کشمیر میں مجاہدین کوئی حملہ، گڑبڑ کرتے ہیں تو بھارتی فوج بین الاقوامی سرحد پار کر کے پاکستان پر حملہ آور نہیں ہوگی۔ لیکن بھارت حملہ آور ہوا۔

1971ء کی جنگ میں بھی ہمیں پورا یقین دلایا گیا کہ مشرقی پاکستان علیحدہ نہیں ہوگا اور چھٹا امریکی بحری بیڑہ پاکستان کی مدد کے لیے مشرقی پاکستان روانہ کر دیا گیا ہے۔ جس کا ہمیں انتظار ہی رہا اور مشرقی پاکستان، بنگلہ دیش بن گیا۔ روس کی افغانستان جنگ میں پاکستان اور طالبان کو امریکی مدد حاصل تھی اور اس وقت افغانیوں کو

"مجاہدین" کا نام دیا گیا۔

جب روس کو شکست ہوئی تو پاکستان اور افغانستان کو تنہا چھوڑ دیا گیا اور امریکی اپنا مقصد حاصل کر کے واپس چلے گئے۔ ہمیں ایٹمی دھماکہ کرنے سے روکا گیا اور طرح طرح کے لالچ دیے گئے کہ ہم ایٹمی دھماکہ نہ کریں تاکہ ہم اسلامی ایٹمی قوت نہ بن سکیں جبکہ بھارت کو کھلی چھٹی تھی کہ وہ ایٹمی دھماکے کرتا رہے۔

9/11 کے بعد ہمیں تباہی کا پیغام دیا گیا کہ اگر ہم نے امریکہ کا ساتھ نہ دیا۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تمام شرائط جنرل مشرف سے منوالیں۔ جن میں ایک ڈیمانڈ "Logistic Supports" کی تھی۔ صرف یہ Facility ہی نہیں دی گئی بلکہ امریکن جاسوسوں کو کھلی اجازت دے دی گئی کہ بغیر ویزے کی جانچ پڑتال کے ہمارے ملک میں جہاں جی چاہے، گھومتے رہیں۔

اس کی ایک مثال لاہور میں ریمنڈ ڈیوس کی بدمعاشی کی صورت میں سامنے آئی۔ صرف یہ ہی نہیں پھر امریکہ ایبٹ آباد میں بغیر ہمیں بتائے حملہ آور ہوا تو کہاں گیا "تقدس پاکستان کی سرزمین کا"۔ "کہاں تھی ہماری فوج"، "کہاں تھی ہماری حکومت"، "کہاں تھی ہماری خفیہ ایجنسیاں"، "کہاں تھی ہماری پارلیمنٹ" جس نے ایک Resolution تو پاس کیا اور جسے امریکہ نے کاغذ کے پرزے سے زیادہ اہمیت نہ دی، اسے پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔

پاکستان اور امریکہ دوستی پر میاں محمد بخشؒ نے اپنی کتاب سیف الملوک میں بہت عرصہ پہلے ہی لکھا دیا تھا کہ ۔

جھوٹے یار دی یاری جھوٹی جیویں رُکھ کھجور
دُھپ لگے تے چھاں نہ دیوے پھل لگے تے دور

جھوٹے یار کی دوستی ہمیشہ جھوٹی ہوتی ہے، جس طرح کھجور کا درخت ہوتا ہے۔ جب گرمی ہوتی ہے تو چھاؤں نہیں دیتا ہے اور جب پھل لگتا ہے تو اونچا ہونے کے باعث رسائی سے دور ہوتا ہے۔" (20)

جناب ریاض احمد چودھری اپنے کالم "پاکستان کے خلاف امریکی بھارتی گٹھ جوڑ" میں

''ہمارے دوست ملک'' امریکہ کا اصل چہرہ بایں الفاظ بے نقاب کرتے ہیں:

''امریکہ جس طرح کے عزائم کے ساتھ عشروں پہلے ہمارے ملک میں داخل ہوا تھا اس سے زیادہ خوفناک عزائم کے ساتھ بھارت میں داخل ہوا ہے۔ تب اسے پاکستان سے اس لیے دلچسپی تھی کیونکہ پاکستان اس کے اسلحے کا خریدار تھا جبکہ بھارت اپنا تمام تر اسلحہ سوویت یونین سے خریدا کرتا تھا۔ اپنا اسلحہ بیچنے کے لیے امریکہ نے نہ صرف یہ کہ آج تک مسئلہ کشمیر حل نہیں ہونے دیا بلکہ پاکستان اور بھارت کے مابین جنگیں بھی کرائیں اور اب جبکہ دنیا کے حالات بدل گئے ہیں اور بھارت سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد پکے ہوئے پھل کی طرح امریکی جھولی میں جا گرا ہے تو امریکہ کی چاندی ہوگئی ہے۔ اب پاکستان اور بھارت دونوں اس کے گاہک ہیں اور روایتی دشمن بھی، وہ دونوں کو اسلحہ فروخت کرے گا کیونکہ وہ دنیا میں سب سے زیادہ اسلحہ بناتا ہے اور اسی اسلحے کو بیچ کر معاشی طور پر اتنا مضبوط ہوا ہے۔ اب جبکہ افغان جنگ کی وجہ سے وہ کھربوں ڈالرز اجاڑ چکا ہے اور امریکہ میں بیروزگاری کی شرح تیزی سے بڑھ رہی ہے تو اپنی معیشت کو سنبھالنے کے لیے جنوبی ایشیا کی دوسری بڑی منڈی کو اپنے قابو میں لے لیا ہے اور اسے علاقے کی تھانیداری کا لالچ دے کر اس کی معیشت کو تباہ کر دینا چاہتا ہے۔ اور امریکہ نے خطے کا مجموعی ماحول ایسا بنا رکھا ہے کہ بھارت پاکستان سے ڈرتا رہے اور پاکستان، بھارت سے خطرہ محسوس کرتا رہے اور یوں امریکی گیم پلان مکمل ہو جائے۔''(2)

پاکستان میں امریکہ کا کس قدر عمل دخل ہے، وہ نوائے وقت کی دو ادارتی تحریروں سے واضح ہو جائے گا۔ نوائے وقت کے مستقل کالم ''سر راہے'' میں لکھا ہے:

''امریکی عہدیداروں تک اسامہ بن لادن کے قتل پر ہونے والے پاکستانی پارلیمنٹ کے ان کیمرہ اجلاس کی لحہ بہ لحہ تفصیلات پہنچ گئیں۔

حیرانی والی بات نہیں، یہ پاکستان ہے، یہاں سب کچھ ممکن ہے۔ میاں نواز شریف نے موبائل فون پر جب ساری تقریر گھر بیٹھ کر سن لی، امریکی تو پھر بھی پارلیمنٹ کے قریب اسلام آباد میں ہی بیٹھے ہوئے تھے، ''بھیت کنے کھولنے وچو وچی کھائی جاؤ، اتوں رولا پائی جاؤ'' یہ پاکستان ہے۔ بکاؤ مال کانی مل جائے گا، بس قیمت اچھی لگانی چاہیے۔

سی ڈیز کو اگر سپیکر یا سیکرٹری کی موجودگی میں سیل بھی کر دیا جائے تو اس کا اوپن ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں کیونکہ پاکستان میں صدر سے لے کر عام سیکرٹری تک تو امریکی احکامات پر تبدیل ہوتے اور بنتے ہیں۔

ان کیمرہ اجلاس کی سی ڈیز امریکیوں کے ہاتھ پہنچنے پر ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ وہ انسان تو ہو سکتا ہے، لیکن پاکستانی نہیں۔ امریکیوں کو داد دینی چاہیے کہ انھوں نے پارلیمنٹ میں بھی ''وطن کے غدار'' تلاش کر لیے ہیں، ایسے ضمیر فروشوں کے لیے پروین شاکر نے کہا تھا۔

تہمت لگا کے ماں پہ جو دشمن سے داد لے
ایسے سخن فروش کو مر جانا چاہیے

ماں جائی دھرتی کے راز چند ڈالروں کی خاطر بیچنے والو! ماں کی عزت کو نیلام نہیں کیا جاتا۔''(22)

پاکستان میں امریکی عمل دخل کے حوالے سے روزنامہ نوائے وقت لاہور کا ادارتی شذرہ ملاحظہ ہو:

''پہلی سے دسویں جماعت تک کے نصاب سے جہاد سے متعلق قرآنی آیات و احادیث یا واقعات کو نکالنے کا کام تیزی سے جاری ہے اور رواں سال میں چھوٹی کلاسوں سے یہ ذکر حذف کر دیا جائے گا۔

کسی بھی پاکستانی مسلمان کو یہ یقین نہیں ہو سکتا کہ حکومت امریکہ کی غلامی میں اس حد تک چلی جائے گی کہ اس کے اشارۂ ابرو پر پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک کے نصاب میں سے وہ تمام قرآنی آیات احادیث نبوی اور جہادی واقعات نکال باہر کرنے کا کام بھی شروع کر دے گی، امریکہ جہاد کو دہشت گردی کا نام دیتے ہوئے ہے اور وہ چاہتا ہے کہ پاکستان کو اللہ نے جو حق دفاع جہاد کی صورت عطا کیا ہے وہ بھی اُس سے چھین لیا جائے کچھ عرصہ پہلے مشرف کی حکومت میں زبیدہ جلال نے بھی یہ

سلسلہ شروع کیا تھا مگر حکومت کے ختم ہوتے ہی وہ پروگرام بھی دم توڑ گیا، حکومت ایسے حساس مسائل امریکی اشاروں پر کیوں کھڑے کر رہی ہے کہ حکومت رہے نہ جمہوریت، کیا ان حکمرانوں کا کوئی دین ودھرم نہیں، کیا اللہ کی پکڑ اور باز پرس سے نہیں ڈرتے، صرف وائٹ ہاؤس کا خوف ان پر طاری ہے وہ بھی اپنے ذاتی مفادات کے لیے آخر کیوں قومی مفاد کو اس بیدردی سے داؤ پر لگایا جا رہا ہے۔ پہلی جماعت سے دسویں جماعت تک نصاب میں سے جہاد کو خارج کرنے کی کوشش ملتِ پاکستانیہ ردّ کرتی ہے اور حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنے زوال کو دعوت نہ دے، امریکہ بہت سی زیادتیاں حکمرانوں کے ذریعے کرا رہا ہے، مگر اب یہ جوئی نا کردنی وہ ہماری حکومت سے کرانے چلا ہے اس کو ہرگز تسلیم نہیں کیا جا سکتا، چھوٹی کلاسوں کے نصاب کے ساتھ تو یہ کھلواڑ شروع کر دیا گیا جسے فوراً بند کر دیا جائے، ورنہ اس کے عوامی سطح پر خطرناک نتائج برآمد ہوں گے۔" (23)

جناب فضل حسین اعوان نوائے وقت میں "شفق" کے عنوان سے کالم لکھتے ہیں، وہ ادارہ نوائے وقت سے باقاعدہ وابستہ ہیں۔ وہ بڑے سخت مسلم لیگی ہیں۔ آپ انھیں "جناحی جیالا" کہ سکتے ہیں۔ انھوں نے ایک کالم بعنوان "نیا ترانہ" لکھا ہے جس میں وہ رقم طراز ہیں:

"اگر معاملات اسی ڈگر پر چلانے ہیں، جھوٹ بولنا ہے، قوم کو دھوکا دینا ہے، امریکہ کی پالیسیوں پر چلنا ہے تو مندرجہ ذیل ترانے کو حرزِ جان بنا لیں:

نیا ترانہ

یا حافظ امریکہ یا ناصر امریکہ

ہیں تیرے ثناں خواں ہم اور تابع فرماں ہم   تھامے ہیں عقیدت سے عظمت سے ترا پرچم
اک تو جو ہمارا ہے پھر ہم کو بھلا کیا غم   ہر دکھ کی دوا تو ہے ہر زخم کا تو مرہم
پھیری جو نظر تو نے جائیں گے وہیں مر، ہم   تو حافظ کل عالم تو ناصر کل عالم
امریکہ او امریکہ ہے وردِ زباں ہر دم

یا حافظ امریکہ یا ناصر امریکہ

دنیا میں فقط سچا اک تیرا سہارا ہے   ہر رنج و مصیبت میں بس تجھ کو پکارا ہے

تجھ پر دل و جاں کیا ہے! ایمان بھی وارا ہے   ہر دوست ترا ہم کو جی جان سے پیارا ہے
جو بھی ترا دشمن ہے، دشمن وہ ہمارا ہے   تیری ہی عطاؤں پر اب اپنا گزارا ہے
دلوائے کسی سے بھی رازق تو ہمارا ہے

یا حافظ امریکہ یا ناصر امریکہ

جو تیری طلب ہوگی ہم اس سے سوا دیں گے   اک تیرے اشارے پر ہم جان لڑا دیں گے
پیاروں کو کٹا دیں گے خوابوں کو سلا دیں گے   خود اپنے نشیمن کو ہم آگ لگا دیں گے
پھر آگ کے شعلوں کو ڈالر کی ہوا دیں گے   مقتل میں تہہ خنجر جینے کی دعا دیں گے
یوں شانِ وفاداری دنیا کو دکھا دیں گے

یا حافظ امریکہ یا ناصر امریکہ" (24)

پاکستان کے ممتاز ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کی ایک تحریر پر اس باب کو بند کرتا ہوں۔ اس تحریر میں دراصل ڈاکٹر خان نے ایک عرب دوست کی زبانی ہمارے سیاست دانوں کا شجرۂ حسب ونسب بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"آیئے آپ کو ایک نہایت ہی عزیز عرب دوست کا ہمارے لیڈروں کے بارے میں تجربہ بیان کرتا ہوں۔ یہ دوست پاکستانی معاملات پر ماہر ہیں اور ہمارے ملک، عوام اور لیڈروں کو پاکستانی عوام کی اکثریت سے زیادہ جانتے ہیں۔ ایک روز میں نے ان سے دریافت کیا کہ ان کا ہمارے حکمرانوں کے بارے میں کیا خیال ہے۔ میرا سوال سن کر مسکرائے اور کہا، آپ خود ہی بہتر جانتے ہیں، مگر میرے اصرار پر کہا کہ آپ کے اس سوال نے مجھے اپنے علاقہ کے ایک نہایت خوبصورت عام منظر کی یاد دلا دی ہے کہ ریگستان میں اونٹوں کی قطار جا رہی ہے ایک کے پیچھے ایک، بہت ہی خوبصورت قافلہ، سب سے پچھلے اونٹ کی نکیل اگلے اونٹ کی دُم سے، اسی طرح یہ سلسلہ جاری ہے مگر جب میں سب سے اگلے اونٹ کے پاس جاتا ہوں تو تعجب اور حیرت کا شکار ہو جاتا ہوں کہ اس کی نکیل ایک گدھے کی دُم سے بندھی ہے اور وہ ان کا لیڈر اور رہنما ہے۔ انھوں نے کہا، مجھے آپ کے ہاں ہمیشہ یہی خوبصورت منظر نظر آتا ہے۔" (25)



حوالہ جات

(1) روزنامہ نوائے وقت لاہور/2 جون 2011ء
(2) ہفت روزہ فیملی میگزین لاہور/26 اگست 2012ء/ص 12
(3) روزنامہ جنگ لاہور/21 جولائی 2011ء
(4) روزنامہ نوائے وقت لاہور/26 مئی 2011ء
(5) روزنامہ نوائے وقت لاہور/20 مئی 2011ء
(6) روزنامہ نوائے وقت لاہور/21 مئی 2011ء
(7) روزنامہ نوائے وقت لاہور/26 فروری 2011ء
(8) ایضاً
(9) روزنامہ نوائے وقت لاہور/18 مئی 2011ء
(10) ایضاً
(11) ہفت روزہ عزم لاہور/10 دسمبر 2006ء/ص 32
(12) ایضاً
(13) روزنامہ نوائے وقت سنڈے میگزین لاہور/17 جنوری 1999ء/ص 4
(14) روزنامہ نوائے وقت لاہور/9 ستمبر 2009ء
(15) روزنامہ جنگ لاہور/20 اپریل 2009ء
(16) روزنامہ نوائے وقت لاہور/16 فروری 2011ء
(17) روزنامہ جنگ لاہور/14 مئی 2011ء
(18) روزنامہ نوائے وقت لاہور/11 جولائی 2011ء
(19) روزنامہ نوائے وقت لاہور/28 جولائی 2011ء
(20) روزنامہ نوائے وقت لاہور/28 جولائی 2011ء
(21) روزنامہ نوائے وقت لاہور/18 جون 2011ء
(22) روزنامہ نوائے وقت لاہور/5 جولائی 2011ء
(23) روزنامہ نوائے وقت لاہور/14 مئی 2011ء
(24) روزنامہ نوائے وقت لاہور/12 جولائی 2011ء
(25) روزنامہ جنگ لاہور/6 جون 2011ء

پس چہ باید کرد؟

مجھے امید ہے کہ گزشتہ سطور میں جو کچھ قاری کی نظر سے گزر چکا ہے۔ وہ اس کے اطمینان کے لیے کافی ہوگا:

1) برصغیر کی تقسیم نہ تو اسلام کا تقاضا تھا اور نہ یہ عمل برصغیر کے مسلمانوں کے مجموعی مفاد میں تھا۔ تعداد کی قلت و کثرت کبھی اہلِ ایمان کے لیے مسئلہ نہیں ہوتی۔ درحقیقت جب بھی کسی نظریہ کے علم بردار کثرت وقلت میں الجھتے ہیں تو یہ ان کی طرف سے اعترافِ شکست ہوتا ہے اور یہی کچھ برصغیر کی مسلم لیڈرشپ نے کیا۔

2) دوقومی نظریہ کی بنیاد کہ قوم مذہب سے بنتی ہے نہ کہ وطن سے، غلط تھا اور غلط ہے۔ قومیت کی بنیاد مذہب تھا تو مسلمانوں کی قیادت کو کثیر القومی نظریہ پیش کرنا چاہیے تھا کیونکہ برصغیر میں دو سے زیادہ مذاہب تھے، جبکہ ہم نے دوقومی نظریہ پیش کر کے تمام غیر مسلموں کو موقع فراہم کر دیا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف متحد ہو جائیں اور وہ متحد ہو گئے۔

3) دوقومی نظریہ ایک اضافی (Relative) نظریہ تھا جو 14 اگست 1947ء کی شام کو دفن کر دیا گیا۔ اب پاکستان میں مذہب کی بنیاد پر دو اقوام کی تشکیل نہیں کی جارہی بلکہ وطن کی بنیاد پر ایک پاکستانی قوم کی تشکیل کی کوشش کی جارہی ہے۔

4) دوقومی نظریہ کا مقصد برصغیر کے مسلمانوں کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ان کی عددی طاقت کو بے اثر کرنا تھا اور وہ بے اثر ہو گئے۔

5) دوقومی نظریہ کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اگر نظری طور پر نہیں تو عملاً برصغیر کے مسلمان یہ تسلیم کر لیں کہ اسلام اپنی دعوتی قوتِ تاثیر کھو چکا ہے اور مسلمانوں کی قیادت کی سیاسی پالیسی کی

بنیاد یہ تھی کہ اس بات کا اب کوئی امکان ہی نہیں کہ آئندہ کبھی برصغیر میں مسلمان اکثریت حاصل کر لیں۔ یہ ایک جرمِ عظیم تھا جس کا ارتکاب برصغیر کے مسلمانوں سے سرزد ہوا۔

6) دوقومی نظریہ کا ایک مقصد یہ بھی تھا یا اس کا منطقی نتیجہ تھا کہ برصغیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اس قدر شدید منافرت پیدا کر دی جائے یا ہو جائے کہ ہندوؤں تک اسلام کا پیغام پہنچانا ناممکن ہو جائے اور برصغیر کے مسلمان غیر مسلموں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ دعوت نہ سمجھیں، بلکہ انھیں مسلمانوں کا دشمن سمجھا جائے۔

میں عرض کر چکا ہوں اس فہرست میں مزید اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ لندن کے انڈیا آفس کے چند برطانوی افسروں نے آغا خاں سوم اور اس کے معنوی فرزند جناح صاحب کے ذریعہ یہ مقصد حاصل کر لیا کہ آئندہ کئی صدیوں تک برصغیر مسلم اکثریت کا ملک نہ بن سکے۔ ہندو مذہب اوہام اور خرافات کے سوا کچھ نہیں، یہاں تک کہ انتہائی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو بھی نہ اپنے مذہب کے بارے میں کسی سوال کا جواب دے سکتا ہے اور نہ انھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مذہب کا بنیادی تصور یا تخیل (Key Concept) کیا ہے۔ یا ان کے مذہب کے پاس انسانیت کے لیے کیا پیغام ہے۔ نہ ہی کسی ہندو کی خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ اس کے مذہب کو قبول کر لیں۔ برصغیر کے مسلمانوں نے دوقومی نظریہ پیش کر کے اسلام کے لیے تو ہندو کے کان بند کر دیے۔ لیکن یہ مذہب سوچنے والے ذہن کو مطمئن کر ہی نہیں سکتا تھا۔ دوسری طرف بھارت میں عیسائی مشنری تنظیمیں تندہی سے ان میں عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف ہیں۔ مزید یہ کہ ہندو ذہن میں عیسائیت کے بارے میں وہ تعصب بھی موجود نہیں جو برصغیر کے مسلمانوں نے دوقومی نظریہ پیش کر کے اسلام کے بارے میں ہندو ذہن میں پیدا کر دیا تھا۔ اسی لیے بھارت کی ہندو آبادی تیزی سے عیسائیت قبول کرتی جا رہی ہے۔ اگر رفتار یہی رہی تو گمان ہے کہ آئندہ پچاس سال میں بھارت عیسائی اکثریت کا ملک بن جائے گا۔ ان حالات میں اہلِ پاکستان کو کیا کرنا چاہیے۔ یہ سوال ایسا ہے کہ اس پر پاکستان کے صاحبانِ علم و دانش کو ضرور غور کرنا چاہیے۔ میں تو ایک عام آدمی (Lay man) ہوں اور خود کو اس کا اہل بھی خیال نہیں کرتا کہ اس سوال کا جواب دے سکوں، لیکن عربی کا ایک مقولہ ہے کہ کبھی کسی چھوٹے شخص کو بھی صحیح بات سوجھ جاتی ہے۔ خود کو بے دانش خیال کرنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے جو کچھ میرے فہم میں ہے میں بھی عرض کر دیتا ہوں۔ یہ ایک

سادہ سا سوال ہے اور میری رائے میں اس کا جواب بھی بہت سادہ ہے۔

برصغیر کے مشرکین سے معاملہ (Deal) کرنے کی دو صورتیں ہیں: ایک صورت تو ہے تصادم (Confrontation) کی جس پر ہم 1906ء سے تا ایں دم عمل پیرا ہیں۔ اسی پالیسی کے تحت ہی ہم نے برصغیر کو تقسیم کروایا، پندرہ لاکھ مسلمان قتل کروائے، نوے ہزار مسلمان عورتیں بے آبرو کروائیں۔ ہم نے دو جنگیں لڑیں۔ اسی طرزِ عمل کا نتیجہ ہے کہ آئے دن بھارت کے مسلمانوں کو مشقِ ستم بنایا جاتا ہے۔ مستقبل میں بھارت سے آنے والے دریاؤں کا پانی بند ہو جائے گا اور پاکستان بدترین قسم کے غذائی بحران کا شکار ہو جائے گا۔ اس کے بعد کیا ہو گا؟ ایک تو یہ کہ اس صورتِ حال کو گوارا کر لیا جائے۔ کشکولِ گدائی لے کر بین الاقوامی ساہوکاروں سے ان کی شرائط پر قرضہ لیا جائے یا بھارت سے ایک تیسری جنگ پانی کے حصول کے لیے لڑی جائے۔ یہ جنگ ایسی ہو گی کہ اس میں دونوں ممالک ایٹمی ہتھیار استعمال کریں گے اور دونوں ممالک میں کھیت کھلیان سب کچھ راکھ ہو جائے گا۔ ایک بڑی صحافتی شخصیت مجید نظامی پہلے ہی یہ بیان دے چکی ہے کہ پانی کے مسئلہ پر انڈیا سے ایٹمی جنگ کر لی جائے۔ لیکن کیا حکمتِ عملی کا تقاضا یہ ہے کہ تصادم کی اس پالیسی کو جاری رکھا جائے۔ بھارت کے مسلمان بھی مسلسل عذاب میں گرفتار رہیں اور پاکستان ایتھوپیا بن جائے یا بھارت سے ایٹمی جنگ کر کے تباہ ہو جائے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مصالحت (Reconciliation) کی پالیسی اختیار کر لی جائے۔ مشرکینِ بھارت کو اپنا دشمن نہ سمجھا جائے، بلکہ گمراہ سمجھا جائے۔ ان کو اسلام کی راہِ راست کی طرف لانے کو اپنا فرض سمجھا جائے۔ یہ ہدف بنا لیا جائے کہ ہم نے برصغیر کو مسلم اکثریت کا ملک بنانا ہے۔ اس صورتِ حال میں جو حکمتِ عملی اختیار کی جائے گی وہ درج ذیل نکات پر مشتمل ہو سکتی ہے:

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش کے مسلمان اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار کریں کہ ان سے گمراہ قیادت کے ذریعے فراڈ دوقومی نظریہ کو قبول کرنے کی جو غلطی ہو چکی ہے، اللہ تعالیٰ اسے معاف کرے۔ اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے سامنے بھی وہ اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔ اس کے علاوہ اپنے ذہن میں یہ بات راسخ کر لیں کہ تمام دنیا کے غیر مسلم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ دعوت ہیں اور ان تک اسلام کا پیغام پہنچانا ہر مسلمان پر فرض ہے جو کسی حال میں ساقط نہیں ہوتا۔ یہی امتِ مسلمہ کا مقصدِ تاسیس ہے۔

صرف اور صرف اسلام ہی برحق ہے اور اسلام کے سوا ہر مذہب باطل ہے۔ نہ صرف باطل ہے، بلکہ ڈھکوسلا ہے۔ اگر اسلام کے سوا دیگر مذاہب دنیا میں موجود ہیں تو صرف اس لیے کہ مسلمانوں نے دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو اسلام کا پیغام پہنچانے کا حق ادا نہیں کیا۔ اسلام ہی نوعِ انسانی کی نجات اور فلاح کا ضامن ہے۔

درج بالا مقاصد کے حصول کے لیے پاکستان کے مسلمانوں کو بھارت کے ساتھ تعلقات معمول پر لانے ہوں گے اور تمام متنازعہ مسائل کو حل کرنا ہوگا جن میں مسئلہ کشمیر بھی شامل ہے۔ کشمیر کے تنازعہ کو ساتواں عشرہ شروع ہو چکا ہے اور اس معاملہ میں ہنوز روزِ اول ہے۔ اگر بھارت کو گزشتہ سات عشروں میں آمادہ نہیں کیا جا سکا کہ وہ اقوامِ متحدہ کی نگرانی میں کشمیر کے اندر رائے شماری کروائے تو آئندہ بھی اس کا کوئی امکان نہیں۔ یہ محض خوش فہمی ہے کہ ماضی کی طرح اگر پاکستان کی طرف سے ''کشمیر کشمیر'' کی گردان جاری رکھی گئی تو کسی روز کشمیر کا الحاق پاکستان سے ہو جائے گا اور بھارت کشمیر میں رائے شماری کے لیے اور وہ بھی اقوامِ متحدہ کی نگرانی میں تیار ہو جائے گا، البتہ پاکستان کے اس طرزِ عمل نے بھارت کے مسلمانوں کے لیے بے پناہ مشکلات ضرور پیدا کی ہیں اور آئندہ ان کی مشکلات میں چند در چند اضافہ ہی ہوگا۔

کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق 1947ء میں ہی ہو سکتا تھا جب ضلع گرداسپور کو تقسیم کے ابتدائی اعلان کے مطابق پاکستان میں شامل کیا گیا تھا۔ اگر بعد میں تقسیم کی اس تجویز کو تبدیل نہ کیا جاتا تو بھارت کو زمینی راستے سے کشمیر تک رسائی حاصل ہی نہیں تھی اور کشمیر کسی صورت میں بھارت کے ساتھ الحاق نہیں کر سکتا تھا۔ اور یہ الحاق اسی طرح ناقابلِ عمل ہو جاتا جس طرح جونا گڑھ اور منادر کا پاکستان کے ساتھ الحاق ناقابلِ عمل ہو گیا تھا۔ لیکن ہمارے ''قائدِ اعظم'' کی ہوسِ اقتدار نے ماؤنٹ بیٹن کو دھکیل کر بھارت کے کیمپ میں بھیج دیا۔ جب وہ بھارت کا گورنر جنرل ہی رہ گیا تو اس نے بھارت کے مفاد کے لیے وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتا تھا۔ اب اس بات کا قطعاً کوئی امکان نہیں کہ کشمیر کبھی پاکستان کا حصہ بن سکے۔

پاکستان کے ممتاز ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کئی سالوں سے روزنامہ جنگ میں مستقل کالم لکھ رہے ہیں۔ ان کا کالم ''سحر ہونے تک'' کے عنوان سے شائع ہوتا ہے۔ انھوں نے 9 ستمبر 2009ء کے کالم میں کشمیر کے بارہ میں بہت عمدہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ ہندستان کا بنیادی اصول یہ رہا ہے کہ کشمیر ہندستان کا اٹوٹ انگ یعنی ناقابلِ جدا حصہ ہے اور یہ کہ ہندستان بشمول کشمیر کی سرحد میں ایک انچ کا بھی ردّ و بدل نہ ہوگا......''

''حقیقت یہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر کے رہنماؤں کی سب سے بڑی غلطی یا بلنڈر یہ رہا ہے کہ انھوں نے بغیر سوچے سمجھے اپنی قسمت اور مستقبل کو پاکستان سے منسوب کر دیا ہے۔ اس وقت تک ستر ہزار سے لے کر تقریباً ایک لاکھ کشمیری نوجوان ہلاک ہو چکے ہیں اور حالات پہلے سے زیادہ مایوس کن ہیں۔ اگر مقبوضہ کشمیر کے تمام رہنماؤں کو حقیقت کا احساس ہوتا تو ان کو چاہیے تھا کہ سب مل کر الیکشن میں حصہ لیتے۔ لوگوں کو ثبوت دیتے کہ عوام کی اکثریت ان کے ساتھ ہے اور پھر متحد ہو کر اپنے حقوق مانگتے۔ ایک آزاد پالیسی بناتے اور زیادہ سے زیادہ اندرونی خود مختاری لے کر اپنے حالات پر خود کنٹرول رکھتے۔ اپنے عوام کی خدمت کرتے......''

اس کے بعد ڈاکٹر خاں صاحب کشمیری قیادت کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ پاکستان سے کیا لینا چاہتے ہیں، آمریت، ڈکٹیٹرشپ، لوٹ مار، رشوت ستانی اور لوٹا بازی۔ کوئی بھی جدوجہد اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتی جب تک کہ ایک طاقتور، بہادر، سنجیدہ ملک آپ کی کھل کر مسلسل مدد نہ کرتا رہے۔ پاکستان کو تو مشرف نے امریکہ اور ہندستان کے ہاتھوں کوڑی کے داموں بیچ دیا ہے۔ پاکستان کی اپنی حالت خستہ اور قابلِ رحم ہے۔ وہ آپ کی کیا مدد کرے گا۔''

اپنے کالم کو ڈاکٹر صاحب ان الفاظ کے ساتھ ختم کرتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ جہاں چند خود غرض، مفاد پرست اور شہرت کے بھوکے لیڈروں نے اپنے ہزاروں بے گناہ اور کم فہم عوام کا قتلِ عام کرا دیا اور خود عیش و عشرت سے زندگی گزارتے رہے۔''

ڈاکٹر عبدالقدیر خاں صاحب کا مذکورہ بالا تجزیہ اس قدر مبنی برحقائق ہے کہ اس سے اہلِ پاکستان کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں اور ان کو یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ''کشمیر، کشمیر'' کی گردان کرتے رہنے سے کشمیر کبھی پاکستان کا حصہ نہیں بن سکے گا، لیکن اس سے بھارت میں اشاعتِ اسلام کے

راستہ میں رکاوٹ ضرور پیدا ہوتی رہے گی۔ اس وقت کشمیر بھارت کا واحد صوبہ ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ بھارت سے کشمیر کی علیحدگی کے نتیجہ میں بھارت کے مسلمان مزید کمزور ہو جائیں گے، بلکہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ اس کے نتیجہ میں شدید مسلم کش فسادات ہوں اور جو تنظیمیں وہاں تبلیغِ اسلام میں مصروف ہیں اور اس کے اثرات بھی ظاہر ہو رہے ہیں ان کو شدید نقصان پہنچے۔ اس لیے کشمیر، کشمیر کی گردان ترک کر کے کشمیر کے مسلمانوں کو بھی یہ ہدف دیا جائے کہ وہ بھارت کو مسلم اکثریت کا ملک بنانے کی جدوجہد کریں۔

پاکستان کی حکومت اور پاکستان کے مسلمانوں کو یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنا ہوگی کہ برصغیر کو بالآخر مسلم اکثریت کا ملک بنانا ہے۔ آئندہ دس سالوں میں ایسا ہو جائے یا پچاس سالوں میں ہو۔ اسلام تمام دنیا کی طرح برصغیر کے باشندوں کا بھی مقدر ہے۔ ممکن ہے اس پالیسی سے وقتی طور پر کچھ نقصان ہوتا نظر آئے، لیکن آخر کار یہ پالیسی نفع بخش ثابت ہوگی۔ اس کے لیے شرط یہ ہے اور یہ شرط بہت کڑی ہے کہ برصغیر کے مسلمان خود کو داعیِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا سفیر سمجھیں۔ اس فرض کو ادا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں جو اللہ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر عائد کیا ہے۔ وہ فرض کیا ہے؟ ہر مسلمان اس سے آگاہ ہے۔ اس فرض کو نبی اکرمؐ نے ایک مختصر سی حدیث مبارکہ میں بیان کر دیا تھا کہ ''میری طرف سے پہنچاؤ خواہ وہ ایک آیت ہی ہو''۔ برصغیر کے مسلمانوں نے اس راستہ کو جو اللہ اور اس کے رسولِ مقبولؐ نے ان کے لیے مقرر کیا تھا۔ چھوڑ کر روافض کی قیادت میں جب دوسرے راستہ کو اختیار کر لیا تو پھر ان کے ساتھ وہی ہونا تھا جو ہوا اور ہو رہا ہے۔

ہماری قیادت سے جب بھی کوئی حماقت سرزد ہوتی ہے تو وہ صلح حدیبیہ کا حوالہ دیتے ہیں۔ جن حالات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ کا معاہدہ کیا، تقریباً اسی طرح کے حالات سے برصغیر کے مسلمانوں کو بھی سابقہ پیش آیا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت کے عرب میں دو فریقوں سے مقابلہ درپیش تھا۔ وہ دو حریف تھے، مشرکین مکہ اور یہود۔ نبی اکرمؐ نے معاہدہ حدیبیہ کے ذریعے دس سال کے لیے جنگ بندی کا معاہدہ کر کے مشرکین مکہ کو غیر جانب دار بنا لیا۔ اس کے بعد جو ہوا، وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ تاریخ کا ہر طالب علم اس سے آگاہ ہے، لہٰذا مجھے تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں کو بھی دو حریفوں سے سابقہ پڑا۔ وہ

حریف تھے مغرب کے یہود و نصاریٰ اور مشرق اور مشرق بعید کے مشرک ہندو اور مشرک بدھ۔ اگر برصغیر کے مسلمان بھی وہی حکمت عملی اختیار کرتے جو نبی اکرمؐ نے یہود اور مشرکین کے بارے میں اختیار کی تھی یعنی مشرق اور مشرق بعید کے مشرکین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے اور مغرب کے یہود و نصاریٰ کو اپنا دشمن سمجھتے جو فی الواقع مسلمانوں کے دشمن ہیں اور رہیں گے، بالیقین مشرق اور مشرق بعید کی اکثریت اب تک اسلام قبول کر چکی ہوتی، لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس۔ برصغیر کے مسلمانوں نے روافض، جو یہودیوں کے ایجنٹ ہیں، کی قیادت قبول کر کے اپنے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ بھارت کے کسی مسلمان سے معلوم کر لیجیے یا بنگلہ دیش کے کیمپوں میں 1972ء سے پڑے ہوئے کسی غیر بنگالی مسلمان سے دریافت کر لیجیے۔

میں قاری کے ذہن کو متوجہ کرنا چاہوں گا چنگیز خاں کی تاراجی کی طرف، جس میں تاتاریوں نے مسلمانوں کو کچل کر رکھ دیا۔ اس وقت بھی روافض نے تاتاریوں کی ہی مدد کی تھی۔ بالخصوص بغداد کو تباہ کروانے میں رافضی وزیر اعظم نے جو کردار ادا کیا تھا، اس سے تاریخ کا ہر طالب علم آگاہ ہے۔ تاتاریوں کی یلغار نے مسلمانوں کو ایسا تباہ و برباد کیا تھا کہ اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ کے اوراق میں دستیاب نہیں، کیا اس وقت کوئی شخص سوچ سکتا تھا کہ مسلمان کبھی دوبارہ بھی اٹھ سکیں گے؟ کیا اس تباہی کے بعد اسلام ختم ہو گیا یا مسلمان ختم ہو گئے؟ دنیا نے دیکھا کہ اس کے بعد کئی صدیوں تک عثمانی ترکوں نے اسلام کا علم بلند کیے رکھا۔ اسلام اللہ تعالیٰ کا دین برحق ہے اور اس کی تاثیر لازوال ہے۔ حیف ہے برصغیر کے مسلمانوں پر کہ وہ رافضی قیادت کے کہنے پر ہندو مذہب سے ڈر گئے کہ جس سے زیادہ بیہودہ، لغو اور غیر معقول (Irrational) مذہب دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔ ہندو اپنے مذہب کی کسی کو دعوت ہی نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو مذہب پھیلا نہیں، سمٹا ہے۔ جب مسلمان جزائر شرق الہند (موجودہ انڈونیشیا) کے ساحل پر جا کر اترے تھے تو انھوں نے دو قومی نظریہ کی دعوت نہیں دی تھی اور نہ وہ کثرت و قلت کی بحث میں ہی پڑے تھے۔ آج انڈونیشیا مسلم آبادی کا سب سے بڑا ملک ہے۔ اگر برصغیر کے مسلمان بھی دو قومی نظریہ اور کثرت و قلت کی بحث میں نہ پڑتے تو ممکن ہے اب تک برصغیر میں مسلمان اپنی اکثریت بنا چکے ہوتے۔

پاکستان کے مسلمانوں کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ کیا ان کے نزدیک اسلام بھی اسی طرح کا ایک

دھرم ہے۔ مسلمان بھی صرف پیدائشی مسلمان ہوتا ہے اور کوئی شخص کلمۂ توحید پڑھ کر مسلمان نہیں ہوسکتا، جس طرح کا ہندو مذہب ایک دھرم ہے اور ہندو صرف پیدائشی ہندو ہوتا ہے، کوئی شخص تبدیل (Convert) ہوکر ہندو نہیں ہوسکتا یا یہ کہ اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری برحق دین ہے اور پوری نوعِ انسانی اس کی مخاطب ہے جبکہ دنیا کا ہر مسلمان داعی و مبلغ ہے۔ اگر ان کا فیصلہ یہ ہو کہ اسلام ہی اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ دین ہے۔ اسلام اور صرف اسلام ہی برحق ہے اس کے علاوہ ہر مذہب باطل ہے تو پھر ان کو اس کے ابلاغ کے تقاضے بھی پورے کرنا ہوں گے۔ جغرافیائی حد بندیوں سے اوپر اٹھنا ہوگا۔ ممکن ہے اس میں وقتی طور پر مسلمانوں کو کچھ نقصان بھی اٹھانا پڑے، لیکن بالآخر فتح ان کی ہوگی۔ وہ دنیا میں بھی کامران ہوں گے اور آخرت میں بھی سرخرو ہوں گے۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِيْ أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ (آل عمران: ۱۴۷)



بنیاد پرستی اور جدوجہد آزادی*

میں نے یہ سطور ''روزنامہ خبریں'' لاہور، 17 مارچ 2001ء میں شائع شدہ مضمون ''بنیاد پرستی: تاریخ کے آئینہ میں'' سے تحریک پا کر سپردِ قلم کی ہیں۔ مذکورہ مضمون ڈان میں شائع شدہ اے. بی. ایس جعفری کے مضمون کا ترجمہ ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

''سب سے پہلے ہمیں اخلاقی جرأت کر کے اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ آزادی کی جدوجہد جو دس مارچ 1857ء سے 14 اگست 1947ء کے عرصہ پر محیط تھی اس میں مولویوں اور علمائے دین کا کیا حصہ تھا؟''

موصوف نے بہت عمدہ سوال اٹھایا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ سوال دیر سے اٹھایا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سوال اٹھانے کی اس سے قبل کسی نے جرأت ہی نہ کی ہو۔ واقعی ہمیں بحیثیت قوم تاریخی حقائق کو اسی طرح دیکھنا چاہیے جس طرح کہ وہ ہیں نہ کہ اس طرح جس طرح ہم دیکھنا چاہتے ہیں:

صورت شمشیر ہے دست قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زمان اپنے عمل کا حساب (اقبالؒ)

میرے نزدیک ہماری جدوجہد آزادی میں صرف علمائے کرام ہی نے حصہ لیا ہے۔ مسٹر صاحبان کا اس میں حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں کی آزادی کے دو ادوار ہیں۔ پہلا دور 1857ء سے شروع ہوتا ہے اور مارچ 1940ء پر ختم ہو جاتا ہے۔ دوسرا دور مارچ 1940ء سے شروع ہوتا ہے اور 14 اگست 1947ء پر ختم

* یہ مضمون روزنامہ خبریں لاہور میں شائع ہو چکا ہے۔

ہو جاتا ہے۔

1857ء کے جہادِ آزادی میں بھی علمائے کرام نے نمایاں حصہ لیا اور جب اس میں ناکامی ہوئی تو انھیں پھانسی اور حبسِ دوام کی سزائیں ہوئیں چند ایک فرار ہو کر دوسرے ممالک میں چلے گئے۔ ہندستان سے ہجرت کرنے والوں میں ایک نمایاں نام مولانا رحمت اللہ کیرانوی کا ہے۔ 1857ء کے جہادِ آزادی کی قیادت علمائے کرام ہی کر رہے تھے اور یہ ان کا فرض بھی تھا کیونکہ انگریزوں کی آمد کے ساتھ وہ فلسفہ بھی چلا آ رہا تھا جس نے انسان کو بندر کی ترقی یافتہ شکل قرار دے دیا تھا اور جس سے متاثر ہو کر بہت سے مسٹر صاحبان نہ مسلمان رہے نہ مرتد۔ ان لوگوں نے مسٹر کہلانے کی ترنگ میں دینِ حق کی بنیادی اقدار و روایات سے انحراف کی روش اختیار کر لی۔ قلب و نظر سے تو مرتد ہو گئے لیکن عملاً مسلمانوں میں شامل رہے۔ وہ فرائض سے تو غافل ہو گئے، لیکن مسلمان معاشرے سے اپنے حقوق برابر وصول کرتے رہے جس کی ایک نمائندہ مثال جسٹس محمد منیر تھے جو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے پہلے چیف جسٹس بنے۔ ان کا حال جناب الطاف گوہر نے اپنے ایک مضمون بعنوان ''گوہر گزشت'' مطبوعہ روزنامہ نوائے وقت، لاہور، 29 اگست 1999ء میں اس طرح بیان کیا ہے:

''مجھے خبر ملی کہ جسٹس منیر بیمار ہیں اور ان کے صحت یاب ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ میں عیادت کے لیے ان کے گھر گیا۔ انھوں نے مجھے اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھا لیا۔ باتیں کرتے کرتے انھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ ''الطاف گوہر! تمھیں معلوم ہے کہ خدا کے وجود کے بارے میں میرے دل میں کئی سوال ہیں۔ موت کے بعد اگر میرا اللہ تعالیٰ سے سامنا ہوا تو میں کیا کروں گا؟'' میں نے عرض کیا کہ ''آپ عمر بھر توہینِ عدالت کے مقدمات سنتے رہے ہیں۔ توہینِ عدالت کے مقدمہ کی سماعت اس وقت تک شروع نہیں ہوتی جب تک ملزم اپنے جرم کا اعتراف نہ کر لے۔ آپ بھی یہی کیجیے۔ خداوند کریم کے سامنے پیش ہوتے ہی اپنے جرم کا اعتراف کر لیجیے اور اپنے آپ کو خالقِ دو جہاں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیجیے۔ وہ بڑا تواب الرحیم ہے''۔ منیر صاحب کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ آپ نے میرا کندھا تھپتھپایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ چند روز بعد آپ وفات پا گئے''۔

مسٹر صاحبان کی اکثریت کا یہی حال تھا (الا ماشاءاللہ)۔ جسٹس منیر تو تمام عمر اقرار و انکار کے مابین جھولتے ہی رہے۔ یہی وہ ذات شریف ہیں جنھوں نے 1953ء کی تحریک ختم نبوت پر انکوائری کمیٹی کی سربراہی فرمائی۔ انکوائری کے دوران میں مسلمان کی تعریف کا سوال اٹھایا۔ علما نے مختلف جوابات دیے۔ موصوف یہ بھول گئے کہ دنیا میں ہر چیز، ہر مظہر، ہر نظریے اور ہر عقیدے کی جب بھی تعریف کی گئی، ہر شخص نے مختلف لفظوں میں تعریف کی۔ انھوں نے علماء کے لفظی اختلاف پر وہ طوفان اٹھایا کہ پناہ بہ خدا۔ موصوف کو مذہب کا مذاق اڑانے کا بہانہ ہاتھ آیا تھا۔ انھوں نے علما اور دین سبھی کا مذاق اڑایا اور اپنے ذوقِ انکار کی تسکین فرمائی۔ آں موصوف جناح صاحب کے سیکولرزم کے بہت حامی تھے۔ ہمیں یقین ہے کہ جناح سیکولر تھے؛ ان کی زندگی اس بات کی گواہ تھی، مگر موصوف نے یہ نہ بتایا کہ وہ دوقومی نظریے کی وکالت کیوں کرتے رہے۔ صرف اس لیے کہ وہ گورنر جنرل بن سکیں اور آئندہ نسلیں امریکا اور فوجی جرنیلوں کے پاس گروی رکھی جا سکیں۔ ہم آج بھی مسٹر جناح کی خارجہ پالیسی کے پیدا کردہ الجھاوؤں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ہمارا ملک امریکا بہادر کے حضور گروی رکھا تھا۔ جسٹس منیر نے اس نکتے پر ایک حرف بھی نہیں لکھا۔ کاش ہمارے ملک کے بڑے لوگ سچ بولنا شروع کر دیتے! اے کاش!!— جسٹس منیر ہمارے ملک میں مقدموں کے عدالتی قتل کے بانی بھی ہیں۔ انھوں نے نظریۂ ضرورت کے نام پر اسمبلی کے قتل کو جواز بخشا تھا۔ یہی نظریۂ ضرورت ہماری عدلیہ کی مشترکہ میراث ہے۔ اب تک جتنی اسمبلیوں کا قتل ہوا، ان سب کا خون انھی کے سر جاتا ہے۔

علمائے کرام نے 1857ء کے بعد انگریز حکومت سے بغاوت کی ایک اور کوشش کی، اس کے لیے انھوں نے جگہ کا انتخاب ہندستان کی شمال مغربی سرحد کا کیا اور باقاعدہ ہتھیار اٹھا لیے۔ اس کے لیے امداد پورے ہندستان کے علماء کی طرف سے کی جا رہی تھی۔ یہ 64-1863ء کی بات ہے۔ یہ کوشش کچھ اپنوں کی غداری اور کچھ اپنی بے تدبیری سے ناکام ہو گئی اور علمائے کرام کو پھانسی اور حبسِ دوام کی سزائیں ہوئیں۔ ان سزا پانے والوں میں مولانا محمد جعفر تھانیسری بھی شامل تھے۔ سزا سنائے جانے کے بعد اُن کے ساتھ کیا ہوا؟ وہ بیان کرتے ہیں:

''22 فروری 1865ء کو ہم جیل لاہور کو روانہ ہوئے۔ جوگیانہ گیروا لباس کالا کمبل اوڑھے ہوئے۔ بیڑی ہتھ کڑی کے زیور سے آراستہ پیراستہ ہم منزل در منزل اور کوچ

درکوچ لاہور کو چلے جاتے تھے۔ دو ایک گاڑیاں بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ بقدر تیس چالیس قیدیوں کے ہم جیل انبالہ سے روانہ ہوئے تھے۔ سب پاپیادہ چلتے تھے۔ جب کوئی تھک جاتا تو اُس کو گاڑی پر بھی سوار کر لیتے تھے ورنہ سب کے سب پاپیادہ خلخال کو چھن چھناتے چلے جاتے تھے۔ خیر سوا برس کے بعد جو ہم نے باہر کی ہوا کھائی تو طبیعت نہایت خوش تھی اور راستے میں جو چاہتے سو خرید کر کھاتے۔ اور مولوی یحییٰ علی صاحب کی ہردم مصاحبت میں رہے۔ اس سبب سے ہم کو تو اس سفر میں بھی دن عید اور رات شب برات ہو گئی تھی۔

ہم جو ایک مدت دراز کے بعد جیل کی تنگ تاریک کوٹھڑیوں سے باہر میدان میں پہنچے تو ہم ہرنوں کی طرح اڑے جاتے تھے۔ جن جن قیدیوں کے پاس کچھ نقد تھا ان کا جو کچھ جی چاہتا تھا راہ میں خرید کر کھاتے اور خوشی مناتے چلے جاتے تھے۔ لدھیانہ، پھلور، جالندھر، امرت سر ہوتے ہوتے لاہور پہنچے۔ اخیر منزل پر لاہور میں شالامار باغ کے سامنے ہر کسی نے اپنا اپنا من بھر کر جو چاہا سو کھایا۔ کیونکہ جیل میں جا کر تو سوائے معمولی کھانے کے اور چیزیں ملنی محال بلکہ جرم تھیں۔ قریب تین بجے شام کے ہم لوگ سنٹرل جیل لاہور کے دروازہ پر پہنچے اور ہمارے چالان کے کل قیدی ایک قطار کر کے دروازۂ جیل پر بٹھلا دیے گئے۔ اوّل ایک کشمیری ہندو داروغہ آیا تھا اُس نے پہلے ہمارے مقدمہ والوں کو بغور تمام دیکھا اور کسی قدر افسوس بھی کیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر گرے صاحب سپرنٹنڈنٹ جیل رونق افروز ہوئے۔ انھوں نے سب سے اوّل ہم لوگوں کا ملاحظہ کیا اور بڑے غصہ سے حکم دیا کہ ایک ایک آڑا ڈنڈا بھی ان لوگوں کے پاؤں میں ڈال دو۔ چنانچہ بمجرد صدور اس حکم کے لوہار ڈنڈے آہنی لے کر حاضر ہو گئے اور ہمارے دونوں پاؤں کے دونوں کڑوں کے درمیان سے ایک ایک آڑا ڈنڈا جو ایک فٹ (۵ گرہ) سے زیادہ لمبا نہ تھا ڈال دیا گیا۔ یہ حکم ازراہِ تعصب فقط ہم ہی لوگوں کے واسطے تھا اور تمام جیل بھر میں ہم نے کسی اور قیدی کے پاؤں میں یہ ڈنڈا نہیں دیکھا۔ چلنا پھرنا اُٹھنا بیٹھنا نہایت مشکل ہو گیا۔ اور رات کو پاؤں پسار کر سونا بھی محال تھا۔

اپنے سفر کے اگلے مرحلہ کے بارے میں وہ بیان کرتے ہیں:

اخیر اکتوبر 1865ء میں ایک بڑا بھاری چالان قیدیوں کا تیار ہو کر ملتان کو روانہ کرنے کا بندوبست ہوا۔ ایک ایک ہتھکڑی دو دو آدمیوں کے ہاتھوں میں لگائی گئی۔ میرے ساتھی نے مجھ سے یہ رعایت کی کہ میرا بایاں اور اپنا داہنا ہاتھ ہتھکڑی میں ڈلوایا۔ ہمارے مقدمہ کے فقط تین آدمی یعنی میں اور مولوی یحییٰ علی صاحب اور میاں عبدالغفار صاحب ملتان کو روانہ ہوئے۔ جس دن ہم لاہور سے روانہ ہوئے ریل کے اسٹیشن تک پاؤں میں بیڑی، سر پر بسترہ جس کو ایک ہاتھ سے تھامے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں ہتھکڑی کی کھچوٹ، اس پر سپاہیوں کی مارا مار کہ جلدی چلو جلدی چلو ریل چلی جاوے گی۔ خیر بہر صورت ہم ریل تک پہنچے، وہاں جا کر ریل کی کوٹھڑیوں میں ہم کو بند کر کے قفل لگا دیا اور لاہور سے ملتان تک راہ میں کہیں نہ کھولا، مثل جانوروں مال گاڑیوں میں بھر دیا تھا۔ کوئی آٹھ بجے رات کے بعد ہم ملتان پہنچے۔ وہاں بھی اندھیری رات میں سر پر بستر رکھے ہوئے کشاں کشاں اسٹیشن سے جیل تک پہنچے جہاں بے آب و دانہ مثل جانوروں کے رات کو بند کر دیے گئے۔ دو دن ہم جیل ملتان میں رہے۔ شہر کدھر بستا ہے، بازار کہاں ہے وہ ہم نے آنکھ سے نہیں دیکھا۔ دو روز بعد وہاں سے لے جا کر ایک پتن یا گھاٹ دریائے سندھ پر جو ملتان سے قریب پانچ کوس ہے ہم کو اگنبوٹ پر سوار کرایا۔ سوار کرانے کے بعد ہم سب کو قطار قطار کر کے اس پر بٹھلا دیا اور سوائے بیڑی ہتھکڑی اور ڈنڈے کے جو پہلے سے زیب تن تھے یہاں ایک بڑی موٹی زنجیر آہنی بھی بیڑیوں کے بیچ میں پھنسائی گئی کہ جس سے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہوئے پاخانہ پیشاب کرتے رہے۔ اس وقت قریب آدھا آدھا من کے لوہا ہمارے جسم پر تھا۔ باوجود اس قدر کثرت پانی کے کہ دریائے سندھ ہمارے زیر پا تھا ہم پڑے پڑے تیمم سے نماز پڑھتے تھے گو ہم جکڑے ہوئے پڑے تھے مگر جیل سے نکل کر اور دوستوں کی مصاحبت اور آب دریا کی روانی اور آس پاس کے جنگلوں کی سبزی دیکھ کر بہت بشاش تھے۔ اس کیفیت سے پانچ چھ روز بعد ہم کوٹلی (موجودہ ''کوٹری'' راقم) پہنچ گئے۔ سکھر بکھر اور ٹھٹھے کا نامی قلعہ بھی ہم کو راہ میں سندھ کے کنارے پر ملا۔ کوٹلی کے سامنے دوسرے کنارہ دریائے سندھ پر حیدرآباد سندھ کی

نامی بستی بھی دیکھنے میں آئی۔ کوٹلی سے اسی دن ریل میں سوار ہو کر ہم کراچی پہنچ گئے۔''

سزا پانے والوں میں مولانا محمد جعفر تھانیسری کے ساتھ مولانا یحییٰ علی بھی تھے، ان حضرات کو ایک پرمشقت سفر کے بعد بالآخر جنوری 1866ء میں پورٹ بلیر انڈیمان پہنچا دیا گیا۔ جہاں جرم بغاوت میں گرفتار مولانا احمد اللہ اور دیگر ساتھی پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ ان باغیوں میں کوئی بھی مسٹر نہیں تھا۔ سب مولوی ہی تھے۔ تفصیل کے لیے مولانا محمد جعفر تھانیسری کی خودنوشت تواریخ عجیب المعروف بہ کالا پانی کا مطالعہ کیا جائے۔

بیسوی صدی کے شروع میں علمائے کرام نے انگریز سے نجات کے لیے ایک اور کوشش کی۔ یہ تحریک ریشمی رومال تھی۔ یہ تحریک بھی منصوبہ بندی کی بعض خامیوں اور کچھ غدار مسلمانوں کی غداری کی وجہ سے ناکام ہوگئی۔ تمام کارکن گرفتار ہو گئے اور لمبی سزاؤں کے سزاوار ٹھہرے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن اگرچہ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تھے، لیکن شریف مکہ نے انگریزی حکومت کی استدعا پر انھیں اور اُن کے رفقا مولانا سیّد حسین احمد مدنی، مولانا عزیر گل، مولانا وحید احمد اور مولانا حکیم نصرت حسین کو گرفتار کروا دیا اور وہ کئی سال جزیرہ مالٹا میں قید رہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے بھی ساری جوانی ملک ملک پھر کر جلاوطنی میں گزار دی وہ بڑھاپے میں واپس آئے۔ تفصیلات کے لیے مولانا سیّد حسین احمد مدنی کی خودنوشت آپ بیتی نقش حیات، مولانا سیّد محمد میاں دہلوی کی کتابیں: تحریک ریشمی رومال، اسیران مالٹا اور مولانا عبید اللہ سندھی کی کتاب کابل میں سات سال (مرتبہ: پروفیسر محمد سرور) ملاحظہ فرمائیں۔ یہ سب کتابیں قابلِ مطالعہ ہیں۔

بہرحال انگریزوں کو ہندستان سے بے دخل کرنے کی جتنی بھی کوششیں کی گئیں وہ مسلمانوں میں سے تمام کی تمام علمائے کرام کی طرف سے ہی کی گئیں۔ کسی مسٹر کا اس میں کوئی حصہ نظر نہیں آتا۔ مسٹر صاحبان تو اس دوران میں پوری کوشش کرتے رہے کہ اگر رنگ کے لحاظ سے نہیں تو دوسرے ہر لحاظ سے وہ انگریز بن جائیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں انگریزوں نے اس لیے ترقی کی تھی کہ وہ بائیں سے دائیں کو لکھتے تھے۔ بائیں ہاتھ سے کھاتے تھے۔ کھڑے ہو کر پیشاب کرتے تھے اور استنجا کرتے وقت پانی کا استعمال نہیں کرتے تھے۔

1939ء میں دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو یہ واضح ہو گیا تھا کہ انگریز اس جنگ میں

کامیاب ہوں یا ناکام، جنگ کے بعد انھیں ہندستان سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ اب ہماری آزادی کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ جب یہ بات تقریباً طے ہوگئی کہ جنگ کے بعد ہندستان آزاد ہو جائے گا تو ہمارے لیڈروں نے یہ مطالبہ کر دیا کہ انگریز اگر جانا چاہتے ہیں تو ہندستان تقسیم کر کے جائیں اس مطالبہ کے اندر یہ بات مضمر تھی کہ انگریز اگر مزید سو سال بھی یہاں حکومت کرنا چاہتے ہیں تو کرتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مطالبہ سے انگریز کو کیا تکلیف ہو سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیم ہند کا مطالبہ کرنے والوں نے جیل کا پھاٹک بھی نہیں دیکھا، جبکہ مجاہدین آزادی کی آدھی آدھی عمریں جیلوں میں گزر گئی تھیں۔ جب مجاہدین آزادی جیلیں کاٹ رہے تھے اور انگریز کی عدالتوں میں اپنا دفاع بھی نہیں کر رہے تھے تو ہمارے ہیرو انھیں عدالتوں میں اپنی وکالتوں کے جوہر دکھا دکھا کر مال بنا رہے تھے۔ یہ کہنا کہ انگریز ہندستان کو متحد حالت میں چھوڑ کر جانا چاہتے تھے کیونکہ تاریخ میں پہلی دفعہ انگریزوں نے ہندستان کو طورخم سے راس کماری تک اور کوئٹہ سے برما کے بارڈر تک ایک سیاسی وحدت بنا دیا تھا، یہ صرف ایک خیال ہے۔ چنانچہ جب برصغیر ہندستان ایک سے دو ملک بن گئے تو انگریزوں کی صحت پر کیا اثر ہوا اور جب دو سے تین ملک بن گئے تو بھی انھوں نے نہیں پوچھا کہ بھیا کیسی۔ اگر برصغیر ہندستان تیس حصوں میں بھی تقسیم ہو جاتا تو انگریزوں کی بلا سے۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیم ہند کا مطالبہ کرنے والوں کا تو کبھی قمیص کا کالر بھی میلا نہیں ہوا تھا۔ آزادی کے لیے کوئی صعوبت اٹھانا تو بہت دور کی بات ہے۔

یہ درست ہے کہ مولانا سیّد حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سیّد عطا اللہ شاہ بخاری اور دیگر علمائے کرام، جنھوں نے آزادی کے لیے اپنی آدھی سے زیادہ زندگی جیل میں گزاری تھی تقسیم ہند کے مخالف تھے، لیکن کیوں؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ان لوگوں کے مقابلہ میں محمد علی جناح، لیاقت علی خاں، حسین شہید سہروردی، چودھری خلیق الزمان، نواب افتخار حسین ممدوٹ، ممتاز دولتانہ، ایوب کھوڑو اسلام کا علم بھی زیادہ رکھتے ہوں اور مسلمانوں کے ہمدرد بھی زیادہ ہوں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہ سب اکابر جو عقل سے پیدل بھی نہ تھے اور آزادی کے لیے سختیاں بھی برداشت کر چکے تھے تقسیم ہند کے مخالف تھے؟ میں نے تحریک پاکستان کو دیکھا نہیں کتابوں میں پڑھا ہے، البتہ تقسیم ہند کا مجھے ہوش ضرور ہے۔ میں نے ان لوگوں کے نقطۂ نظر سے مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ تقسیم ہند کی تجویز غالباً ان کو اس لیے اپیل کر سکی:

1) اس تجویز کے اندر یہ بات مضمر تھی کہ اسلام اپنی قوت تاثیر کھو چکا ہے لہٰذا ہندستان میں مسلمان اب قیامت تک اقلیت میں ہی رہیں گے، اس لیے جہاں جہاں اتفاق سے نہ کہ اسلام کی قوت تاثیر کی وجہ سے مسلمانوں کی اکثریت ہے، ان علاقوں کو انگریزوں سے علیحدہ کروا لیا جاوے۔ یہ ایسی بات ہے جو کوئی بھی مسلمان بسلامتی ایمان وبقائمی ہوش وحواس تسلیم نہیں کرسکتا۔ اسلام میں آج بھی وہی قوت تاثیر ہے جو پہلی صدی ہجری میں تھی۔ قصور اگر ہے تو ہم مسلمانوں کا ہے جو اسلام کی نمائندگی کر رہے ہیں۔

2) اس تجویز کے اندر یہ بات بھی مضمر تھی کہ مسلمان جب ان علاقوں پر حکومت کرتے رہے جہاں ان کی اکثریت نہیں تھی تو وہ ظلم کرتے رہے۔ اسے بھی کوئی شخص بقائمی ہوش وحواس تسلیم نہیں کرسکتا۔ مسلمانوں میں جب تک جوہر تھا وہ حکومت کرتے رہے، لیکن جب انھوں نے حکمرانی کی صفات کھودیں تو غلام ہوگئے۔ انھوں نے تو غلام ہونا ہی تھا۔ انگریزوں کے نہ ہوتے تو کسی اور کے ہوجاتے۔ احمد شاہ ابدالی نے اگر مرہٹوں کی کمر نہ توڑ دی ہوتی تو مسلمان انگریز سے بھی پہلے ہندو کے غلام ہوجاتے۔ چونکہ قیام پاکستان کے بعد بھی ہم نے اپنے اندر وہ جوہر پیدا نہیں کیے جو ایک آزاد اقوام کا خاصہ ہوتے ہیں تو ہم پھر سے غلام ہوگئے ہیں اور یہ غلامی آئی۔ ایم۔ ایف اور عالمی بینک کی ہے۔ جیسے ہی ان لوگوں کی طرف سے کوئی ہدایت آتی ہے ہماری پوری حکومت اس کی تعمیل میں لگ جاتی ہے بلکہ ہمارا وزیر خزانہ تو ہوتا ہی ان کا نمائندہ (پروردہ) ہے۔

3) ایک وجہ یہ بھی کہ پاکستان کے لیے جو قیمت ادا کی گئی، اس قیمت پر تو اگر پورا کرۂ ارض بھی پاکستان بن رہا ہوتا تو ایک غیرت مند مسلمان کو قبول نہیں ہوسکتا تھا۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کو جس طرح ذبح کیا گیا اور مسلمان عورتوں کو جس پیمانے پر بے آبرو کیا گیا۔ تاریخ میں اس سے قبل اس کی کوئی مثال موجود نہیں۔ ہر انصاف پسند شخص سے میرا دردمندانہ مگر مبنی برحقیقت سوال ہے کہ کیا ہماری قیادت کو اندازہ تھا کہ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے ساتھ یہ ہوگا؟ اگر اندازہ تھا تو اس کا تدارک کرنے کے لیے ہماری قیادت نے کیا بندوبست کیا؟ اگر اندازہ نہیں تھا تو اس سے زیادہ بے بصیرت قیادت کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ تقسیم ہند کا مطالبہ تو ہم نے انگریز سے کیا۔ اس کی مخالفت اگر کوئی کر رہا تھا تو وہ ہندو تھا، لیکن بیٹیاں ہماری سکھ اٹھا کر لے گئے۔ سکھ توحید پرست ہیں۔ ان کی عبادت گاہ میں بت نہیں ہوتے جس طرح کہ مندروں میں

ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے سکھ مسلمانوں کے زیادہ قریب ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ قادیانی سرظفر اللہ خاں کی پاکستان کے لیے کیا خدمات تھیں کہ اسے پاکستان کا وزیر خارجہ بنادیا گیا۔ ہندو جوگندر ناتھ منڈل کی کیا خدمات تھیں کہ اسے مرکزی کابینہ میں وزیر قانون بنادیا گیا (یہ شخص وزارت سے مستعفی ہوئے بغیر ہی ہندستان چلا گیا تھا اور وہاں کی شہریت اختیار کرلی تھی۔ یہ تھا ہماری قیادت کا حسن انتخاب)۔ اگر ظفر اللہ جیسے مرتد کو اور منڈل جیسے مشرک ہندو کو وزیر بنایا جاسکتا تھا تو ماسٹر تارا سنگھ کو کیوں وزیر نہیں بنایا جاسکتا تھا؟ اس طرح ہم اس تباہی سے تو بچ سکتے تھے جس سے ہم مشرقی پنجاب میں دوچار ہوئے۔ برصغیر 1947ء میں تقسیم ہوا اور فلسطین 1948ء میں تقسیم ہوا۔ دونوں جگہ انگریز حکمرانوں کے ہاتھ سے تقسیم ہوئی۔ جب فلسطین کی تقسیم اور اسرائیل کے قیام کا اصولی فیصلہ ہوگیا تو اردگرد کی عرب ریاستوں نے اعلان کردیا کہ جونہی اسرائیل کے قیام کا اعلان ہوگا، وہ اس پر حملہ کردیں گے۔ چنانچہ انگریز انتقال اقتدار میں تاخیر کرنے لگ گئے تاکہ یہودی قیادت مناسب تیاری کرسکے۔ یہودی قیادت کو جب تاخیر کی وجہ معلوم ہوئی تو انھوں نے انگریز حکمرانوں سے کہا کہ آپ اقتدار منتقل کر کے رخصت ہوں اس کے بعد ہم جانیں اور عرب ممالک۔ چنانچہ جوں ہی اسرائیل کے قیام کا اعلان ہوا تمام پڑوسی عرب ممالک نے اسرائیل پر حملہ کردیا۔ اسرائیل نے تمام حملے نہ صرف پسپا کیے، بلکہ عرب ممالک کی افواج کی کافی ٹھکائی کی۔ یہ ہوتی ہے پیش بینی اور منصوبہ بندی۔ میرا سوال یہ ہے کہ ہماری قیادت نے کیا تیاری کی تھی کہ اگر مسلمانوں کو وہ پورا علاقہ نہ ملا، جس کا وہ مطالبہ کر رہے تھے تو وہ اس کا متبادل حل کیا تلاش کریں گے۔ اگر انگریز پاکستان کی سرحد اٹک کے پل کو بنادیتے تو کیا ہماری قیادت ہتھیار اٹھا لیتی؟

آزادی حاصل کرنے والی قیادت کا یہ حال نہیں ہوتا۔ انھیں اگر آزادی مذاکرات کی میز پر نہ ملے تو وہ بندوق کے زور سے حاصل کرلیا کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ جو مل گیا اسے صبر شکر کے ساتھ قبول کرلیا۔ بہرحال ہندستان تقسیم ہوگیا اور پاکستان بن گیا اور ہماری قیادت کا کمال یہ ہے کہ اس پوری جدوجہد میں اس نے اپنے کالر تک کو میلا نہیں ہونے دیا۔ قربانی تو بہت دور کی بات ہے۔

پاکستان بننے کے بعد سے آج تک مسٹر صاحبان ہی اس کے حکمران رہے ہیں۔ اس ملک کا جو حشر کیا گیا ہے اس پر بات نہ ہی کی جائے تو بہتر ہے۔ انگریز نے جب برصغیر میں ریلوے لائن بچھانی شروع کی تھی تو ان کی رفتار ایک ہزار میل فی سال تھی۔ پاکستان کے حصے میں جو ریلوے لائن

آئی تھی اس کا جو حال ہم نے کیا ہے وہ سب کو معلوم ہے، ہم تو اس کی مناسب دیکھ بھال بھی نہ کر سکے اس میں اضافہ تو کیا کرنا تھا۔ ملک تو بہر حال ریلوے سے زیادہ بڑا ادارہ ہوتا ہے، خواہ کتنا ہی چھوٹا ملک کیوں نہ ہو۔ مسٹر صاحبان کے طفیل ہی ہم پر ایک ناکام ریاست کی پھبتی کسی جاتی ہے۔ آج تک کوئی مولوی تو اس ملک کا حکمران نہیں رہا۔ مسٹر صاحبان نے حال یہ کر دیا ہے کہ کشکول گدائی ہاتھ میں ہے۔ سیاسی میدان میں ہم نے اس ملک کو تجربہ گاہ بنا دیا ہے۔ کبھی ہم پارلیمانی نظام لاتے ہیں تو کبھی صدارتی اور کبھی مارشل لاء اور پھر پارلیمانی۔ سولہ تو ہم اس کے دستور بنا چکے ہیں۔ جس بھونڈے طریقے سے ہم نے مشرقی پاکستان کو علیحدہ کیا ہے اس پر تو ڈوب کر مر جانا چاہیے۔ بے حسی کا عالم یہ ہے کہ 1972ء سے لاکھوں پاکستانی بنگلہ دیش کے کیمپوں میں پڑے ہیں اور ہم انھیں پاکستان نہیں لا رہے۔ ہم انھیں اس بات کی سزا دے رہے ہیں کہ انھوں نے 1946ء میں پاکستان کو ووٹ کیوں دیا تھا۔ سنگاپور اور ملائشیا میں بھی علیحدگی ہوئی ہے اور کسی کو یہ بھی یاد نہیں کہ وہ کب ایک سے دو ملک بن گئے۔ ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ۔ 1983ء میں مجھے امریکا جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ پاکستان میں مارشل لا کیوں نافذ ہے؟ میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اب پانی کا قحط سامنے ہے۔ پنجاب کے تین دریاؤں سے ہم اس طرح دستبردار ہو گئے جیسے کوئی باپ کی وراثت سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ اگر دستبردار نہ ہوتے تو بھی کیا فرق پڑتا۔ ہم کشمیر سے دستبردار نہیں ہوئے تو کون سا کشمیر ہمیں مل گیا ہے۔

یہ بنیاد پرست بھی خوب اصطلاح ہے۔ اسے یورپ نے تراشا ہے اور ہمارے دانش ور صاحبان نے اس کی جگالی شروع کر دی ہے۔ ایک شخص یا تو مسلمان ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ اگر وہ مسلمان ہے تو لازمی طور پر اسلام کے بنیادی عقائد اس کے ایمان کا حصہ ہوں گے۔ وہ نماز کا پابند ہوگا، زکوٰۃ ادا کرتا ہوگا، سود سے پرہیز کرتا ہوگا اور مکروہات سے دامن بچاتا ہوگا۔ اگر یہ بنیادی عقائد کسی شخص کے ایمان کا حصہ نہیں ہیں تو وہ مسلمان ہی نہیں ہے۔ ہمارے دانش ور حضرات کے نزدیک غیر بنیاد پرست مسلمان شاید وہ ہے جس کا اسلام کے بنیادی عقائد میں سے کسی پر بھی ایمان نہ ہو۔ صرف اس کا نام مسلمانوں جیسا ہو (ایسے شخص کو اسلام میں منافق کہتے ہیں)۔ ہمارے دانش ور اور ان کے مغربی آقا غالباً ایسے ہی مسلمان چاہتے ہیں۔ ایسے مسلمانوں کے

راستے میں مولوی (خواہ ڈاڑھی والا ہو خواہ بغیر ڈاڑھی کے) ہمیشہ ایک بہت بڑی رکاوٹ رہا ہے اور رہے گا خواہ جعفری صاحب جیسے دانش وروں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گزرے۔ اگرچہ اس موضوع پر مزید بہت کچھ کہا اور لکھا جا سکتا ہے، لیکن فی الحال اسی قدر، مزید پھر کبھی سہی۔



اسلام، پاکستان اور روح عصر *

14 اگست 2003ء کے تقریباً تمام اخبارات میں جناب حنیف رامے کا ایک مضمون بعنوان ''پاکستان کا مطلب کیا؟'' شائع ہوا۔ جناب حنیف رامے پاکستان کے معروف دانش ور اور مصور تھے۔ ایک وقت میں اگر وہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے تو ایک وقت ان پر ایسا بھی آیا کہ وہ شاہ کے مصاحب نہ رہے اور ان کو سلاخوں کے پیچھے بھی جانا پڑا۔ رامے صاحب کا شمار ان لوگوں میں کیا جاتا رہا ہے جو اس ملک میں ترقی پسند افکار کی ترویج میں مصروف رہے ہیں۔ میری خواہش تھی کہ ملک کے اہل قلم رامے صاحب کے ارشادات کا جائزہ لیتے اور پاکستان کے لوگوں کو اس موضوع پر فکری راہنمائی فراہم کرتے۔ کسی وجہ سے رامے صاحب کے خیالات کو اہل دانش نے وہ اہمیت نہیں دی جس کے وہ مستحق تھے۔ رامے صاحب فرماتے ہیں:

> ''اول اگر پاکستان اسی اسلام کو نافذ کرنے کے لیے بنا تھا جس کی علمبردار ہماری مذہبی جماعتیں ہیں تو پھر یہ دوگوئی کی انتہا ہے کہ انھی جماعتوں نے قیام پاکستان کی کھلم کھلا مخالفت کی۔ دوم اگر ان مذہبی جماعتوں کی مخالفت برحق تھی تو پھر تاریخ یہ گواہی دے رہی ہے کہ پاکستان کا مقصد اسلام کی اس شکل کو نافذ کرنا نہیں تھا جو یہ جماعتیں پیش کرتی ہیں''۔

رامے صاحب کے یہ ارشادات ابہام سے مملو ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ رامے صاحب کے نزدیک اسلام کی بھی کئی شکلیں اور کئی بہروپ ہیں۔ مذہبی جماعتوں کے نزدیک اسلام کی جو بھی شکل ہے، رامے صاحب کے خیال میں وہ غیر مذہبی جماعتوں کے اسلام سے مختلف ہے۔ حالانکہ

---

* یہ مضمون روزنامہ پاکستان لاہور میں شائع ہو چکا ہے۔

اسلام کی تو ایک ہی شکل ہے اور ہمیشہ سے ایک تھی اور ہمیشہ ایک رہے گی۔ جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان فرمادیا ہے اور اس کے رسول مقبولؐ نے اپنی زندگی سے اس کا عملی نمونہ پیش کردیا اور خلفائے راشدین نے اس میں کتاب اور سنت کی روشنی میں جزئیات کے رنگ بھرے اور اس راہ میں تین خلفائے راشدین شہید تو ہو گئے لیکن اُسوۂ رسول ﷺ سے انحراف قبول نہ کیا۔ خلفائے راشدین کے لیے کیا مشکل تھا کہ وہ بھی فیڈرل سیکورٹی فورس کھڑی کرلیتے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ خلفائے راشدین نے جو نمونہ پیش کردیا ہے وہ اتنا بلند ہے کہ انسانیت اس کی طرف پیش قدمی تو کرتی رہے گی، لیکن کبھی اس تک رسائی حاصل نہ کرسکے گی۔ اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے اس ساخت کے لوگ نہ پہلے پیدا ہوئے اور نہ دوبارہ پیدا ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اس عہد کو خیر القرون یقین کرتے ہوئے اسے دوبارہ حاصل کرنے کی تمنا اور جدوجہد کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ یہ درست ہے کہ بعض (سب نے نہیں) مذہبی جماعتوں نے تقسیم ہند کی مخالفت کی تھی، لیکن کیا صرف اس وجہ سے ان جماعتوں کو پاکستان کے شہری حقوق سے محروم کیا جاسکتا ہے؟ جس طرح راے صاحب کو یہ حق حاصل رہا ہے کہ اپنے ترقی پسندانہ خیالات کو حق تصور کرتے ہوئے اس کی اشاعت کریں، اسی طرح مذہبی جماعتوں کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ بھی اپنے خیالات کی اشاعت کریں اور پاکستان میں نفاذ اسلام کے لیے جدوجہد کریں اور پاکستان کا حصول اگر اسلام کے نفاذ کے لیے نہیں تھا تو پھر کس مقصد کے لیے تھا؟ چند مذہبی جماعتوں کو تقسیم ہند کی بنا پر مطعون کرنے اور انھیں شہری حقوق سے محروم کروانے سے قبل اہلِ پاکستان اپنی گزشتہ چھ عشروں کی کارکردگی پر نظر ڈال لیں تو بہتر ہوگا۔ وہ جماعتیں برملا راے صاحب کے ہم خیال حضرات سے دریافت کرسکتی ہیں:

کیا یہی ہے شاہکار تیرے ہنر کا

راے صاحب اور ان کی قبیل کے دانش ور صرف یہ بتادیں کہ اگر مسلم قومیت برحق تھی اور ہے تو لاکھوں پاکستانی مسلمان 1972ء سے بنگلہ دیش کے کیمپوں میں کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ کیا ابھی تک وہ وقت نہیں آیا کہ یہ بحث بند کردی جائے کہ کس نے پاکستان کی مخالفت کی تھی اور کس نے حمایت کی تھی؟ یہ بات اپنی جگہ میرے جیسے لوگوں کے لیے باعث حیرت ہے اور ملین ڈالر کا سوال بھی کہ اشرافیہ طبقہ (بورژوا) سے تعلق رکھنے والے نوابزادے، نواب، ممدوٹ، نون،

دولتانے، کھوڑو، وغیرہ تو تقسیم ہند کے حق میں تھے اور غریب اور بے نوا مذہبی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے درویش جن کا تعلق پرولتاریہ طبقہ سے تھا وہ تقسیم ہند کے خلاف تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ سو پچاس سال آگے دیکھ رہے تھے۔ راے صاحب کا علمائے کرام پر یہ بھی صرف اور صرف ایک الزام ہے:

''سب سے افسوس ناک بات یہ ہے کہ آج عالم اسلام میں مسلمان عوام کے ساتھ جو ظلم ہو رہا ہے اس میں حکمران طبقوں اور استحصال پیشہ افراد کو اہم ترین مددان مسلمان علماء نے ہی پہنچائی ہے جنھوں نے اسلام کے نام پر عوام کو یہ یقین دلایا کہ وہ برسر اقتدار بادشاہوں، سلاطین یا قابضین کی بلاچون وچرا اطاعت کریں''۔

یہ حقیقت ہے اور تاریخ اس پر گواہ ہے کہ سلاطین، قابضین اور استحصالی طبقات کی مدد ہمیشہ راے صاحب جیسے ترقی پسند دانش وروں نے کی جبکہ علمائے کرام نے ہمیشہ ان کی مخالفت کی اور زیر عتاب رہے۔ 1857ء میں پھانسی اور حبس دوام بعبور دریائے شور (کالے پانی) کی سزائیں علمائے کرام نے حاصل کیں اور دانش ور حضرات ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ تھے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں ریشمی رومال تحریک میں بھی صرف علمائے کرام ہی شامل تھے اور 1857ء سے قبل مجاہدین بالاکوٹ کی تحریک کے تو کوئی دانش ور قریب بھی نہیں پھٹکا تھا اور یہ سب تحریکیں استحصالی طبقات کے خلاف تھیں۔ میں راے صاحب سے یہ دریافت کرنے میں حق بجانب ہوں کہ کیا علمائے کرام میں سے بھی کسی کو ''سر'' یا ''خان بہادر'' کا خطاب ملا تھا؟ (''سر'' کا خطاب ملا بھی تو علامہ اقبال مرحوم کو ملا۔ اب راے صاحب کے قبیلہ کے دانش ور علامہ اقبال کو علمائے کرام میں شامل کرتے ہیں تو میرے جیسے لوگوں کو قبول ہے، لیکن اس کے بعد مسٹر صاحبان کے پاس کیا رہ جائے گا)۔ سکندر مرزا کے نورتنوں میں کوئی عالم دین شامل نہیں تھا اور نہ ہی ایوب خاں کی کابینہ میں کوئی عالم دین وزیر تھا اور نہ ہی جنرل یحییٰ کا ہم نوالہ وہم پیالہ کوئی عالم دین تھا اور نہ آج کے جنرل یحییٰ کو کسی عالم دین کی تائید حاصل ہے۔ راے صاحب نے اپنے مذکورہ مضمون میں علامہ اقبال مرحوم کو بھی زحمت دی ہے اور علامہ کے خطبہ الہ آباد کا حوالہ بایں الفاظ دیا ہے۔

''میں ایک الگ ریاست کے قیام کا مطالبہ اس لیے کررہا ہوں کہ اس سے ہندستان کے اندر توازن اقتدار اور امن وامان پیدا ہوجائے گا۔ دوسرے اسلام کو یہ موقع ملے گا

> کہ وہ عربی ملوکیت (Arabian Imperialism) کی چھاپ سے نجات پا کر اپنی اصل روح اور روح عصر کے قریب تر ہو جائے''۔

میرا یہ مقام نہیں کہ میں علامہ اقبال کے افکار عالیہ کے بارے میں کلام کر سکوں، البتہ راے صاحب کے ہم مشرب دانش ور حضرات سے یہ دریافت کرنے کا حق مجھے حاصل ہے کہ کیا ہندستان کے اندر وہ توازن اقتدار اور امن و امان پیدا ہو گیا جس کی توقع علامہ مرحوم نے ایک الگ ریاست کے قیام سے کی تھی؟ اگر نہیں تو کیوں؟ جبکہ ہوا اس کے برعکس ہے۔ تقسیم برصغیر کے وقت ہم نے لاکھوں مسلمان قتل کروائے اور ہزاروں مسلمان عورتیں بے آبرو کروائیں۔ بھارت سے بے نتیجہ تین جنگیں لڑیں۔ 1971ء میں مشرقی پاکستان میں وہ تاریخ دوبارہ دہرائی گئی جو 1947ء میں مشرقی پنجاب کی تاریخ ہے۔ یہ ہے توازن اقتدار اور امن و امان کا حقیقی ناک نقشہ، جو ایک الگ ریاست کے قیام سے حاصل ہوا۔ اب مسئلہ رہ جاتا ہے عربی ملوکیت کی چھاپ کا اور روح عصر کے قریب تر ہونے کا۔ ممکن ہے علامہ مرحوم کو علم نہ ہو لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام سے ''عربی ملوکیت'' کی چھاپ تو دوسری صدی ہجری میں ہی اتر گئی تھی۔ 127ھ میں بنی امیہ کی خلافت ختم ہو گئی تھی اور عباسی خلافت شروع ہو گئی تھی۔ 127ھ تک تابعین اور تبع تابعین کا دور ہے جسے لسان نبوتؐ نے خیر القرون قرار دیا ہے اور مسلمانوں کا ایمان ہے کہ وہ اس طرح کی ملوکیت کا دور ہرگز نہیں تھا جس طرح کی ملوکیت دنیا میں معروف تھی اور ہے۔ اس دور میں ہرگز کوئی استحصالی طبقہ موجود نہیں تھا اور نہ علما کا کوئی مخصوص طبقہ۔ ہر مسلمان ہی عالم دین تھا، بنی امیہ کا دور خلافت راشدہ کے معیار کا تو نہیں تھا لیکن اتنا گیا گزرا بھی نہیں تھا کہ اسے راے صاحب جیسے دانش وروں کے نقطۂ نظر سے قابل مذمت قرار دیا جائے۔

127ھ میں عباسی خلافت قائم ہو گئی جسے قائم کرنے میں ابو مسلم خراسانی نے اہم کردار (Leading Role) ادا کیا تھا۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے جس کے لیے مجھے کسی تاریخی حوالہ دینے کی ضرورت بھی نہیں کہ عباسی خلافت کے لیے تمام حمایت اہل ایران ہی سے حاصل ہوئی تھی۔ نسل پرستی اہل ایران کے خون میں شامل ہے اور غلبۂ اسلام کے بعد اہل ایران کے لیے مجوسی مذہب پر قائم رہنا تو ممکن نہ رہا لیکن اسلام کا بھی انھوں نے ایرانی ایڈیشن ہی تیار کیا جس میں خاندان نبوتؐ کی محبت غلو کی حد تک شامل تھی۔ عباسیوں نے امویوں کے خلاف اہل ایران کے

نسل پرستی کے جذبہ کی انگیخت کی اور بنو امیہ سے اقتدار چھین لیا۔ چنانچہ خلافت عباسیہ صرف نام کی حد تک عربی تھی ورنہ حکومت کے ہر شعبہ میں ایرانی اثرات کا غلبہ تھا۔ اس طرح اسلامی خلافت سے عربی ملوکیت کی تہمت 127ھ ہی میں زائل ہو گئی تھی۔ 927ھ میں خلافت عثمانی ترکوں کے پاس چلی گئی اور اسلامی خلافت سے نام کی حد تک عربوں کا جو تعلق تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ کیا اب راے صاحب یا ان کے قبیلے کا کوئی دانش ور میرے جیسے لوگوں کو آگاہ کرے گا کہ عربی ملوکیت کی کس قسم کی چھاپ باقی رہ گئی تھی جس سے ہندستان تقسیم کروا کر اسلام کو نجات دلانا مطلوب تھا؟

راے صاحب نے علامہ مرحوم کے پروگرام کا دوسرا مرحلہ یہ بیان کیا ہے کہ الگ ریاست قائم کر کے اسلام کی اصل روح کو روح عصر کے قریب کیا جائے۔ اسلام کی اصل روح تو ہمیں علماے کرام سے معلوم ہو گی اور وہ حسب توفیق و استعداد اس کا ابلاغ کرتے بھی رہتے ہیں۔ ہم جیسے عوام الناس کو اسلام کا جس حد تک بھی علم ہے وہ انھی کے طفیل ہے۔ لیکن یہ روح عصر کیا ہے؟ اس کی وضاحت راے صاحب نے اپنے مضمون میں نہیں کی۔ میں علامہ اقبال کے کلام کا غواص نہیں ہوں اس لیے نہیں جانتا کہ ''روح عصر'' سے علامہ مرحوم کی کیا مراد تھی لیکن راے صاحب کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ ''روح عصر'' یہ ہے کہ عورتوں نے بال کٹائے ہوئے ہوں۔ ان کے بازو اور آدھی پنڈلیاں برہنہ ہوں۔ مردوں نے لمبے لمبے بال رکھے ہوئے ہوں۔ ہاتھ میں ان کے گٹار ہو اور منہ میں ان کے سگریٹ ہو اور وہ ناچتے پھر رہے ہوں تو یہ ہو گی روح عصر کی تصویر۔ اگر میری نشان دہی غلط ہے تو راے صاحب کے قبیلہ کا کوئی دانش ور وضاحت کر دے کہ روح عصر کیا ہے؟

پاکستان میں روح عصر کا سب سے پہلا عارف ملک غلام محمد گورنر جنرل پاکستان تھا۔ موصوف ابھی وزیر خزانہ ہی تھے کہ دسمبر 1949ء میں اسے کراچی میں بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ موصوف نے اپنی خداداد بصیرت سے دیکھ لیا کہ کانفرنس میں اسلام تو ہے لیکن روح عصر کا وجود تک شامل نہیں۔ چنانچہ موصوف نے کانفرنس کے آخری اجلاس میں اہل اسلام کو بایں الفاظ متوجہ کیا:

> ''مجھے افسوس ہے کہ ہماری کانفرنس میں کوئی عورت نمائندہ بن کر نہیں آئی۔ مجھے پوری پوری امید ہے کہ تہران میں منعقد ہونے والی کانفرنس کے آئندہ اجلاس میں کچھ نہ

کچھ عورتیں نمائندہ حیثیت سے ضرور شریک ہوں گی"۔

روح عصر کی دوسری بڑی عارفہ مرحومہ بیگم لیاقت علی خاں تھی۔ مرحومہ جب تک فرسٹ لیڈی رہیں انھوں نے اسلام کو روح عصر کے قریب لانے کے لیے پوری جانفشانی سے جہاد جاری رکھا۔ ان دونوں کے بعد روح عصر کا بہت بڑا عارف جنرل یحییٰ خاں تھا اور اس کی کرامات ہمیں حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ سے معلوم ہوئی ہیں۔ جنرل یحییٰ کے بعد روح عصر کے عارف جنرل پرویز مشرف تھے جنھیں دیکھ کر ایک بزرگ جو خواجہ سگ پرست کے نام سے مشہور ہیں یاد آ جاتے ہیں۔ جنرل مشرف اپنی عارفانہ قوت سے ہمیں پچاس سال پیچھے لے گئے ہیں۔ تھوڑا سا زور اور لگاتے تو ہم انگریزوں کے دور میں پہنچ جاتے۔ ان کی مہربانی سے انگریز نہیں تو امریکا ہی سہی ہمارے لیے کوئی نہ کوئی آئیڈیل سہارا تو انھوں نے مہیا کر ہی دیا ناں! ویسے بھی اب انگریز کی جگہ امریکا بہادر نے حاصل کر لی ہے جو ہم پر ہر طرح سے مہربان ہے اسلام کو روح عصر کے قریب لانے میں اگر کوئی کسر باقی رہ گئی ہے تو جنرل مشرف کے ذوق جہاد سے وہ بھی پوری ہو گئی ہو گی۔ لیکن راے صاحب جیسے دانش وروں کے نزدیک شاید اسلام اور روح عصر کا اتصال اس وقت مکمل ہو گا جب ہمارے ہاں بھی حالت یہ ہو جائے گی کہ ایک بیٹی شام کو اپنے باپ سے کہے گی کہ "Dad, I am going with my boy friend. Don't wait for me at breakfast"۔ اور جواب میں باپ ان الفاظ میں دعا دے گا "Have a nice time" یا بیٹی ماں سے یہ کہے گی "Mom- Keep my baby till morning, I have to spend the night with my boy friend"۔ اور جواب میں ماں کہے گی "Sure, sure, don't worry for the baby, go and enjoy yourself"۔

جواب میں بیٹی ماں سے کہے گی "Oh, thanks Mom, You are a fantastic Mom"۔ اگر یہی ہے روح عصر، تو مولوی صاحبان ڈاڑھی والے ہوں یا بغیر ڈاڑھی کے، روح عصر کے راستے میں بالیقین دیوار بنے رہیں گے اور اس راہ میں نہ تو کسی الزام کی صفائی پیش کریں گے اور نہ کسی دشنام کا جواب دیں گے۔



من از بیگانگاں چنداں نہ نالم *

روزنامہ خبریں لاہور کی 15۔16/جون (2001ء) کی اشاعت میں آتش فشاں والے جناب منیر احمد منیر کا ایک مضمون بعنوان: "مولانا آزاد کو یہ آواز کانگریس کے پلیٹ فارم سے بلند کرنا چاہیے تھی" تین اقساط میں شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ اگر مولانا ابوالکلام آزاد 1947ء میں تقسیمِ ہند کے وقت، پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے خلاف تھے تو اس مقصد کے لیے انھیں کانگریس کے پلیٹ فارم سے یہ آواز بلند کرنا چاہیے تھی۔ چونکہ انھوں نے ایسا نہیں کیا تھا اس لیے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے خلاف نہیں تھے، لیکن اس مسئلہ کے دوسرے پہلو کے بارے میں مجھے بھی کچھ عرض کرنا ہے، جسے انھوں نے نظر انداز کر دیا ہے۔

منیر صاحب نے اپنے مضمون کی ابتدا جمعیت علمائے اسلام کے رہنما حافظ حسین احمد (ایم۔ این۔اے) کے اس بیان سے کی ہے جس میں انھوں نے کہا تھا:

> "مجھے دوقومی نظریے کا علم نہیں کہ وہ کیا ہوتا ہے، البتہ اتنا ضرور معلوم ہے کہ پاکستان میں اس وقت درجنوں نظریات ہیں۔ قیامِ پاکستان کے وقت میں دنیا میں نہیں تھا، لیکن ہمارے بزرگ بتاتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کا مقصد برصغیر کے مسلمانوں کی طاقت کو کم کرنا تھا۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان میں 14 کروڑ عوام بستے ہیں، بنگلہ دیش میں 20 کروڑ اور بھارت میں 22 کروڑ مسلمان ہیں۔ حساب لگا کر دیکھ لیں، حقیقت سامنے آجائے گی۔"

* یہ مضمون ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان میں شائع ہو چکا ہے۔

جہاں تک میں نے اس موضوع کا مطالعہ کیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ تقسیمِ برصغیر سے قبل ہمارا موقف یہ تھا کہ قوم مذہب سے بنتی ہے نہ کہ وطن سے۔ چونکہ ہندستان میں دو مذاہب (ہندو اور اسلام) کے ماننے والے رہتے تھے اس لیے ہندستان میں دو جداگانہ اقوام رہتی تھیں۔ اگر بر بنائے بحث مان بھی لیا جائے کہ قوم مذہب سے بنتی تھی یا بنتی ہے لیکن ہندستان میں ہندو کے علاوہ دوسرے مذاہب کے ماننے والے مثلاً سکھ، عیسائی، پارسی، بدھ اور جین مذاہب کے پیروکار بھی تھے۔ تو سوال یہ ہے کہ یہ سب اختلاف مذاہب کے باوجود مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندو کے ساتھ مل کر ایک قوم کیسے بن گئے؟ اس طرح تو دو قومی نظریہ کی جگہ کثیر القومی نظریہ ہونا چاہیے تھا۔ یہ بھی مان لیا کہ برصغیر میں صرف دو مذاہب کے ماننے والے ہی تھے، ہندو اور مسلم۔ مسلمان اپنے مذہب اسلام کے پیروکار ہونے کی وجہ سے ایک الگ قوم تھے، ہندو الگ قوم تھے۔ تو سوال یہ ہے کہ کیا صرف برصغیر کے مسلمان ہی اپنے مذہب کی بنا پر ایک الگ قوم تھے یا پوری دنیا کے مسلمان ایک الگ قوم تھے۔ اگر پوری دنیا کے مسلمان 14 اگست 1947ء سے قبل ایک قوم تھے تو آج بھی پوری دنیا کے مسلمانوں کا ایک قوم ہونا ضروری ہے لیکن یہ خلاف واقعہ ہے۔ ایران والوں سے دریافت کریں تو ان کا جواب یہ ہے کہ ہم تو اسلام سے قبل بھی ایرانی تھے اور اسلام کے بعد بھی ایرانی ہیں۔ عربوں سے دریافت کرلیں تو وہ بھی یہی کہیں گے کہ ہم اسلام سے پہلے بھی عرب تھے اور اسلام کے بعد بھی عرب ہیں۔ ترکی کا ذکر کیا کریں کہ وہاں تو اللہ تعالیٰ کا نام لینا بھی قابل دست اندازیِ پولیس جرم بن گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ صرف برصغیر کے مسلمان ہی بر بنائے مذہب ایک قوم تھے تو کیا آج بھی پورے برصغیر کے مسلمان ایک قوم ہیں یا اب وہ تین اقوام میں تقسیم ہو گئے ہیں؟ اگر آج پورے برصغیر کے مسلمان ایک نہیں بلکہ تین اقوام میں تقسیم ہیں تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ دو قومی نظریہ ایک وقتی اور اضافی نظریہ تھا جو 14 اگست 1947ء کی شام کو ختم ہو گیا تھا؟ کیا اب پاکستان میں ہم دو قومی نظریہ اور مذہب کی بنیاد پر دو اقوام کی تشکیل کر رہے ہیں، یا وطن کی بنیاد پر ایک قوم کی؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے بارے میں جناب منیر احمد منیر یا کسی دوسرے دانش ور کو اظہار خیال کرنا چاہیے تھا لیکن کسی نے بھی ان کی طرف توجہ نہیں کی۔

جہاں تک مولانا ابوالکلام آزاد کا تعلق ہے، مولانا ایک صاحب بصیرت و فراست راہنما تھے۔ وہ دو قومی نظریہ کو انتہائی گمراہ کن قرار دیتے تھے۔ وہ اس بنیاد پر تقسیمِ ہند کے سخت خلاف

تھے۔ بعد کے حالات نے بھی ان کے موقف کو درست ثابت کر دیا۔ آغا خان یونیورسٹی آف کراچی کے شعبہ اسلامک و پاکستان سٹڈی کے صدر، معروف دانش ور جناب ڈاکٹر حسین محمد جعفری نے جناب عارف میاں کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں مولانا ابوالکلام آزاد کی بصیرت و فراست پر مبنی سیاست کو درج ذیل الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا تھا:

''ایک تنہا انسان تھا پورے برصغیر میں، جو دو سو، پانچ سو سال آگے دیکھ رہا تھا اور دو سو، پانچ سو سال پیچھے دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ دیکھو اس جال میں نہ پھنسو۔ یہ تمھاری جگہ ہے۔ یہ تمھارا ملک ہے۔ اس کو مت چھوڑو۔ اس کا نام تھا ابوالکلام آزاد!'' (1)

اگر مولانا آزاد نے تقسیمِ پنجاب اور تقسیم بنگال کے خلاف آواز بلند نہیں کی تو ہمیں ان سے شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ کیا لیگی قیادت کو یہ اندازہ تھا کہ پنجاب اور بنگال تقسیم بھی ہو سکتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں مسلمانوں پر قیامت بھی ٹوٹ سکتی ہے؟ کیا لیگی قیادت نے اس کا کوئی بندوبست کیا تھا کہ اگر اسے وہ تمام علاقہ جس کا مطالبہ کیا گیا تھا مذاکرات کی میز پر نہ ملا تو وہ اسے کس طرح حاصل کرے گی؟ یا صرف انگریز کے رحم و کرم پر ہی بھروسہ تھا؟ اگر اس قیادت میں بصیرت و حکمت نام کی کوئی چیز تھی تو اسے اس کا اندازہ ہونا لازمی تھا۔ اگر اندازہ تھا تو لیگی قیادت نے اس کا تدارک کرنے کے لیے کیا انتظام کیا تھا؟ اگر اِسے اندازہ نہیں تھا تو اس قیادت کو کیا نام دیا جائے؟ اور اگر اندازہ تھا تو اس نے اس تباہی کو روکنے کے لیے کچھ بھی تو نہ کیا جو مشرقی پنجاب میں ہم پر ٹوٹی۔ بقولِ شاعر:

من از بے گانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہرچہ کرد آں آشنا کرد

ترجمہ: ''میں بے گانوں کی (بدسلوکی) کو نہیں روتا، مجھ سے جو بھی کیا اپنوں نے ہی کیا''

اصل بات یہ ہے کہ جناح صاحب کا یہ مسئلہ ہی نہیں تھا کہ مسلم ریاست کے لیے کتنا علاقہ ملتا ہے۔ انھیں تو صرف ایک خطہ چاہیے تھا جس کے وہ بانی کہلا سکیں۔ جناح صاحب خود کہتے تھے کہ مجھے تو الگ وطن چاہیے، بے شک اس کا جغرافیہ ایک رومال کے برابر ہو۔ لیگی قلم کار جناب ڈاکٹر ایم۔اے صوفی ''تقسیمِ ہند، وائسرائے اور قائداعظم'' کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں:

''ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ مسٹر جناح! ٹوٹا پھوٹا پاکستان کا کیا کرو گے؟ اس پر قائداعظم

محمد علی جناح نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور کہا کہ اتنا بھی ہو، مجھے تو مسلمانوں کا جدا وطن چاہیے۔" (2)

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلم لیگ نے تحریک پاکستان کے دوران قطعاً کوئی منصوبہ بندی نہیں کی تھی۔ انھیں اس سے کچھ غرض نہیں تھی کہ کیا ملتا ہے، کتنا ملتا ہے؟ جناب نسیم انصاری (علیگ) اپنی آپ بیتی جواب دوست میں لکھتے ہیں:

"پاکستان بنانے کے لیے تو سب بے چین تھے لیکن اس کا کوئی نقشہ کسی کے ذہن میں نہیں تھا اور ستم بالائے ستم تو یہ بات تھی کہ کوئی اس کی ضرورت بھی نہیں سمجھتا تھا۔ ہر طرف سیاسی جوش وخروش کے جلوے دکھائی دیتے تھے۔" (3)

کاش ہمارے "ہیرو" مسٹر جناح نے بھی پورے برصغیر سے مسلمان رضا کاروں کو ساتھ لے کر شمال مغرب کی طرف ماؤزے تنگ کی طرح لانگ مارچ کیا ہوتا اور انگریز سے برصغیر کی تقسیم کی بھیک مانگنے کی بجائے مسلح جدوجہد کے ذریعے پاکستان حاصل کیا ہوتا تو ہم بھی آج چین جیسی طاقت ہوتے۔ لیکن جناح صاحب نے تو زندگی میں کبھی بندوق یا پستول کو ہاتھ بھی لگایا ہوگا تو اس کے لیے جارج ششم اور ایڈورڈ ہفتم کی حکومت سے باقاعدہ پیشگی اجازت نامہ (لائسنس) حاصل کیا ہوگا۔ کاش جناح صاحب نے گورنر جنرل کی کرسی کو رونق بخشنے کی بجائے مشرقی پنجاب سے آنے والے قافلوں میں سے کسی قافلے کے ساتھ پیدل سفر کیا ہوتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ اس نے کس قیمت پر کیا حاصل کیا ہے؟

ہندستان میں اگر مسلمان غلام ہوئے تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مسلمان تعداد میں کم ہو گئے تھے اور انگریز تعداد میں زیادہ آ گئے تھے۔ عددی قلت وکثرت مسلمان کا کبھی مسئلہ ہی نہیں رہی۔ انڈونیشیا آج مسلم آبادی کا ملک ہے، وہاں تو کوئی محمود غزنوی حملہ آور نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی ان مسلمانوں نے جو اُن جزیروں کے سواحل پر اترے تھے، وہاں قلت وکثرت کی بحث چھیڑی تھی اور نہ ہی ایک قومی یا دو قومی نظریہ پیش کیا تھا۔ انھوں نے وہاں پر جا کر اللہ کے واحد اور احد ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ کے آخری رسول ہونے کی گواہی دی تھی۔ اگر قلت وکثرت ہی کی بات ہے تو برصغیر میں غیر مسلموں کی کثرتِ تعداد کی ذمہ داری کس پر ہے؟ کیا ہم مسلمانوں نے غیر مسلموں پر اس طرح اتمام حجت کر دی تھی جس طرح انبیائے کرامؑ کیا کرتے تھے۔ اگر یہ کام

جو مسلمانوں کا فرض منصبی تھا اور ہے، نہیں کیا تھا تو ان کی قلتِ تعداد کی ذمہ داری خود اُنھی پر عائد ہوتی ہے۔

ہندستان میں مسلمان اس وجہ سے غلام نہیں ہوئے تھے کہ ان کی تعداد کم ہو گئی تھی اور انگریز زیادہ تعداد میں آ گئے تھے بلکہ مسلمان اس لیے غلام ہو گئے تھے کہ ان کے اندر وہ اوصاف ختم ہو گئے تھے جو کسی قوم کو آزاد رکھ سکتے ہیں۔ لیکن کیا 14 اگست 1947ء تک ہم مسلمانوں نے اپنے اندر وہ جوہر پیدا کر لیا تھا جو آزادی قائم رکھنے کے لیے درکار تھا؟ افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ ہم ہندستان میں غلام اس لیے ہوئے تھے کہ ہم مسلمان رہے ہی نہ تھے۔ اگر ہمارے اندر ایمان خالص ہوتا جو ایک حقیقی مسلمان سے مطلوب ہے تو ہم غلام ہو ہی نہیں سکتے۔ ہندستان میں مسلمان ایک جداگانہ قوم تھے یا نہیں، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ ہم وہ مسلمان تھے ہی نہیں جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہیں، کیونکہ مسلمانوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. (آل عمران 139)

"اور تم ہمت نہ ہارو اور غم نہ کرو اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم صاحبِ ایمان ہو۔"

غلبہ واقتدار اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے لیکن اس کے لیے شرط صرف ایمان ہے۔ صرف ایمان۔ کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے قلت وکثرتِ تعداد کا مسئلہ کبھی مسلمانوں کا مسئلہ رہا ہی نہیں۔ مسلمان کا سرمایہ تو ہے ہی اس کا ایمان جو اس کے پاس ہے تو سب کچھ ہے اگر یہ نہیں ہے تو اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، کیونکہ مسلمان کو معلوم ہے:

قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ. (البقرہ 249)

"ایسے لوگ جن کو یہ خیال تھا کہ اللہ کے روبرو پیش ہونے والے ہیں کہنے لگے کہ اکثر ایسا ہوا کہ بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آ گئیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

چونکہ 15 اگست 1947ء تک اور نہ اس کے بعد ہم نے اپنے اندر وہ صفات پیدا کیں جو ایک آزاد قوم کے لیے ضروری ہیں تو ہم پھر سے غلام ہو گئے ہیں۔ پہلے ہم اگر عیسائیوں کے غلام تھے تو اب ہم یہودیوں کے غلام ہیں۔ کشکول گدائی ہاتھ میں ہے اور خیرات کے حصول کے لیے ہم

آئی۔ ایم۔ ایف اور عالمی بینک کی ہر شرط قبول کرنے کے لیے تیار ہیں اور ہمارے وزرائے خزانہ خواہ ڈاکٹر محبوب الحق ہوں یا شوکت عزیز یا پھر شوکت ترین، انھی کے نمائندے ہوتے ہیں۔ البتہ یہ غلامی وکھری ٹائپ کی ہے۔ اس لیے ہم اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ ہم آزاد ہیں۔ اخلاقی طور پر ہم پست ترین مقام پر ہیں۔ فراڈ اور دھوکہ دہی کی نئی سے نئی قسم ہم نے ایجاد کرلی ہے کہ شیطان بھی ہمیں استاد مان گیا ہوگا۔ منافقت ہماری قومی پالیسی ہے اور یہ پالیسی ہمیں اسی جماعت سے ورثہ میں ملی ہے جس کے توسط سے ہم نے برصغیر تقسیم کروایا۔ کیا ہمارے قائدین کو معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے اور اس حد تک حرام ہے کہ سود کا کاروبار کرنے والا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کرتا ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے قائدین دیدہ دلیری سے سود پر قرض لیتے رہے تو یہ اللہ اور اُس کے رسولؐ کے خلاف کھلی جنگ ہی تو ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ سے جنگ کر کے ہم کس طرح فلاح پا سکتے ہیں؟ ہمارے ملک کا نام تو ہے: ''اسلامی جمہوریہ پاکستان۔'' لیکن اس اسلامی جمہوریہ پاکستان میں اسلام کس حد تک ہے؟ ٹیلی ویژن کے پروگرام دیکھ لیں۔ جمہوریت کو دیکھنا ہو تو جنرل ایوب، جنرل یحییٰ، جنرل ضیاء اور جنرل پرویز مشرف کے ادوار یا کوئی بھی نام نہاد جمہوری ادوارِ حکومت دیکھ لیں۔



حوالہ جات

(1) برصغیر کیسے ٹوٹا؟/عارف میاں/ص:117
(2) روزنامہ نوائے وقت (سنڈے میگزین)، لاہور/22 ستمبر 2010ء
(3) جوابِ دوست (آپ بیتی)/نسیم انصاری/ص:24

اختتامیہ

تقسیم ہند کے حوالے سے لیگی نقطۂ نظر رکھنے والے ایک معروف دانشور جناب خالد ہمایوں کی ایک تحریر پر میں اپنی اس کتاب کا اختتام چاہتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ایک بار میں نے ممتاز ادیب سیّد قاسم محمود سے انٹرویو کے دوران پوچھا: ''شاہ جی! آپ مسلمانانِ برصغیر کے علیحدہ وطن کے مطالبے کو کس طرح ایک درست مطالبہ سمجھتے ہیں؟'' فرمانے لگے: ''مسلمانوں کا پاکستان بنانے کا فیصلہ تو درست ہی تھا، لیکن وہ مقصد پورا نہیں ہو سکا جس کی خاطر اتنی عظیم الشان تحریک چلائی گئی تھی۔ میں جب چوتھی جماعت میں تھا تو ہمارے ایک ہندو استاد نے ہم مسلمان طلبہ سے مخاطب ہو کر کہا: ''پاکستان بنانے چلے ہو، بنالو، لیکن یاد رکھو تم پر پھر بھی دولتانے اور ٹوانے ہی حکومت کریں گے۔'' میں آج ساٹھ سال کے عرصۂ آزادی پر نگاہ ڈالتا ہوں تو اپنے اس ہندو استاد کا یہ بصیرت افروز جملہ ضرور یاد آ جاتا ہے۔

بلاشبہ حصولِ آزادی کے وقت سیاست پر جاگیردار اور وڈیرے ہی غالب تھے۔ بعد میں ان کا سول اور غیر سول افسروں سے گٹھ جوڑ قائم ہو گیا۔ ان طبقات کی غیر متوازن اور مفاد پرستانہ پالیسیوں کے نتیجے میں صنعت اور تجارت کے شعبے شروع ہی میں کرپشن کا شکار ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے ملک دولخت ہوا، پھر سوشلزم، اسلامی نظام اور پھر روشن خیالی کے تجربے کیے گئے، جن سے مذکورہ طبقات کے کروفر میں اضافہ تو ضرور ہو گیا، لیکن عوام مسلسل غربت، جہالت، بیروزگاری، رشوت ستانی اور لاقانونیت کے اندھیروں میں بھٹکتے رہے۔ انھیں اب خودکشی کرنے کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ ان حالات میں کچھ لوگوں نے قیامِ پاکستان کے جواز پر جرح و تنقید شروع کر دی

ہے۔ ہے تو فطری سی بات۔ جب آئے روز مارشل لاء لگتے ہوں، آئین وقانون کی سرِ عام دھجیاں بکھیری جا رہی ہوں اور ملکی تاریخ میں لال مسجد کے سانحہ ایسا باب رقم ہو رہا ہو، تو ذہن میں ان سوالات کے ابھرنے کے امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ کیا یہ وہی پاکستان ہے جس کا خواب اقبالؒ نے دیکھا، اور قائداعظمؒ نے جسے عملی شکل دی تھی؟ کہیں یہ انگریز کی سازش ہی نہ ہو؟ کیونکہ آزادی کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کی طاقت تین حصوں میں منقسم ہوگئی ہے۔ اگر ہندستان متحد رہتا تو ممکن ہے مسلمان ایک مؤثر قوت کے طور پر موجود رہتے؟ نہ لاکھوں افراد قتل ہوتے، نہ گھر بار چھوڑنے پڑتے اور نہ عفتوں کے آبگینے ٹوٹتے۔ قائداعظمؒ ماؤنٹ بیٹن کو پاکستان کی گورنر جنرل شپ کی آفر دے دیتے تو ممکن ہے کشمیر کا تنازع سر نہ اٹھاتا، نہ اس مسئلے کی وجہ سے صرف ایک ہی طبقہ پھلتا پھولتا۔

علم ودانش کی روشنی میں اور باقاعدہ استدلال کے ساتھ اگر کوئی ان اشکالات پر غور وفکر کرتا اور تجزیہ رقم کرتا ہے تو اس پر کسی کو ناراض نہیں ہونا چاہیے، نہ کسی کی حب الوطنی پر طعن وتعریض کی گنجائش ہوتی ہے۔'' (1)



حوالہ

(1) روزنامہ پاکستان لاہور/16 نومبر 2009ء

مراجع ومصادر

اُردو کتب

1۔ ارشادات حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائپوری/ مولانا محمد عبداللہ/ مکتبہ رشیدیہ، لاہور

2۔ اک شکستہ داستاں، کچھ شگفتہ تذکرے/ سرور میواتی/ ادارہ تحقیقات میوات، لاہور

3۔ اوراق ھند (والٹیر کا گمنام۔تاریخی اور ادبی شاہکار)/ حمیرا اشفاق/ سانجھ، لاہور/ جنوری 2011ء

4۔ انڈیا ونز فریڈم/ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مرتبہ: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری/ آزاد نیشنل اکیڈمی، کراچی

5۔ آزادی کی کھانی، میری زبانی/ سردار عبدالرب نشتر، مرتبہ آغا مسعود حسین/ طاہر نیوز ایجنسی، کراچی/ س،ن

6۔ آغا خاں/ مہیر بوس۔ مترجمہ: حمید اختر/ جمہوری پبلی کیشنز، لاہور

7۔ برصغیر کیسے ٹوٹا؟/ عارف میاں/ براڈلے پبلی کیشنز، لاہور/ اگست 2009ء

8۔ برطانوی راج کے آخری ایام/ لیونارڈ موزلے (مترجمہ: سیّد فضل حسین)/ ادارہ نقوش، لاہور

9۔ بندۂ صحرائی (خودنوشت آپ بیتی)/ علامہ محمد اسد۔ مترجمہ: محمد اکرام چغتائی/ دی ٹروتھ سوسائٹی، لاہور

10۔ پاکستان اور اچھوت/ چودھری افضل حق/ مکتبہ اُردو، لاہور/ طبع اوّل: 1941ء

11۔ پاکستان، قیام اور ابتدائی حالات/ سری پرکاش (ہائی کمشنر بھارت برائے پاکستان)، مترجمہ: حمایت الحسن/ تخلیقات، لاہور/ اگست 1993ء

12۔ پاکستان میں جمہوریت اور گورننس/ طاہر کامران/ ساؤتھ ایشیاء پارٹنر شپ پاکستان، لاہور/ اکتوبر 2008ء

13۔ پاکستان کی سیاست کا پہلا عوامی و ہنگامی دَور (69ء تا 72ء کے سیاسی تجزیے)/ ڈاکٹر اسرار احمد/ مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور/ 1996ء

14۔ پاکستان میں اُردو کا المیہ/ مولوی عبدالحق/ انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی

15۔ پاکستان میں کیا ہو گا؟ [خطبات وتقاریر: مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ]/ مرتبہ: سیّد محمد کفیل بخاری/ بخاری اکیڈمی، ملتان

16۔ تاریخ پاکستان— پس منظر و پیش منظر/ حکیم محمود احمد ظفر/ نشریات، لاہور/ 2010ء

17۔ تواریخ عجیب المعروف بہ کالا پانی/ مولانا محمد جعفر تھانیسری، مرتبہ: ڈاکٹر محمد ایوب قادری/ کراچی

18۔ تحریک پاکستان اور انتقال اقتدار (ماؤنٹ بیٹن پیپرز)/ مترجمہ: محمد فاروق قریشی/ فکشن ہاؤس، لاہور

19۔ تحریک خلافت/ قاضی محمد عدیل عباسی/ قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، نئی دہلی/ 1997ء

20۔ تحریک ریشمی رومال/ مولانا سیّد محمد میاں دہلوی/ مکتبہ محمودیہ، لاہور

21۔ تحفۂ اثنا عشریہ/ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی/ عالمی مجلس تحفظ اسلام، کراچی

22۔ تصوف کی حقیقت تاریخ کی روشنی میں/ ڈاکٹر حبیب الرحمٰن علوی/ پاک اکیڈمی، کراچی

23۔ جائزہ (خودنوشت سوانح عمری)/ جسٹس کے. ایم. اے. صمدانی/ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور/ 2004ء

توصاحب منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی

24۔ جواب دوست (خودنوشت آپ بیتی)/ نسیم انصاری/ آج کتب خانہ، کراچی/ 1997ء

25۔ حالات قائداعظم/ خالد اختر افغانی/ آتش فشاں پبلی کیشنز، لاہور

26۔ حضرت قائداعظمؒ کے حضور میں/ پروفیسر محمد مظفر مرزا/ ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور/ 2010ء

27۔ حیات امیر شریعت/ جانباز مرزا/ مکتبہ تبصرہ، لاہور/ 1980ء

28۔ خودنوشت افکار سرسید/ مرتبہ: ضیاء الدین لاہوری/ فضلی سنز سپر مارکیٹ، کراچی

29۔ دو قومی نظریہ اور پاکستان/ پروفیسر محمد مسعود احمد/ ادارۂ مسعودیہ، کراچی/ 1996ء

30۔ خطبات قائداعظم/ رئیس احمد جعفری ندوی/ مقبول اکیڈمی، لاہور

31۔ ذوق پرواز (خودنوشت آپ بیتی)/ محمد صدیق/ نشریات، لاہور/ اشاعت دوم 2009ء

32۔ سفیر اور سفارت کاری (ایک دور کی کہانی: 1987-1947ء)/ سمیع اللہ قریشی/ پیراماؤنٹ پبلشنگ انٹر پرائزز، کراچی/ نومبر 2006ء

33۔ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری: سوانح و افکار/ آغا شورش کاشمیری/ ادارہ مطبوعات چٹان، لاہور

34۔ شاہراہ پاکستان/ چودھری خلیق الزماں/ کراچی

35۔ شہاب نامہ/ قدرت اللہ شہاب/ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

36۔ صلاح الدین/ عبدالسلام خورشید

37۔ قائداعظم— اعتراضات اور حقائق/ منیر احمد منیر/ مکتبہ آتش بیاں، لاہور/ 2010ء

38۔ قائداعظم اور راولپنڈی/ منظور الحق صدیقی/ قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، اسلام آباد/ 1983ء

39۔ قائداعظم بحیثیت گورنر جنرل/ قیوم نظامی/ جہانگیر بکس، لاہور/ 2010ء

40۔ قائداعظم جناح: برصغیر کا مرد حریت/ شریف فاروق/ پشاور

41۔ قائداعظم کے رفقاء سے ملاقاتیں/ سیّد محمد ذوالقرنین زیدی/ قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، اسلام آباد/ 1990ء

42۔ قائداعظم کے خاندانی تنازعے/ خالد احمد/ پرنٹ لائن پبلشرز، لاہور/ اپریل 2000ء

43۔ قائداعظم- تقاریر و بیانات/ اقبال احمد صدیقی/ بزم اقبال/ لاہور

44۔ کاروانِ احرار (جلد ہشتم)/ جانباز مرزا/ مکتبہ احرار، لاہور/ 1986ء

45۔ کلیات شبلی/ علامہ شبلی نعمانی (مرتبہ: علامہ سیّد سلیمان ندوی)/ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ/ 2007ء

46۔ گم گشتہ قوم (خودنوشت سوانح حیات)/ سردار شوکت حیات خاں/ جنگ پبلشرز، لاہور/ دسمبر 1995ء

47۔ گونج (چند یادیں، چند باتیں)/ ایم. اقبال/ لاہور/ 1985ء

48۔ لفظوں کی کہانی، لفظوں کی زبانی/ خالد احمد/ مشعل، لاہور/ 2010ء

49۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے انکشافات/ شکیل احمد ضیا/ شبل پبلی کیشنز، کراچی/ مارچ 1988ء

50۔ میں نے پاکستان بنتے دیکھا/ کرنل (ر) حامد محمود/ القلم دارالاشاعت، اسلام آباد/ اگست 1996ء

51۔ ہند- پاک ڈائری/ مولانا وحیدالدین خاں/ گڈورڈ بکس، دہلی/ 2006ء

52۔ ہم آغاخانی مسلمان کیسے ؟/ اکبر علی غلام حسین/ اسماعیلیہ نمازی خدمت کمیٹی، کراچی

53۔ ہماری قومی جدو جہد/ عاشق حسین بٹالوی/ پاکستان ٹائمز پریس، لاہور

54۔ ہمارے اسمٰعیلی مذہب کی حقیقت اور اس کا نظام/ ڈاکٹر زاہد علی/ مکتبہ بیّنات، کراچی

55۔ یاد ایام (آپ بیتی)/ مولانا محمد زکریا کاندھلوی/ مکتبہ خلیل، لاہور/ س،ن

56۔ یادوں کے دریچے (آپ بیتی)/ صلاح الدین ندیم/ مکتبہ میقات، سرگودھا

57۔ یادیں جو فراموش کر دی گئیں/ منشی عبدالرحمٰن خاں/ عالمی ادارہ اشاعت علوم اسلامیہ، ملتان/ س،ن

اُردو رسائل و جرائد اور اخبارات

1۔ ہفت روزہ اخبار جہاں، کراچی

2۔ ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ، لاہور، آزادی نمبر

3۔ روزنامہ اساس، لاہور

4۔ ماہنامہ افق، کراچی

5۔ ماہنامہ افکار معلم، لاہور

6۔ ماہنامہ الاحرار، لاہور

7۔ روزنامہ الجریرہ، لاہور

8۔ روزنامہ الجمعیۃ، دہلی

9۔ الهلال، لاہور

10۔ روزنامہ انصاف لاہور

11۔ روزنامہ انقلاب لاہور

12۔ روزنامہ ایکسپریس، لاہور

13۔ روزنامہ آواز، لاہور

14۔ ماہنامہ بتول لاہور، آزادی نمبر

15۔ روزنامہ پاکستان، لاہور

16۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور

17۔ ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور

18۔ ماہنامہ تجزیات، اسلام آباد

19- ماہنامہ تھذیب، کراچی

29- روزنامہ جنگ، لاہور

21- ماہنامہ چھار سو، راولپنڈی

22- ماہنامہ حکایت، لاہور

23- روزنامہ خبریں، لاہور

24- روزنامہ دن، لاہور

25- ماہنامہ ذھن لاہور، قراردادِ لاہور نمبر

26- ماہنامہ سیّارہ، لاہور

27- ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ، لاہور

28- ماہنامہ عزم، لاہور

29- ہفت روزہ فرائیڈے سپیشل کراچی

30- ہفت روزہ فیملی میگزین لاہور

31- ماہنامہ قومی ڈائجسٹ، لاہور، اشاعت خصوصی: مسلم لیگ کے سو سال

32- سہ روزہ مدینہ بجنور

33- پندرہ روزہ معارف فیچر، کراچی

34- ماہنامہ میثاق، لاہور

35- ماہنامہ ملّیہ، فیصل آباد

36- ماہنامہ مولوی، دہلی

37- ماہنامہ نیازمانہ، لاہور

38- پندرہ روزہ ندا، لاہور

39- ہفت روزہ ندائے ملت، لاہور

40- ماہنامہ نقیب ختم نبوت، ملتان

41- روزنامہ نوائے وقت، لاہور

42- ہفت روزہ ھم شھری لاہور

English Books

1. *American Role in Pakistan,* by Venkat Ramani, Vanguard Books Ltd., 1984
2. *Bangladesh-A Legacy of Bloodshed,* by Mascarenhas, Hodder and Stoughton, London, 1986
3. *English Translation of Holy Quran,* by Arther J. Arberar
4. *Facts are Facts,* by Abdul Wali Khan, Publication Cell, Bacha Khan Trust, Peshawar, 2006
5. *Freedom at Midnight,* by Larry Collins& Dominique Lapierre, published by Harper Collins, London, 1997
6. *Gandhi, The Man, His People and The Empire,* by Rajmohan Gandhi, Haus Book, London, 2007
7. *India Wins Freedom,* by Maulana Abu-Alkalam Azad, Orient Longman (Pvt) Ltd.
8. *Jinnah of Pakistan,* by Stanely Walpert, Oxford University Perss, 1984
9. *Liberty or Death,* by Patrick French, Harper Collins, London, 1997
10. *Our Freedom Fighters,* by G.Allana
11. *Roses in December, by M.C.Chagla, Bharatiya Vidia Bhavan, Mumbai, 2000*
12. *The Great Divide,* by H.V.Hodson, Oxford University Press, 2008

13. *The Divine Imprint on the Birth of Pakistan,* by Como. Tariq Majeed
14. *The Shameful Flight,* by Stanely Wolpert
15. *The Sole Spokesman,* by Ayesha Jalaal, Sang-e-Meel Publishers, Lahore, 1999
16. *The Sun Shall Rise/* Atta Rabani/ Feroz Sons, Lahore
17. *Towards India's Freedom & Partition,* by S.R.Melhotra, Rupax Co., Darya Ganj, Delhi

English Newspapers

1. The Nation, Lahore

من آنم

میری پیدائش دسمبر 1933ء میں پاکپتن شہر میں ہوئی جہاں ہمارا خاندان صدیوں سے آباد ہے۔ والد صاحب کے حصہ میں تقریباً اٹھارہ ایکڑ زرعی زمین آئی تھی۔ اسی پر ان کا گزارہ تھا، لہٰذا بچپن عسرت میں گزرا۔ والدِ مرحوم میں دیانت داری، حق گوئی اور قناعت کی صفات انتہا درجہ پر تھیں۔ اس کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ 1947ء میں تقسیم ہند کے موقع پر غیر مسلموں کے چھوڑے ہوئے سامان سے لوگوں نے گھر بھر لیے لیکن ہمارے گھر میں ایک چمچ تک نہیں آیا تھا۔ والد صاحب نہ تو کسی سے سوال کر سکتے تھے اور نہ کسی کی ماتحتی میں کام کر سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

1948ء میں میٹرک پاس کیا تو عسرت کے سبب سلسلۂ تعلیم ختم کرنا پڑا۔ اتفاقاً کوآپریٹو بنک پاکپتن میں کلرک کی نوکری مل گئی جہاں تقریباً سات سال کام کیا۔ بنک کی ملازمت چھوڑنے کے بعد تقریباً چار سال منٹگمری (موجودہ ساہیوال) میں ایک دو پرائیویٹ فرموں میں کام کیا، اس دوران بی اے کر لیا۔ اس کے بعد اظہار کنسٹرکشن لمیٹڈ نامی ادارے سے وابستہ ہو گیا۔ اس دوران 1963ء میں کراچی تبادلہ ہو گیا۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے ایل ایل بی کرنے کے اسباب پیدا کر دیے۔ 1965ء میں ایل ایل بی کرنے کے بعد بھی اسی ادارے سے وابستہ رہا۔ 1973ء میں لاہور آ گیا۔ 1986ء میں وکالت شروع کر دی۔ اظہار کنسٹرکشن لمیٹڈ نے اس وقت تک ایک گروپ آف کمپنیز کی صورت اختیار کر لی تھی، تب مجھے گروپ کے ٹیکس مشیر اور سیکرٹری کی پوزیشن دے

دی۔

میرا بچپن مشرکانہ ومبتدعانہ یعنی بریلویانہ ماحول میں بسر ہوا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے وقت گزرنے کے ساتھ وہ تمام اثر ختم ہو گیا۔ الحمدللہ اب میں مسلک اہلِ سنت پر قائم ہوں۔ اللہ تعالیٰ اُن علمائے کرام کو جزائے خیر دے جن کی کتب اور رسائل کے مطالعہ نے مشرکانہ ومبتدعانہ اثرات دھو ڈالے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بعد میں ختم نبوت کے موضوع پر بھی کچھ کام کیا جسے:

(1) نزول مسیحؑ کیوں؟

(2) حیات مسیحؑ اور ختم نبوت

(3) مرزا غلام احمد قادیانی کے "کارنامے"

کے عنوانات سے کتابوں کی صورت میں شائع کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کیا۔ الحمدللہ ان کتابوں کو پسند کیا گیا ہے۔

1971ء تک میں ذہناً مسلم لیگی تھا۔ دو قومی نظریہ پر ایمان رکھتا تھا۔ مسٹر جناح کا بھی عقیدت مند تھا۔ لیکن مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش میں منقلب ہونے کی وجہ سے ذہن میں بہت سے سوالات پیدا ہوئے تو تقسیم برصغیر سے قبل کی سیاسی کشمکش کے مطالعہ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ خاص طور سے مسلم لیگ، مسٹر جناح اور دو قومی نظریہ کے بارے میں پڑھا۔ جس کے نتیجہ میں سابقہ نظریات وخیالات سے تائب ہوا اور اس مطالعہ کے نتیجہ میں جو فہم میں آیا اُسے **تو صاحب منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی** کے عنوان سے ہدیۂ قارئین کر دیا ہے۔ اب یہ فیصلہ قاری ہی کرے گا کہ اس میں خطا کتنی ہے اور صواب کس قدر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بلاتعصب حق کو شناخت کرنے، حق کو تسلیم کرنے اور پھر حق کو بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

نور محمد قریشی

19 جولائی 2011ء

اشاریہ

مرتب

حسین عبداللہ میواتی

شخصیات

اماکن

جماعتیں، ادارے، تحریکیں

کتابیں، رسالے، اخبارات